جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

احمد اقبال

8

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی ، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

آٹھواں حصہ

احمد اقبال

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۲۰۰۳ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

ISBN 969-517-087-0

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اس کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سارا راستہ پیدل چل کے یا دوڑ کے آئی ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور صورت سے وحشت عیاں تھی۔

میں نے کہا "رخشی، کیا بات ہے؟"

خود کو میری بانہوں میں دیکھ کے وہ کچھ شرمائی "معاف کرنا۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے خود کو سنبھالا "مجھے، مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

سونی میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی "اچھا اندر آ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ کے بات کریں گے۔"

"کہاں سے آ رہی ہو اس وقت؟" میں نے کہا۔

"گھر سے۔"

اندر سے رئیس نمودار ہوا "ارے تم۔ رخشی۔!"

رخشی نے سر ہلایا "دراصل امی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔"

مجھے کچھ شرمندگی ہوئی "آئی ایم سوری۔ مجھے پیغام ہونا تھا۔"

"لیکن فرصت نہیں ملی۔" رخشی نے طنز سے کہا۔

"فرصت آدمی نکالتا ہے صرف اپنے کام کے لیے۔"

میں نے کہا "ایسا نہیں ہے۔ میں کوئی عذر نہیں تراش رہا ہوں۔ ندامت کا اظہار کر رہا ہوں۔"

رئیس نے کہا "ہم سے بھی پوچھو تو سہی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں۔ پہلے بتاؤ امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس نے دیوار کا سہارا لے کر انکار میں سر ہلایا "نہیں، فریدان کو اسپتال لے گئے ہیں۔"

سونی نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا "چلو اندر نہ سہی، یہاں آ کے آرام سے بیٹھو۔"

وہ برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی "مجھے اسپتال جانا ہے۔"

"چلی جانا۔ میں چھوڑ آؤں گا تمہیں" میں نے اسے تسلی دی۔

رئیس نے بھی اس کے کندھے پر ہمدردانہ تھپکی دی "اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

"یہ سب رسمی باتیں مت کرو" رخشی نے بیزاری سے کہا۔

سونی نے اسے پانی کا گلاس دیا "پانی پی کے ذرا پرسکون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں چائے لاتی ہوں۔"

س نے پانی پی کے سونی کو روک دیا "ان کی طبیعت
ت خراب چل رہی تھی۔"

"آخر مسئلہ کیا ہے؟"

رخشی نے خفگی سے کہا "یہ سوال تم پوچھ رہے ہو۔
جنی ہوگئے ہو تم چند دن میں۔"

ں نے کہا "میرا مطلب تھا' اچانک کیا ہوگیا؟"

"کچھ بھی اچانک نہیں ہوا۔ تمہیں لگ رہا ہے اچانک
یا کیوں آگے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ ان کو ہائی بلڈ پریشر
بیت ہے پرانی۔ شوگر کی پرابلم ہے اور پھر ان کی عمر۔۔۔
ں سے گھبراہٹ کی شکایت کررہی تھیں مگر اسپتال جانے
ں نہیں تھیں کہ وہ داخل کرلیں گے۔"

"بزرگ تو ایسے ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا "بوڑھا بچہ
ہے ضدی ہوجاتے ہیں۔"

"ان کے دل میں اسپتال کا ایک ڈر بیٹھا ہوا ہے کہ جو
ہ' وہ واپس نہیں آئے۔ کہتی تھیں کہ مجھے گھر پہ مرنا
ہے۔ ان کی فیملی میں کچھ واقعات ایسے ہوچکے ہیں۔
ں باپ اور بھائیوں کی مثال دیتی تھیں۔"

"آخر فرید کیوں سنتا تھا ان کی؟" رئیس بولا۔
"نہ سنتا تو لیا کرتا۔ باندھ کے لے جاتا انہیں؟" رخشی
گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کے بیٹھ

"اب کیا ہارٹ پرابلم ہے؟"

ظاہر ہے۔ وہ گھبراہٹ بھی ہارٹ پرابلم کا نتیجہ تھی۔
و فرید کا ایک ڈاکٹر دوست آیا تھا۔ وہ بہت خفا ہوا کہ
ں کررہے ہیں آپ لوگ۔ اس کے باوجود امی نے کہا
چھا صبح ہونے دو۔ صبح تک طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو
جانا ہی پڑے گا۔ لیکن۔۔۔"

لیکن کیا؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔
"ان کے انکار کی ایک وجہ اور تھی۔۔۔ وہ انتظار کررہی
ہمارا اگلی دن سے۔"

ں نے کہا "مجھے سخت شرمندگی ہے۔"

سونی نے چائے کا کپ لا کے رخشی کو تھمادیا "لو پیو۔"
"میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔"

پھر بھی پیو۔ زبردستی کر دل کے ساتھ" سونی نے کہا۔
رخشی نے ایک گھونٹ لیا اور کچھ سوچتی رہی۔ "رات
تک انہوں نے کہا کہ ناصر کو کیا ہوگیا ہے' وہ کیوں نہیں
رید نے ٹالنا چاہا کہ امی مصروف ہوگا۔ اس کے اپنے

چکر ہیں۔ اس پر وہ فرید پر خفا ہونے لگیں کہ تو نے بھی معلوم
نہیں کیا؟ اگر وہ کسی پریشانی کی وجہ سے نہیں آیا تو تجھے توفیق
نہیں ہوئی پوچھنے کی۔ کسی نے فون تک نہیں کیا۔ بس غصے
میں ان کی طبیعت بگڑی تو سینے میں درد اٹھا اور وہ بات کرتے
کرتے خاموش ہوگئیں۔ میں نے فون کرکے ایمبولینس
منگوالی۔ فرید کے ساتھ میں بھی بیٹھ گئی تھی پھر راستے میں فرید
سے کہا میں نے کہ مجھے یہاں اتار دو۔ میں جا کے ناصر کو
بتادوں۔ اس نے مجھے کچھ دور ڈراپ کردیا تھا لیکن میں راستہ
بھول کے دوسری گلی میں چلی گئی۔ وہ آگے سے بند تھی۔
واپس آتے ہوئے ایک کتا پیچھے لگ گیا تھا" وہ پریشان ہونے
کے باوجود مسکرائی۔

میں نے کہا "تم فون کردیتیں۔"

"فون بند ہے۔ شکایت کی تو پتا چلا کہ عدم ادائیگی پر بند
کردیا گیا ہے۔ یہاں تو ایسے ہی ہے۔ انہیں بتایا کہ یہ غلط
ہے۔ ہم نے بل وقت پر ادا کردیا تھا تو کہا گیا کہ اچھا' لکھ کر
دیں اور بل کی فوٹو کاپی ساتھ لگادیں۔ آج ایک ہفتہ ہوگیا۔
اب دیکھو' کتنے چکر لگانے پڑتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے غور نہیں کیا۔ ہم کہیں جارہے
تھے۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ ایک ساتھ کہاں جارہے ہو اس
وقت؟"

سونی نے کہا "ملک رب نواز کے گھر۔"

رخشی کی سوالیہ نظریں حیرت آگئی۔ "کیوں؟"

میں نے کہا "دراصل۔ شبنم کو اغوا کرلیا گیا تھا کل۔
سترہ اٹھارہ گھنٹے ہوگئے۔"

"او مائی گاڈ۔ کیا یہ حرکت ملک رب نواز کی تھی؟"
رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ اتفاق سے اس کا سراغ فوراً ہی مل گیا تھا لیکن
شبنم وہاں نہیں ملی جہاں ہمارا خیال تھا کہ اسے لے جایا گیا
تھا۔"

اس نے تشویش کا اظہار کیا "اور اب تم نے اس کی
رہائی کے لیے کمانڈو ایکشن کا فیصلہ کیا ہے؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں" میں نے کہا۔
"لیکن کیا تمہیں یقین ہے۔۔۔ اور فرض کرو شبنم وہاں
ہے تو کیا تم تینوں اسے لاسکتے ہو' یہ کام اتنا آسان ہے؟"

میں نے کہا "رخشی۔ تم فکر مت کرو۔ ہم نے بہت سوچ
کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہم ملک ہاؤس پر حملہ کرنے نہیں جارہے
ہیں۔ ہم اندر جائیں گے چوروں کی طرح چور دروازے سے
اور شبنم کو چرا لائیں گے۔ سونی اندر کے راستوں سے اور
وہاں رہنے والوں کے معمولات سے واقف ہے۔ وہ ہماری
راہنمائی کرے گی۔"

رخشی مطمئن نہیں ہوئی "ناصر۔ اگر اتنا ہی یقین ہے
تمہیں تو۔۔۔ تم قانون کی مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"قانون!" میں نے تلخی سے کہا "ہائی ڈیئر رخشی۔ تم کس
قانون کی بات کررہی ہو۔ وہ جو ملک رب نواز جیسے لوگ ہی
بناتے اور توڑتے ہیں اور ہمیشہ ان کی مٹھی میں رہتا ہے۔ ہم
اس سے کیا مدد لیں؟"

"یہ زیادہ مشکل بھی ہوگا" رئیس بولا۔

"اور خطرناک بھی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ۔۔۔ پولیس کا
ہے فرض مدد آپ کی' یہ کوئی حقیقت ہے؟" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے رخشی کہ پولیس کو قائل کرنے کے لیے
ہمارے پاس صرف اپنا یقین ہے اور ملک رب نواز کا نام سنتے
ہی پولیس کا طرز عمل یکسر بدل جائے گا۔ اول تو وہ رپورٹ ہی
نہیں لکھیں گے کہ ایک دن پورا گزر انہیں اور آپ آگے ہو
گمشدگی کی رپورٹ درج کرائے۔"

"یہ گمشدگی کہاں' اغوا ہے۔" رخشی نے کہا۔

"اس کے لیے گواہ کہاں سے لائیں گے ہم۔ صرف
ہمارے کہنے سے ملک کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ سکتی پولیس۔"
رئیس نے کہا۔

"وہ جو اخبار کے ایڈیٹر صاحب ہیں" رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ ان کو پولیس انکار نہیں کرسکتی۔ اگر ابھی شبنم
کے ملک ہاؤس سے بازیاب ہونے کا کوئی چانس ہے تو پھر
بالکل بھی نہیں رہے گا۔ اس کے وفادار کتے پہلے سے بھونک
کر اسے خبردار کردیں گے کہ ملک صاحب ہوشیار۔"

رئیس نے کہا "رخشی بی بی' تم تو سیاست کو سمجھتی ہو۔
بہت سیاست دیکھی ہے تم نے۔ ملک کو شک بھی ہوا تو شبنم کو
غائب کردے گا ایسے کہ پھر ہمارے فرشتے بھی اسے تلاش نہ
کرسکیں گے۔ اس کے بعد وہ خود پولیس سے کہے گا کہ ہاں'
میرے خلاف ایف آئی آر درج کرو۔ خود کسی مجسٹریٹ کو
چھاپا مارنے کے اور خانہ تلاشی کے وارنٹ جاری کرائے گا
اور پولیس بھی خوب ڈراما کرے گی۔ آدھی رات کے بعد
معلوم یہ ہوگا کہ ملک ہاؤس کو گھیر لیا گیا ہے ہر طرف سے اور
ملک آئے گا سوتے سے اٹھ کے آنکھیں ملتا ہوا اور سخت
حیرانی اور ناراضی کا اظہار کرے گا اور پھر ملک ہاؤس کے
دروازے کھول دے گا کہ آجاؤ' دیکھ لو ہر جگہ۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے کچھ اس کے حامی رپورٹرز اور
فوٹو گرافر بھی اس موقع پر موجود ہوں۔ وہ ظاہر کریں گے کہ
اپنی ایک ہم پیشہ رپورٹر کے اغوا کی خبر نے انہیں سخت
تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔"

رئیس بولا "بالکل ٹھیک ہے تیرا اندازہ۔ جب شبنم
برآمد نہیں ہوگی تو اپنے ملک صاحب موقع سے فائدہ اٹھا کے
خوب برا بھلا کہیں گے اپنے سیاسی حریفوں کو کہ مجھے بدنام
کرنے والوں نے بڑی گھناؤنی سازش کی ہے میرے خلاف
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں
ہے۔ میں تو بہت عزت کرتا ہوں صحافیوں کی' سب جانتے
ہیں۔"

"اس کے نمک خوار صحافی اسے انسان نہیں فرشتہ
ثابت کرنے میں زور قلم صرف کردیں گے۔" میں نے کہا۔

"التا ہم پھنس جائیں گے شکایت کرکے" سونی بولی۔

رخشی نے چائے کا مگ نیچے رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے۔ تم
لوگ جارہے ہو تو جاؤ' دیر ہورہی ہے تمہیں۔"

"اور تم۔!" سونی نے کہا۔

"میں۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔ مل جائے گی کوئی ٹیکسی۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تمہارا' اس وقت ٹیکسی
کہاں مل جائے گی تمہیں اور مل بھی جائے تو کیا تم اکیلی
جاؤ گی؟"

"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔۔۔"

رئیس نے اسے ڈانٹا "ایسی رسکی باتیں مت کرو۔ چلو
بیٹھو گاڑی میں' ہم پہلے اسپتال میں چھوڑیں گے تمہیں۔"

ابھی رخشی نے برآمدے سے قدم نیچے رکھا ہی تھا کہ
اندر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اندر سے تیمی مارخان نے
جھانک کے کہا "فرید صاحب گفت وشنید فرمائی جناب!"

میں سب سے پیچھے تھا۔ ایک انجانے خوف نے مجھے
دوڑ کر ریسیور لینے پر مجبور کردیا "فرید۔ خیریت ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔ وہ رخشی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ یہ کھڑی ہے میرے پاس مگر تو بتا' امی
کی طبیعت کیسی ہے؟"

"امی ٹھیک ہیں۔ یہ بتا نا تھا اسے بھی۔ پریشانی کی کوئی
بات نہیں ہے' تم لوگ صبح آجانا۔ ابھی آنے کا کوئی فائدہ
نہیں۔"

میں نے ریسیور رخشی کو دے دیا۔ "کیا ہوا فرید! نہیں'
میں ابھی آرہی ہوں۔ سچ بتاؤ' بالکل ٹھیک ہیں امی! مجھ سے
جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا۔۔۔ اچھا' ٹھیک ہے اگر تم کہتے
ہو' ہاں یہ لو" اس نے ریسیور پھر مجھے تھمادیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...یں نے کہا "ہاں' فرید!۔ کیا بات ہے؟"
...اس نے کہا "دیکھ یار' امی ہیں آئی سی یو میں ہے۔ اور ...یں بھی نہیں جا سکتا۔ یہاں باہر کھڑا ہوا ہوں۔ رخشی ...کی تو خود بھی پریشان ہو گی اور مجھے بھی پریشان کرے گی۔ ...روک لے وہاں۔"
...میں نے کہا "چل اچھا کیا تو نے کہ فون کر دیا' اطمینان ...ہو گیا۔"
...اس نے کہا "امی ہوش میں ہیں مگر وہ شاید ایک دو دن ...گی آئی سی یو میں۔ وہاں جو کریں گے' ڈاکٹر کریں گے۔ ...لوگ باہر رہ کے دعا کر سکتے ہیں۔ سب کے یہاں اکٹھے ...کا بالکل کوئی فائدہ نہیں۔"
...میں نے کہا "او کے۔ ہم صبح آئیں گے سب۔"
ریسیور رکھ کے میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے ...اطمینان کا اظہار کیا "اب تم ایزی ہو جاؤ۔ RELAX۔"
...رخشی اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی "ناصر۔ ...واقعی وہ ٹھیک ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں انہیں۔"
"ہم سب دیکھنا چاہتے ہیں" میں نے کہا "مگر فرید نے ...کر دیا ہے سب کو۔ تم آرام سے بیٹھو۔ ابھی دو گھنٹے میں صبح ...جائے گی۔"
"ہم ابھی آتے ہیں' زیادہ دیر نہیں لگے گی" رئیس نے ...
"اور زیادہ دیر ہو تو اپنے ساتھ تمیں مارخان کو لے ...ہم سیدھے اسپتال پہنچ جائیں گے" میں نے کہا۔
رخشی نے مشورے اور فیصلے کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کیا۔ ...یہاں آئی تھی' ہم سے ہمدردی کی توقع لے کر اور ہمارے ...فعل کی شکایت کرنے۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ ہم ...زیادہ سنگین نوعیت کی ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہیں' پہلے ...سے صرف فرید کی ماں کی فکر تھی مگر اب شبنم کے اغوا کی خبر ...کے اس کی پریشانی دوچند ہو گئی تھی۔
فرید کا فون بہت وقت پر آیا ورنہ ہم اسپتال جاتے تو یقیناً ...ایک گھنٹا لگ جاتا۔ میرے لیے گزرنے والے وقت کا ہر لمحہ ...بھاری تھا مگر میں رخشی کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نہ جاتا ...تو خود بھی فرید کے سامنے شرمندہ ہوتا مگر اس نے غیر جذباتی ...انداز میں صحیح فیصلہ کیا تھا۔ آئی سی یو کے باہر مجمع لگانے سے ...کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے رخشی کو روکنے کے لیے مجھے کما ...مجھے تھوڑی سی سہولت مل گئی۔ فرید کی امی کے لیے میں بھی ...کم فکرمند نہیں تھا۔ ہم سب کا دل ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو تھا مگر اب میں ترجیح کے اعتبار سے پہلے شبنم کے مسئلے سے نمٹ سکتا تھا۔
میرے اصرار پر رخشی اندر چلی گئی۔ میں نے گاڑی باہر نکالی اور تمیں مارخان کو ساری صورتِ حال سمجھا دی "دیکھو گیٹ کو لاک رکھنا اور رخشی کو کہیں جانے مت دینا۔"
اس نے سر ہلایا "آپ جیسا حکم فرمائیں۔"
میں نے کہا "ہم جا رہے ہیں ایک کام سے۔ ملک رب نواز کے گھر۔ ہمیں پوری امید ہے کہ دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے' لیکن ہم نہ آئیں تو۔"
اس نے آسمان کی طرف دیکھ کے ہاتھ اٹھائے "ام آپ کی مغفرت شریف کا واسطے فاتحہ کرتی۔ آپ کا روح شریف کے لیے جنت الفردوس۔"
"الو کے پٹھے۔ بند کر اپنی بکواس۔" رئیس نے گرج کے کہا "ابھی سے ہمارے سوئم چہلم کی فاتحہ خوانی کا پروگرام بنا رہا ہے۔"
میں نے کہا "ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔ صبح رخشی بی بی اسپتال جانے کی ضد کریں تو ان کے ساتھ چلے جانا اور فرید کو بھی بتا دینا کہ ہم کہاں گئے تھے اور کس کام سے۔ آٹھ بجے کے بعد آزاد صاحب کو فون پر سب بتا دینا مگر اس سے پہلے نہیں۔"
رئیس نے کہا "یار' فرید کرے گا یہ سب۔"
میں نے کہا "کیا پتا وہ اسپتال سے فون بھی نہ کر پائے۔"
سوئی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اب چلو۔ کچھ بھی نہیں ہو گا ہمیں۔ ہم سورج نکلنے سے پہلے ملک ہاؤس سے نکل آئیں گے۔"
"شبنم کے ساتھ" رئیس نے کہا۔
"انشاءاللہ!" میں نے کہا۔
میں پُرامید ضرور تھا لیکن میرا یقین کامل نہیں تھا۔ اس میں شک سے بھرے ہوئے ایسے سوالات شامل تھے جن کا جواب عقل کے پاس نہیں تھا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم نے قیاس کے جو گھوڑے دوڑائے تھے' وہ صحیح سمت میں دوڑے ہوں؟ کیا ملک اتنا بے وقوف ہو سکتا ہے کہ اغوا کرانے کے بعد شبنم کو اپنے ہی گھر میں رکھنے کا خطرہ مول لے؟ کیا اٹھارہ گھنٹے گزر جانے کے بعد یہ توقع رکھنا خود فریبی اور احمقانہ خوش فہمی نہیں ہے کہ وہ زندہ سلامت مل سکتی ہے؟ آخر ملک رب نواز نے شبنم کو کیوں اغوا کرایا تھا؟ اس لیے نہیں کہ وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ اسے خوبصورت عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

شبنم کے اغوا کے پیچھے دو ہی مقاصد کارفرما ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ ملک کو شبنم سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اس کے کاروبار' سیاسی ٹیک نامی اور خاندانی عزت کا بیڑہ غرق کر دے گی کیونکہ مسلسل جستجو اور تفتیش کے نتیجے میں وہ اس کے سارے راز جان چکی ہے۔ دوسرا مقصد ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ہو سکتا تھا جو شبنم کو ذریعہ بنا کے اسے تباہ کرنا چاہتے تھے۔ شبنم لالچ میں کسی خوف کے باعث یا محض صحافت کی دکان چلانے کے لیے ان کے ساتھ مل گئی تھی جو ملک کے دشمن تھے۔
ملک رب نواز اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ شبنم کو لالچ یا دباؤ سے خرید نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمانے کا سوچا ہو۔ کسی عورت کو بلیک میل کرنے کے لیے چند رسوا کن تصاویر کافی ہیں۔ ایسی تصاویر کو ابھی ہمارے میڈیا اخبارات رسائل یا ٹیلی وژن پر نمائش کے لیے پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ دوسرا مؤثر طریقہ ایسی تصاویر کی ترسیل ہوا کے ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا ہوتا ہے جو حلقہ شناسائی میں شامل ہوں۔ دوست احباب' ہمسائے' رشتے دار اور ہم پیشہ لوگ۔ اگر شبنم کو ایسے ہی کسی شرمناک اور تنگِ انسانیت مقصد کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس کو کسی نامعلوم مقام پر ایک دو گھنٹے رکھنے کے بعد ضرور چھوڑ دیا جاتا کہ جاؤ مس رپورٹر' اب تم جو توپ چلا سکتی ہو' چلاؤ مگر یہ خیال رکھنا کہ تمہیں اس سوسائٹی میں عزت دار بن کے رہنا ہے یا بے آبرو ہو کے۔ جو تمہارے ساتھ ایک بار ہوا ہے' دوسری تیسری یا دسویں بار بھی ہو سکتا ہے۔
اگر ملک رب نواز شبنم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا جو کاروباری اور سیاسی طور پر اس کے دشمن تھے اور شبنم کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلا رہے تھے تو اس کے لیے بھی ایک دو گھنٹے کافی تھے۔ شبنم تو خیر ایک عورت تھی۔ مضبوط جسم اور ناقابلِ شکست قوتِ ارادی رکھنے والے مرد بھی تشدد کو ایک حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد موت کی حد آ جاتی ہے۔ چنانچہ اٹھارہ گھنٹے تک شبنم کا لاپتا رہنا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔
میرے ذہن میں خوف کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ اٹھارہ گھنٹے بعد شبنم کا زندہ ملنا مشکل ہے۔ تفتیش اور تشدد کا سلسلہ اتنا دراز نہیں ہو سکتا۔ وہ نازک سی لڑکی وحشی درندوں کی یلغار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اذیت سے نہیں تو احساسِ ذلت کی شرم سے مر گئی ہو گی۔ اگر ملک رب نواز نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس خطرے سے نمٹنے کے بجائے اس سے نجات حاصل کر لی جائے تو اس کے حکم پر اب تک شبنم کے مردہ جسم کو بھی ایسے غائب کر دیا گیا ہو گا کہ پھر تاحشر اس کا سراغ نہ ملے۔
اس کے باوجود میں سوئی کے ساتھ ملک رب نواز ہاؤس میں اسے تلاش کرنے جا رہا تھا۔ میں اپنے خوف کو جھٹلانا چاہتا تھا۔ اُمید کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ اس خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا تھا کہ شبنم کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک صحافی ہونے کی وجہ سے وہ محفوظ ہے۔ ملک اسے نقصان پہنچانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ محفوظ کون ہے اس ملک میں جہاں عوامی حمایت کی بھرپور طاقت رکھنے والے وزیراعظم کو جلسہ عام میں گولی مار کے شہید کے مرتبے پر فائز کیا جا سکتا ہو اور عام آدمی کو قانون کے محافظ سرعام کسی وجہ کے بغیر بھی گولی مار سکتے ہوں۔
باہر رات کا خاموش سفر جاری تھا۔ راستے سنسان تھے اور گھروں کے محفوظ حصار میں شریف لوگ سکون کی نیند میں گم تھے اور زندگی کے حسن کے ہر رنگ سے سجے ہوئے خواب دیکھ رہے تھے۔ بچے جن کو کچھ دیر بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھ کے ہر روز کی طرح بستے اٹھا کے حصولِ علم کے سفر پر روانہ ہونا تھا' نوجوان جن کو خوش حالی کی منزل کے لیے جدوجہد کا آغاز یقین کے ساتھ کرنا تھا' محبت کرنے والے مرد اور احساسِ طمانیت سے سرشار عورتیں جو زندگی سے تمام توقعات رکھنے میں حق بجانب تھے اور سب کچھ کر لینے کے باوجود بہت کچھ نہ کرنے کا ملال رکھنے والے بوڑھے جو اب صرف ماضی کے خواب دیکھتے تھے۔ سب سو رہے تھے۔
رئیس نے اچانک کہا "وہ صبح تک نہیں رکے گی۔"
میں سمجھ گیا کہ وہ رخشی کے بارے میں سوچ رہا تھا "ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ ابھی جانا چاہے گی تمیں مارخان کے ساتھ۔"
"فرید نے کیا کہا تھا تجھ سے؟"
میں نے اسے بتا دیا "میں نے کہہ دیا تھا تمیں مارخان سے کہ صبح سے پہلے رخشی کو نہ نکلنے دے۔"
سوئی نے کہا "گاڑی کو آخری موڑ سے پہلے ہی روک لینا۔ ہم ایک ساتھ نہیں جائیں گے آگے۔"
رئیس نے کہا "ہم تمہارے مشورے اور بھروسے پر آئے ہیں۔ راہنمائی تم ہی کرو گی۔"
میں نے کہا "ابھی تک مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذہن میں کیا ہے۔ کیسے ہوگا یہ کام۔ کوئی لائن آف ایکشن ہے یا نہیں۔"

"بالکل ہے۔ سب کا اندر جانا قطعی غیر ضروری ہوگا" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "یعنی ہم باہر بیٹھ کے دعا کریں گے کہ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس لائے۔"

سونی ہنسی "ہم نہیں' یہ کام صرف تم کرو گے۔ میں اور ناصر اندر جانے کے لیے کافی ہیں۔"

رئیس نے سخت برا مانا "پھر مجھے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی اگر میرا کوئی کام نہیں تھا۔"

"کیا یہ کام نہیں ہے؟ دعا کرنا۔۔۔" سونی نے اسے چھیڑنا جاری رکھا۔

"یہ کام تو میں گھر پر زیادہ اچھا کر لیتا۔ وضو کر کے بیٹھ جاتا مصلیٰ پر۔"

میں نے کہا "ناراض مت ہو۔ تو گاڑی کو ریڈی رکھنا۔ ایسے کہ ہم دوڑتے ہوئے آئیں اور ہمارے پیچھے ملک رب نواز کے شکاری کتے ہوں یا ڈزاڈز گولیاں چل رہی ہوں۔ تو فرار ہونے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہو۔"

سونی نے کہا "گڑبڑ تو ہو سکتی ہے کسی بھی پروگرام میں اور بھاگنا پڑے تو سب سے زیادہ اہم کردار بن جاتا ہے بھاگ کے لے جانے والے کا۔"

میں نے اس کی تائید کی "اور کسی کرائسس میں جو سب کو حفاظت سے نکال کر لے جائے اور دشمنوں کے عزائم کو ناکام کر دے' سب سے بڑی ذمے داری کا کام بھی ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے مشکل بھی۔"

رئیس کی ناراضی دور ہو گئی "اچھا۔۔۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "یار' میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ ایسا ہی ہے درحقیقت۔ اب تو دیکھ کہ دیسے تو آگ بجھانے والے فائر فائٹر بے کار بیٹھے اور اونگھتے نظر آتے ہیں مگر آگ لگتی ہے تو پھر کوئی اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہاں جان پر کھیل کے سب کو بچاتے ہیں۔"

رئیس مسکرانے لگا "ابے میں جانتا ہوں۔"

"جانتے ہو تو پھر نخرے کیوں دکھا رہے تھے؟" سونی نے کہا۔

"اپنا منہ تو کسی کو دکھانے کے قابل ہے نہیں۔ تو بس نخرے ہی دکھا سکتے ہیں اور ناز اٹھانے والوں کو ہی نخرے دکھاتا ہے آدمی" رئیس نے ہنس کے کہا۔

رئیس بے وقوف نہیں تھا۔ یہ اس کی سادگی اور معصومیت تھی۔ دوستی کا خلوص تھا اور فراخ دلی تھی کہ ہم اسے کچھ بھی کہہ دیں' وہ برا نہیں مانتا تھا یا مانتا تھا تو کوئی بات دل میں نہیں رکھتا تھا۔ منہ پر صاف کہہ دیتا تھا اور وہ بات وہیں ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس کی سادگی کا فائدہ اٹھاتا تھا اور اسے باتوں سے EXPLOIT کر سکتا تھا۔ بدنیتی سے یا کسی غلط مقصد کی خاطر نہیں' بعض اوقات کوئی جائز بات منوانے کے لیے دلیل یا بحث کا نتیجہ ضد کی صورت میں نکلتا تھا لیکن جذباتی اپیل کام کر جاتی تھی۔

رئیس بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ سونی یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر مجھے اس پر پورا بھروسا تھا کہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں جس پر اسے سوچ بچار کی ضرورت پڑے۔ وہ جتنا مخلص تھا اتنا ہی بہادر بھی تھا۔

صبح سے پہلے اور رات کے آخری پہر میں سڑکوں پر ایک دو جگہ آوارہ کتے دکھائی دیے۔ فٹ پاتھوں پر اور ایک سیمنٹ کی ٹوٹی ہوئی بنچ پر فقیر قسم کے نشے باز پڑے نظر آئے۔ میں نے ایک سائیکل سوار کو دیکھا جو آگے کسی عورت کو بٹھا کے تیز تیز پیڈل مارتا جا رہا تھا۔ عورت اتنا آگے جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سر سائیکل کے ہینڈل پر لگ رہا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی اور اسے اسپتال لے جانے والے کو ٹیکسی نہیں ملی تھی یا وہ ٹیکسی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ایک کار نے ہمیں اوورٹیک کیا اور ہمارے سامنے سے آنے والی ایک پولیس وین جس کی صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ سیدھی گزر گئی۔

قدرتی طور پر ٹریفک جام اور صبح شام کے ٹریفک رش میں محتاط اور مستعد رہ کے گاڑی چلانے والا رئیس خان کچھ ایزی ہو گیا تھا۔ سڑک خالی ہونے کے ساتھ چوڑی بھی تھی چنانچہ وہ اچانک سڑک پر آجانے والے ایک یتیم پاگل خستہ حال اور برہنہ تن فقیر کو نہ بچا سکا۔ میں آگے بیٹھا ہوا تھا مگر میری نظر بھی اسے نہ دیکھ سکی اور جب میرے چلانے کے ساتھ رئیس کا پاؤں بریک پیڈل پر جم گیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

گاڑی کے پچھلے پہیے جام ہو گئے مگر گاڑی SKID کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور اس کے سائڈ والے مڈگارڈ کی ٹکر سے وحشت زدہ نظروں سے موت کو سامنے دیکھ کر پتھر

ہو جانے والے فقیر کو اوپر اچھالا اور دور پھینک دیا۔ وہ جہاں گرا تھا' وہیں پڑا رہا۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے دروازے سے باہر چھلانگ لگائی۔ سونی نے کچھ دیکھا نہیں تھا مگر بریک پوری قوت سے لگانے کے نتیجے میں وہ بھی منہ کے بل آگے آئی۔ سنبھلنے کے بعد اس نے چلا کے پوچھا "کیا ہوا؟" اور فقیر پر نظر ڈالی تو اس کے حلق سے ایک چیخ غیر ارادی طور پر نکل گئی۔

رئیس کے اتر کر میرے قریب آنے تک' میں جھک کے اس فقیر کے بے حس و حرکت جسم کو ہلا جلا کے دیکھ چکا تھا۔ بظاہر اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں آیا تھا اور نہ کہیں خون کا داغ تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے ٹوٹ گئی ہے۔ دائیں ٹانگ کے مقابلے میں وہ ٹانگ کچھ عجیب سے انداز میں مڑی ہوئی نظر آئی تھی۔

میں اسے اٹھا کے فٹ پاتھ پر ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے لے گیا۔ رئیس سخت بدحواس اور پریشان تھا۔ سونی بار بار کھڑکی سے چلا کے پوچھے جا رہی تھی "اسے کیا ہوا ہے رئیس؟" بالآخر رئیس نے دانت پیس کے اسے ایک گالی دی۔

"اپنا منہ بند کر کے بیٹھ الو کی پٹھی۔ ابھی ہم نے جی دیکھا نہیں ہے ٹھیک سے تو تجھے کیا بتائیں؟"

میں نے فقیر کے ہاتھ کو تھام کے اس کی نبض دیکھی مگر نبض کی رفتار ہی نہیں تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے تصدیق کے لیے اس کے سینے پر سر رکھا تو دل کی دھڑکن بھی مفقود تھی۔ اس کی سانس بھی رکی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "رئیس۔۔۔ یہ تو مر گیا۔"

"کیا؟" رئیس وحشت سے چلایا۔

"ہاں۔ کوئی اندرونی چوٹ ہے یا پھر دہشت سے مر گیا ہے بے چارہ۔"

رئیس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ "یا میرے خدا۔ صبح صبح یہ کیا ہو گیا؟"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ تو گاڑی کو آگے لے جا۔ میں اس فقیر کو مصنوعی تنفس دے کر کوشش کرتا ہوں کہ اس کے دل کی دھڑکن بحال ہو جائے۔"

"مگر یار۔۔۔!"

"اگر مگر مت کر۔ ابھی کوئی آگیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

رئیس پلٹا اور گاڑی کو تقریباً پچاس قدم دور لے گیا۔

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

زندان میں پھول

لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر' تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان

قیمت 300 روپے

چار پیارے خوبصورت بچے جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفے میں دینا پسند کریں گے

بہترین کتابت
خوبصورت گرد و پیش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ

محصول ڈاک 30 روپے

براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے فقیر کے بے جان جسم کو اٹھا کر درختوں کے پیچھے تاریکی میں رکھ دیا اور اپنے منہ سے منہ ملا کے اس کے پھیپھڑوں میں ہوا بھری۔ میں نے سینے کو دبا کے اور چھوڑ کے اس کے دل کو چلانے کی کوشش بھی کی مگر اس سے فقیر کے مردہ جسم میں ایک لمحے کے لیے بھی زندگی کے آثار پیدا نہ ہوئے۔

رئیس کی صورت پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "یار' اب کیا ہوگا' خدا کی قسم' میں نے اسے نہیں مارا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "پھر کس نے مارا ہے؟ تیری پے جیرو نے؟"

"میرا مطلب تھا۔۔۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تیرا مطلب۔ میں نے بھی اسے اس وقت دیکھا جب وہ گاڑی کے سامنے آچکا تھا۔"

"میں نے بریک بھی فوراً لگائے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس وقت کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا "اس کی قسمت تھی جو فقیر کو یہاں کھینچ لائی تھی اور ہمیں بھی۔۔۔ کوئی بھی اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود یہ قانونی مسئلہ ہے۔۔۔ چل آجا۔"

رئیس نے مزاحمت نہیں کی "یار' یہ تو بڑی غیر اخلاقی بات ہوگی۔"

"اللہ سب دیکھنے جاننے اور معاف کرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"یار' وہ انسان تھا۔ کوئی کتا بلی نہیں کہ نیچے آگیا تو ہم چھوڑ کے نکل جائیں ایسے ہی" رئیس بولا۔

میں نے اسے اپنی جگہ بٹھا کے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ "احساسِ جرم کا یہ رد عمل بالکل جائز ہے مگر تو جذبات سے نہیں عقل سے سوچ۔ اس حادثے کی ذمے داری ایک فیصد بھی تجھ پر' تیری ڈرائیونگ پر یا غفلت پر عائد نہیں ہوتی۔ اسے خودکشی بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ بس اس کو ایسے ہی مرنا تھا۔ ہماری گاڑی نہ ہوتی تو کسی اور کی ہوتی۔ اس کے نصیب میں ایک پُرسکون باعزت طبعی موت نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسے لوگ واقعی کتے بلیوں کی طرح جیتے ہیں اور انہی کی طرح مرجاتے ہیں۔"

خلافِ توقع سونی نے رئیس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "ایسے لوگ تو زمین کا بوجھ ہی ہوتے ہیں۔"

"بکواس مت کر سونی!"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ نشے کا زہریلی کے خودکشی کرتے ہیں مگر اس کے لیے بڑا لمبا اور مشکل طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جتنا دکھ خود اٹھاتے ہیں' اس سے زیادہ سوسائٹی کو دیتے ہیں۔"

"بدقسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ اور قابلِ رحم" میں نے کہا۔

"بدقسمتی وہ خود اپنے اعمال سے خریدتے ہیں۔ انہیں قابلِ رحم کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ معاشرے کے مجرم ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ نشے باز اگر لاعلاج ہو جائیں تو انہیں بھی پاگل کتے کی طرح خطرناک قرار دے کر گولی مار دینی چاہیے۔" وہ بولی۔

"تمہارا دل نہیں' پتھر ہے۔۔۔"

"دل پاگل نہیں ہے میرا۔ میں کہتی ہوں آخر معاشرے کو کیا ضرورت ہے انہیں زندہ رکھنے کی۔ خطرناک بچھو اور زہریلے سانپ کوئی گھر میں پالتا ہے؟"

میں نے کہا "اسٹاپ اٹ سونی' یہ کوئی وقت نہیں ہے ان سماجی مسائل پر بحث کا۔ ابھی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے ایک خطرناک پاگل انسان اور کتے کو ایک ہی طرح سے ہلاک کرنے کی۔"

"ہونی چاہیے" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"MERCY KILLING بھی ابھی تک غیر قانونی ہے۔ امریکا اور یورپ میں۔ جس لاعلاج مریض کی اذیت کے آخری چند گھنٹے رہ گئے ہوں' اس کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش ترک نہیں کی جاسکتی اور وہ موت کی خواہش کرے تو اسے زہر فراہم کرنا بھی قتل جیسا ہی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ اب کچھ دیر کے لیے اسے بھول جاؤ" میں نے گاڑی کو ایک کنارے پر لگا کے بند کردیا۔

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "آدمی کا یوں مرنا بڑی عبرت کی بات ہے۔"

"ہمارا ذہن اگر ایسے ہی خیالات سے ڈسٹرب رہے گا تو ہم وہ کام ٹھیک سے نہیں کرپائیں گے جس کے لیے ہم نکلے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہمیں ساری توجہ ایک طرف رکھنی ہوگی ورنہ ہم مارے جائیں گے رئیس!" سونی نے ہمدردی سے کہا۔

رئیس نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

"غم انگیز اور دکھ دینے والے خیالوں میں مت کھوئے رہنا۔ مجھے بھی بہت افسوس ہے اس کی موت کا۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ اس کے لیے کچھ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ ابھی تو بالکل الرٹ نہیں رہ سکتا تو بہتر ہے کہ واپس چلا جا تاکہ ہم

تیرے آسرے پر تو نہ رہیں۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے آثار اچھے نہیں لگتے۔ پہلے ایک بری خبر لے کر رخشی آگئی اور ابھی ذہن الجھا ہوا تھا فرید کی ماں کے خیال میں۔۔۔ کہ یہ دوسرا معاملہ ہوگیا۔"

میں نے کہا "وہمی مت بن۔ DISTRACTION ضرور ہے مگر اسے برا شگون سمجھنا جہالت کی بات ہوگی۔ یاد ہے خان اعظم کیا کہتے رہے ساری عمر۔ دماغ کو کنٹرول میں کرو' وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے۔ خیال اور سوچ پر آدمی قادر ہو تو ناکامی صرف حادثاتی ہوتی ہے' کامیابی ارادے سے ضرور ملتی ہے۔"

"میں اپنے دماغ کو کنٹرول کرلوں گا' فکر مت کرو" رئیس مسکرانے لگا۔

"صرف دانتوں کی نمائش سے دماغ پر کنٹرول نہیں آتا۔"

"پھر کیا کروں یار!" وہ جھنجلا کر بولا "زور زور سے آیتہ الکرسی پڑھنے لگوں۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک تو یہی کر۔ بھوت اور وحشت انگیز خیالات قریب نہیں آئیں گے۔"

سونی نے کہا "میں آگے جا کے صورتِ حال کا جائزہ لیتی ہوں۔"

"اور میں کیا کروں؟ یہاں رہ کے رئیس کے ساتھ بیٹھ کے قوالی کروں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم چالیس قدم پیچھے رہو۔ سب ٹھیک ہوگا تو میں ایسے سگنل دوں گی" اس نے دوبار سیٹی بجائی اور جاتے جاتے گاڑی میں سے کوئی چیز اٹھالی۔

میں نے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟ سیٹی کے جواب میں کوئی دل والا نکل آیا پھر؟"

"پھر کیا ہوگا؟"

"سمجھے گا اس کے خواب کو تعبیر مل گئی ہے۔ فریفتہ ہوجائے گا تمہاری اس ادا پر اور اس صورت پر۔"

رئیس نے تاؤ کھا کے کہا "قسم اللہ کی' کوئی نکل کے دیکھے' آج ہی اس کی تاریخِ وفات ہوگی۔"

میں سونی کو جاتا دیکھتا رہا۔ "رئیس خان' کیا سونی پر آپ نے اپنی اجارہ داری قائم کرلی ہے؟"

"اجارہ داری۔"

"ہاں۔ اس پر کسی اور کے فریفتہ ہونے کے خیال سے بھی آپ کشت و خون کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

رئیس ادھر ادھر دیکھنے لگا "وہ یار۔۔۔! اب اس کا خیال رکھنا فرض ہے ہمارا۔"

"فرض کے بچے۔ یہ محبت ہے" میں نے کہا "صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو چاہتا ہے اسے؟"

وہ جھینپ کر لڑکیوں کی طرح شرمانے لگا "ابے یار۔۔۔ تجھ سے کیسا پردہ۔"

"کیا یہ بات میں تیری طرف سے کہہ دوں سونی سے؟" میں نے کہا۔

وہ گھبرا کے بولا "یار' ایسا مت کرنا۔ وہ کیا سمجھے گی؟"

"کیا سمجھے گی؟"

"یہی کہ ہم ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کی مجبوری کا۔"

"ہم کیوں کہتا ہے" میں نے اسے ڈانٹا "صرف اپنی بات کر لیکن ڈرمت' مجبوری کا فائدہ سب اٹھاتے ہیں اور یہ تو معاملہ ہی جذبات کا ہے۔ دل پر کس کا اختیار ہے۔ کسی بھی حسین لڑکی پر عاشق ہونا ہر مرد کے بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے۔ میں تیری طرف سے دلائل دے کر اسے قائل کرسکتا ہوں۔"

"مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔"

میں نے جاتے جاتے کہا "دوستوں کے لیے اپنی خدمات بلامعاوضہ حاضر ہیں۔"

سونی کو میں نے ملک رب نواز کے ساتھ والے گھر کی دیوار کے پاس دیکھا۔ اس نے نیچے سے پتھر اٹھایا اور ایک خفیف سے دھماکے کے ساتھ اسٹریٹ لائٹ کا بلب پھٹ گیا۔ اس سے پہلے اور بعد والے دو کھمبوں پر پہلے ہی روشنی نہیں تھی۔ ممکن ہے کارپوریشن کے کاغذی گھاتوں میں فیوز ہوجانے والے بلب کئی بار بدل دیے گئے ہوں۔ یہ ایک بلب ملک صاحب کے در خاص کے مقابل بطور خاص لگایا گیا تھا یا ملک صاحب کے رعب داب کے باعث روشن رہنے پر مجبور تھا۔

میں نے سونی کے نشانے کو دل ہی دل میں سراہا اور اس کی پلاننگ کو بھی۔ پڑوس کی کوٹھی کے چوکیدار نے سونی کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے باہر آکے ادھر ادھر دیکھا اور بولا "اوئے کس کو سویرے سویرے تکلیف ہوئی ہے؟ اور کوئی کام نہیں پتھمار کے بلب توڑنے کے سوا۔"

سونی بالکل دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ اس نے پیچھے سے چوکیدار کو ایسے دبوچا کہ نہ وہ پلٹ کے دیکھ سکا اور نہ اس کو حلق سے کوئی آواز نکالنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسے انھا کے جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دو" اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

میں نے فرمانبرداری سے سر جھکایا "یس یور ہائی نس!" اور بلا مقابلہ ٹاک آؤٹ ہو جانے والے کو تین فٹ اونچی باڑھ کے پیچھے ٹٹولا۔ یہ باڑھ کوٹھی کی بیرونی دیوار کے بھی باہر تھی اور کوٹھی کی چوڑائی کے رخ بنے ہوئے لان کا احاطہ کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ لان تجاوزات میں شامل تھا مگر اس سڑک پر سب نے ہی سڑک تک پھیلی ہوئی سرکاری زمین کو اپنا سمجھ رکھا تھا۔ اعتراض کسی کو نہیں تھا چنانچہ سڑک پر دونوں طرف اضافی باغ یا سیمنٹ کے پلیٹ فارم سے بنے ہوئے تھے۔

سونی کھلے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اس کی ہلکی سی سیٹی سنی اور اندر گیا تو وہ درمیان کی مشترک دیوار کے سائے میں چلتے ہوئے آگے جا رہی تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے گیٹ کو لاک کرنے کے لیے کہا۔ میں چوکیدار کے لیے بنائے گئے لکڑی کے کیبن میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں گیٹ کو بھی دیکھ سکتا تھا اور پچھلی طرف ایک چھوٹے سے روشندان سے مجھے کوٹھی کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔

دیوار کے آخری حصے میں پہنچ کے سونی اوپر چڑھی اور ملک رب نواز کے گھر میں اتر گئی۔ میں نے ملک ہاؤس کے اس حصے کو دوبارہ دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ گیٹ سے عقبی حصے کے مختصر باغ تک آٹھ دس فٹ چوڑی گلی ہے جس میں دو دروازے کھلتے ہیں اور تین گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ ملک کے ذاتی استعمال کی پجیرو پورچ کے نزدیک ہوتی ہے۔ دوسری وہ چھوٹی سوزوکی کار تھی جو ملک نے ضرورت پوری کرنے کے لیے شبنم کو پیش کر دی تھی کیونکہ شبنم کی گاڑی ملک صاحب کے دروازے پر سے چوری ہو گئی تھی۔ تیسری سوزوکی پک اپ تھی جسے پہلے فیکا چلاتا تھا۔

شبنم کی سوزوکی ایف ایکس بھی مل چکی تھی اور غالباً انہی گاڑیوں کے ساتھ کہیں موجود تھی۔ سونی نے ملک رب نواز کی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچنے کے لیے بہت اچھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ گاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے پوری گلی طے کر کے گیٹ تک جا سکتی تھی۔ خطرہ صرف آخری پچیس تیس گز کا تھا جہاں کوئی کور نہیں تھا اور چوکیدار سائے کو بھی حرکت کرتا دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ دیوار کے ادھر ملک ہاؤس کے گیٹ پر بھی ایسا ہی ایک کیبن بنا ہوا ہے اور اس کا چوکیدار رات کے وقت کیبن میں ہی بیٹھتا ہے۔ دن میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور اسے ہر بار کسی گاڑی کے گزرنے کے لیے گیٹ بھی کھولنا پڑتا ہے چنانچہ وہ مستعد رہتا ہے۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے چوکیدار کو عام طور پر فراغت رہتی ہے اور وہ کرسی پر بیٹھ کے آرام بھی کر سکتا ہے۔ رات کے آخری پہر میں وہ یقیناً اتنا ایزی ہو گا اور اپنی گن گود میں یا ایک طرف رکھے اونگھ رہا ہو گا۔

اچانک کسی قریب کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی قریب اور دور کی ہر مسجد سے جیسے اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ سونی نے مجھے بتایا تھا کہ چوکیدار اپنے پڑوسی چوکیدار کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جاتا ہے۔

دوسری طرف ابھی تک مکمل خاموشی تھی۔ میرے کان سونی کی آواز یا اس کی سیٹی کے سگنل پر لگے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی میوزیکل کلاک نے پانچ بجائے پھر ملک رب نواز ہاؤس میں پرانے وقتوں کا کلاک ٹن ٹن پانچ بار بجا۔ ادھر ادھر سے مرغوں نے ایک ساتھ اذان دینی شروع کی۔

کوٹھی کے برآمدے میں ایک دروازہ کھلا اور میں نے روشنی میں کسی بزرگ کو دیکھا جن کا لباس بے داغ سفید تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال بھی سفید تھے۔ وہ یقیناً نماز کے لیے مسجد جانے کے ارادے سے نکلے تھے۔ میرا خون خشک ہونے لگا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ گیٹ کے سامنے سے گزریں گے تو چوکیدار سے کوئی بات ضرور ہو گی۔ قاعدے کے مطابق چوکیدار ہر روز انہیں سلام بھی کرتا ہو گا اور وہ اسے جواب دینے کا اخلاقی فرض بھی پورا کرتے ہوں گے۔

یہ بات سونی کے علم میں نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ دونوں چوکیدار اکٹھے مسجد جاتے ہیں اور غالباً مالکوں کو علم نہیں ہوتا کہ وہ آدھے گھنٹے کے لیے ڈیوٹی سے غائب ہو گئے تھے۔ کیا بزرگ اسلامی تعلیمات کی حد تک مساوات کے قائل ہیں کہ مسجد جاتے وقت چوکیدار کو بھی ساتھ لے جاتے ہوں؟ اور عملاً ثابت کرتے ہوں کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں، آج بھی۔

بزرگ کھنکار کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیٹ کی طرف آ رہے تھے اور میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے چوکیدار کی جگہ مجھے دیکھ کر شور مچایا تو میں کیا کروں گا؟ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہو گا کہ نماز کے لیے مسجد جانے والے ایک بوڑھے کو خاموش رکھنے کے لیے ٹاک آؤٹ کر دیا جائے۔ یہ خطرناک بھی تھا۔ اتنا ضعیف شخص کسی قسم کے

تشدد کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ یہاں آتے ہوئے ہم نے بلا ارادہ پہلے بھی ایک جان لے لی تھی۔ یہ دوسری جان لینا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس کے لیے میں کسی طرح بھی نظریۂ ضرورت کو جواز نہیں بنا سکتا تھا۔

لیکن اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ بزرگ میری درخواست تو قبول کرنے سے رہے کہ برائے مہربانی شور مت کیجئے۔ وہ چند سیکنڈ میرے لیے کئی گھنٹے کا ذہنی عذاب بن گئے جب مجھے غلط یا صحیح کوئی فیصلہ بہرحال کرنا تھا۔ ایسے وقت میں خدا سے مدد کی دعا کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی تھی۔

بزرگوار میرے سامنے سے گزرے تو میرا دل دھڑکنا بھی بھول گیا تھا اور مجھے اس خیال سے پسینہ آ رہا تھا کہ مجھے اس بوڑھے نمازی کے ساتھ زیادتی کرنی پڑے گی۔ وہ سر جھکا کے چلنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کی کمر ضعیفی میں جھک گئی تھی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے پھر کھنکارا لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ گیٹ ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ بڑے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھولتے ہوئے انہوں نے چوکیدار کے کیبن کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ آج چوکیدار نے سلام کیوں نہیں کیا؟ آج اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کیوں نہیں کھولا' شاید وہ پلٹ کر آئیں گے اور دیکھیں گے۔

لیکن بزرگوار نے وہیں سے بڑبڑا کے کہا "بدبخت نکالا جائے گا کسی دن نوکری سے۔ اوئے آدم خان' سو رہا ہے۔"

میں نے بڑی مشکل سے آواز بنا کے کہا "نہیں جناب!"

پتا نہیں کیوں بزرگوار کو شک نہیں ہوا۔ یا تو میری آواز آدم خان چوکیدار کی آواز سے ملتی تھی یا ان کی سماعت میں فرق تھا "آج نماز کے لیے نہیں گیا؟"

میری مشکل ملک رب نواز کی کوٹھی کے چوکیدار نے آسان کی۔ اس نے دوسری طرف سے کہا "آدم خان!"

میں نے آواز کو دبا کے کہا "ہوں۔"

"تھوڑا ٹھہرنا' میں آتا ہوں" دوسری طرف سے آواز آئی۔

بزرگوار نے مطمئن ہو کے باہر قدم رکھا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے فرض کیا کہ وہ کوٹھی کے مالک تھے اور اس خاندان کی خوش حالی انہی کی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ ان کے جوان بیٹے اپنی اپنی پُرتکلف خواب گاہوں میں سو رہے تھے اور شاید بہت دیر سے سو کے اٹھتے تھے۔ ناشتا کرتے تھے اور اپنی اپنی گاڑیوں میں اپنے اپنے کاروبار کے لیے نکل جاتے تھے۔ اگر زندہ ہوں گی تو بڑے میاں کے ساتھ ان کی اتنی ہی ضعیف شریکِ حیات بھی عبادت کے لیے اٹھتی ہوں گی ورنہ نوکر چاکر بھی سورج نکلنے سے پہلے اٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہوں گے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جوانی میں سب غفلت کی نیند سوتے ہیں۔ بوڑھوں کو نیند نہیں آتی۔ انجام کے خوف سے عاقبت سنوار لینے کا خیال پریشان کرتا ہے پھر خدا یاد آتا ہے۔ بڑھاپے کو سب اللہ اللہ کرنے کی عمر کہتے ہیں۔ کیا جوانی میں اللہ اللہ کرنا فرض نہیں ہے۔

اچانک میرے کانوں نے دوسری طرف سے قفل کھولے جانے کا کھٹکا سنا پھر کنڈی کی آواز آئی اور گیٹ کے دوبارہ بند ہونے کی۔ ایک بار پھر چابی قفل میں لگی۔ چوکیدار نے اب گیٹ کو باہر سے چابی گھما کے لاک کر دیا تھا۔ میں نے مکمل خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ سنی پھر اس نے باہر سے پکارا "آدم خان ــــ چل۔" چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد اس نے پھر آواز دی "اوئے آدم خان!"

اس وقت مجھے کیبن سے نکل کے پیچھے چھپ جانے کا خیال نہ آتا تو ہماری ساری منصوبہ بندی دھری رہ جاتی۔ میں نے ملک رب نواز کے چوکیدار کو گیٹ کو دھکیل کر اندر آتے دیکھا۔ اس نے کیبن میں جھانک کے سر ہلایا اور اپنے آپ سے بولا "چلا گیا' میں نے بولا تھا ذرا ٹھہرجا۔" پھر پلٹ کے اس نے گیٹ بند کیا اور اوپر سے لوہے کا بلک اڑا دیا۔

ایک منٹ بعد میں نے سونی کی سیٹی کا سگنل سنا۔ دیوار میرے پیچھے ہی تھی۔ میں پلٹ کر اوپر چڑھنے ہی والا تھا کہ کوٹھی کے برآمدے والا دروازہ پھر کھلا اور ایک ضعیف خاتون نے برآمدے میں آ کے آدم خان کو آواز دی "آدم خان۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ پیچھے جا کے دیکھ کیا گیزر بجھ گیا ہے؟"

میں دم سادھے کھڑا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ خاتون انہی بزرگوار کی زوجہ تھیں جو نماز باجماعت ادا کرنے مسجد گئے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ کے گرد دوپٹا پوری طرح لپیٹ رکھا تھا۔ شاید وضو کرتے وقت انہیں گرم پانی کی ضرورت پڑی تھی مگر نل سے ٹھنڈا پانی آتا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ سے بڑبڑا کے کہا "چلا گیا نماز پڑھنے۔ اب گیزر کیا میں خود جا کے جلاؤں۔ مجھ سے نہیں ہوتے یہ کام' کسی کو ذرا خیال نہیں کہ اسے ٹھیک کرا لیں۔"

سونی نے دوسری بار سیٹی بجا کے مجھے لائن کلیئر کا سگنل دیا مگر میں اسے کیسے بتاتا کہ میری گاڑی کہاں پھنسی ہوئی ہے۔ بڑی بی کے کان غیر معمولی طور پر تیز تھے کہ انہوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیڑھی پر اندر جاتے جاتے رک کر باہر کی طرف دیکھا اور پھر سرہلا کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پلٹ کے دیوار پر چڑھ گیا۔ سونی مجھے دیوار کے ساتھ دبکی ہوئی نظر آئی۔

"کیا سو گئے تھے؟" اس نے سرگوشی میں سوال کیا۔

"نہیں، بھول گیا تھا کہ یہاں کس کام سے آیا تھا؟" میں نے کہا۔

"آجاؤ۔ میدان صاف ہے" وہ مسکرائی تو مجھے تاریکی میں بھی اس کے اجلے دانتوں کی چمک صاف نظر آئی۔

دونوں کو ٹھیوں کو الگ کرنے والی مشترک دیوار کے ساتھ ساتھ بوگن ویلیا کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے سے ان کی خشک اور ویران شاخیں نظر آتی تھیں جو آپس میں لپٹ گئی تھیں۔ اوپر گھنے پتوں کو ایک خاص انداز میں تراشا گیا تھا۔ کیاری کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کے فرش پر اس کے رنگین پھول یا پتے بکھرے ہوئے تھے۔ ہم اس کے سائے میں چلتے ہوئے آخر تک گئے۔

پورچ سے آگے ہمیں گاڑیوں کی ایک قطار نے پناہ فراہم کی۔ سب سے پہلے ملک رب نواز کی شاہانہ لینڈ کروزر تھی جسے میں نے پے جیرو سمجھا تھا۔ اس کے آگے وہ آلٹو تھی جو شبنم اغوا ہوتے وقت چلا رہی تھی پھر سوزوکی پک اپ اور سب کے بعد شبنم کی اپنی سوزوکی ایف ایکس کھڑی تھی جو چوری ہونے کے بعد مل گئی تھی مگر کار ملی تھی تو ماکن چوری ہو گئی تھی۔

گلی میں گھر کا ایک دروازہ کھلتا تھا لیکن اوپر نیچے کی منزل کے ہر کمرے کی کھڑکی نظر آرہی تھی۔ ہر کھڑکی بند تھی کیونکہ ہر کمرے کا اے سی گلی کی طرف اپنی حرارت خارج کرتا تھا۔ سونی بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی کوٹھی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی۔ یہاں ایک خاصا بڑا باغ تھا۔ سامنے والے حصے کے باغ میں خوبصورت اور پھولوں والے پودے لگائے گئے تھے مگر پائیں باغ میں سبزیاں اگی ہوئی تھیں۔

ڈرین پائپ دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ لائنس صرف باتھ روم میں روشن ہیں۔ پچھلی طرف کھلنے والے دونوں دروازے بند تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں سے ایک کچن کا دروازہ تھا۔ میں نے جھک کر زمین سے ایک نٹ اوپر بنے ہوئے روشن دانوں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ہال میں اندھیرا تھا۔ کوٹھی کا یہ سکوت کسی حد تک آسیب زدہ محسوس ہوتا تھا۔

سونی نے ایک روشن دان کی طرف اشارہ کیا "تم اس میں سے اندر جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر اوپر سے نیچے تک میرے دو حصے کر دیے جائیں تو۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ چلو مجھے اٹھاؤ" وہ بولی۔

"اندر کیا ہے، میرا مطلب ہے کچن یا باتھ روم؟"

"یہ کچن کا اسٹور ہے" وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے اسے نیچے سے ٹانگیں پکڑ کے اونچا کیا۔ اس نے اپنے جسم کو اکڑا کے سخت کر لیا تھا۔ مجھے وہ حیرت انگیز حد تک ہلکی لگی۔ اس کے ہاتھوں نے روشن دان کے کناروں کو پکڑتے ہی جسم کو اوپر کھینچا اور اس کا ڈنڈے کی طرح سیدھا رہنے والا جسم ایک دم رسی کی طرح ہو گیا۔ اس نے خود کو یوں روشن دان سے گزار دیا جیسے اس کے جسم میں کوئی ہڈی نہیں۔ یا ہے تو کسی ناگن کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی کے سیکڑوں مہرے ہیں۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ سر کے بل اندر نہ جا گرے اور اس کے گرنے سے کوئی میز، مین ڈبے یا برتن گرنے کا دھماکا نہ ہو جائے لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ ایک ڈاکوؤں کے گروہ میں رہنے سے اس کی جتنی عملی تربیت ہوئی تھی، وہ کسی حد تک ایسے کاموں کے لیے کار آمد تھی۔ شاید سونی میں چوری ڈکیتی کے فن کو سیکھنے کی غیر معمولی قدرتی صلاحیت تھی۔ حفاظتی انتظام کو ناکام بنانا۔ سیکیورٹی پر مامور عملے کی آنکھوں میں دھول جھونکنا۔ چور دروازے اور خفیہ راستے تلاش کرنا۔ رکاوٹوں کو اور اندر باہر کے نقشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے آگے بڑھنا۔ آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین کا اور کانوں سے راڈار کا کام لینا۔ ہر لحہ کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے مستعد رہنا اور اپنا دفاع کرتے ہوئے چھلاوے کی طرح غائب ہو جانا۔ ان سب میں وہ ماہر تھی اور خداداد صلاحیت نہ ہوتی تو شاید وہ ڈاکوؤں کے ساتھ برسوں رہ کے بھی کچھ نہ سیکھتی۔

آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں دروازہ کھل گیا۔ سونی نے کنڈی ایسے کھولی تھی کہ دروازے سے چند انچ کے فاصلے پر ہونے کے باوجود میں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ میرے اندر جاتے ہی سونی نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ اسٹور بھی اچھا خاصا بڑا کمرا تھا۔ اس میں آٹے چاول اور چینی کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ گھی کے ٹین تھے اور چھت تک بنے ہوئے شیلف میں [illegible] ہوئے تھے۔

"اس [illegible] کاریڈور ہے" سونی نے کہا "لیکن ہمیں ادھر سے جانا پڑے گا۔"

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت میں دیکھا تو مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا "ادھر کیا ہے؟"

"کچن۔۔۔ اور کچن میں ایک ملازم سوتا ہے" اس نے آہستہ سے بیچ کے دروازے کو دھکیل کر جھانکا اور پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کچن کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کچن جیسا تھا۔ وسیع و عریض اور خوبصورت، سفید ٹائلوں کی دیواروں اور بے داغ فرش والا۔ اندھیرے کے باوجود میں لائن سے بنے ہوئے کیبنٹ اور الماریاں دیکھ سکتا تھا۔ ملازم آخری حصے میں فرش پر گدا بچھائے سر تک کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔

ہم آہستہ آہستہ کاریڈور میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ مکمل خاموشی میں ہمارے کان خود اپنے دل کی دھڑکن بھی سن رہے تھے۔ ایسے میں ایک بلی نے میاؤں کی تو ہم ایسے چونکے جیسے ہمارے سامنے آگے شیر دھاڑا ہو۔ اسی وقت کمبل اوڑھ کر سونے والے ملازم نے کروٹ بدلی تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"چل دفع ہو" اس نے نیند میں بلی کو گالی دی "روز آجاتی ہے۔"

میں اور سونی وہیں بیٹھ گئے۔ میں ایک الماری جیسے بڑے فریج کی آڑ میں تھا اور سونی کو اوون نے پناہ فراہم کر دی تھی۔ ملازم کے دھتکارنے کے باوجود بلی وہیں کھڑی ہمیں گھورتی رہی اور اس کی غراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ شاید وہ گھر کی پالتو بلی تھی یا روز چکر لگاتی تھی اور گھر میں رہنے والوں کو پہچانتی تھی۔

ملازم نے اس کی طرف چپل پھینکی جو سیدھی بلی کو لگی اور ایک زوردار میاؤں کے بعد وہ فرار ہو گئی۔ ہم سانس روکے وہیں دبکے رہے۔ کچھ دیر بعد ملازم کے خراٹے سنائی دینے لگے تو سونی نے مجھے نکلنے کا اشارہ دیا۔ میں نے باہر نکلنے سے پہلے جھانک کر دائیں بائیں دیکھا پھر ہم کاریڈور میں آگئے۔

سونی نے میری طرف کوئی چیز بڑھائی "یہ لو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"وائر کٹر۔ اوپر جا کے ٹیلی فون کے تینوں تار کاٹ دو۔"

"میں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم اوپر جانے کا راستہ" میں نے کہا۔

وہ بے خوفی سے آگے آگے چلنے لگی "ادھر سیدھے ہاتھ پر زینہ ہے۔"

میں نے کہا "تم کو وائر کٹر ساتھ لانا یاد تھا؟"

"ٹیلی فون کے تار ہم کیسے کاٹتے، دانتوں سے؟ ایسی باتیں یاد رکھنی پڑتی ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہاری شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔"

اس نے مجھے زینہ دکھایا اور خود دوسری طرف چل پڑی "دیر مت کرنا۔"

"تم۔۔۔ تم کہاں جا رہی ہو؟"

"ادھر برقی الارم ہے اور ایک انٹر کام جنکشن باکس۔ میں اس کے تار کاٹ کے یہیں آتی ہوں ایک منٹ میں۔"

سونی اپنی بہن کے ساتھ اندر آتی جاتی رہی تھی اور اس نے ہر چیز کا مشاہدہ بڑے غور سے کیا تھا۔ اسے سب یاد تھا اور اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر ذہنی طور پر اس آپریشن کی تمام اہم تفصیلات پر خوب غور کر لیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں پھر اس کی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کیا۔

زینہ خود بخود مجھے دوسری منزل سے چھت تک لے گیا۔ اوپر چھت پر کھلنے والا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے کنڈی کھولی مگر دروازے کے پٹ الگ کرنے کے لیے مجھے زور لگانا پڑا۔ شاید اوپر سے بارش اور دھوپ پڑنے کے باعث وہ کچھ جام ہو گئے تھے پھر قبضے چرچرانے لگے مگر میں خوف سے رک نہیں سکتا تھا۔ سونی نے کہا تھا کہ وہ ایک منٹ میں فارغ ہو جائے گی۔ ایک منٹ میں مجھے بھی واپس نیچے پہنچنا تھا۔

چھت پر ٹی وی کے دو انٹینا لگے ہوئے تھے اور تین مختلف سمتوں میں آسمان سے سیٹلائٹ نشریات وصول کرنے والی ڈشیں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف لائن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کپڑے سکھانے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ ادھر ایک مرغیوں کا ڈربا بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے کڑکڑانے لگیں۔ چھت پر اندھیرا تھا مگر میری آنکھیں خفیف سے اجالے میں سب کچھ صاف دیکھ رہی تھیں۔ ٹیلی فون کے تار وڈبے کے اوپر سے آرہے تھے۔ یہ وائر کٹر ہی تھا جو ہم مرغی خانے سے لائے تھے۔ کاٹنے والی تار کاٹنے سے ان کی دھار کچھ خراب ہو گئی تھی پھر بھی ٹیلی فون کے تار کاٹنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں پھر نیچے پہنچا تو سونی بڑے آرام سے ٹہل رہی تھی "بہت دیر لگا دی تم نے۔"

میں نے اسے سیلیوٹ کیا "سوری باس۔ پہلا کام ہے یہ۔ ابھی تجربہ نہیں ہے آپ کی طرح۔"

وہ مسکرائی "میں دیکھ رہی ہوں، تم بڑی ٹینشن میں ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور مجھے تمہارا اتنا پُرسکون رہنا جتنا حیران کر رہا ہے' اس سے زیادہ شرمندہ کر رہا ہے۔"

"بالکل ایزی رہو باس۔ ہم کوئی ڈاکا ڈالنے نہیں آئے ہیں۔ بس ایک راؤنڈ لگائیں گے اور شبنم مل گئی تو ساتھ لے کر خاموشی سے چلے جائیں گے۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا "کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟ تم بھی حد کرتی ہو۔"

"مشکل بھی ہے تو کیا ہوا۔ پریشانی اور گھبراہٹ میں کام خراب ہوتا ہے۔ اب دیکھو' یہ ادھر والا دروازہ ہے ملک صاحب کے بیڈ روم کا' یہ ماسٹر بیڈ ہے۔"

میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ ہم اس دروازے سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ وہ کسی شک یا ضرورت کی وجہ سے باہر آتا تو اس کی نظر سب سے پہلے ہم پر پڑتی۔ میرے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل تھا کہ شبنم کو اغوا کرانے کے بعد اس نے گھر کے کسی حصے میں قید کر رکھا ہے اور خود آرام سے سو گیا ہے مگر اس کے استعمال کی ذاتی گاڑی باہر کھڑی تھی اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ گھر میں یقیناً موجود ہے۔

میں نے کہا "خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ میں بلاوجہ کی ہنگامہ آرائی اور خون خرابا نہیں چاہتا۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی "ظاہر ہے کہ شبنم اندر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بیڈ روم میں۔ اس فلور پر ڈرائنگ روم ہے اور لاؤنج۔"

میں نے کہا "وہ میں دیکھ چکا ہوں میں شبنم کے ساتھ آیا تھا۔"

"ادھر ملک صاحب کا آفس ہے۔ وہاں دیکھ لیتے ہیں۔" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ہمیں کھلا ہوا ملے گا؟"

وہ پلٹ کے مسکرائی "تالے چوروں کے لیے نہیں لگائے جاتے۔ شریف آدمی کو روکنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

"میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تم نے ڈاکوؤں کے ٹریننگ اسکول سے ہرفن میں ایم اے پاس کیا ہے۔"

وہ ہنسی "وہ ڈاکو پہلے چور تھے اور ہر چور پہلے جیب کترا یا اٹھائی گیرا ہوتا ہے۔"

"یعنی ایف اے' بی اے اور پھر ایم اے کی طرح سارے مدارج طے کرنے پڑے ہیں" میں نے کہا۔

ملک رب نواز کا آفس بند تھا۔ سونی نے اس کی دونوں کھڑکیوں کو چیک کیا لیکن وہ بھی اندر سے بند تھیں۔ اس نے آہستہ سے شیشے پر دو تین بار دستک دی۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

"بس ایسے ہی دیکھنا چاہتی تھی کہ شبنم آفس میں تو بند نہیں ہے؟"

میں نے کہا "ذہین سے ذہین عورت بھی کسی نہ کسی موقع پر ثابت کر دیتی ہے کہ وہ بہرحال ناقص العقل ہے۔"

"میں نے تو ابھی تک ایسا نہیں کیا" اس نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسی ہوئی ایک تھیلی نکالی "اگر ماسٹر کی لگ جائے تو کام آسان ہو جائے۔"

میں نے کہا "شبنم اگر اندر آزاد ہوتی تو کیا کھڑکی کھول کے باہر نہ آ جاتی؟ اس تھیلی میں کیا ہے؟"

"پیشہ ورانہ ضرورت کے آلات۔ جیسے ڈاکٹر کے پاس یا مکینک کے ہوتے ہیں" اس نے بالشت بھر کی تھیلی میں سے کوئی چیز نکالی۔

"یہ تم ساتھ لائی تھیں؟"

"نہیں۔ راستے میں ایک شاپنگ سینٹر سے خریدی تھیں سب چیزیں۔ تم بھی تو ساتھ تھے" وہ بولی۔

مجھے یاد آیا کہ اس نے گاڑی میں سے کچھ اٹھایا تھا "تم بھی کمال کی لڑکی ہو۔"

"کمال کی ناقص العقل یا ہوشیار!" اس نے ایک عجیب سے آلے کو تالے میں لگا کے گھمانا شروع کیا۔

"یعنی تم تالے بھی کھول لیتی ہو؟ ماشاءاللہ۔"

اس نے سر ہلایا "بنیادی طور پر تالے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ لیور والے' نمبروں والے اور الیکٹرانک۔"

میں نے کہا "خدا کے واسطے یہ لیکچر یہاں مت دو۔"

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا "کھل گیا۔"

اس نے ڈور ناب کو بہت احتیاط سے گھمایا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آواز بالکل نہ ہو۔ ایک معمولی سا کھٹکا مجھے خاموشی میں بم کے دھماکے جیسا لگا۔ سونی فوراً اندر گھس گئی اور اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔

"ایسے کیوں کھڑے ہو عقلمند۔ کوئی نکل آیا پھر؟"

میں نے رکی ہوئی سانس کو خارج کیا۔ سونی نے دروازہ بند کر کے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے رہ کے میں نے جھانکا تو مجھے کاریڈور کے آخر تک کا پورا منظر دکھائی دیا۔ طویل راہداری کی چھت کو بہت بلندی پر لگی ہوئی ایک لائٹ نے روشن کر رکھا تھا۔ راہداری میں ایک جیسے تین فانوس لگے ہوئے اور ان کے درمیان شیشے کے گول شیڈ والی دو لائٹس تھیں۔

ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ کھول کے ملکانی نے باہر دیکھا۔ اس وقت وہ ریشمی نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کا یہ انداز حسن بڑی دلکشی رکھتا تھا۔ اس نے کچھ دیر راہداری میں رک کے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر اندر چلی گئی۔

سونی نے کہا "ملکانی بہت خوبصورت ہے' نہ؟"

میں نے کہا "ملک نے اس کی ڈگری سے شادی نہیں کی تھی۔ یا اس لیے نہیں کہ وہ پروفیسر تھی مگر تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"اس لیے کہ تم بھی دیکھ سکتے ہو اسے ایک مرد کی نظر سے" سونی نے پردہ چھوڑ دیا اور آفس کا جائزہ لینے لگی۔

"میرا آفیشل بیان یہ ہوگا کہ دنیا میں شبنم سے زیادہ حسین کوئی عورت نہیں ہو سکتی' اس کے بعد تمہارا نمبر ہے۔"

"اچھا؟ چندا بے چاری اس لسٹ سے بھی خارج ہو گئی' افسوس۔"

میں نے شرمندہ ہو کے بات بدل دی "اب چلو نکلو یہاں سے۔ شبنم نہیں ہے یہاں' کسی میز کی دراز میں تو ہونے سے رہی۔"

"تم مرد بڑے مطلبی اور طوطا چشم ہوتے ہو۔ اپنی پسند کے مطابق اپنی رائے بدل سکتے ہو" اس نے دروازے کا رخ کیا "پہلے تمہاری نظر میں دنیا کی سب سے حسین عورت تھی شادو پھر چندا ہو گئی۔ آج شبنم ہے' کل نہ جانے کون ہو گی؟"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "تم بہت شرمندہ کر چکی ہو مجھے۔"

اس نے کہا "اب اپنے دوست رئیس کو ہی لو۔"

میں نے کہا "کیا ساری باتیں اسی وقت کرنا ضروری ہیں؟"

"باتوں سے اعصابی دباؤ کم ہو جاتا ہے اور میں بہت آہستہ بول رہی ہوں۔"

"تمہارا آہستہ بولنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

وہ ایک اور دروازے پر رک گئی "اتنا زیادہ خوف کو سوار مت کرو اپنے ذہن پر۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں اور تم مل کے چار سے تو نمٹ ہی سکتے ہیں۔ اسلحہ بھی ہے ہمارے پاس۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی "یہ لائبریری ہے۔ ملک ویسے تو جاہل ہی کہلائے گا مگر یہاں وہ اخبار والوں سے ملتا ہے اور تصویریں بنواتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں کتابوں سے بھری الماریاں نظر آتی ہیں تو لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ملک صاحب کتنے صاحب علم ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس ایک مین ٹارچ بھی ہونی چاہیے۔"

"تھی مگر اس کے سیل ختم ہو گئے تھے" وہ بولی۔

الماریوں کے اندر یا ان کے پیچھے شبنم کو چھپا کے رکھنے کی کوئی جگہ نہیں بنتی تھی۔ اس دھندلکے میں جو کوریڈور کی ایک لائٹ نے پیدا کر دیا تھا' اندر کا پورا منظر واضح ہو رہا تھا۔ اسٹڈی ٹیبل کے علاوہ لائبریری میں ٹی وی' وی سی آر اور ڈش ریسیور کے لیے ایک نرالی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم تہ خانہ پہلے دیکھ لیں۔" میں نے کہا۔

"تہ خانہ ہم آخر میں دیکھیں گے۔ کم آن' اب ہم اوپر چلتے ہیں۔ اوپر رب نواز کا بڑا بیٹا اور بہو ایک بیڈ روم میں ہوں گے۔ دوسرے لڑکے اور ایک بیٹی کے کمرے بھی اوپر ہی ہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ زینے کا رخ کیا "کیا اندازہ ہے تمہارا؟ ملک گھر میں ہو گا۔ گاڑی تو موجود ہے اس کی۔"

"گاڑیوں کی اسے کمی نہیں۔"

میں نے کہا "آہٹ پر صرف ملکانی باہر نکلی تھی۔ ملک ہوتا تو وہ آتا۔"

سونی نے کہا "ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے ملک شراب کی مدہوشی میں پڑا ہو۔"

دس منٹ میں ہم نے اوپر کے کمرے کھنگال ڈالے۔ خواب گاہوں میں جھانک کر دیکھنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ گھر کے لوگ اتنے سکون سے سو رہے تھے کہ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ اگر اس گھر میں کسی مہمان خاتون کو اغوا کر کے قید میں رکھا گیا ہوتا تو کشیدگی کا احساس گھر کے ماحول سے ہوتا۔

سونی نے میرے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ "عادی اور پیشہ ور مجرم کسی کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے بھی اتنے ہی پرسکون رہ سکتے ہیں۔ انہیں کسی ضمیر صاحب کی خلش پریشان نہیں کرتی۔"

"مجھے گھر کے اندر خصوصی حفاظتی انتظامات بھی نظر نہیں آتے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شبنم یہاں نہیں ہے۔"

سونی نے کہا "ملک کو خطرہ کوئی محسوس نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟ تم نے ہی کہا تھا کہ ملک نے اپنی بیوی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھوٹ بولنے کے لیے کہا ہوگا۔ تاکہ اس کے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے آئیں اور پکڑے جائیں؟"

سونی نے بے پروائی سے کہا "وہ صرف ایک خیال تھا۔ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

میں سونی کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ "اگر وہ نہ ملی تو ہم کیا کریں گے؟"

"یہ ایک اچھا سوال ہے" اس نے میرے ساتھ تہ خانے کا زینہ اترتے ہوئے کہا "ایک آسان جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ نہیں۔ ہم جیسے آئے ویسے ہی نکل جائیں گے۔"

"اور مشکل جواب؟" میں نے خود کو اس کے مقابلے میں احمق محسوس کیا۔

"مشکل جواب ابھی نہیں، کچھ دیر بعد سامنے آئے گا۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "تم بلاوجہ کا سسپنس پیدا کر رہی ہو اور مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بچہ ہوں جسے تم انگلی پکڑ کے چلا رہی ہو۔"

"اگر تم ایسا سمجھنے لگے ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو خود تمہارے کہنے... پر یہاں آئی ہوں۔ یو آر دی باس!"

"باس ــ مائی فٹ۔ مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں" میں نے کہا۔

سونی تہ خانے کے مقفل دروازے پر رک گئی۔ یہاں اندھیرا بہت گہرا تھا۔ جب وہ رکی تو مجھے پتا نہیں چلا۔ میں چلتا ہوا اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کے خود کو دروازے پر گرنے سے بچالیا ورنہ دھماکا زیادہ گونج پیدا کرتا۔ میں نے کہا "سوری۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"آنکھیں نہیں ہوتیں تو اندھے کیا کرتے ہیں؟ اندھیرے میں ٹٹول کر چلتے ہیں" اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے لاک کا سوراخ تلاش کیا۔

میں اس کے قریب کھڑا رہا "یہ بڑی خفیہ اور خطرناک جگہ ہے۔ کہیں کوئی الارم سسٹم نصب نہ ہو۔ جو دروازہ کھلتے ہی چلانے لگے۔"

"میں نے اسے ناکارہ کر دیا ہے۔ فکر مت کرو" وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مخصوص اوزاروں کی مدد سے تالے کو کھولنے میں لگی رہی۔

"صبح ہونے والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اجالا پھیل جائے گا" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے کہا ہے کہ اتنا مت ڈرو۔" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا، ہم پکڑے گئے تو۔؟"

"اتنا ڈر تھا پکڑے جانے کا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مرنے مارنے کا حوصلہ ہونا چاہیے آدمی میں۔"

میں نے پھر خفت محسوس کی "حوصلہ کم نہیں ہے مگر غیر ضروری مار دھاڑ اور کشت وخون کیوں کریں ہم؟"

"یہ غیر ضروری کیسے ہوا؟ کوئی ہمیں پکڑنا یا مارنا چاہے تو ہم اپنے دفاع میں کچھ نہیں کریں گے؟ یہاں رعایت یا مروت کا کوئی تصور نہیں۔ وہ ہمیں معاف نہیں کریں گے تو ہم بھی نہیں کریں گے۔ ایک ایک کو لٹا دیں گے۔ خواہ سب کو جان سے مارنا پڑے مگر ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور بزدلوں کی طرح مارے نہیں جائیں گے۔"

"اوکے اوکے! یہ تالا کیوں نہیں کھل رہا ہے آخر؟"

"سب تالے ایک سے آسان نہیں ہوتے۔ یہ لو، کھل گیا" وہ بولی اور دیکھے بغیر اندر گھس گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ احمقانہ حد تک نڈر اور بہادر تھی۔ اس کے ذہن میں نہ شک تھا اور نہ خوف۔ اس کا رویہ وہی ڈاکوؤں والا تھا۔ وہ ڈاکا ڈالنے جاتے ہوں گے تو یہ سوال کوئی نہیں کرتا ہوگا کہ لوگ جاگ اٹھے یا پولیس سے مقابلہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اس کا جواب پہلے سے طے تھا کہ ہم چوڑیاں پہن کے نہیں، اسلحہ لے کر گھس لیے جا رہے ہیں آخر۔

نیچے والے ہال میں اندھیرا کچھ کم تھا کیونکہ روشندانوں سے اوپر جلنے والی لائٹس کا تھوڑا سا اجالا اندر بھی پہنچ رہا تھا۔ پہلے میں نے اس ہال میں ایک بہت بڑا کباڑ خانہ دیکھا تھا۔ وہ سب نوادرات تھے۔ پرانے اور نامکمل مجسمے۔ آرائشی اشیا، مٹی اور تانبے پیتل کے ظروف۔ کچھ اصلی کچھ جعلی لیکن آج ہال بالکل خالی تھا۔ صرف ایک گوشے میں کچھ ورزش کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ہال میں نیا قالین بچھایا گیا تھا اور اسے ایک کانفرنس روم یا پریس بریفنگ ہال بنا دیا گیا تھا۔

میرا دل مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا "سونی۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آؤ، آگے بھی دیکھ لیں۔"

"آگے کیا ہے؟"

"سائڈ میں دو بیڈ روم ہیں۔ دو اسٹور ٹائپ کمرے ہیں" اس نے کہا۔

ہم نے ہال کی چوڑائی کو عبور کیا اور کمروں میں جھانک

کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ان چیزوں کے جو رہائش اور آسائش کے لیے ضروری تھیں۔ ملک رب نواز ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کو محفوظ کر لیا تھا۔ اب یہ بعید از امکان لگتا تھا کہ اس نے شبنم کو اسی گھر میں رکھا ہو۔ اسے جگہ کی کیا کمی، اس شہر میں اور دوسرے شہروں میں اس کی نہ جانے کتنی کوٹھیاں بنگلے، کاروباری ادارے اور کارخانے تھے۔ نمک خواروں اور غلاموں کے گھر تھے اور عین ممکن ہے اس کی ذاتی جیل، ٹارچر سیل اور خرکار کیمپ بھی ہو۔

"سونی۔ بس اب چلو" میں نے کہا "وہ نہیں ہے یہاں پر۔ یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ ہم نے ایسا سوچا۔"

وہ واپس چلنے لگی "کیا سوچا؟"

"یہی کہ شبنم کو ملک ہاؤس میں رکھا گیا ہوگا۔ ملک اتنا بے وقوف نہیں ہے۔"

وہ بولی "ملک واقعی بہت سیانا ہے اور اس کی جگہ میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ شبنم کو وہاں رکھتی جہاں کسی کا خیال بھی نہ جائے۔ یہ ہم سب کی نفسیاتی خامی ہے۔ ہم مشکل پسند ہو جاتے ہیں۔ ذہن کو دور دراز کے امکانات میں الجھا لیتے ہیں۔ سامنے کی جگہ کو دیکھتے ہی نہیں۔ بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔ یہ اس کی مثال ہے۔"

"یعنی تم اب بھی مصر ہو کہ شبنم یہیں ہوگی؟"

"اسے ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں اس بڑی کوٹھی کے چپے چپے سے واقف ہوں۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے۔ دیکھو، باہر صبح صادق کا اجالا پھیل رہا ہے۔"

اس نے سرسری نظر سے باہر دیکھا "چوکیدار بھی آگیا ہوگا نماز پڑھ کے۔"

میں نے کہا "یہ تمہارے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں؟"

وہ بولی "ہم یہاں کب تک چھپے رہ سکتے ہیں۔ جانا تو پڑے گا۔"

"میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے۔"

"چور ڈاکو ایک اصول پر سختی سے عمل کرتے ہیں کہ اندر جانے سے پہلے باہر نکلنے کے راستے دیکھو۔ صرف ایک راستہ نہیں، راستے" سونی نے کہا۔

"اور ایک ہی راستہ ہو، پھر؟"

"پھر اسے کھلا رکھنے کا بندوبست پہلے کرو ورنہ اپنی بحفاظت واپسی کی ضمانت لے لو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ضمانت لے لو، کس سے؟"

اس نے اپنا ریوالور نکال لیا "اب تیار ہو جاؤ۔ ایکشن کے لیے۔"

"اوہ نو!"

"اوہ یس۔ ہم شبنم کو نہ لے جا سکے تو اس کی بحفاظت واپسی کو یقینی بنانے کی ضمانت لے کر جائیں گے۔"

یکلخت مجھ پر اس کا پورا پلان یوں عیاں ہو گیا جیسے بٹن دباتے ہی ٹی وی کی تصویر روشن ہو جاتی ہے۔ "ونڈرفل سونی۔ تم ان معاملات میں ایک جینیس ہو۔"

"لیکن عورت ہونے کی وجہ سے ناقص العقل بہرحال ہوں" وہ خوش دلی سے بولی۔

میں نے اپنا ریوالور نہیں نکالا "ہم کسے ساتھ لے جائیں گے؟"

"اسے جو ملک کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی بیوی مت کہنا۔"

میں نے کہا "نہیں کہوں گا۔ بیویاں تو بازار سے مل جاتی ہیں۔ بیٹے پیدا کرنے پڑتے ہیں اور پال پوس کے جوان کرنے پڑتے ہیں۔"

ہم آہستہ آہستہ قدم رکھتے اوپر گئے۔ سونی نے ایک بند دروازے پر رک کے کچھ سوچا۔ شاید وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق ملک کے بیٹے اور بہو کا یہی بیڈ روم تھا مگر بیڈ روم بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ بڑا بیٹا یہ حق رکھتا ہے کہ اسے دوسرا بیڈ روم پسند آجائے تو خود وہاں شفٹ ہو جائے۔

سونی نے کہا "اگر یہ ــ غلط دروازہ ہوا؟"

میں نے آہستہ سے کہا "تو جو یہاں سو رہا ہے اس کی بدقسمتی۔"

سونی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی عورت نے خواب آلود لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

سونی کچھ ناک میں منمنائی جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اب عورت نے واضح الفاظ میں پوچھا "کیا آفت آگئی آدھی رات کو؟"

سونی نے کہا "وہ جی ــ دراصل ــ آپ کو ــ وغیرہ وغیرہ۔"

عورت کی سمجھ میں خاک آتا۔ وہ مجبوراً اٹھ کے دروازے تک آئی۔ شاید اندر اس کے مجازی خدا نے سوال کیا ہوگا کہ منہ اندھیرے اٹھ کے کہاں جا رہی ہو، اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب میں کہا "پتا نہیں کیا کہہ رہی ہے" اور اندر سے ڈور لاک کھول دیا۔

اس کے دروازے میں نمودار ہوتے ہی سونی نے اسے دبوچ لیا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا "خبردار۔۔۔ آواز مت نکالنا۔"

سونی کے پیچھے میں اندر داخل ہوگیا۔ سونی کی دھمکی کے باوجود عورت نے چیخ ماردی تھی۔ اب وہ دہشت سے ٹاش کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

ملک رب نواز کے بیٹے نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا ہاتھ خود بخود تکیے کی طرف گیا تھا۔ شاید اس کے نیچے ریوالور تھا۔ میرے ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھ کے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کی نظر اب سونی پر جم گئی تھی۔

"سونی۔۔۔ تم۔۔۔"

"ہاں میں' اچھا ہوا تم نے مجھے پہچان لیا" سونی نے کہا۔

وہ بولا "کیا چاہتی ہو تم۔۔۔ دیکھو' میری بیوی کو چھوڑ دو۔"

"میری بہن کو چھوڑا تھا تم نے؟" سونی نے کہا۔

اس وقت مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ سونی نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ مجھے شبنم کو اغوا کرنے والے ملک رب نواز کو سزا دینی تھی۔ سونی کو اپنی بہن کے قاتل سے بدلہ لینا تھا۔ ہمارا دشمن ایک تھا۔ ہماری منزل ایک تھی۔ ہمارے مقاصد ایک تھے۔ شاید یہ انتقامی جذبات کی شدت تھی کہ سونی خوف سے اتنی بے نیاز ہوگئی تھی۔

وہ بولا "میری بیوی کا اس میں کیا قصور تھا' اسے تو کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں مگر تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں لے جانا چاہتے ہو تم مجھے؟"

"سوال جواب مت کرو۔" میں نے آگے بڑھ کے اس کے سر پر ایک مکا رسید کیا۔ وہ چکرا کے گر گیا۔ اس کی بیوی نے بے اختیار چیخ ماری۔

سونی نے اس کا گلا اپنے بازو کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس نے دباؤ بڑھایا تو اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ تڑپنے لگی۔

ملک کا بیٹا پھر سنبھل کے بیٹھ گیا "میں۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ لیکن اسے۔۔۔ اسے چھوڑ دو۔"

میں نے اسے کھینچ کے فرش پر کھڑا کردیا۔ وہ نائٹ سوٹ کے لٹکتے ہوئے ازار بند کے ساتھ بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ عینک بھی استعمال کرتا تھا اور اس کے بغیر اعتماد کی کمی محسوس کررہا تھا۔ میں نے اس کا تکیہ الٹ کر دیکھا۔ تکیے کے نیچے ریوالور کے ساتھ ایک موبائل فون بھی پڑا تھا۔ میں نے فون کو دیوار پر دے مارا۔

بہو کی چیخ ملک رب نواز کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ صبح کے پہلے پہر میں اس کی نیند زیادہ گہری نہیں تھی یا پھر اسے بیوی نے جگادیا تھا۔ میں نے زینے پر چڑھنے والے قدموں کی آواز سنی پھر دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ملک اندر آگیا۔ اس کے پیچھے ملکانی دوڑتی ہوئی اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آگئی۔

اندر کا منظر دیکھتے ہی ملک اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ ملک کی بیوی نے جلدی میں دوپٹا بھی نہیں لیا تھا اور سلک کی نائٹی میں وہ جوان سوتیلے بیٹے اور بہو کے سامنے اور کچھ میری موجودگی میں زیادہ بدحواس ہورہی تھی۔

"ملک صاحب! یہ آپ کا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔" سونی نے کہا "دوسرا تو ابھی چھوٹا ہے۔"

"سونی۔۔۔ حرام زادی۔۔۔ کنجری۔۔۔" اس کی بیوی نے چلاّ کے کہا۔

ملک نے اسے خاموش کرادیا "کیا چاہتی ہے تو؟"

میں نے کہا "مجھ سے بات کرو ملک۔ میں ایک بات واضح کردوں پہلے کہ اپنے محافظوں پر' اسلحے کی طاقت پر' چالاکی پر یا سیکیورٹی سسٹم پر بھروسا کرتے ہوئے کوئی بے وقوفی مت کرنا ورنہ ساری عمر روتے رہو گے۔"

ملک بولا "تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

"دیکھا تو ہے لیکن تمہیں یاد نہیں آرہا ہے" میں نے کہا۔

ملک نے ایک انگلی پیشانی پر رکھی "رائٹ۔ تم ڈرائیور ہو۔ اس عورت کے۔"

"کیا اس کا نام بھی یاد نہیں آرہا ہے؟" میں نے کہا۔

"شبنم۔۔۔ یس' وہ رپورٹر۔۔۔ تم اس کے ساتھ آئے تھے مگر مجھے تم کسی طرح بھی ڈرائیور نہیں لگتے" وہ بولا۔

"ڈراما مت کرو' شبنم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"شبنم' میں کیا بتاؤں۔" ملک نے سوچ کے کہا "ہوگی اپنے آفس میں یا کہیں کسی کے ساتھ۔ اس میں ڈراما کیا ہے' مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کو پہلے ہی منتخب کرلیا تھا۔

میں نے غصے میں چلاّ کے اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا "نہیں' تم جانتے ہو۔"

میز کا اوپر والا آدھے انچ موٹی لکڑی کا تختہ درمیان سے دو ٹکڑے ہوگیا۔ ان سب کی نظروں میں خوف گہرا ہوگیا۔

"شبنم کے بارے میں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ تم نے ہی اسے اغوا کرایا تھا۔ انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ملک۔ میں تمہارے بیٹے کو لے جارہا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

ملک کی بیوی چلائی "خدا کے لیے ایسا مت کرو۔"

میں نے کہا "یہ تختہ زیادہ مضبوط تھا۔ تمہارے بیٹے کی گردن اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ ریڑھ کی ہڈی بھی توڑ سکتا ہوں میں۔ یہ ساری عمر مفلوج پڑا رہے گا۔"

سونی نے ملک کی بہو کو اس کی طرف دھکیل دیا "ہم اسے بھی لے جاسکتے تھے مگر تمہاری طرح تمہارے بیٹے کی نظر میں بھی بیوی کی کیا قیمت ہوگی۔ وہی جو ایک کنیز کی ہوسکتی ہے۔ پاؤں کی جوتی کے برابر۔"

ملک کی اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی "دیکھو' تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔"

"ملک' فضول بکواس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "شبنم کو ہمارے حوالے کردو' تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا۔"

ملک بہت اچھا ایکٹر تھا "یار' کس اُلو کے پٹھے نے کہا ہے تم سے کہ وہ یہاں ہوگی۔ کیا اسے میں نے اغوا کیا ہے' میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے۔ تم نے واقعی اغوا نہیں کیا۔ اغوا کرنے والے تمہارے آدمی تھے۔ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرچکے ہیں۔"

"مجھے نام بتاؤ ان کے۔ کیا کہا ہے انہوں نے؟" ملک غصے سے بولا "میں تو خود شبنم کا انتظار کررہا ہوں۔ اس نے میری گاڑی واپس کردی مگر اپنی گاڑی لینے کے لیے نہیں آئی۔"

میں نے کہا "ملک' شبنم کو پرل پولٹری پروڈکٹ کے ایک ٹرک میں اغوا کیا گیا۔ ایک پیٹرول پمپ سے۔ اس واردات کے چشم دید گواہ مل جائیں گے۔ اس ٹرک کا ڈرائیور تھا سراج نام کا ایک شخص مگر ایک پان والا' ایک ٹریفک سارجنٹ اور ایک ایس ڈی ایم کا بیٹا' یہ سب جانتے ہیں۔"

ملک کی بیوی نے اپنے شوہر کا کندھا ہلایا "اگر تم کو بیٹے کا خیال ہے۔"

ملک نے دہاڑ کے کہا "تو چپ کر۔ ان پر یقین کررہی ہے تو؟"

اس نے دبے دبے لہجے میں کہا "کل ایک فون بھی تو آیا تھا۔"

"خاموش نہیں رہ سکتی تو" ملک نے اسے ایک گالی دی "یہ سارا حرامی پن اس کا ہے۔ یہ لے کر آئی ہے اپنے کسی یار کو یہاں۔"

سونی نے تڑخ کے کہا "سب کے یاروں کا پتا ہے تجھے۔ اپنی ماں کے یاروں کو جانتا ہے؟ کتے کی نسل۔ تیری گھر والی کس کے ساتھ سوتی ہے۔ یہ پتا ہے تجھے؟" اس کی زبان کھلی تو گالیاں خود بخود مشین گن کی گولیوں کی طرح نکلنے لگیں۔

"میں چھوڑوں گا نہیں تجھے۔۔۔" ملک نے چیخ کے کہا۔

جواب میں سونی نے اسے ماں بہن کی وہ فحش اور شرمناک گالیاں دیں کہ مجھے بھی پسینہ آگیا۔ ملک کی بیوی اور اس کی بہو کی حالت زیادہ غیر تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ کوئی شریف نظر آنے والی اور شرافت سے بات کرنے والی عورت ایسی زبان بھی استعمال کرسکتی ہے۔

میں نے سونی کو روکا "سونی۔ کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ خود کو سنبھالو' اسٹاپ اِٹ سونی۔ سونی ہوش میں آؤ۔"

شاید اپنی بہن کا انجام یاد کرکے سونی غصے سے پاگل ہوگئی تھی۔ اس جنونی کیفیت کا ذمے دار ملک بھی تھا جس نے اسے دھمکی دے کر بارود میں چنگاری پھینک دی تھی۔ وہ اچانک بے قابو ہوگئی۔ اس کی وحشت کا ہسٹریا بڑی خرابی پیدا کرسکتا تھا۔ پاگل پن کے دورے میں وہ ملک کو شوٹ بھی کرسکتی تھی۔ مجبوراً مجھے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارنا پڑا۔ وہ ایک جھٹکے سے گری اور زمین پر سر پٹخ کے رونے لگی۔ وہ اپنی بہن کو یاد کررہی تھی۔

"تم ذمے دار ہو سونی کی اس حالت کے ملک اور اب تم الٹا اسے دھمکا رہے ہو۔ تمہیں کوئی حیا شرم نہیں ہے۔ کوئی احساس نہیں ہے کہ اس کی بہن کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا۔ بے غیرت آدمی' خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک تم زندہ ہو۔ اگر یہ ابھی تمہیں گولی ماردیتی تو تمہاری فرعونیت تمہارے کسی کام نہ آتی۔ دو منٹ میں تمہاری ہوا نکل جاتی۔"

ملک کا بیٹا خاموش کھڑا تھا۔ شاید اس صورتِ حال کا ذمے دار وہ بھی اپنے باپ کو سمجھتا تھا۔ ملک کی بیوی اور اس کی بہو بھی خاموش تھیں۔ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ سونی کی بہن اور فیکے کی بیوی کو ایک عبرت ناک موت کی سزا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے والا ملک کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ ملک کے شوق' اس کے کاروبار' اس کی خاندانی روایات' اس کے مزاج اور ماحول سے اچھی طرح واقف تھے مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ملک کی حمایت میں ہر الزام کو جھوٹ کہہ کر رد کردیں۔

سوئی نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ وہ آنسو پونچھ کے کھڑی ہوگئی۔ باہر اب صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ "آئی ایم سوری!"

میں نے ملک کے بیٹے کو آگے دھکیلا "چلو۔"

ملک بے اختیار آگے بڑھا تھا مگر بیوی نے اسے پکڑلیا "پاگل ہوئے ہو کیا' وہ ماردیں گے اسے۔"

ملک کے بیٹے نے کہا "ابا جی۔ جو کریں سوچ سمجھ کے کریں۔"

ملک نے سرہلایا "پتر تو فکر مت کر۔"

میں نے کہا "تم نے ہمیں مجبور کردیا ملک۔ ایسا تو ہوتا ہے ایک نہ ایک دن۔ اولاد کے گناہوں کی سزا ماں باپ کو ملتی ہے یا ماں باپ کے اعمال کا خمیازہ اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ سوئی' چھوٹے ملک صاحب کو لے کر چلو۔"

سوئی نے کہا "گاڑی کی چابی کہاں ہے؟"

ملک نے سرہلایا "ڈرائیور کے پاس رہتی ہے چابی۔"

مگر اس کے بیٹے نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا "چابی دے دو انہیں۔"

ملک کی بہو نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی چابی سوئی کی طرف اچھال دی۔ سوئی نے اسے کیچ کرتے ہوئے بھی ریوالور کا رخ ملک کی طرف رکھا پھر وہ الٹے پاؤں چلنے لگی۔ میں نے ملک کے بیٹے کو آہستہ سے آگے دھکیلا۔

"تمہاری معمولی سی حماقت تمہارے یا تمہارے بیٹے کی جان لے سکتی ہے ملک!" میں نے بھی پلٹ کے دروازے کا رخ کیا "اس معاملے میں پولیس کو مت لانا بیچ میں۔"

ملک کی بہو رونے لگی "انہوں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔"

میں نے کہا "تم کیا چاہتی ہو۔ ہم تمہارے سسر کو لے جائیں؟ وہ تو دو بیویوں کا اکلوتا شوہر ہے۔ چار بچوں کا باپ ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے شوہر کو کچھ نہیں ہوگا۔ اگر خود باپ نے بیٹے کا برا نہ چاہا۔"

ملک بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ "اگر تم نے میرے بیٹے کو انگلی بھی لگائی' اسے خراش بھی آئی۔۔۔"

"تو کیا ہوگا۔ کیا کرلوگے تم ملک رب نواز۔" میں نے ایک ایک زینہ اترتے ہوئے کہا "بہتر یہ ہوگا کہ تم ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ تمہاری ساری طاقت' رعونت اور دولت اس وقت بے اثر ہے۔ اپنی بے بسی سے سبق لو ملک اور سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ شبنم کو کچھ نہ ہوا تو تمہارے بیٹے کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ شبنم واپس ملے گی تو تمہارا بیٹا بھی واپس مل جائے گا۔"

"مگر میں کہاں سے لاؤں تمہاری شبنم کو؟" ملک نے ٹوٹے ہوئے حوصلے کے ساتھ بے اعتمادی سے کہا۔

"جہاں سے چاہو لاؤ۔ بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے اور نہیں جانتے تو معلوم کرو۔"

وہ سب بھی ایک ایک زینہ اترتے جارہے تھے۔ ان کا رخ میری طرف تھا۔ میرا رخ ان کی طرف۔ میں بہت احتیاط سے الٹا چل رہا تھا۔ جس راستے سے ہم آئے تھے' وہ میرے ذہن میں تھا مگر اب میں پیچھے دیکھے بغیر کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ میرے کان سوئی کی آواز پر تھے۔ ہم نیچے ہال میں پہنچے تو میں نے ملک کی دیوزاد ملازمہ کو دیکھا۔ وہ کچن کی طرف سے آئی تھی اور اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا لیکن مالکوں کی بے بسی دیکھ کے وہ بھی مجبور ہوگئی۔ وہ مجھ پر گولی چلا کے ملک کے بیٹے کو نہیں بچاسکتی تھی۔

اوپر سے ملک رب نواز کے چھوٹے بیٹے اور اس کی دو بیٹیوں نے چلانا شروع کیا "ابا جی! یہ کیا ہورہا ہے؟" بچی نے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" بیٹا بولا "کیا یہ چور ہیں؟"

"یہ بھائی جی کو کہاں لے جارہے ہیں؟" سب سے چھوٹی لڑکی نے رو کر کہا۔

"تم چلو' اپنے کمرے میں" ملکانی نے انہیں ڈانٹا "کس نے کہا تھا تمہیں باہر آنے کو۔ شور کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ملک رب نواز کے ملازم جاگ اٹھے تھے اور جو باہر سے کام کرنے آئے تھے' سب دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں باہر آگیا۔ اس وقت تک سوئی کے ساتھ ملک رب نواز کا بیٹا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے اپنی کلاشنکوف اٹھائی ہی تھی کہ ملک نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

میں نے گاڑی کے پاس پہنچ کے کہا "اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو وہ ملک صاحب کے ولی عہد بہادر سے دشمنی کرے گا۔ سوئی' گاڑی باہر نکالو۔"

سوئی نے ملک کے بیٹے کو حکم دیا "چلو!"

سوئی نے ڈرائیونگ سیٹ پر ملک صاحب کے بیٹے کو

بٹھایا تھا اور خود پیچھے والی سیٹ پر ریوالور لیے بیٹھی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور گیٹ سے نکل گئی۔ ملک اور اس کی فیملی کے سب لوگ اور ملازم برآمدے میں رک گئے تھے۔ میں گیٹ تک الٹے پاؤں چلتا رہا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی ادھر اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ گیٹ پر میں نے چوکیدار کو بھی کور کیا۔

"لاؤ' یہ مجھے دے دو" میں نے کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

چوکیدار نے انکار میں سرہلایا ہی تھا کہ میں نے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کھڑے کھڑے گر گیا۔ میں نے اس کی کلاشنکوف اٹھالی اور گیٹ میں اندر کی طرف لگی ہوئی چابی قبضے میں لے لی۔ گیٹ بند کرکے میں نے باہر سے لاک میں چابی گھمائی اور پھر اطمینان سے سوئی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گیٹ کے بند ہوتے ہی اندر بھگدڑ مچی ہوگی گروہ ادھر اُدھر فون کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اس کے لیے انہیں اپنے موبائل فون استعمال کرنے تھے۔ فوری طور پر گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابیاں تلاش کرنی تھیں۔ بے ہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو اٹھانا تھا۔ ڈاکٹر کو بلانا تھا اور سوچنا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

لیکن اب بازی ہمارے ہاتھ میں تھی اور انگریزی محاورے کے مطابق گیند ملک رب نواز کے کورٹ میں تھی۔ سوئی کی مدد اور منصوبہ بندی سے کھیل کا پانسا پلٹ رہا تھا۔ اب شبنم کے تحفظ اور اس کی واپسی کی ضمانت ہمارے پاس تھی۔ پہلے ہم شبنم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اب ملک رب نواز کی باری تھی۔

مجھے اس دعوے میں کوئی غرور محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اپنے سارے وسائل' ساری دولت اور طاقت' اثر رسوخ اور تعلقات استعمال کرکے وہ ہم سے اپنا بیٹا واپس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اب سودا کرنے پر مجبور تھا۔ گلی کے پہلے موڑ پر میں نے رئیس کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا پھر جیسے ہی گاڑی نے دوسرا موڑ کاٹا' میں نے ملک کے بیٹے سے کہا "اب گاڑی میں چلاؤں گا' تم پیچھے آجاؤ۔"

اس نے تعمیل کی۔ وہ تقریباً ستائیس اٹھائیس سال کا صحت مند نوجوان تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی شادی کو بھی بہت دن نہیں گزرے تھے۔ اس کی نئی نویلی بیوی کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کا رنگ اس کا گواہ تھا۔ باپ کے مقابلے میں وہ کم گو اور مہذب نظر آتا تھا۔ نوجوانی میں بھی اس کا خون اتنا گرم نہیں تھا جتنا اس کے باپ کا تھا لیکن پچاس سال کے ملک کی صحت اپنے بیٹے کے مقابلے میں یقیناً قابل رشک تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے پیچھے سے ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف جھک گیا۔ اسے کھینچ کر پیچھے لانے میں مجھے خاصی طاقت صرف کرنی پڑی۔ سوئی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی پھر اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ وہ گاڑی کے فرش پر الٹا پڑا رہا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے لینڈ کروزر کو دوڑانا شروع کیا۔ تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں زور سے قہقہے لگاؤں۔ گاؤں اور چلا چلا کے ہر شخص کو ساری دنیا کو بتاؤں کہ بالآخر میں نے ملک رب نواز کے سر پر غرور کو جھکنے پر مجبور کردیا ہے۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد تھا جب ملک رب نواز کے بڑے بھائی حق نواز نے ایک معمولی خطا پر رئیس کی کھال ادھیڑ دی تھی اور اس کی حمایت کے الزام میں مجھے بھی شریکِ جرم قرار دیتے ہوئے حکم دیا تھا کہ ہم پر کتے چھوڑ دیے جائیں۔ دست غیب کا اشارہ بن کر اس کی ماں ہمیں بچانے نہ آتی تو کتے ہماری بوٹیاں نوچ کے کھاجاتے۔

غریب رعایا اور اپنے سے کمزور پر ظلم و جبر اور انسانیت سوز مظالم کا یہ سلسلہ ایک خاندانی روایت تھا جس پر حق نواز اور رب نواز بڑے فخر اور غرور کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ ان کا دیا کھانے والے کی زندگی اور اس کے گھر کی بہو بیٹیوں کی عزت کو انہوں نے ہمیشہ اپنی جاگیر سمجھا۔ جس پر نظر دوبارہ اٹھے' اسے اٹھوالینا اور جو سر اٹھائے اس کا جنازہ بھی نہ اٹھنے دینا' وہ اپنی حاکمیت کا حق سمجھتے تھے اور اس پر غرور کرتے تھے۔ شہر میں آکے انہوں نے سیاسی طاقت حاصل کرلی تھی تو پیرو رکرسی ان کو سلام کرنے لگی تھی اور پولیس ان کے اشارے کی غلام ہوگئی تھی۔ ان کی نا قانونیت کا دائرہ محدود ہونے کے بجائے وسیع تر ہوگیا تھا۔

پہلے فیکے کی بیوی کا اور پھر فیکے کا قتل اس کی ایک مثال تھا۔ سوئی اگر انتقامی جذبات میں پاگل ہوجاتی تو ملک کے بیٹے اور اس کی بہو کو وہیں گولی مار دیتی اور اسے اپنے پیاروں کی جدائی میں دیوانہ وار تڑپتا دیکھ کے تسکین حاصل کرتی مگر کمزور عورت اور حیثیت میں ملک سے کم تر ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا اور اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا جب طاقت اس کے ہاتھ میں تھی اور ملک بے بس تھا۔ میرا بھی چھوٹے ملک کو اس کے باپ یا تایا کے جرائم کی سزا دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ملک رب نواز کے بڑے بھائی نے رئیس کے اور میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا تھا' اسے میں بھول چکا تھا۔ وہ مرگیا تھا چنانچہ میں نے اسے معاف کردیا تھا۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو ان سب کو معاف کر دیا تھا جنہوں نے یتیم خانے میں میرے جیسے لاتعداد یتیم بچوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا تھا۔ ان کا حساب میں نے میدانِ حشر میں میزانِ عدل تھامنے والے کے سپرد کر دیا تھا جس کے پاس سب کے اعمال نامے تھے۔

رب نواز کے ساتھ بھی میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی مگر اس نے شبنم کو اغوا کرا کے دشمنی کو دعوت دی تھی۔ اب مجھے دیکھنا تھا کہ اسیری میں شبنم پر کیا گزری ہے۔ اس کے بعد بھی میں فیصلہ کر سکتا تھا کہ رب نواز کس سزا کا مستحق ہے۔ اس کے مغرور سر کو جھکا ہوا اور اس کی شکست خوردہ دیکھنا ہی فی الحال میرے لیے ایک طمانیت بخش نظارہ تھا۔

سونی کے جذبات زیادہ شدید تھے۔ وہ اپنی بہن اور بھائی کی موت کو بھولی نہیں تھی اور اس کی ملک رب نواز کے ساتھ دشمنی کی نوعیت ذاتی تھی۔ یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا اور اگر وہ حصولِ انصاف کے لیے رب نواز کو خود سزا دینے پر تل جاتی تو میں اسے سمجھا سکتا تھا۔ غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ روک نہیں سکتا تھا۔

سڑک پر صبح کا منظر وہی تھا جو ہر روز ہوتا تھا۔ ابھی سائیکلوں اور بسوں میں لد کے نوکریوں پر جانے والے اور بستے لٹکا کے اسکول جانے والے گھر سے نہیں نکلے تھے۔ سڑک پر اخبار والے اور دودھ والے اپنی ہنڈا فٹفٹی موٹر سائیکل دوڑاتے پھر رہے تھے۔ حلوائیوں نے حلوا پوری کے لیے چولھے جلا کے کڑھاؤ رکھ دیے تھے اور چائے خانوں سے چائے کی مہک دیتی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ رئیس کچھ فاصلے سے پے جیرو میں پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کے سونی سے کہا "آج میں بہت خوش ہوں۔"

سونی رونے لگی "مجھے بہت افسوس ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تم رو رہی ہو۔ اس کامیابی کا سہرا تمہارے سر ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں ملک رب نواز کو گولی مار دیتی۔ یا اس کے سامنے بیٹے کو قتل کر دیتی اور پھر اسے خون کے آنسو روتا دیکھتی۔ جیسے میں نے بھائے تھے اپنی بہن کے لیے۔ تم کامیابی کے سہرے کی بات کرتے ہو' تو مجھے وہ پھول یاد آتے ہیں جو میں نے اپنی بہن کی قبر پر ڈالے تھے۔"

میں نے کہا "نیک اِٹ ایزی سونی۔ تم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس میں زیادہ بڑائی ہے تمہاری کہ تم نے قتل کر کے ملک جیسے شیطان کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہونے کو برا سمجھا اور قبول نہیں کیا۔"

"تم نے مجھے بچا لیا یہ جرم کرنے سے۔"

"میں نے؟"

"ہاں۔ اس وقت ایک خطرناک لمحہ یہ خیال بن کے آیا تھا کہ میں ملک کو نہیں' اس کے بیٹے کو اور ہو سکا تو شوٹ کر دوں۔ اس سے پہلے کہ یہ خیال مجھے مغلوب کر لیتا' تم نے میرے تھپڑ مار دیا۔ میں ہوش میں آ گئی۔"

"آئی ایم سوری! وہ ایک مجبوری تھی۔ یہی علاج تھا اگر ہو سکتا تھا اس وقت" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "چھوڑو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہم ایک خطرناک مشن میں کامیاب ہوئے اور تم جانتے نہ مانو مگر اس کا سارا کریڈٹ میں تمہارے سوا کسی کو نہیں دے سکتا۔ میں تو صرف شبنم کو نکال کرانا چاہتا تھا لیکن سچ پوچھو تو میں ذرا بھی پُرامید نہیں تھا اور میں ڈرا ہوا تھا۔"

"جو ڈر گیا سو مر گیا۔"

میں نے کہا "تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کی میں جتنی تعریف کروں کم ہوگی۔ جو پلان تمہارے ذہن میں تھا' اس کا مجھے علم ہی نہیں تھا اور تم نے اس پر جس طرح عمل کیا۔ اسی کا یہ انعام ہے۔"

"اگر میں ناکام ہو جاتی تو سب الزام بھی میرے سر آتا۔"

"تمہارا اعتماد اتنا بھرپور تھا کہ ناکامی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب میں بھی شبنم کی طرف سے بہت پُرسکون ہوں۔ ہم اسے کہاں کہاں تلاش کرتے۔ اتنے بڑے شہر میں۔ انسانوں کے اس وسیع سمندر میں ایک آدمی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔"

سونی نے بڑے غرور آمیز اعتماد کے ساتھ کہا "اب ملک خود لے کر آئے گا شبنم کو۔ ہاتھ جوڑ کے بیٹا مانگے گا حرام زادہ۔"

میں نے کہا "ابھی اور گالیاں دینی باقی ہیں۔ آج جس روانی کے ساتھ تم نے ملک کو گالیاں دی تھیں اس کی فیملی کے سامنے۔ وہ ناقابلِ تصور تھا میرے لیے بھی۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی "میں کیا کروں' میں بہت چاہتی ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتی ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤں مگر نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ میں ہار جاتی ہوں اپنی کمزوری سے۔ میں وہی پرانی سونی بن جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "اِٹ از آل رائٹ۔ تبدیلی چاہنے سے ہی آتی ہے لیکن راتوں رات نہیں آ سکتی۔ خواہش کا دل میں پیدا ہونا شرطِ اول ہے پھر ارادے سے اس پر عمل بھی کیا

جا سکتا ہے۔"

رئیس نے پیچھے سے ہیڈ لائٹس جلا کے مجھے سگنل دیا تو میں نے اپنی رفتار کم کی۔ وہ سڑک پر میرے ساتھ آ گیا۔ "اس سفید ہاتھی کو چھوڑ دے یہاں پیارے۔" رئیس نے چلا کے کہا۔

میں نے بھی چلا کے جواب دیا "یار' جلدی کیا ہے؟"

اس نے میری طرف جھک کے کہا "یہ ہاتھی ہمارے دروازے تک گیا تو بہت لوگ دیکھیں گے۔"

میں نے قائل ہو کے کہا "ٹھیک ہے۔ تو گاڑی کو سائڈ میں لگا۔"

چند منٹ میں ہمارا اتصال ہو گیا۔ سفید لینڈ کروزر سے ہم نے بلیک پے جیرو میں باقی سفر طے کیا۔ ملک رب نواز کا سفید ہاتھی واقعی اپنی ایک نمایاں پہچان رکھتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے لوگوں کو مرعوب کرنے والی پیتل کی چمکتی ہوئی گول پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی جس پر ایم پی اے کے حروف لوگوں کو خبردار کرتے تھے کہ وہ باادب باملاحظہ ہوشیار ہو جائیں۔ یہ کوئی عام لینڈ کروزر نہیں۔ ایک رکن اسمبلی اور صاحبِ اقتدار کی شاہانہ سواری ہے۔ جو اس کی راہ میں آیا مارا جائے گا اور پھر نہ داد ہوگی نہ فریاد۔ پولیس اسے دیکھ کے آئین شن ہو جاتی تھی اور بڑی سے بڑی غلطی پر بھی اس کے ڈرائیور کا چالان کرنے سے پہلے اسے نوکری بچانے کی فکر ہوتی تھی۔

ایسی گاڑی اگر رئیس خانے کے گیٹ سے اندر داخل ہوتی اور کچھ دیر بعد واپس جاتی تو نہ جانے کتنے لوگ اسے دیکھتے اور یاد رکھتے۔ بعد میں ملک کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ضرور ہوتا مگر ناممکن نہیں۔ ایسا رسک لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے ایک منٹ میں چھوٹے ملک کو رئیس کی گاڑی میں شفٹ کر دیا۔ فنگر پرنٹ سے پولیس کا ہم تک پہنچنا عملاً ناممکن تھا۔ عام طور پر پولیس کے پاس سراغ رسی کی یہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میرے یا سونی کے فنگر پرنٹس پولیس کے ریکارڈ پر نہیں تھے۔ اس کے بازو میں سے ایک رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں میرے یا سونی کی انگلیوں کے نشانات پائے جانے کا کوئی امکان تھا۔

سونی نے مجھے مشورہ دیا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ تم گاڑی کو آگ لگا دو۔"

میں نے کہا "تاکہ وہ شاخ ہی نہ رہے جس پر آشیانہ تھا۔ مجھے نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ اس سے کوئی خوشی ملے گی لیکن ایسا کام کرنا ٹھیک نہیں جس سے لوگ متوجہ ہوں۔"

رئیس بولا "تاکہ ہم ہوتا تو لگا دیتے۔ دس منٹ بعد دھماکا ہوتا۔"

میں نے کہا "یار زندہ صحبت باقی۔ ایسے مواقع بہت آئیں گے انشاء اللہ۔"

رئیس بولا "یہ تمہارا پروگرام اچانک ملک زادے کو لانے کا کیسے بن گیا۔ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"یہ تو سونی نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا۔ شبنم نہیں ملی تو اس نے کہا کہ کچھ لے جانا چاہیے' جس سے شبنم کی واپسی یقینی ہو جائے۔"

"سودا کرنے کے لیے اپنے پاس بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ بولی "اس کے علاوہ صبح کا اجالا پھیل گیا تھا۔"

رئیس بولا "تم نے بہت دیر کی۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے۔"

"ہمیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ اتنا وقت لگ جائے گا۔ دیر ہو گئی تو پھر خود ہمارے باہر آنے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی۔ کسی کو یرغمال بنا لیں" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "تم یہی ارادہ لے کر گئی تھیں' دیر کا تو بہانہ بن گیا۔"

"سچ پوچھو تو۔ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ میرا خیال تھا کہ ملک مزاحمت کرے گا۔ اندر بھی سیکیورٹی گارڈ ہوں گے۔ شاید وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گے۔ فائرنگ ہوگی اور اس افراتفری میں مجھے موقع مل جائے گا بدلہ لینے کا۔ یہ طے تھا کہ میں ملک کو نہیں ماروں گی۔ جیسے میں زندہ ہوں اپنی بہن کو رونے کے لیے۔ ایسے ہی وہ روتا رہے گا بیٹے کو یاد کر کر کے پھر اسے اندازہ ہوگا کہ سونی کی بہن کے خون کی کیا قیمت تھی۔"

رئیس اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "پھر ایسا کیوں نہیں کیا تم نے؟"

"مجھے ناصر نے ایک قتل کے الزام سے بچا لیا" وہ باہر دیکھتی رہی۔

ہم رئیس خانے پہنچے تو صبح کے سات بجے تھے۔ آنے جانے میں ہمارے تین گھنٹے صرف ہوئے تھے۔ خوشی کی بات تھی کہ ہمارا مشن اگر کامیاب نہیں ہوا تھا تو ناکام بھی نہیں تھا۔ شبنم نہیں ملی تھی مگر اس کی واپسی کا یقین ایک ضمانت کی صورت میں ہمارے پاس تھا۔

ملک نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے ہمیں جھٹلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ وہ شبنم کے اغوا کا ذمے دار نہیں۔ اگر ہم اسے موقع دیتے تو شاید وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی قسم بھی کھا لیتا۔ اس جیسے بے ضمیر اور بے ایمان لوگوں کا دین کیا اور ایمان کیا مگر میں نے قسم پر اعتبار سے انکار کر دیا تو ملک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا کھوکھلا اعتماد کچھ متزلزل ہوا۔ وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے شبنم کا پتا بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ شاید اس نے اپنی فیملی کے سامنے اعترافِ جرم نہ کرنا بہتر سمجھا۔

ہمیں دیکھ کر تمیں مارخان کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا "شبنم بیگم آپ کے ہمراہ قدم رنجہ نہیں فرمائی۔ ہمارا دل غمگین ہوتی۔"

میں نے کہا "وہ بھی آئے گی۔ فی الحال ہم شبنم کے بدلے کچھ اور لے آئے ہیں۔ اسے رئیس خانے کے مدفن میں رکھنا ہے فی الحال یہ ملک کا بیٹا ہے۔"

تمیں مارخان نے چھوٹے ملک کو غور سے دیکھا "یہ آپ کیا فرماتی' کیسا غضب فرماتی آپ شبنم بی بی کے بدلے میں اس کو لاتی۔ حسین ہرنی کے بدلے میں منحوس گدھے کا بچہ قبول فرماتی۔ خوش نوا بلبل کی جگہ ایک مردار خور گدھ کو دیتی۔"

رئیس نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "زیادہ دکھی مت ہو۔ یہ بتا رخشی بی بی کہاں ہیں؟ اسپتال سے کوئی فون آیا؟"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا "ام رخشی بی بی کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہوتی' وہ ام پر غیظ و غضب کا اظہار فرماتی۔"

"کس وقت گئی تھی وہ؟" میں نے کہا۔

"آپ کا تشریف برداری کے دس منٹ بعد۔ مجبوراً ام اس کے ساتھ جاتی۔ اسپتال چھوڑ کے واپس آتی" تمیں مارخان بولا۔

رئیس بولا "مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ خیر' اب اسے اٹھا کے اندر لے جا۔"

چھوٹے ملک کو اٹھانا چھوٹے سے تمیں مارخان کے لیے آسان نہ تھا۔ چنانچہ میں ہی اسے یہ خانے میں لے گیا۔ اب ہم نے یہاں سکونت ترک کر دی تھی مگر یہ جگہ پہلے کی طرح رہائش کے تمام لوازمات رکھتی تھی۔ میں نے چھوٹے ملک کو ایک بیڈ پر لٹا دیا۔

"کچھ دیر میں اسے ہوش آجائے گا" میں نے کہا "ہوش نہ آئے تو ڈاکٹر کو بلا لینا۔"

"تو کہاں جا رہا ہے؟" رئیس بولا۔

"مجھے فوراً اسپتال پہنچنا چاہیے" میں نے گھڑی دیکھی۔

"اسپتال تو مجھے بھی جانا ہے۔ ہم سب کو جانا ہے" سونی نے کہا۔

"پھر یہاں کون رہے گا؟"

"یہ بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتا" سونی نے کہا۔

"اس کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ ہم اس کے ساتھ مہمانوں والا سلوک کریں گے۔ جب تک یہ یہاں رہے گا" میں نے کہا "اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

سونی کو میری بات پسند نہیں آئی "کیا شبنم کے ساتھ بھی مہمانوں والا سلوک کیا گیا ہوگا؟"

"اس کے ساتھ جو زیادتی ہوگی' اس کا ذمے دار ملک رب نواز ہوگا اور ہم جو سزا دیں گے' اسے دیں گے۔ اس کے بیٹے کو نہیں۔"

"تمہیں اخلاقیات کا اتنا خیال ہے؟"

میں نے کہا "میرا پرانا اصول ہے۔ کتا آدمی کو کاٹ لے تو آدمی کتے کو نہیں کاٹتا۔ اور کاٹنے والا پاگل کتا ہو تو اس کے بچے کو گولی نہیں ماری جاتی۔ یہ اخلاقی تقاضا ہوگا ملک رب نواز کے منہ پر۔"

سونی قائل نہیں ہوئی "یہ خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھتا۔"

رئیس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "اگر سونی تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلی جائے۔ میں کافی ہوں چھوٹے ملک کی خدمت کے لیے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

تمیں مارخان کے اصرار پر میں نے ایک کپ چائے پی لی کیونکہ چائے بالکل تیار تھی۔ اس سے رات بھر کے خوف اور اعصابی کشیدگی کی تکان میں کچھ کمی آئی پھر بھی رئیس نے ڈرائیونگ کے لیے تمیں مارخان کو میرے ساتھ کر دیا۔

اسپتال کا کارنر ایک وسیع ویٹنگ ہال کے آخر میں بنا ہوا تھا۔ فرید عباسی اور رخشی کو میں نے ہال کے وسط میں ایک آرائشی ستون کے گرد بنے ہوئے صوفے پر بیٹھا دیکھ لیا۔

میں نے کہا "اب کیا صورتِ حال ہے۔"

"بہتر ہے۔" فرید نے کہا "شاید آج کسی وقت انہیں آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیں۔"

"تیری بات ہوئی ڈاکٹرز سے؟"

"ہاں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے یہاں آنے میں بہت دیر کی۔"

میں نے فرید کی تسلی کے لیے کہا "ڈاکٹر ایسے ہی کہتے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمیں بہت پہلے آنا چاہیے تھا مگر امی کی ضد کے آگے میری کبھی نہیں چلی۔ میں اپنے

آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں۔"

"یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ ہم بزرگوں کا لحاظ کرتے جاتے ہیں' ان کے ساتھ زبردستی نہیں کر پاتے۔ خیر' دیر کے باوجود تم اسپتال آگئے۔ اب اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی بہت جلد۔"

فرید نے نفی میں سر ہلایا "جو نقصان ہونا تھا' ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک میں جو نقصان ہوتا ہے وہ IRREVERSIBLE ہوتا ہے۔ ناقابلِ تلافی اور یہ تیسرا اٹیک تھا۔"

"تیسرا؟ پہلے دو کب ہوئے تھے؟"

فرید نے کہا "یہی تو مسئلہ ہے۔ اماں کو شوگر کی پرابلم بہت پرانی ہے اور DIABETIC کیس میں ہارٹ اٹیک کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔"

میں نے کہا "ہاں SILENT ATTACK ہوتے ہیں جن کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ وہ مجھے بلاتی رہیں اور میں نہ آسکا۔"

"کیا ہو سکتا ہے۔ سب کے اپنے اپنے کام ہیں۔"

میں نے کہا "یار' طعنہ مت دے۔"

"میں طعنہ نہیں دے رہا ہوں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تو بھی خود کو بلاوجہ مجرم سمجھ رہا ہوگا۔ جیسے میں سمجھ رہا ہوں۔"

رخشی اور سونی کچھ فاصلے پر چلی گئی تھیں۔ یہاں تین سے زیادہ افراد کے لیے جگہ نہیں تھی اور نزدیک کی کوئی نشست خالی نہ تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ان کے انہماک سے ان کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "مجھے کچھ معلوم ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ ایسی کیا ضروری بات تھی؟"

فرید نے سپاٹ لہجے میں کہا "کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا؟"

"وہ تیری اور رخشی کی شادی کے مسئلے پر میری رائے لینا چاہتی ہوں گی؟"

فرید نے اقرار میں سر ہلایا "ویسے تو رخشی سے بہت متاثر ہیں وہ اور پوری طرح مطمئن بھی ہیں اور مجھ سے بھی پوچھ چکی ہیں۔"

"پھر میری رائے کی اتنی اہمیت کیوں؟"

وہ بولا "دیکھ یار۔ وہ پرانے وقت کی وضع دار عورت ہیں۔ انہیں نظر آرہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا پسند

سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔

کرتے ہیں لیکن وہ رخشی سے براہِ راست ایسی کوئی بات نہیں کریں گی کہ بیٹی' کیا تمہیں میرا بیٹا پسند ہے اور پسند ہے تو کیا شادی کرو گی اس سے؟"

"یہ کام مجھے کرنا ہوگا۔"

"ہاں۔ اماں کو پتا نہیں کیوں یہ خیال ہے کہ کہیں رخشی برا نہ مانے۔ کہ لوبڑی بی نے اچھی پناہ دی۔ میری مجبوری کو بہانہ بنا لیا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں مگر اماں چاہتی ہیں کہ کوئی اور رخشی سے پوچھے اور انہیں بتائے کہ اس نے کیا کہتے ہیں وہ۔ بقائمی ہوش و حواس اور برضا و رغبت۔ مجھے قبول کیا۔ کسی احسان کا بدلہ چکانے یا کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں' بیچاری اماں۔"

میں نے کہا "کیا یہ بات میں انہیں بتا دوں' خود ہی۔"

"نہیں یار۔ رسماً یا اخلاقاً رخشی سے پوچھ لے۔ حالانکہ جواب مجھے معلوم ہے۔ ہم تو آنے مستقبل کے سارے پلان ڈسکس کر چکے ہیں۔ پھر بھی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں ابھی دو گواہوں کی موجودگی میں پوچھ لیتا ہوں یہاں کوئی کینٹین یا کیفے ٹیریا ہے؟"

"ہاں ہے۔ ہم صبح ناشتا کرنے گئے تھے" فرید بولا۔

"ہمیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

کیفے ٹیریا میں لوگ موجود تھے پھر کرسیوں والی ایک ٹیبل پر رخشی کے سامنے بیٹھ کے میں نے کہا "رخشندہ' تم ہوش و حواس میں ہو۔"

وہ ہنسنے لگی "تم ہو؟"

"میری بات کا جواب ہاں یا نا میں دو۔ یہ ایک قانونی اور شرعی سوال ہے۔ اگر نشے میں ہو یا فاتر العقل ہو تو مان لو" میں نے کہا۔

"یہ تم خود فیصلہ کر سکتے ہو" وہ بولی۔

"تو کسی جبر یا مصلحت کو سامنے رکھے بغیر مجھے واضح الفاظ میں اور آسان اردو میں بتا دو کہ کیا تم فرید عباسی سے شادی کرو گی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رخشی نے گھبرا کے کہا "یہ کیا تماشا ہے۔ لوگ سن رہے ہیں۔"

"لوگوں کو سننے دو۔ میں نے کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی سوال نہیں کیا۔ مجھے تمہارا جواب فرید کی امی کو پہنچانا ہے اور حسن اتفاق سے وہ میرے سوا کسی کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتیں۔"

سونی نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"

"پوچھنے والی بات ہے اسی لیے تو پوچھی ہے۔ اماں کے اعتماد کو دھوکا دینا نہیں چاہتا میں کہ پوچھے بغیر تمہاری طرف سے ہاں کردوں۔"

رخشی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "کیا فرید نے کچھ نہیں بتایا۔"

"گولی مارو فرید کو۔ محاورے کے مطابق، تم بولو" میں نے کہا۔

رخشی نے اقرار میں سر ہلایا مگر میں نے اس سے ہاں کہلوا کے چھوڑا۔

"بھئی مبارک ہو۔" میں نے فرید سے مصافحہ کیا "اب اگر اجازت ہو تو میں نکاح بھی پڑھادوں چائے آنے تک۔ ایجاب و قبول بھی تو ہوگا۔"

"تیرے جیسے قاضی کے بارے میں ہی کہا گیا ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟"

"ایک قاضی اسٹیٹ بینک کے گورنر بھی تھے" میں نے کہا۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ بھی ہوئے تھے کہ کیفے ٹیریا میں لگے ہوئے ایک اسپیکر سے اعلان نشر ہونے لگا کہ آئی سی یو کے بیڈ نمبر فور کے اٹینڈنٹ فوراً کاؤنٹر پر پہنچ جائیں۔ فرید کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کے بھاگا۔ رخشی اور سونی اس کے پیچھے چلی گئیں۔ میں نے ویٹر کو بلا کے بل کی رقم سے زیادہ کے نوٹ میز پر چھوڑے اور خود بھی کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کسی بری خبر کے خیال سے میرے دل کا ڈوبنا ایک فطری بات تھی۔ ان سب مریضوں کے ساتھ آنے والے جو آئی سی یو میں ہوں ہر وقت اسی خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہم تینوں بہت دیر تک ہال میں آئی سی یو کے دروازے سے کچھ دور پریشانی میں مبتلا کھڑے رہے۔ فرید عباسی کو ڈاکٹر نے اندر بلا لیا تھا اور معلوم نہیں اس سے کوئی بات کر رہا تھا یا خدانخواستہ وہ بات ہو گئی تھی جس کا ڈر تھا۔ گزرتے وقت کا دباؤ ہمارے اعصاب پر بڑھتا جا رہا تھا لیکن ہمارے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اندر کی کوئی مصدقہ خبر ڈاکٹر دے سکتا تھا یا خود فرید عباسی۔

بالآخر فرید دروازے سے باہر آیا "ڈاکٹرز نے سرجری کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "ہائی پاس ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ ہارٹ والو کے ریگرگیشن کا مسئلہ ہے۔ اس میں ففٹی ففٹی چانس ہوتے ہیں" فرید نے کہا۔

"ففٹی ففٹی؟" رخشی نے تشویش سے کہا۔

"ہاں۔ ہائی پاس تو اب بچوں کا کھیل ہو گیا ہے۔ ایک دو پرسنٹ کا رسک ہوتا ہے" فرید نے کہا۔

"سرجری ضروری ہے" میں نے کہا۔

فرید بولا "ڈاکٹرز نے کہا کہ آپ جلد فیصلہ کرلیں۔ کسی اور ڈاکٹر سے سیکنڈ OPINION لینی ہو یا کسی دوسرے اسپتال کو آپ بہتر سمجھتے ہوں تو مریض کو لے جائیں۔ میں نے کہا کہ زندگی اور موت تو ہر جگہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی سرجن کے ہاتھ میں نہیں، آپ آپریشن کریں۔"

"بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تو نے مگر یار۔! تو نے بتایا تھا کہ آج انہیں آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کردیا جائے گا۔"

"اس وقت کی حالت دیکھ کر ڈاکٹروں نے اپنی رائے دی تھی۔ طبیعت بگڑ گئی اس کے بعد دل کا معاملہ ہے یار۔"

ہم انتظار کرتے رہے۔ میں نے رئیس کو فون کر کے صورت حال سے مطلع کردیا۔ رخشی اور سونی نے ہمارے اصرار کے باوجود گھر جانے سے انکار کردیا اور رئیس میرے منع کرنے کے باوجود چھوٹے ملک صاحب کو باندھ کے اور تالے میں بند کر کے اسپتال آگیا۔ دوپہر تک ہم سب نے ایک اذیت ناک انتظار میں وقت کاٹا۔ ایک انتظار فرید کی امی کے آپریشن کا وقت طے ہونے کا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر کنٹرول پر نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر پوری کوشش کر رہے تھے مگر بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا پھر ایک بار سرجری کا فیصلہ ہوا تو اتنے نیچے چلا گیا کہ ڈاکٹرز نے آپریشن کو موخر کردیا۔

دوسرا انتظار بڑے ملک یا شبنم کی طرف سے رابطے کا تھا۔ ملک اپنے بیٹے کے اغوا پر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے رویے سے مجھے امید ہو چلی تھی کہ ہم بہت جلد شبنم کے بارے میں اچھی خبر سنیں گے۔ اس نے سونی کو پہچان لیا تھا، اس کے نہ پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سونی اب اس کی دشمنی کا نمبروں اور ڈائریکٹ ٹارگٹ تھی مگر ملک کے لیے اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ وقت ملک رب نواز کے لیے بھی اہم تھا۔ ہم نے اسے پولیس کی مدد لینے سے منع کردیا تھا اور وہ خود بھی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ خود اپنی رسوائی کی تشہیر کا سامان کرے۔ اگر یہ خبر عام ہو جاتی تو سننے

والوں کے ذہن میں پہلا سوال یہ اٹھتا کہ ملک کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا صحیح جواب ہم فراہم کرتے تو سارا پریس ملک کے پیچھے پڑ جاتا اور خاموشی سے باعزت رہتے ہوئے تصفیہ کرنے کا موقع اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

دوپہر تک ہم ویٹنگ ہال بیٹھے رہے۔ یہ اسپتال تھا۔ بیماری اور حادثات کا شکار ہونے والے لائے اور لے جاتے جا رہے تھے۔ صحت اور زندگی پا کے جانے والوں کے چہرے پر تشکر اور طمانیت سے مسکراتے نظر آتے تھے مگر ایسے بدقسمت بھی تھے جن کا وقت پورا ہو چکا ہوتا تھا چنانچہ ڈاکٹروں کی صلاحیت اور جدوجہد انہیں بچانے میں ناکام رہتی تھی۔ باقی ہم جیسے امید اور ناامیدی کے عالم برزخ میں تھے اور نہیں جانتے تھے کہ آنے والا کوئی لمحہ نوشتہ تقدیر کا کیا حکم لاتا ہے۔

دوپہر کے بعد رئیس نے تیمور خان کو فون کیا اور مجھے آ کے بتایا کہ آزاد صاحب نے فون کیا تھا مگر انہوں نے تیمور خان سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس ہمارے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہہ دیا کہ اسپتال گئے ہیں۔

"تیمور خان کو اسپتال کا نام معلوم تھا۔"

"ہاں مگر اسپتال فون کر کے آزاد صاحب ہم سے کیسے بات کرتے؟ انکوائری سے اسپتال کے RECEPTION یا کسی وارڈ کا نمبر ضرور مل جاتا مگر انہیں فرید عباسی کی ماں کا نام معلوم نہیں کہ وہ یہاں کس نام سے داخل ہیں۔ مسز عباسی کے نام سے یا اپنے اصل نام سے۔"

میں نے کہا "پھر کیا کریں، آزاد صاحب سے پوچھیں؟"

رئیس بولا "ملک رب نواز کے پاس رابطے کا وہی ایک ذریعہ ہیں۔ تو ان سے بات کرلے، کیا پتا ملک نے خود شبنم سے فون کروایا ہو۔"

میں کاؤنٹر پر لگے ہوئے پبلک فون کی طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک اعلان نشر ہونے لگا "مسٹر فرید عباسی، آئی سی یو سے رابطہ کریں پلیز!"

ایک بار پھر ہم سب تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ فرید عباسی دس منٹ بعد واپس آیا تو زیادہ متفکر تھا۔ "یار، اماں نے مجھے پوچھا تھا۔ وہ ملنا چاہتی ہیں مجھ سے۔"

"وہ ہوش میں ہیں" رخشی نے کہا "پہلے میں مل آؤں؟"

"آئی سی یو میں کوئی نہیں جا سکتا" فرید نے کہا "ایمرجنسی میں صرف ایک آدمی کو ایک منٹ کے لیے لے جاتے ہیں۔"

"آپریشن کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔"

"یار، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب بات نہیں کرتے۔ ابھی بلڈ پریشر کنٹرول میں نہیں ہے۔ جب تک ان کی کنڈیشن STABLE نہ ہو جائے، وہ رسک نہیں لے سکتے۔ حالانکہ وہ ہائی رسک پر پہلے ہی ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹرز کا فیصلہ ٹھیک ہے۔ آپریشن کا مقصد ہے زندگی بچانا اور اس کے لیے CONDITIONS آئیڈیل ہونی لازمی ہیں۔"

"جب کنڈیشن ٹھیک ہوتی ہے تو کوئی دوسرا آپریشن چل رہا ہوتا ہے۔ آپریشن تھیٹر خالی نہیں ہوتا اور سرجن دستیاب نہیں ہوتے۔"

"اگر تو مطمئن نہیں ہے تو کہیں اور لے چلیں اماں کو؟" رئیس بولا۔

فرید نے نفی میں سر ہلایا "یہ زیادہ مشکل ہے، تو جانا صرا!"

ایک نرس نے مجھے آئی سی یو میں داخلے کے لیے اسپتال کا STERILISED لباس بدلنے کے لیے کہا۔ مجھے جوتے کی جگہ ایک چپل دی گئی اور ڈیوٹی پر موجود ایک شفیق صورت ڈاکٹر نے کہا "آپ کم سے کم بات کریں۔ وہ کیا ہیں آپ کی۔؟"

"والدہ!" میں نے کہا۔

"انہیں بات کرنے کی بالکل اجازت نہیں مگر وہ ضد کر رہی ہیں۔"

میں نے کہا "میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔"

فرید کی امی سفید بے داغ بستر پر سرخ مکمل اوڑھے بڑے سکون سے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں سے مانیٹر کے ELECTRODES کی رنگین تاریں منسلک تھیں اور مانیٹر اسکرین پر اعداد و شمار مسلسل تبدیل ہو رہے تھے۔ یہ ان کی نبض اور دل کی رفتار ظاہر کرنے والے اعداد تھے۔ دل کی کیفیت ایک اوپر نیچے ہونے والی روشن لکیر سے پتا چلتی تھی۔ ان کی ناک کے نیچے آکسیجن کی ٹیوب لگی ہوئی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کے مسکرائیں اور میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا "اچھا ہوا تم آگئے۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

میں نے کہا "آپ کو باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ فضول باتیں کرنے کی تو بالکل نہیں۔ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی انشاء اللہ۔"

"تمہیں معلوم ہے؟"

میں نے کہا "میں نے رخشی سے پوچھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ بس تقدیر کے فیصلے کی وجہ سے ذرا دیر سے ملے۔"

انہوں نے سرہلایا "مجھے معلوم تھا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی میری زندگی میں ہوجائے۔"

میں نے کہا "بالکل ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوگی۔"

"نہیں ناصر۔ دھوم دھام کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "بس میں جارہا ہوں۔"

"سنو۔ ان کی شادی کا انتظام کرو' آج ہی۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "آج ہے!"

"ہاں آج۔ میری تو خواہش تھی کہ یہ خوشی اپنے گھر میں ہوتی مگر ڈاکٹر مجھے کہاں جانے دیں گے" انہوں نے بڑی حسرت سے کہا۔

وارڈ کے ڈاکٹر نے دور سے مجھے کلائی کی گھڑی پر انگلی مار کے اشارہ دیا کہ ایک منٹ گزر چکا ہے۔

میں نے کہا "امی' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے اگر تم کرو اور تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا جیسے بھی ہو۔" انہوں نے حکم کے انداز میں اصرار کیا "میں انکار نہیں سنوں گی۔"

"امی' اتنی جلد بازی۔"

"دیکھو ناصر۔ یہ بات کہہ کے میں کسی کو دکھی کرنا نہیں چاہتی مگر یہ میری آخری خواہش سمجھ لے تو۔۔۔ میں یہ کام اپنی زندگی میں کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے سامنے' اس کے بعد کا مجھے یقین نہیں۔ یہ پاگل پن کی ضد لگے گی تمہیں' ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "میں بات کرتا ہوں۔"

"بات تو نے کرلی۔ اب جو میں کہتی ہوں وہ کر۔"

میں نے کہا "میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں۔ وعدہ کرکے جا۔ تجھے قسم ہے میری جان کی۔"

میں مجبور ہوگیا "ٹھیک ہے۔ آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں' دیکھیں ڈاکٹر مجھے گھور رہا ہے۔"

انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا تو میں نے اس قیدی کی طرح محسوس کیا جس کی زنجیریں تو کاٹ دی گئی ہوں مگر اس کے سر پر اتنا بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہو کہ اس کے لیے ایک قدم چلنا بھی مشکل ہو۔

ڈاکٹر نے مجھے برہمی دکھائی "آپ پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا آپ ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں گے؟"

اس نے سرہلایا "ادھر ڈیوٹی روم میں چلیں' میں آتا ہوں۔"

ڈیوٹی روم میں ایک نوجوان ڈاکٹر ایک واجبی صورت کی جوان نرس کا ہاتھ پڑھ رہا تھا لیکن ہاتھ کی لکیریں شاید اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نرس گھبرا کے کھڑی ہوگئی۔ یہ بھی دل کا معاملہ ہے۔ میں نے سوچا۔ دل کا ہر معاملہ الگ ہے' زندگی کا ہو یا موت کا۔

ڈاکٹر میرے پیچھے پیچھے ہی آگیا "یس۔ کیا پرابلم ہے؟"

میں نے کہا "مجھے آپ کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں بلکہ ہم سب یہاں اسی لیے موجود ہیں" وہ بولا۔

"وہ خاتون میری مدر ہیں اور انہوں نے ایک عجیب فرمائش کی ہے۔ اسے وہ اپنی آخری خواہش کہہ رہی ہیں۔"

"بوڑھے لوگ جذباتی بلیک میلنگ کرتے ہیں۔ آپ کو عقل سے کام لینا چاہیے" وہ بولا۔

"وہ چاہتی ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی آج ہی ہوجائے۔ جبکہ آج وہ سرجری کے لیے ویٹنگ پر ہیں۔ بلڈ پریشر نارمل ہوتا تو اب تک وہ آپریشن تھیٹر میں ہوتیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے' ان کی کنڈیشن سیریس ہے۔"

"آئی سی یو میں ہونے کا مطلب ہی یہ ہے" اس نے المونیم شیٹ کے کاغذ رانھایا جس پر نمبر چار لکھا ہوا تھا اور چند لمحے پلٹ کے سرہلایا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں سمجھائیں۔"

وہ کچھ سوچتا رہا "میرا خیال ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔ سچ یہ ہے کہ مسئلہ ان کے بلڈ پریشر کا نہیں۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ آپریشن کے قابل نہیں ہیں" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

ڈاکٹر نے کہا "SHE MAY NOT SURVIVE ہم یہ چانس نہیں لے سکتے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"اور سرجری نہ کرنے کی صورت میں؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"SAME۔ اسی لیے ہم اپنا ٹائم انہیں دے رہے ہیں جن کو بچا سکتے ہیں۔ یہ ایک بے رحم حقیقت لگے گی تمہیں لیکن ہمیں اپنا فیصلہ غیر جذباتی رہ کے کرنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ان کی خواہش پوری کردو۔"

"کیا سینئر سرجن کی رائے بھی یہی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "سینئر سرجن کو فیس سے غرض ہے۔ وہ فیس لے کر کوئی ضمانت نہیں دیتا۔ وہ تم سے جھوٹ بولے گا کہ آپریشن کامیاب ہوگا۔ دو لاکھ کے لیے وہ جھوٹ بول سکتا ہے اور بولتا ہے۔ میں ابھی اس پیشے میں نیا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کل اتنا ہی نامور اور دولت مند ہوجانے کے بعد میرے خیالات بھی بدل جائیں۔ اس کے علاوہ' جو بات تمہاری ماں نے کہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مان کے تم بھی بعد میں مطمئن رہو گے اور وہ بھی زندگی کی ایک آخری خوشی حاصل کرلیں گی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

میں اسے دیکھتا رہا "تھینکس۔ اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میرا مطلب ہے' یہاں آئی سی یو میں شادی کا انتظام کیسے کروں؟"

اس نے کہا "تو پرابلم۔ تم ان کے فزیشن کو لکھ کر دے دو کہ تم اپنے رسک پر انہیں گھر لے جانا چاہتے ہو۔"

"اپنے رسک پر؟"

"آف کورس۔ خود ڈاکٹر کیسے ALLOW کرسکتے ہیں اور یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اس میں رسک نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ سرکاری اسپتال ہوتا تو وہ شاید تمہاری مدر کو داخلہ ہی نہ دیتے مگر یہاں ہر مریض ایک بلینک چیک ہے۔ اس کے ہر لمحے کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ میں نمک حرامی نہیں کررہا ہوں۔ میں نے نوکری کی ہے ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرنے کی۔ جھوٹ بولنا میرے فرائض میں شامل نہیں۔ یہ بات اگر اسپتال والوں کو معلوم ہوگئی تو وہ مجھے فوراً نکال دیں گے کہ میں نے ان کے انٹرسٹ کے خلاف کام کیا ہے لیکن میں اپنے ضمیر کے خلاف بھی کام نہیں کرسکتا۔ رزق تو خدا دے گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "تم جیسے ڈاکٹروں سے اس پیشے کی آبرو ہے۔"

میری جگہ فرید عباسی نے یہ لکھ کر دیا۔ صرف اس کے لیے ہی نہیں' ہم سب کے لیے یہ بڑی بے رحم سچائی تھی مگر اسے قبول کیے بنا چارہ نہ تھا۔ تیسرے پہر ہم ایک سائن بجاتی ایمبولینس میں فرید کی امی کو لٹا کے واپس ہوئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ انتہائی ٹریجک' ڈرامائی اور ناقابلِ تصور تھا۔ رخشی اور سونی نے بڑی افراتفری میں فرید عباسی کی پہلی بیوی کے جوڑے نکالے۔ ان میں شادی کا جوڑا بھی شامل تھا مگر فرید کی امی نے اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی پھر رخشی نے اپنی شادی کا جوڑا نکالا۔ سونی نے اسے تیار کیا۔ رئیس ایک طرف مڑا تو میں دوسری طرف۔ ہم سب کی نظر بیک وقت گھڑی کی سوئیوں پر فرید کی امی پر رہی۔ خوف ایک بچھو کی طرح ہمارے دلوں میں ڈنک مارتا رہا کہ نہ جانے کون سا آنے والا سیکنڈ زندگی کے راستے میں دیوار بن جائے۔ نہ جانے کون سی سانس آخری ہو۔

میں جہنم کو بھول گیا۔ آزاد صاحب کے فون کو بھول گیا۔ چھوٹے ملک کو بھول گیا۔ شام ساڑھے چار بجے قاضی نمودار ہوا۔ اس وقت تک رئیس کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے تیمی مارخان اور چھوٹی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ چھوٹے ملک کو تہ خانے میں ایسے بند کرکے آئے تھے کہ فرشتۂ اجل کے سوا اسے وہاں سے کوئی بھی نہیں لے جاسکتا تھا۔

ہم سب نے آپس میں طے کرلیا تھا کہ فرید کی امی کے سامنے بالکل مایوس یا غمگین نظر نہیں آئیں گے۔ ہم سب ہنگامہ کرتے رہے جیسے سب ٹھیک ہے۔ ہر چیز نارمل ہے۔ پریشانی اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ فرید کی امی کو ہم نے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹرز نے فی الحال آپریشن کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے انہیں ملاح اور آرام جاری رکھنے کے لیے گھر آنے کی اجازت دے دی ہے۔

لیکن میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ ہماری ساری اداکاری کا کمال فرید کی امی کو قائل کرنے میں ناکام تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا ہے۔ ان کی زندگی کا چراغ کسی وقت بھی گل ہوسکتا ہے مگر وہ خوش تھیں۔ وہ ایکٹنگ نہیں کررہی تھیں اس لیے خوش نظر نہیں آرہی تھیں کہ وہ ہماری خوشی کا بھرم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ واقعی خوش تھیں کیونکہ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا تھا۔ جو وہ چاہتی تھیں' وہ ہورہا تھا۔

رئیس ہار پھول اور مٹھائی لے آیا تھا۔ نکاح کے وقت بھی فرید نے اور خود رخشی نے سخت ضبط سے کام لیا۔ فرید مسکرا تا رہا اور رخشی شرماتی رہی۔ ہم زور شور سے ہنستے رہے اور انہیں مبارک باد دیتے رہے۔ انہوں نے رخشی کو گلے لگایا اور خوشی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے ڈھیروں دعائیں دیتی رہیں پھر انہوں نے فرید۔ پھر مجھے۔ رئیس کو اور سونی کو۔ تیمی مارخان کو اور چھوٹی کو' سب کو گلے لگا کے دعائیں دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر رات کے لیے ایک دعوت کا اہتمام شروع ہوا۔ جس میں سونی اور چھوٹی کی ٹیم نے زبردست انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ میں نے موقع پاتے ہی آزاد صاحب سے بات کی۔

وہ سوتے سے اٹھے اور عادت کے مطابق سخت خفا ہوئے۔ "بھئی کوئی حد ہوتی ہے گویا نامعقولیت کی تو عرض کرو کہ 'کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔ محبوب کی کمر کی طرح۔"

میں نے کہا "مجھے بہت دیر ہوگئی۔"

"افوہ۔ بخدا تم متقابل ہوتے تو مناسب گوشمالی فرماتے گویا۔ بھئی' جب دیر ہو ہی گئی تھی تو کچھ دیر مزید توقف فرمائیے' کم سے کم اس خواب کا آخری جان لیوا منظر تو دیکھ لیتے ہم گویا اور خبردار' جو ہم سے منظر کی تفصیلات دریافت کرنے کی بے شرمی کا مظاہرہ کیا۔"

میں نے کہا "آپ نے فون کیوں کیا تھا؟"

"ہم نے ۔۔۔ ہاں' مگر وہ تو گویا قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا۔ تم صبح کے بھولے ہو اس لیے بتادیتے ہیں کہ معاملہ کچھ ناقابل فہم رہا۔ ہماری عقل نارسا کے لیے گویا۔ کل تم نے کچھ عرض کیا تھا بلکہ استفسار فرمایا تھا عزیزہ شبنم کے بارے میں کہ اس کی خبر نہیں۔"

میں نے کہا "تو کیا اس کی کوئی خبر ملی؟"

"خبر تو یہاں اخبار والوں کو بھی ملتی ہے۔ اب یہ مصدقہ وغیرہ ہے یا نہیں گویا' وہ کیا نامعقول سا نام ہے اس بدقماش کا۔ زیر لگاؤ تو بزبان انگریزی دودھ' زبر لگاؤ تو بادشاہ اور پیش لگاؤ تو گویا کنٹری۔" وہ ہنسے۔

"ملک رب نواز نے فون کیا تھا؟" میں نے ضبط سے کام لیا۔

"ہاں' عجیب ناہنجار شخص ہے گویا۔ ہم سے پوچھ رہا تھا تمہارا پتا۔ بقول شاعر' میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔ ہم نے کہا کہ میاں لفظوں سے تصویر کشی بھی حرام ہے ہمارے نزدیک تو۔ نام بتاؤ کہ کیا چاہیے اور کیوں؟ کہنے لگا کہ نام تو معلوم نہیں مگر مولانا کی ریش مبارک ہے سیاہ اور بالشت بھر سے قدرے کم اور چہرے پر ایک ناک بھی ہے' خطرناک قسم کی گویا کیونکہ وہ مجسم خطرہ ہے اور دو کان ہیں تو دو آنکھیں۔ ہم نے کہا کہ مقصد عرض کرو ۔۔۔ گویا۔ خدانخواستہ رویت ہلال کمیٹی کے لیے کوئی صدر نہیں مل رہا ہے کیا بصیرت والا۔ تو کہنے لگا کہ اسے شبنم کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔ بس اس پر ہم نے خوب کھری کھری سنا کے طبیعت گویا ہری بھری کردی اس کی۔ نامعقولیت کی انتہا ملاحظہ ہو کہ ہم مثل فادر بزرگوار ہیں شبنم کے لیے اور وہ ہم سے عرض نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "دیکھیے' وہ پھر فون کرے گا۔ آپ اس سے پوچھ لیں کہ وہ کب کہاں دستیاب ہوگا۔ میں خود اس سے بات کرلوں گا۔"

"بھئی خوب یاد دلایا۔ تم نے تو فون پر عرض کیا تھا کہ شبنم تلاش گمشدہ ہوگئی ہے گویا اور ہم نے فرمایا تھا کہ فوراً حاضر ہوجاؤ تاکہ ہم اپنی پاپوش مبارک سے تمہارے سر عزیز کو زدوکوب کرائیں۔ تم نے سخت نااہلی اور غیرذمے داری کا ثبوت دیا تھا گویا اور تم نے ہم سے جھوٹا وعدہ بھی کرلیا تھا۔ علاوہ ازیں' تم نے چلبلی کو نظرانداز کرکے جس طرح ہمیں پابیادہ کیا ہے اور اس عفیفہ کی دل آزاری کی ہے۔ اس کے بعد تو گویا بیچ وقتہ گوشمالی تمہارا استحقاق ہے اور ہمارا فرض"

میں نے کہا "میں کچھ ایسے نازک معاملات میں الجھ گیا تھا اور اب بھی الجھا ہوا ہوں کہ حاضر نہیں ہوسکا۔"

وہ بطخ کی طرح ہنسے "نازک؟ چہ خوب۔ اس نازکی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔"

میں نے کہا "آپ میری بات سن لیں۔ ایک تو ملک رب نواز سے کہیں کہ میں خود بات کروں گا اس سے۔ اسے میرا فون نمبر یا پتا ہرگز نہ دیں۔ کسی کے بارے میں نہ بتائیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ ہم جانتے کیا ہیں کسی کے بارے میں کہ بتائیں۔ اب اس نے سوال کیا عجب جاہلانہ ہم سے کہ سونی کہاں ہے تو ہم نے کہا کہ میاں' پہلے تو جاپان کی کمپنی تھی گویا اور بخدا ابھی تک ہم نے نہیں خریدی۔ امریکی بڑے متاثر ہیں ان کی مصنوعات کی ارزانی اور خوبی سے اور اگر تلفظ کی خرابی کے باعث تم اپنے گجرات کی سوہنی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو مینوال سے رجوع کرو گویا۔"

میں نے کہا "خدا حافظ" اور فون بند کردیا۔ مجھے اب یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ شبنم زندہ ہے اور خیریت سے ہے یا نہیں ہے مگر اب ملک رب نواز خود اپنے جال میں پھنسا ہے تو ابھی کچھ تڑپے۔ بیٹے کی واپسی کے لیے انتظار کا عذاب کاٹے۔ پریشان ہو کے کھانا پینا چھوڑے اور رات بھر جاگے۔ شبنم کو لے جا کے جتنا کامیابی کے غرور میں تھا اب اس کی واپسی کے لیے اس سے زیادہ ذلیل ہو۔

رئیس نے رات کی دعوت کے بعد اجازت لی۔ وہ تمیں

مارخان اور اس کی چھوٹی سی ہونے والی شریک حیات کے ساتھ چلا گیا مگر میں نے اور سونی نے جانا چاہا تو خود فرید نے مجھے روک لیا۔

"یار' تمہیں گھر جا کے سونا ہی ہے۔"

میں نے کہا "تیری تو ہے شب عروسی۔ ہم کیا کریں۔"

"تم یہیں سوجاؤ۔"

"کہاں۔ تیرے حجلہ عروسی میں" میں نے کہا۔

"مذاق مت کریار۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ رات کو کچھ ہو نہ جائے اماں کو" فرید بولا۔

رخشی نے شرمانے کے باوجود سونی سے یہی کہا۔ "تم اماں کے پاس رہو۔"

"اب شبنم کی طرف سے تو اطمینان ہوگیا ہے" فرید بولا۔

فرید کی ماں آدھی رات تک باتیں کرتی رہیں۔ ان کا تو موڈ تھا رات بھر باتیں کرنے کا۔ وہ فرید عباسی کے شہید والد سے اپنی شادی کی باتیں کرتی رہیں پھر ان کی شہادت کا واقعہ سنا کے روئیں۔ یہ سوچ کے روئیں کہ آج وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ میں نے اور سونی نے انہیں بہت روکا مگر انہوں نے ہماری ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار کہتی تھیں کہ خدا بھی عجیب فیصلے کرتا ہے مگر اپنی مصلحت وہ خود ہی جانتا ہے۔ رخشی مجھے پہلے مل جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان دونوں کی زندگی خراب نہ ہوتی۔

میں سخت ٹینشن میں تھا۔ مجھے ان کی یہ کیفیت ایک خطرے کی علامت نظر آرہی تھی۔ بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ ان کے دل کے لیے انتہائی خوشی بھی اتنی ہی ضرر رساں تھی جتنی انتہائے غم پھر مجھے اس ڈاکٹر کی بات یاد آتی تھی۔ میں پرانے وقتوں کی یادوں کے آسیب زدہ جنگل میں بھٹکنے لگتا تھا۔ مجھے رخشی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آتی تھی۔ اس وقت کے ساتھ عذاب ناک یادوں کا ایک طویل سلسلہ منسوب تھا اور گزرے ہوئے وقت کا ہر نقش میرے ذہن میں تازہ تھا۔ جیسے یہ ابھی کل کی بات تھی۔ جب میں شاہ عالم تھا۔ میں قتل ہوگیا تھا۔ مجھے بڑی دھوم دھام سے دفن کردیا گیا تھا پھر میں زندہ ہوا تھا اور میری دوسری زندگی رخشی کی مہربانی کا نتیجہ تھی مگر میں شاہ عالم بن کے بھی نہ جی سکا تھا اور ناصر تخلیم بھی نہیں رہا تھا۔ میرا ماضی اور میرا مستقبل دونوں بے وجود ہوگئے تھے اور میرا حال تباہ تھا۔

میں اور سونی گزشتہ رات بھی جاگے تھے۔ جب بالآخر ہم نے فرید کی ماں کو خاموش ہوکے سوجانے پر مجبور کردیا تو خود ہمارے لیے جاگنا مشکل ہوگیا۔ ہم وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئے۔ کچھ دیر بعد سونی تو امی کے ساتھ بیڈ پر ہی لیٹ گئی اور میں نے زمین پر بستر بچھالیا۔

میری نیند بہت ڈسٹرب رہی۔ رات کو دوبار اٹھ کے میں نے فرید کی امی کو دیکھا مگر وہ سو رہی تھیں۔ میرے ذہن میں ایک نامعلوم خوف انہونی کا بیٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سوتی رہ جائیں گی اور میں نے ان کو نزدیک سے دیکھ کر یہ اطمینان حاصل کیا کہ ان کی سانس چل رہی ہے۔

صبح وہ معمول کے مطابق نماز فجر کے لیے جاگ اٹھیں۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز کے لیے جائے نماز بچھائی مگر نہ مجھے پتا چلا نہ سونی کو۔ میری آنکھ کھلی تو وہ وہیں بیٹھی قرآن کی تلاوت کررہی تھیں۔ میرے سلام پر انہوں نے دعا دی۔ میں نے سونی کو جگایا اور وہ کچھ خفت زدہ سی کچن کی طرف چلی گئی پھر رخشی سلام کرنے آگئی اور انہوں نے اسے شاد آباد رہنے کی ساری دعائیں دیں۔

ناشتے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا "ناصر' تو نے میرا بوجھ ہلکا کردیا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ اب میں سکون سے مرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "مرنے کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ابھی آپ کو بہت دن جینا ہے۔ پوتے پوتیوں کو بڑا کرنا ہے پھر ان کی شادی کرنی ہے۔"

وہ ہنسنے لگیں "آدمی کی ہر خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ فکر بھی ہے ناصر کی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "کیا ہم اس کے نہیں ہیں؟"

"مرد ساری عمر محتاج رہتا ہے۔ بچپن میں ماں سنبھالتی ہے پھر بیوی اور آخر میں بیوی نہ ہو تو ہو' اب رخشی میری جگہ لے سکتی ہے۔ میں اپنی ذمے داری اسے سونپ سکتی ہوں۔"

رخشی نے کہا "امی' خدا آپ کا سایہ ہمیشہ سلامت رکھے۔"

انہوں نے مسکرا کے ہاتھ اٹھایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ صبح سے اٹھی ہوئی تھیں اور ان کی طبیعت بھی سنبھلی ہوئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے اجازت لے لوں۔ ذہن پر سے یہ تفکرات کا بار اترا تو مجھے پھر شبنم کا خیال ستانے لگا۔ چھوٹے ملک کی دیکھ بھال کرنے کے لیے رئیس کافی تھا۔ مجھے اب ملک رب نواز سے معاملات طے کرنے کا طریقہ کار سوچنا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے فون کرکے کہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلالوں کہ اچھا تم شبنم کے ساتھ فلاں جگہ آجاؤ۔ میں تمہارے بیٹے کو لے آتا ہوں۔ ہم قیدیوں کا تبادلہ کریں گے' ہاتھ ملا کے گھر چلے جائیں گے کہ چلو جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ ذرا احتیاط اور پھر اپنی اپنی راہ لیں۔ اگر میں اسے آزاد صاحب کے آفس میں بلاتا تب بھی یہ رسک اپنی جگہ رہتا کہ وہاں پولیس چڑھائی نہ کردے۔ ملک رب نواز کے خلاف نہ کوئی ایف آئی آر درج تھی اور نہ اس کے جرم کا کوئی گواہ تھا لیکن جو ہم نے کیا تھا اس پر میرے اور سونی کے خلاف سنگین جرائم کی نہ جانے کتنی دفعات کا اطلاق ہوتا تھا۔ غیر قانونی اسلحے کے ساتھ' مجرمانہ نیت لے کر کسی کے گھر میں گھسنا۔ قتل کی دھمکی دینا۔ ڈکیتی' اغوا اور اقدام قتل۔ ان سب پر ہمیں کئی بار سزائے موت نہ سہی' عمر قید ہو سکتی تھی۔

مجھے اب سونی کی طرف سے زیادہ فکر تھی۔ ملک رب نواز اور اس کا بیٹا' دونوں اسے جانتے تھے اور پہچان بھی چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بس کو آگ لگا کے تباہ کرنے والی سونی تھی اور وہ اندر کے بہت سے راز جانتی تھی۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں رہا تھا اور وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ ملک جیسے مرد اسے سب سے آسان ٹارگٹ سمجھتے تھے اور اس سے انتقام میں اپنی وحشیانہ درندگی کے سارے جذبات کی تسکین کر سکتے تھے۔ چھوٹے ملک نے رئیس کو بھی دیکھ لیا تھا اور رئیس خانے کو بھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ رہائی پانے کے بعد اس جگہ دوبارہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے فرید سے کہا "یار' میں چلتا ہوں۔ تو جانتا ہے مجھے کیا کام ہے۔ بس تیرے لیے رک گیا تھا میں۔"

"میں کن الفاظ میں کہوں۔ جو تو نے کیا' شاید اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔" فرید نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"جو رخشی نے کیا وہ میں بھی نہیں کر سکتا تھا" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "ہاں' تم شادی نہیں کر سکتے تھے ان سے۔"

"ان سے تمہارے علاوہ شادی بھی کون کرتا۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔ اب اس غلطی کو تمہیں ہی نبھانا ہے" میں نے کہا۔

جب میں نے فرید کی امی سے اجازت چاہی تو وہ آنکھیں بند کیے مسکراتی رہیں۔ اس مسکراہٹ میں بڑی طمانیت تھی' شکر گزاری تھی اور سکون تھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھیں۔ میں نے دوبارہ کہا "امی۔ ہم جا رہے ہیں۔ شام کو پھر آئیں گے۔ اب ہو بھی ہے آپ کے ساتھ جو اب تک بیٹی تھی۔"

جب انہوں نے دوبارہ جواب نہیں دیا تب بھی مجھے شک نہیں ہوا۔ فرید نے بھی یہی سمجھا کہ شاید وہ سو گئی ہیں لیکن وہ ہم سب سے بہت دور جا چکی تھیں۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ انہوں نے موت سے جو مہلت لی تھی وہ تمام ہو گئی تھی۔ وہ فرید کی رخشی سے شادی تک رکی ہوئی تھیں۔ وہ عین شادی والے دن بھی مرنا نہیں چاہتی تھیں۔ بیٹے کی شب عروسی کی صبح ہو گئی تو ان کے پاس کوئی عذر نہ رہا۔ انہوں نے آخری بار دعا دی اور فرشتۂ اجل کے ہمرکاب ہو گئیں۔

شام آئی تو ہم سب نے ایک ساتھ ہونے کے باوجود خود کو بہت تنہا محسوس کیا۔ میں نے آزاد صاحب کو فون کر دیا تھا کہ ملک کا فون آئے تو اس سے معاملات طے کر لیں۔ وہ اپنا بیٹا کیسے لے گا اور شبنم کو کہاں ہمارے حوالے کرے گا۔ وہ مڈل مین کا رول ادا کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے۔ ذہین آدمی تھے اور ملک رب نواز ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ جیسے مجھے ملک نے فون کیا تھا' ایسے ہی کسی نامعلوم شخص نے فون کر کے یہ خواہش کی تھی۔ فون پر میں دونوں کو کیسے پہچان سکتا تھا۔ شبنم کو میں نے بیٹی کی طرح پالا ہے لیکن مجھے اس کے اغوا کیے جانے کا قطعی علم نہیں۔ نہ مجھے ملک رب نواز کے بیٹے کا پتا ہے۔

رات ہونے سے پہلے میں نے رخشی اور فرید عباسی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا اس گھر میں رہنا اب کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ خود بھی اکیلے رہ جانے کے خیال سے ڈرتے تھے۔ فرید نے صرف یہ کہا کہ سوئم کی فاتحہ اسی گھر میں ہونی چاہیے تاکہ محلے والے بھی شریک ہو جائیں۔ انہوں نے ضرورت کے کپڑے لیے اور ہمارے ساتھ رئیس خانے آ گئے۔

ملک رب نواز کا بیٹا بالکل ٹھیک تھا۔ تیمور خان نے اس کے آرام کا پورا خیال رکھا تھا اور تہ خانے کے اس بیڈ روم میں ہر سہولت فراہم کر دی تھی' جس کا وہ عادی تھا لیکن وہ قید تنہائی سے گھبرا گیا تھا اور بار بار پوچھتا رہا تھا کہ آخر اسے کب تک یہاں رہنا ہوگا اور اس کا جرم کیا ہے؟

رات کو فرید دیر تک اپنی ماں کی باتیں کرتا رہا۔ ہر بیٹے کے لیے ماں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ماں کی ممتا میں باپ کی شفقت کا انداز بھی تھا۔ باپ کی کمی کو امی نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا مگر امی نہ رہی تو وہ اچانک یتیم ہو گیا۔ ہم سب کی طرح جو پہلے ہی یتیم تھے۔

میں نے اسے سمجھایا "اب تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

وہ بولا "اور اس گھر کا کیا کروں جس سے میری زندگی کی ہر یاد وابستہ ہے۔"

میں نے کہا "یادیں دل میں رہتی ہیں۔ اس گھر کو یادوں کا مزار بنا کے رہنے سے کیا ہوگا۔ زندگی کا سفر آگے کی طرف ہوتا ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ یہی سب سے مؤثر طریقہ ہے والدین کو خراج عقیدت پیش کرنے کا۔"

"اولاد کے سارے اعمال ماں باپ کے لیے صدقۂ جاریہ بن سکتے ہیں۔ ہر نیکی کا ثواب انہیں پہنچ سکتا ہے۔" رئیس بولا "اس کوٹھی کو کرائے پر اٹھا دے۔"

"اور سامان جو بھرا پڑا ہے۔"

"صرف ضروری سامان رکھ لے۔ باقی چھوڑ دے۔" میں نے کہا۔

فرید نے نفی میں سر ہلایا "میں وہ سب کسی کباڑی کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"یہ ہم کب چاہتے ہیں۔ یہ سب سے محفوظ جگہ ہے" میں نے کہا۔

"اور یہاں جگہ کی کوئی کمی نہیں" رئیس بولا۔

فرید نے رخشی کی طرف دیکھا "ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

رخشی نے سر ہلایا "ہم دو سرا گھر لے لیں گے۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتے۔ تم بہرحال اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ جتنی ضرورت تمہیں ہے ہماری' اس سے زیادہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے لیکن جلدی کوئی نہیں۔"

رخشی نے کہا "ہاں۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

اس رات ملک رب نواز سے کوئی بات کرنا خود میرے لیے ایک جذباتی مجبوری بن گیا تھا۔ میرے لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں تھا کہ میں نے اس کے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی ہے اور ملک رب نواز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ شبنم کی اسیری کو دو دن ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں اسیری میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا مگر اچانک اس کی نگرانی اور اس سے تفتیش پر مامور لوگوں کے رویے میں تبدیلی سے اسے یقین آنے لگا ہوگا کہ شاید اب اس کی رہائی قریب ہے اور اس نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہم نے اس کا سراغ لگا لیا ہے اور ہماری کوشش میں کامیابی نے ملک کو یہ احساس دلایا ہوگا کہ اس کے گرد خطرے کا حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی دولت اور طاقت کی مضبوط دیواریں شاید اس کی حفاظت نہ کر پائیں گی۔

امید کے ساتھ شبنم کا حوصلہ بھی بڑھ گیا ہوگا۔ بے شک اسے بچانے والا خدا ہے مگر زمین پر اس کی مدد کس نے کی؟ اس کے لیے پریس نے آواز اٹھائی اور پچھلی سطح پر ملک کو بدمعاشی کا لائسنس دینے والی پولیس یا انتظامیہ کے لیے اس آواز کو دبانا مشکل ہو گیا۔ اسے آزاد صاحب پر بھی بھروسا ہوگا جو ایوانِ اقتدار تک مؤثر رسائی رکھتے تھے لیکن شبنم کو سب سے زیادہ یقین جذبۂ عشق کی طاقتِ تسخیر پر ہوگا جو پہاڑوں سے جوئے شیر بھی لا سکتی ہے۔

چنانچہ اب اسے ہر لمحہ میرا انتظار ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ اسے کھوجنے اور واپس لانے کے لیے ہم نے مشکلات کے کتنے صحرا عبور کیے اور خطرات کے کتنے سمندر پار کیے لیکن امید کی پہلی کرن پھوٹے دو دن گزر گئے تھے اور کامیابی کے سورج کا اجالا اب بھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ یہ سب خیالوں کا فریب تھا خواہش کا طلسم تھا۔ حقیقت اب بھی وہی ہے کہ وہ ملک کی قید میں ہے اور اس کی رہائی کے خواب کو صرف ملک کی شرائط پر تعبیر مل سکتی ہے۔

رئیس نے تہ خانے کے دروازے کا تالا کھولا پھر اس بیڈ روم کا جس میں چھوٹے ملک نے قید تنہائی کے دو دن گزار دیے تھے۔ بظاہر اسے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی مگر احساس کی اذیت ہی اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اسے اپنے باپ کے کسی جرم کی پاداش میں یہ سزا مل رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سزا کب ختم ہوگی اور اس کی انتہا کیا ہوگی۔ کیا باپ اسے اپنے جرم کا کفارہ ادا کر کے چھڑا لے گا یا اسے قصاص کے اصول پر آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان دینی پڑے گی۔

وقت' حالات اور ماحول بدل جانے سے بھیڑیے کے بچے کے خون میں موروثی اثرات اس حد تک نہیں بدلتے کہ وہ بکری بن جائے اور سبزی خور ہو جائے۔ چھوٹے ملک کی پرورش شیر میں ہوئی تھی۔ اس نے انگلش میڈیم اسکول اور کالج میں تعلیم پائی تھی مگر اس سے وہ مہذب اور شریف آدمی نہیں بنا تھا۔ اسے بھی بچپن سے خاندانی مزاج کی رعونت' حاکمانہ اختیار کی قوت اور دولت کی قوتِ خرید کے بے پناہ غرور کا احساس تھا مگر خونی رشتوں کے معاملے میں وہ بھی جذبات سے شکست کھانے والا عام آدمی تھا۔ اس کے لیے بھی اپنی بیوی' اپنے بیٹے' ماں باپ اور بھائی بہن سے دور رہنا اتنی ہی عذاب ناک حد تک اتنی ہی عام آدمی کے لیے ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔

میں نے اسے دو دن بعد دیکھا تو اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ شیو بڑھ جانے سے اور بے خواب آنکھوں کی ویرانی سے وہ بیمار نظر آتا تھا۔ اس نے شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا حالانکہ خواب گاہ سے متصل باتھ روم میں ہر سہولت مہیا تھی۔ مسلسل سوچتے رہنے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہنے سے اس کے اعصاب بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے تیم دیوانگی کی کیفیت میں مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے ایک بھرپور مکا منہ پر رسید کیا تو وہ پلٹ کر بیڈ پر جا گرا۔ رئیس نے میرے پیچھے رُک کر ریوالور نکال لیا تھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

چھوٹے ملک نے اپنے ہونٹ کے کنارے سے رِستے والا خون صاف کیا اور مجھے خونی نظروں سے گھورتا رہا "چلاؤ گولی' مارڈالو مجھے۔ ختم کرو یہ کھیل۔"

میں نے کہا "بعض اوقات موت بھی مانگنے سے نہیں ملتی۔"

"آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ۔ ابھی تک کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" اس نے اپنا سر تھام لیا۔

میں نے کہا "ابھی تو صرف دو ہی دن گزرے ہیں ملک زادے اور تمہارے ساتھ سلوک بھی مہمانوں جیسا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں سوچو جن کو تمہارے آباؤاجداد کے زمانے سے آج تک تمہارے خاندان کی روایات کے مطابق نجی جیلوں میں رکھا گیا۔ سزا انھا کے اپنا حق مانگنے یا کلمۂ حق کہنے کی گستاخی پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کوڑے مار کے یا ان پر شکاری کتے چھوڑ کے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں یہ مان لوں؟ بچھو کا بیٹا کہے کہ میں نے کسی کو ڈنک نہیں مارا اور میرا تو ڈنک بھی زہرت خالی ہے۔ تم یہ بات مان سکتے ہو؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارے کارناموں سے ہم واقف نہیں مگر جو تمہارے باپ نے کیا اور تایا نے کیا' وہ تم بھی ضرور جانتے ہو گے۔ تم دو دن میں گھبرا گئے۔ ان عورتوں کے بارے میں سوچا تم نے جن کو تمہاری حویلیوں میں سب کے سامنے بے آبرو کیا گیا۔ ان کے شوہروں' باپوں اور بھائیوں کے کسی جرم کی پاداش میں۔ جانوروں سے بدتر درندہ صفت غلاموں نے ان کی اجتماعی عصمت دری کا عذاب دے کر انہیں مار ڈالا۔"

وہ سر جھٹک کے بولا "مجھے میرا جرم بتا دو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔"

میں نے کہا "تم اپنے باپ کے جرم کی سزا کاٹ رہے ہو اور اس لیے ابھی تک تم سے کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اب تمہارے باپ نے مجبور ہو کے اپنی شکست کی ذلت تسلیم کر لی ہے۔ وہ ہم سے ہماری شرائط پر سودا کرنے کے لیے راضی ہو گیا ہے۔ تم انتظار کرو' اور دعا کرو کہ تمہارا باپ اپنی چالاکی یا طاقت سے تمہاری زندگی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہ کرے۔"

رئیس نے کہا "اگر اس نے ایک باپ کی طرح بات کی تو تم جلد اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟"

"اس کا موقع تمہیں ضرور ملے گا' کب۔۔۔ یہ ہم فی الحال نہیں بتا سکتے۔"

"میں انہیں قائل کر سکتا ہوں۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا "برخوردار۔ تم جس باپ کے بیٹے ہو' اسے قائل نہیں صرف مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن جب تم واپس جاؤ تو یہ بات اسے ضرور سمجھانا کہ وقت بدل گیا ہے۔ وقت سب کا ایک جیسا نہیں رہتا اور وہ اپنی پہلی شکست کو آخری نہ سمجھے تو اچھا ہے۔"

"میری اپنی بیوی سے اور ماں سے بات کرا دو' پلیز!"

میں نے کہا "ہم بات ضرور کرا دیتے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ تمہارے خود کو بہت ہوشیار اور اپنے آپ کو بااثر سمجھنے والے باپ نے ہمارے لیے کوئی جال نہ پھیلا رکھا ہو۔ اگر اس نے فون کو آبزرویشن پر لگا رکھا ہو گا تو اس کا نقصان تمہیں ہو گا۔ ہاں' ہم پیغام دے سکتے ہیں انہیں تمہارا۔"

"دو دن میں تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہوا' ملک صاحب سے؟"

میں نے کہا "رابطہ صرف ہم کر سکتے ہیں۔ جہاں تم ہو یہاں اس کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بہتر ہے کہ تم نوشتۂ تقدیر پر بھروسا کرتے ہوئے آرام سے رہو۔ جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔"

ہم دروازے کو پھر تالا لگا رہے تھے کہ اوپر سے تیم مارخان دوڑتا ہوا آیا۔ "صاحب جی' آپ فوراً تشریف لائیں۔ ٹیلی فون پر گفتگو فرمائیں۔"

میں نے کہا "کس کا فون ہے؟"

اس نے بدحواسی میں کہا "وہ فرماتی کہ ام آزاد بکرا

ہوتی۔"

رئیس نے کہا "ابوبکر آزاد کو پتا چلا کہ تو نے ان کا نام آزاد بکرا کر دیا ہے تو وہ تیری مونچھیں اتار کے اپنی دُگ بنوالیں گے۔"

میں نے اوپر جاتے ہوئے کہا "جیسے سزا کے طور پر کھال کے جوتے بنوائے جاتے تھے۔"

تیم مارخان کی حالت غیر ہو گئی "صاب' آپ بہت معافی عنایت فرماتی۔ ام خرکا بچہ غلطی کرتی۔"

آزاد صاحب عام دنوں میں اس وقت اتنے مصروف ہوتے تھے کہ خود کو بھی بھولے ہوتے تھے مگر خلاف توقع انہوں نے کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر کہا "وہ کیا ہے برخوردار کہ اپنے وہ تمہارے لیے چشم براہ ہیں گویا۔"

میں نے کہا "کون۔۔۔ ملک رب نواز۔"

"خوب سمجھے ماشاءاللہ سے۔ ہم بقلم خود اس نام سے اپنی زبان خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دن تو ہمارے لیے رات ہوتا ہے گویا۔ شام سے اس ملعون و مردود نے اس آلۂ گفت و شنید پر ہم سے تین بار کوشش کی کچھ عرض کرنے کی مگر ہم نے عمداً گریز کیا گویا۔ ایک بار کہہ دیا کہ عدد ہی غلط ہے گویا۔ رانگ نمبر۔ دوسری بار یہ ظاہر کیا کہ ہم خدانخواستہ وہ ہو گئے۔ بہرے۔"

میں نے کہا "اب وہ خود آ گیا ہے؟"

"ہاں اور بے حد خواہاں ہے گویا تم سے بالمشافہ مذاکرات کا۔"

میں نے کہا "کیا وہ اکیلا آیا ہے؟ آپ کو یقین ہے؟"

"بھئی یہ ہم کیا عرض کریں کہ ہم رکاب صرف کراماً کاتبین ہیں یا وہ اپنے منکر نکیر بھی کہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہیں مگر نہیں ہیں۔"

میں نے عاجز آ کے کہا "دیکھیے۔ میں اس سے ملنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ آپ کو کیا پتا نیچے اس کے بدمعاشوں کی فوج کھڑی ہے یا نہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ شبنم کہاں ہے۔"

"بھئی سوال نمبر ایک تو گویا یہی تھا مگر اس نے شرط عائد کر دی کہ پہلے میں اس شخص سے ملوں گا۔ تم سے گویا۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کہاں ہے اور آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"کہاں سے کیا مطلب ہے برخوردار' ہم بقلم خود اپنے منہ سے بول رہے ہیں اور وہ بیٹھا ہے انتظار گاہ میں۔" ابوبکر آزاد نے کہا۔

میں نے کہا "اچھا' اسے کہئے میں فون پر بات کروں گا۔ آپ کے فون پر میرے لیے کوئی رسک نہیں۔"

چند منٹ بعد میں نے ملک رب نواز کی آواز سنی "ہیلو!"

میں نے کہا "کیا حال ہے ملک تمہارا اور تمہارے بیٹے کے لواحقین کا؟"

وہ بولا "دیکھو۔ تم اس معاملے کو بلاوجہ طول دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "آج تم بے بس ہو تو تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ ورنہ تم کسی کو عذاب دیتے وقت گھڑی یا کلینڈر دیکھتے ہی نہیں ہو گے۔"

"میں چاہتا ہوں۔۔۔ یہ معاملہ ختم ہو جائے" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ شبنم کہاں ہے' میری بات کرا دو اس سے۔"

وہ بولا "پھر تم میرے بیٹے سے میری بات کرا دو گے؟"

"وہ میں ابھی کرا سکتا ہوں۔ لیکن۔۔۔"

وہ بے قراری سے چلایا "پلیز۔۔۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ صرف تم جیسے ذلیل آدمی کے لیے بھی خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فراخ دلی اور نیک نیتی کا ثبوت دے رہا ہوں۔"

میں نے رئیس سے کہا کہ وہ نیچے والے فون کی ایکس ٹینشن لائن چھوٹے ملک کو دے دے۔ تقریباً ایک منٹ کے بعد اس کی آواز آئی "ہیلو!"

جواب میں جو آواز میں نے سنی وہ کسی ملک یا ایم پی اے یا فرعونیت کا زعم رکھنے والے جاگیردار' سرمایہ دار' صنعت کار کی نہیں' صرف ایک پریشان حال اور دکھی باپ کی تھی۔ "پُتر۔ تو ٹھیک ہے۔"

پتر نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں ابا جی!"

"تو یہ بات زبردستی تو نہیں کہہ رہا ہے؟ ڈر سے۔۔۔"

"نہیں ابا جی۔ مجھے بالکل آرام سے رکھا گیا ہے مہمانوں کی طرح" وہ بولا۔

"کہاں ہے تو' مجھے بتا۔"

میں نے بیچ میں کہا "وہ تمہیں پتا نہیں سمجھا سکتا ملک رب نواز۔ اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟"

چھوٹے ملک نے کہا "آپ گھر میں سب کو تسلی دینا۔"

"ہاں' ہاں۔ یہاں اور کون ہے؟ جہاں تو ہے؟"

چھوٹے ملک نے چڑ کے کہا "ابا جی' تفتیش مت کرو۔ جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہہ رہا ہوں وہ سن لو۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں لیکن آپ نے ان لوگوں کی بات نہ مانی تو پچھتائیں گے۔ آپ ویسا ہی کرو جیسا یہ لوگ کہتے ہیں۔"

"ہاں پتر۔ تو فکر مت کر' انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابا جی' خود بخود سب ٹھیک نہیں ہو گا۔ دو دن سے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ہم سب آپ کی غلطی کی سزا پا رہے ہیں" وہ غصے میں بولا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں دو دن سے کوشش کر رہا تھا ـــ اب بڑی مشکل سے رابطہ ہوا ہے۔"

"اب آپ میری بات سن لیں۔ آپ ان لوگوں کے ساتھ اپنا معاملہ طے کریں ورنہ نقصان مجھے ہو گا۔ میری ماں روئے گی سر پر ہاتھ رکھ کے اور میری بیوی۔"

"تو ناراض مت ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہو گا پتر!"

"اگر آپ نے پولیس کو بیچ میں ڈالا یا کوئی چالبازی کی تو معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہو گا۔ ایک بار اعتبار گنوا دیا آپ نے تو۔"

میں نے پھر درمیان میں کہا "ابھی تک کچھ نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے ملک رب نواز کہ جوان بیٹے کو دفنا کے تم ساری عمر روتے رہو۔ ایک ماں کی بددعا لگ جائے تمہیں یا اس سماگن کی۔"

وہ چلایا "ایسا مت کہو۔ تم جو کہو گے میں کروں گا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ اپنے بیٹے کو بتاؤ کہ تمہارا جرم کیا تھا؟"

ملک رب نواز خاموش رہا تو اس کے بیٹے نے کہا "بتا دیں ابا جی۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گی۔"

"دیکھ پتر۔ تو ان معاملات کو نہیں سمجھتا۔"

"میں سب سمجھتا ہوں ابا جی۔ بچہ نہیں ہوں اب میں" چھوٹے ملک نے برہمی سے کہا۔

"تجھے کیا معلوم یہ فون پر ہونے والی سب گفتگو ریکارڈ کر رہے ہوں۔" رب نواز اسے سمجھانے لگا "انہیں تو پتا ہے کہ میں ایک اخبار کے دفتر سے بات کر رہا ہوں لیکن یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے بات کر رہے ہیں' میں نہیں جانتا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا پتر۔ جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے گھر سے وہ کوئی شریف لوگ نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے ملک صاحب۔ آپ شبنم کی بات کرا دیں آزاد صاحب سے۔ وہ مجھے بتا دیں گے۔"

چھوٹے ملک نے کہا "ابا جی۔ آپ شبنم کو ان کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟"

ملک نے چالاکی سے کہا "میں پھر بات کروں گا" اور فون بند کر دیا۔

میں نے نیچے جا کے چھوٹے ملک کو دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں کم پریشان تھا۔ "یہ شبنم کون ہے؟"

میں نے کہا "بہتر ہوتا اگر تم یہ سوال اپنے باپ سے کرتے۔ جس نے اسے اغوا کر کے سمجھا تھا کہ یہ بڑی بہادری ہے اور عقلمندی ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"تم اپنے باپ کے لہجے میں بول رہے ہو۔ صرف اس لیے کہ تم بول سکتے ہو۔ اس قابل ہو کہ بول سکو" رئیس بگڑ کے بولا "اگر تمہارا واسطہ پڑتا پیشہ ور مجرموں سے یا اس کے جیسے دشمنوں سے ـــ تو بولتی بند ہو جاتی تمہاری۔"

"یہ وہی مشہور صحافی تو نہیں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "واہ چھوٹے ملک صاحب! اچھے جا رہے ہو تم بھی۔ کیا اداکاری ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو۔"

"تمہیں کیوں شک ہے کہ اسے ملک رب نواز نے اغوا کیا تھا؟"

"شک نہیں' یقین تھا ہمیں اور اس کا ثبوت خود ملک صاحب نے فراہم کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں شبنم کا فون آئے گا کہیں سے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو بیچ میں ڈالنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ تمہارا باپ اپنی بدمعاشی نہ دکھائے۔ اگر اس نے کچھ نہیں کیا تھا تو وہ کیوں گیا وہاں؟"

"فرض کرو ایسا ہی ہے مگر میرا باپ بھی بے وقوف تو نہیں ہے کہ ایک صحافی کو اٹھوائے۔ اس کی سیاسی اور کاروباری ساکھ بہت اچھی ہے۔"

میں نے کہا "اس رپورٹر کی وجہ سے یہ ساکھ خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس نے تمہارے باپ کے بہت سے راز جان لیے تھے۔ اس کے غیر قانونی کاروبار کا پتا چلا لیا تھا شبنم نے۔"

رئیس بولا "اور وہ اسے خریدنے میں ناکام ہو گیا تھا۔"

چھوٹے ملک کے لبوں پر ایک پُرتمسخر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "شاید اپنی قیمت بہت زیادہ لگائی ہو گی اس نے۔ ایک رپورٹر کی کیا حیثیت ہے؟"

"اس کا تجربہ ہو گیا تمہیں بھی اور تمہارے باپ کو بھی۔ کہ کچھ لوگ کسی قیمت پر خریدے نہیں جا سکتے۔"

"یہ بات نہیں۔ ایک تجربہ رکھنے والا بزنس مین دس ہزار کی چیز دس لاکھ میں تو نہیں خرید سکتا" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور اگر وہ بدمعاش ہو تو سودا ہی نہیں کرتا۔ دس ہزار میں اس کی زندگی کا سودا کسی پیشہ ور قاتل سے کر لیتا ہے۔ آدمی کی جان کی کوئی قیمت نہیں رہی مگر کبھی کبھی پانسا الٹا پڑ جاتا ہے۔"

رئیس نے کہا "جیسا کہ ملک رب نواز کے ساتھ ہوا۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بولنے لگی۔ میں نے مسکرا کے چھوٹے ملک کو دیکھا "میں اٹھائے بغیر بتا سکتا ہوں کہ فون کس کا ہو گا؟"

رئیس نے ریسیور اٹھا لیا "ہیلو ـــ جی!"

میں نے کہا "آزاد صاحب کا فون ہے یا شبنم کا؟"

"آزاد صاحب کا" رئیس بولا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

آزاد صاحب نے کہا "بھئی اپنے ناصر میاں' ہم قائل ہو گئے گویا اس محاورے کی افادیت کے۔ کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ملک رب نواز ابھی ابھی اتر کر نیچے گیا ہی ہو گا کہ فون آ گیا اس کا ـــ شبنم نے بقلم خود گفتگو فرمائی ہم سے۔"

میں نے چلا کے کہا "شبنم سے بات ہو گئی آپ کی' وہ ٹھیک تو ہے؟"

"فرمایا تو یہی ہے اس نے لیکن خیریت کے مفہوم بھی جدا ہوتے ہیں برخوردار۔ ہم دیکھ تو نہیں سکتے تھے اسے لیکن جو کچھ اس کی آواز کے لہجے سے اخذ کیا جا سکتا تھا' اس سے خیریت ہی لگتی تھی گویا۔ ہم نے اس کے اغوا کنندگان پر واضح کر دیا تھا گویا کہ اب تو خیر معاملات طے کر لیے ہیں تم نے اور ہماری حیثیت بھی ریفری کی ہو گئی ہے گویا اس لیے تم لوٹ کے گھر جا رہے ہو اپنے پیروں پر ورنہ ہم بقلم خود تمہیں گولی وغیرہ ضرور مار دیتے اور پھر پھانسی بھی مرحمت فرماتے گویا۔"

"یہ اچھا کیا آپ نے۔"

"ہم تو گویا برا کر ہی نہیں سکتے اگر چاہیں تب بھی لیکن تمہاری حرکات و سکنات پر سخت تشویش اور اعتراض وغیرہ ہے ہمیں اور کسی دن سخت عالم غیظ و غضب میں ہم بالکل سیدھا کر دیں گے تم دونوں کو جلیبی کی طرح گویا۔ ہم تو کتے کی دُم سیدھی کر دیں مگر بس خیال آ جاتا ہے کہ پھر محاورہ غلط ہو جائے گا۔"

"دیکھیے' ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"بس چپ۔ خاموش" انہوں نے ڈانٹ کے کہا "ایک لفظ کا بھی اخراج ہوا تمہارے نامعقول دہن سے گویا ـــ تو ہم تمہاری کھال میں وہ بھروں گے جو تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ وہ جو موشی فوش فرماتے ہیں۔"

"بھوسا!" میں نے کہا۔

"ہاں وہی۔ یہ جو حرکت قبیحہ فرمائی ہے آپ نے کہ نادر شاہ کی طرح اس کے گھر پر حملہ کر کے اس کے کوہ نور ہیرے جیسے بیٹے کو لے گئے گویا۔"

میں نے کہا "آپ اسے کوہ نور ہیرا کہہ رہے ہیں؟"

"ہوتا ہے برخوردار۔ کوئلہ بھی ہو تو ہیرا ہوتا ہے گویا باپ کے لیے ـــ یہ مجرمانہ سرگرمی سخت قابل مذمت و سرزنش وغیرہ ہے گویا۔"

میں نے کہا "آپ نے اسے کچھ نہیں کہا؟"

"کیوں نہیں کہا۔ ہم کہتے ہی رہے اور ہم نے تو اس کے ایک چھڑی بھی رسید فرمائی کہ تمہاری لمبی زبان کا مقابلہ ہم ایسے کر سکتے ہیں گویا' ہماری بیٹی ہے شبنم اور ہم ثالث نہ ہوتے اور ہمیں اس کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو ہم تمہیں نشان عبرت وغیرہ بنا دیتے گویا۔ خیر' آئندہ ذرا احتیاط پھر بھی شبنم کو شکایت ہوئی تو ہم بقلم خود تمہیں ہاتھی کے پیاؤں سے باندھ دیں گے ـــ پارہ ہے گویا ـــ یہ کیا' جواہر لال نہرو کی ناجائز اولاد ـــ یہ وزیر محنت پر اضافی نقطے ـــ ایک ساتھ دو اضافی نقطے۔ وزیر محنت ـــ اف! علی الصباح ہم سب محنت کر دیے جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے' مگر تیری منکوحہ ہے ایک عدد ـــ" میں سمجھ گیا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے آزاد صاحب پروف بھی دیکھتے جا رہے تھے کیونکہ یہ وقت اخبار کی کاپی جانے کا تھا۔

اب جو آزاد صاحب نے ادھر ڈانٹ ڈپٹ شروع کی تو بالکل ہی بھول گئے کہ ان کے ہاتھ میں ریسیور ہے اور دوسری طرف میں گوش بر آواز ہوں۔ بالآخر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کے کاتب لال دین جواہر رقم نے' جسے وہ غصے میں جواہر لال نہرو کی اولاد کہتے تھے' بڑی دلچسپ غلطی کی تھی۔ وزیر محنت کو وزیر مخنث بنا دیا تھا۔

وقتی طور پر میرے دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ شبنم یہ نہیں بتا پائی تھی کہ وہ سو فیصد خیریت سے ہے اور اسے اغوا کر کے قید رکھنے والے اس سے کیا پوچھنا چاہتے تھے اور یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تفتیش کے مروجہ طریقے آزمائے تھے یا نہیں۔ ظاہر ہے اسے بھی کڑے پہرے میں ایک بیان جاری کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ خود آزاد صاحب نے خیریت کے سوال کا جواب گول مول الفاظ میں دیا تھا۔ اس سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ شبنم کے ساتھ اسیری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ زندہ تھی اور اس کی واپسی یقینی ہوگئی تھی' فی الحال میں اسی پر خدا کا شکر ادا کرسکتا تھا۔

ہم نے شبنم کی ضمانت پر چھوٹے ملک کو کمرے میں لاک کیا پھر اوپر آکے یہ خانے کو مقفل کیا تو رات کا ایک بجا تھا۔ سونی ایک صوفے پر بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ اس نے خود بتایا تھا کہ نیند کے معاملے میں اس کا خود پر اختیار نہیں چلتا۔ رئیس نے اس کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ رحمتی اور فرید اداس صورت بنائے چپ بیٹھے تھے۔ ہم نے انہیں بھی سونے کے لیے بھیج دیا۔

ذہنی اور جسمانی تھکن سے میرا بھی حال خراب تھا مگر شبنم کی طرف سے ایک امید افزا اطلاع پانے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ یہی حال رئیس کا تھا۔ شبنم کے ساتھ اب اسے سونی کی طرف سے تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے کچن کی طرف چلے گئے جہاں اب سونی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد تیس مار خان اکیلے ہی سوتے تھے۔ کافی بنانے کے لیے میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

رئیس وہیں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا "یار۔ یہ ملک رب نواز بہت حرامی ہے۔"

"دریں چہ شک۔ یہ ایک آفاقی سچائی ہے۔ جیسے یہ کہ دنیا گول ہے۔"

"اس نے صرف سونی کو پہچانا تھا۔"

"ہاں۔ دوبارہ دیکھے گا تو مجھے بھی پہچان لے گا۔"

رئیس بولا "ابھی تو وہ مجبور ہوگیا تھا لیکن آئندہ وہ زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"بس پیارے۔ یہ تو اب وہی بات ہے کہ اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ ہم خطرناک کا مقابلہ خطرناکی سے کریں گے۔ بدمعاشی کا بدمعاشی سے۔ ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ اگر ہم نے شرافت دکھائی تو اسے کمزوری سمجھا جائے گا اور دنیا میں کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ سوائے جیل یا قبرستان کے۔"

"کیا ہم اس سے مصالحت کے امکانات پر غور نہیں کرسکتے؟"

"مصالحت؟ تو پاگل ہوگیا ہے یا بزدل۔ ابے اس کے ساتھ ہماری کون سی ذاتی دشمنی ہے۔ شبنم کے معاملے میں ہوگئی تھی اور سونی کی ضرور ہے لیکن باقی معاملات میں ہم اس سے ڈر کے صلح کرتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ اپنی غیرت کا سودا کرلیں۔ کوئی آپ کی بیوی کو اٹھا لے جائے تو آپ سوچنے لگیں کہ اگلی مرتبہ یہ بیٹی یا بہن کو لے جائے گا۔ بہتر ہے بیوی واپس لو اور اس بات کو بھول جاؤ۔ وہ ایک قومی مجرم بھی ہے۔ اس کے ساتھ مصالحت کیسی۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ بزنس پارٹنر بن جائیں۔ پیسہ کمائیں خوب اور عیش کریں۔"

رئیس شرمندہ ہوگیا "یار' تو گرم ہوگیا ایسے ہی۔ میں اپنی جان کی فکر نہیں کرتا۔"

"تو کسی کی جان کی فکر مت کر۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے اور کسی ملک رب نواز کا اس پر کوئی اختیار نہیں۔ تو ڈر گیا ہے تو چلا جا سونی کے ساتھ شادی کرکے۔"

"یار' ایسی بات کرے گا تو قسم اللہ کی لڑائی ہوجائے گی۔ ابے تیری جان سے پہلے رئیس کی جان جائے گی۔ اپن یاری میں بھی ایک چیز قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔"

میں نے کافی کا مگ اسے دیا "اسی لیے مجھے حیرانی ہے کہ تو نے ایسا سوچا۔ ذرا شبنم کو آئینے دے پھر پتا چلے گا کہ ملک کیا چاہتا ہے۔ اتنا تو ہمیں پتا چل گیا ہے کہ کچھ تو اس کے اپنے طبقے کی اور خاندان کی وہ روایات ہیں جن پر انسانیت کو شرم آئے مگر انہیں ہم بدل نہیں سکتے۔ اس کی زمینداری' سیاست اور دولت مندی اسے مبارک۔ اگر وہ شیطان ہے تو یہاں اس سے بڑے ہزاروں شیطان ہیں جو اس ملک کی تباہی کے ذمے دار تھے اور ہیں۔ وہ منشیات کا دھندا کرتا ہے اور بہت لوگ کررہے ہیں۔ ان کے خلاف کرنے کے لیے پولیس سے اینٹی نارکوٹکس ایجنسی تک بہت سے ادارے قانونی جنگ میں مصروف ہیں۔ کم از کم دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی مافیا کا مسئلہ ہے جس میں الجھنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔"

"پھر تو ایک ہی معاملہ رہ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ جو ملک کے تاریخی ورثے آرٹ اور کلچر کے دفینے اور آثار قدیمہ کی چوری اور اسمگلنگ ہے۔ یہ بہت سنگین مسئلہ ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ اخباروں میں مسلسل خبریں چھپ رہی ہیں۔ پریس شور مچا رہا ہے لیکن لگتا ہے حکومت اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی۔"

"حکومت!" رئیس تنک سے بولا "کس حکومت کی بات کرتا ہے تو یار' یہ کوئی اس ملک کے بارہ چودہ کروڑ لوگوں کی حکومت ہے۔ یہ تو خواص کی حکومت ہے۔ مجھے خاص طریقے سے لایا جاتا ہے۔ اسے نام انتخاب کا دیا جاتا ہے مگر منتخب کرنے والے ووٹر نہیں ہوتے۔ وہ تو بے وقوف بنائے جاتے ہیں۔ انتخاب کرتے ہیں بیرونی آقا۔"

میں نے کہا "المیہ یہ ہے دوست کہ ہم جب شیخی مارتے ہیں تو سیکڑوں سال پہلے کے عہد زریں کی بات کرتے ہیں۔ جب دنیا پر مسلمان حاکم تھے اور اسلامی تہذیب و ثقافت علوم و فنون نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر رکھا تھا۔ ہم اسلامی تعلیمات کے ان اصولوں کی بات کرتے ہیں جن کو ہم بھلا چکے۔ خلفائے راشدین کے عدل کی صرف مثالیں دیتے ہیں۔ تمغل اور حکومت کی شان و شوکت پر فخر کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ہماری یہ حالت کیسے ہوئی۔ اس طرف سے نظریں چرا جاتے ہیں۔ ہم تاریخ کے آئینے میں اپنے زوال اور اپنی آج کی ذلت کے اسباب نہیں دیکھتے۔ صرف شاندار ماضی پر فخر کرتے رہنے سے نہ حال میں تبدیلی آتی ہے اور نہ مستقبل میں بہتری۔"

"آخر کب تک چلے گا یہ سلسلہ یار!"

"ایک بہت بڑے حقیقی انقلاب تک۔ جو پُرامن نہیں ہوگا۔ صرف حاکموں کی تبدیلی سے نہیں آئے گا۔"

"کب آئے گا وہ انقلاب۔" رئیس جیسے خوابوں میں کھو گیا۔

"صبح آٹھ بج کر چوالیس منٹ پر" میں نے گھڑی دیکھ کے بتایا "ابے یہ دنیا امید پر قائم ہے۔ ہم سب اچھے وقت کی آس پر جیتے ہیں اور اچھے وقت کے لیے صرف دعا نہیں کرتے' جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ اچھا وقت کوئی تہوار نہیں۔ اس وقت سے جب آدمی جنگل میں جانوروں کی طرح رہتا تھا' آج کی خوبصورت' مہذب اور مسلسل ترقی کرتی ہوئی دنیا تک وقت بہتر اور بہتر سے بہترین کی جانب ارتقا کا سفر ہے جو جاری ہے۔"

وہ سر کھجانے لگا "تیری باتوں سے تو مجھے نیند آنے لگی ہے۔ جیسے بچپن میں تاریخ' جغرافیہ پڑھتے ہوئے آنے لگتی ہے۔"

رئیس سو گیا مگر میں کچھ دیر جاگتا رہا اور شبنم کے تصور سے باتیں کرتا رہا پھر کسی وقت نیند نے مجھے بھی خوابوں کی دنیا میں بلا لیا۔ میں ایک خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ اب رئیس نے مجھے بیدار کیا اور میں نے آنکھ کھولتے ہی کلائی کی گھڑی میں دیکھا تو صبح کے دس بجنے والے تھے۔

ہم سب نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ فرید کو رئیس نے اور سونی نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب ہم سب کے لیے انتظار زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔ سب کی نظریں ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھیں۔ سب کے ذہن میں ایک سے سوالات گردش کررہے تھے۔ اب کس کا فون آئے گا؟ آزاد صاحب کا یہ بتانے کے

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکٹی بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
تحریر جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۲۰ روپے

برادِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے شبنم لوٹ آئی ہے۔ یا یہ کہ ملک رب نواز نے اسے پہنچانے کا بندوبست کرلیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ پہلے میرے بیٹے کو پہنچاؤ۔ شاید یہی سب سے مشکل مسئلہ ہوگا۔ قیدیوں کا تبادلہ کیسے ہو اور کہاں ہو۔ ضامن کون ہوگا کہ کوئی کسی کے ساتھ چال نہیں چل رہا ہے۔ کسی کی نیت میں فتور نہیں ہے۔ شاید اس کام کے لیے سب سے موزوں شخصیت آزاد صاحب کی تھی۔ وہ کچھ ایسا انتظام کرسکتے تھے کہ سامنے آنے پر ہمارے اور رب نواز کے درمیان ہونے والے معاہدے پر عمل ہوجائے۔

لیکن اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ملک رب نواز ان کو بھی اعتبار کے قابل نہ سمجھے۔ وہ بہرحال شبنم کے باپ کی جگہ تھے اور قدرتی طور پر اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ ملک رب نواز جیسے لوگوں سے اصولی اختلاف کی بنا پر رعایت کے قائل نہیں ہوسکتے تھے۔ ملک رب نواز ایک بار تو اچانک ان کے پاس پہنچ گیا تھا مگر دوسری بار جانے سے پہلے سوچے گا کہ کہیں آزاد صاحب نے اس کے لیے قانون کو جال پھیلانے پر مجبور نہ کردیا ہو۔

میں شبنم کی ذہنی کیفیت کا تصور کرتا تھا تو میرے دل میں ٹیس سی اٹھتی تھی۔ وہ ایک بار شدید ذہنی صدمے کے باعث نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوچکی تھی۔ وہ بہت ہمت والی اور نڈر لڑکی تھی مگر وہ ایک عورت تھی اور اگر درندے اس کی عزت نفس کو وحشیانہ انداز میں تار تار کردیں تو جسم سے زیادہ روح کا آزار اسے پھر اسی کیفیت میں لے جاسکتا تھا۔

میرے دل سے بار بار ایک ہی دعا نکلتی تھی۔ خدا کرے اس کے ساتھ وہ سب نہ ہوا ہو جو میں سوچ سوچ کے ڈر رہا ہوں۔ صرف چاہنے سے کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ میں تصور میں اس کی خراب حالت دیکھتا تھا تو میرا خون گرم ہوکے میری رگوں میں سنسنی پھیلانے لگتا تھا۔ میں عہد کرتا تھا کہ شبنم کی آبرو پر داغ آیا تو میں اسے ملک رب نواز کے لہو سے دھوکر صاف کروں گا۔ وہ جسم داغ رسوائی ہو تب بھی میرے لیے وہی شبنم رہے گی۔

بوجھل خاموشی کا ایک طویل وقفہ فرید نے ختم کیا "یار میں نے بہت سوچا، رخشی سے بھی بات ہوئی میری۔"

میں نے کہا "کس مسئلے پر؟"

"یہی۔ ہمارے یہاں رہنے کا مسئلہ۔ ان حالات میں جب کہ تمہارے اپنے مسائل کم نہیں ہیں۔ ہم ان میں اضافہ کریں۔"

میں نے کہا "تمہارے یہاں رہنے سے ہمارے مسائل میں کیا اضافہ ہوگا ذرا وضاحت فرمایئے۔ یہاں جگہ کم ہے۔ کھانے کو نہیں ہے ہمارے پاس تو کھلانے کے لیے کہاں سے لائیں گے ہم۔"

"یہ بات نہیں۔ ابھی میں نے بھی کچھ طے نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کی نوکری راس نہیں آئی حالانکہ وہ میرا PASSION تھی۔ وکالت میں نہیں چل سکا۔ جس پیشے کو دیکھتا ہوں اس میں چھوٹی بے ایمانی اور ضمیر فروشی نظر آتی ہے مجھے۔ میں کہیں فٹ نہیں ہوسکتا؟" فرید بولا۔

میں نے کہا "ایک کام کے لیے فٹ ہیں آپ اور میں نے وہ کام تم دونوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔"

فرید نے آدھی ادھوری دلچسپی سے کہا "مسئلہ پیسے کا نہیں، رخشی جیسی دولت مند بیوی ہو تو نکھٹو آدمی کو عیش کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے مگر میں نکھٹو نہیں ہوں۔ مجھے کام کرنا ہے کوئی۔ جس میں مجھے پیسہ ملے نہ ملے۔ تسکین اور خوشی ضرور ملے۔ رخشی کہتی ہے بزنس کرو۔"

میں نے کہا "تو نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ اپنی کمے جارہا ہے۔ ایک کام ہے ایسا جو تیرے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔"

"وہ کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "میرے لیے وہ کام نہیں۔ ایک خواب کی تعبیر ہے۔ ایک مشن ہے اور مقصدِ حیات ہے۔"

زیادہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اسے مختصراً اپنے یتیم خانے والے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا جس کا سارا پیپر ورک مکمل ہوچکا تھا اور بس کام شروع کرنے کی دیر تھی۔ آہستہ آہستہ فرید کی دلچسپی بڑھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر اطمینان دینے والی پُرعزم خوشی یوں پھیل رہی ہے جیسے سردیوں کی دھند سے بھری صبحوں میں اجلی دھوپ پھیلتی ہے۔

میری بات ختم ہوئی تو وہ مسکرا رہا تھا۔ رخشی نے اس کی اداسی کو مٹانے والی مایوسی کے جمود کو توڑنے والی اور حوصلے کو بیدار کرنے والی خوش خبری کا اعجاز مسیحائی بڑی مسرت اور طمانیت کے ساتھ دیکھا۔ فرید کی کیفیت اس راہ گم کردہ مسافر کی طرح تھی۔ جس نے منزل کی امید۔ جدوجہد کا یقین اور تائید ایزدی کا ایمان تک کھودیا ہو کہ اچانک اسے نشانِ منزل مل جائے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا تو رخشی نے کہا "فرید۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ میں کروں گا یہ کام بلکہ کسی اور کو نہیں کرنے دوں گا" وہ جوش سے بولا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آج دو باتیں پھر سچ ہوگئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام ہوتا ہے۔"

"اور دوسری۔؟"

"دوسری یہ کہ ہر کام کے لیے ایک آدمی اور ہر آدمی کے لیے ایک کام ہوتا ہے۔ جیسے قائداعظم کے لیے پاکستان کی تخلیق ایک کام تھا۔ تاریخ ایسے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ فلاسفر، سیاست داں، موجد۔ سب کو قدرت نے ایک کام سونپا جو انہوں نے وقت آنے پر ایسے کیا کہ اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔"

"میرا موازنہ ان سے مت کر۔"

"میرا یہ خواب کب سے شرمندۂ تعبیر تھا۔ بس اس کے لیے فرید عباسی کے ملنے کی شرط تھی۔ میں خود بھی یہ کام نہ کرسکا۔"

"شاید یہ بھی انتظام دست غیب ہے کہ میں بھٹکتا دھکے کھاتا بالآخر وہیں پہنچ گیا جہاں میری ضرورت تھی۔ جہاں میں کچھ کرسکتا تھا" وہ بولا۔

"آسان زبان میں کہتے ہیں۔ جتنے دی کھوتی اُتنے آن کھلوتی" رئیس بولا۔

سب ہنسنے لگے اور وقتی طور پر شبنم کی عدم موجودگی اور فرید کی امی کے انتقال کے صدمے سے بوجھل دل کچھ ہلکے ہوگئے۔ میں نے کہا "اب کوئی سمجھے یہ بات کہ میں کیوں تجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ ساتھ سے میری مراد رئیس خانے میں قیام ہی نہیں تھا، یتیم خانے کے لیے مختص زمین پر آفس پہلے سے موجود ہے۔ عملے کا انتخاب بھی کرلیا گیا تھا۔"

"ہم وہیں رہ لیں گے" فرید نے کہا۔

"یہ منصوبہ مکمل ہوجانے کے بعد تمہیں اس کو چلانا بھی ہے۔ سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ پہلے وہاں اپنے رہنے کے لیے کوئی چھوٹا سا گھر بنالو۔ اپنی ضروریات کے مطابق" میں نے کہا۔

رخشی نے کہا "بنالیں گے وہ بھی۔ ہم دونوں کو ایک کمرا بھی کافی ہوگا۔"

فون کی گھنٹی بجی تو رئیس نے ریسیور اٹھایا "کون...؟ کس اسپتال سے؟"

میں نے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب ہوتے محسوس کیا اور رئیس سے ریسیور چھین لیا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت بول رہی تھی "ناصر کون ہے؟"

میں نے کہا "آپ کون ہیں؟"

"دیکھیے، یہاں ایک خاتون داخل ہیں، شبنم نام ہے ان کا۔"

"شبنم!" میں نے چلا کے کہا "اسے کیا ہوا ہے؟"

"یہ میں آپ کو فون پر نہیں بتاسکتی۔"

میں نے کہا "اتنا تو بتادو کہ خدانخواستہ۔"

اس نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے ہمیں دو نمبرز دیے تھے۔ ایک مسز ابوبکر آزاد کا تھا لیکن وہاں کوئی ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔"

میں نے کہا "میں آتا ہوں۔ شبنم کو بتادیں کہ ہم سب ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

میں اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ میں نے یہ اطلاع دینے والی

سیمیں غزل

وہی یہ تھیں

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:-

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:- ۲۴۷۲۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کس وارڈ میں ہے۔ اس کا بیڈ نمبر اور روم نمبر کیا ہے؟

رئیس نے کہا "انکوائری سے اسپتال کے استقبالیہ کا نمبر لے لینا۔ وہیں معلوم ہو جائے گا۔"

فرید نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ون سیون ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ "کیا مصیبت ہے۔ یا بزی ملتا ہے یا کوئی اٹھاتا نہیں۔"

میں نے کہا "کوئی فائدہ نہیں وقت ضائع کرنے میں۔ وہ کون سا سرکاری اسپتال ہے۔ سرکاری اسپتال میں بھی ہم اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔"

رخشی نے میری تائید کی "یہ تو چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال ہے۔"

فرید نے سوچ کے کہا "شبنم وہاں کون لے گیا؟"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے وہاں داخل کرایا اور پھر بھاگ گئے یا پھر شبنم خود ہی پہنچ گئی۔" میں نے کہا۔

"اسپتال نے اس کا کیس کیسے لے لیا؟" فرید نے دوسرا سوال کیا "یہ میڈیکو لیگل کیس ہوگا۔"

میں نے جھلا کے کہا "یار، وہ صحافی ہے اور سب اسپتال والے ایک سے نہیں ہوتے۔ وہاں جا کے سارے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔"

فرید نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سب کا موڈ دیکھ کے خاموش رہا۔ ہم سب بڑی عجلت میں نکلے۔ میری ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے فرید نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ رخشی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سونی میرے ساتھ۔ سونی مجھ سے نہ جانے کیا کیا سوال کر رہی تھی مگر میرا ذہن غیر حاضر تھا۔ میرا تصور شبنم کے ساتھ تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم تشدد کی منہ بولتی تصویر تھا۔ زخم خوردہ، لہو لہو اور بربریت کی داستان سناتا ہوا۔ میرا دل رو رہا تھا اور خون رگوں میں دوڑنے والا تیزاب بن گیا تھا۔ میں خود کو قائل کرنے میں ناکام تھا کہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوگی۔

فرید نے اچانک کہا "یار، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ملک رب نواز نے شبنم کو کیسے چھوڑ دیا۔ انہی تو اس کا بیٹا ہماری قید میں ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے نے خود کہا تھا باپ سے۔ کہ اسے چھوڑ دو۔"

"کیا پتا شبنم قید سے خود نکل بھاگی ہو؟" میں نے کہا۔

گاڑی اسپتال کے گیٹ سے داخل ہونے لگی تو گارڈ نے سیٹی بجا کے اسے روک دیا "ادھر سے صرف ایمبولینس کی گاڑی جا سکتی ہے یا ایمبولینس۔"

میں نیچے اتر گیا۔ سونی میرے ساتھ اتر گئی "ہم چلتے ہیں۔ تو گاڑی کو پارکنگ میں لے جا۔"

گارڈ نے اشارے سے بتایا "ادھر ہے پارکنگ۔ گاڑی بنا میں صاحب، ایمبولینس آ رہی ہے۔"

سامنے بھائی ایک ایمبولینس اسپتال کے گیٹ پر رکی ہوئی تھی کیونکہ گیٹ کے سامنے ریڑھی کھڑی تھی۔ فرید نے فوراً سے آگے بڑھا دیا۔ میں سونی کے ساتھ اندر گیا۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں کے دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے بائیں جانب استقبالیہ کاؤنٹر دیکھا۔ وہاں ایک نرس فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی تین چار لوگ کھڑے تھے۔ دوسری ایک وقت کسی رجسٹر میں اندراج کر رہی تھی اور سامنے کھڑے لوگوں کے سوالات کے جواب بھی دے رہی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھا "دیکھئے، مجھے مس شبنم کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

پھر ایک تیسری نرس میرے پاس سے گزر کے کاؤنٹر کے پیچھے جاتے جاتے رک گئی "مس شبنم۔۔۔ دو جرنلسٹ۔۔۔!"

میں نے بے تابی سے کہا "جی، کہاں ہے وہ؟"

"فرسٹ فلور۔ پرائیویٹ روم نمبر فور۔" اس نے کہا "کم وِد می!"

میں اور سونی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ایک راہداری کے موڑ پر اشارہ کیا "ڈیٹ از روم نمبر فور" اور خود دوسری طرف چلی گئی۔

اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے ہمارے ساتھ کیسے مڑ گئی تھی اور پھر واپس کیوں نہیں گئی تھی۔ میرا دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چار نمبر کمرے کی طرف بڑھا۔ میرا... ساتھ دینے کے لیے سونی کو دوڑنا پڑ رہا تھا۔

پھولی ہوئی سانس کے ساتھ سونی نے کہا "وہ۔۔۔ فرید اور رخشی۔"

میں نے کہا "آ جائیں گے وہ بھی چار نمبر میں۔ کاؤنٹر سے پوچھ لیں گے۔"

میں نے بند دروازے پر انگلی سے دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی "یس!"

میں دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سونی میرے ساتھ ہی تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی عورت شبنم نہیں تھی۔

میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ شاید میں نے جلدی میں کمرے کے باہر لکھا ہوا نمبر نہیں دیکھا تھا۔ بے شک نرس کا اشارہ اسی سمت میں تھا مگر چار نمبر کمرے کا دروازہ ساتھ والا بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تین نمبر یا پانچ نمبر ہوگا۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے کہا "سوری!" مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹتا، ایک ساتھ تین واقعات پیش آ چکے تھے۔

سب سے پہلے تو بستر پر بیمار بن کر لیٹی ہوئی عورت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لبوں پر عجیب سی شرارت آمیز اور بے شرم مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک خریدی ہوئی عورت کی گنہگار مسکراہٹ تھی جسے آنکھ رکھنے والا صرف انداز دیکھ کے پہچان سکتا تھا۔

پھر میرے پیچھے دروازہ ایک دم بند ہوا اور میں نے سونی کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی جو چیخ بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے دروازے کی کنڈی لگائے جانے کی آواز سنی۔

اس کے بعد میری معذرت کے جواب میں کسی نے گالی دینے کے انداز میں کہا "سوری دا پُتر!"

ان واقعات کا دورانیہ ایک ہی تھا۔ ان میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی ہوتا تو خطرے کا احساس دلانے والی جبلت مجھے ہوشیار کر دیتی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ میری چھٹی حس نے میرا ساتھ دیا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ شاید میں سیدھی جست لگا کے اس دھوکے باز کرائے کی عورت کو یرغمال بنا لیتا۔ پلٹنے اور دیکھنے کی میرے پاس مہلت ہی نہیں تھی لیکن سب کچھ ایک ساتھ ہو گیا۔ میری آنکھوں نے اس عورت کو دیکھا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں اور میرے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی میرے سر کے پچھلے حصے پر وار ہوا۔

وار اتنا سخت تھا کہ میں پلٹ کے وار کرنے والے کو بھی نہ دیکھ سکا۔ بس ایک دھماکا سا ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں تارے سے چمک گئے پھر اسی اندھیرے نے مجھے نگل لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے میں ایک بھیانک خواب سے گزر رہا ہوں۔ خواب کا منظر واضح نہیں تھا۔ میرے سر پر ایک بھاری چٹان جیسا وزن تھا جسے اٹھانا میری جسمانی طاقت کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بے چہرہ لوگ تھے جو مجھے لاٹھیاں مار مار کے آگے دھکیل رہے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ بعد جب ہوش کی کیفیت میں بہتری آئی تو خواب نے ایک حقیقت کا روپ دھار لیا۔ درد کی ناقابل برداشت لہریں میرے سر کے اندر سے اٹھ کے میرے جسم میں پھیل رہی تھیں اور جسم ایسے دُکھ رہا تھا جیسے اسے واقعی لاٹھیوں سے کوٹا گیا ہو۔ مجھ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ اپنے ارادے سے میں ہاتھ تو کیا ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

میرے کان جو پہلے آوازوں کا ملا جلا شور سن رہے تھے۔ اب الفاظ کو الگ الگ کر کے ان کا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایک سیاہ فام دُبلے پتلے اور خاصے بدصورت شخص نے مجھ پر جھک کے کہا "اس نے آنکھیں کھولی ہیں۔"

دوسری آواز سرہانے کی طرف سے آئی مگر میں سر گھما کے دیکھنے کے قابل ہی نہ تھا۔ "انجکشن لگا دے فوراً" پھر بات کرنے والا سامنے آ گیا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ جوان اور خوبصورت تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی اور گلے میں اسٹیتھس اسکوپ لٹکا رکھا تھا۔ اس نے مجھے جھک کر دیکھا پھر میری کہنی پر اور گھٹنوں پر کوئی چیز ماری۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے کسی نے میرا بازو پکڑ کے سوئی چبھو دی۔ میں نے بڑی مشکل سے سر گھمایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری انسانی گردن پر ہاتھی کا سر لگا دیا گیا ہے۔ انجکشن لگانے والی ایک عورت تھی جس کی صورت مجھے کچھ آشنا سی لگی۔

میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اب بیدار ہو رہی تھی مگر انہوں نے مجھے پھر سلانے کا انجکشن لگا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں کچھ دیکھوں، سنوں اور سمجھوں۔ کون تھے وہ؟ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے تھے؟

اچانک مجھے سب یاد آ گیا۔ میں اسپتال گیا تھا۔ میرے ساتھ سونی تھی اور فرید تھا، رئیس تھا، نہیں۔۔۔ رخشی تھی۔ ہم وہاں شبنم کو دیکھنے گئے تھے۔ یس۔ ایک نرس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ روم نمبر فور میں ہے۔

لیکن یہ جھوٹ تھا۔ وہاں بیڈ پر شبنم نہیں کوئی اجنبی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی مجھے اسی عورت نے انجکشن لگایا تھا۔ رائٹ، اس عورت کی جگہ اب میں لیٹا ہوا تھا۔ میرے سر پر کوئی چیز ماری گئی تھی۔ لوہے کا پائپ جس پر ربر چڑھا ہوا تھا یا ڈنڈا جس پر کپڑا لپیٹا گیا تھا۔ اس سے میرا سر تو نہیں پھٹا تھا مگر اندر سے مغز الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

اوہ مائی گاڈ۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ سونی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہاں ہے؟ وہ میرے ساتھ ہی پکڑی گئی تھی اور جب میرے ساتھ یہ ہوا تو سونی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ ملک رب نواز نے کتنی ہوشیاری سے جال پھیلایا تھا اور ہم اپنی عاجلانہ بے وقوفی کے باعث اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ہم نے اسپتال سے موصول ہونے والی فون کال پر اعتبار کرلیا تھا۔ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس میں بھی دھوکا ہو سکتا ہے۔

شک کا اظہار صرف فرید نے کیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آخر شبنم کو اسپتال کون لے گیا؟ وہ ایک پولیس مین کے دماغ سے بالکل ٹھیک سوچ رہا تھا۔ ہر اسپتال ایسے کیس نہیں لیتا جس میں کوئی قانونی پیچیدگی پیدا ہونے کا ذرا بھی امکان ہو۔ حادثات اور خودکشی ۔ مار پیٹ تشدد اور اقدام قتل۔ زہر خورانی وغیرہ کے کیس سرکاری اسپتال میں بھی پہلے میڈیکو لیگل سیکشن میں پولیس سرجن کی رپورٹ کے ساتھ درج ہوتے ہیں۔

ہم نے فرید کو خاموش کردیا تھا حالانکہ اس کا اعتراض بالکل درست تھا اور ہماری عقل پر جذبات کا غلبہ تھا۔ فرید نے اس وقت بحث نہیں کی تھی مگر اپنے شکوک کا اظہار کردیا تھا کہ آخر ملک رب نواز نے شبنم کو یکطرفہ طور پر آزاد کرنے کا فیصلہ کیسے کرلیا تھا؟ اس نے اپنے بیٹے کی رہائی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اچھا تم اسے چھوڑ دو' میں شبنم کو چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ ایسی بات کرتا تو ہم اس پر ہرگز اعتبار نہ کرتے۔ نہ وہ اعتبار کے قابل تھا اور نہ کسی پر اعتبار کرتا تھا۔

یہ ناممکن تھا کہ اس نے ڈر کے شبنم کو چھوڑا ہو۔ وہ ابوبکر آزاد صاحب کے دیے جانے والے قول کی ضمانت بھی قبول نہ کرتا۔ وہ اپنی طرف سے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شبنم کو پہلے رہا کردیتا۔ یہ تو سوچا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا تھا لیکن قصور دھوکا دینے والوں کا نہیں تھا۔ وہ تو دشمن تھے۔ قصور ہماری عقل کا تھا کہ ہم جذبات کی رو میں بہہ کر احتیاط بھول گئے۔ ہم نے فرض کرلیا کہ رئیس خانے کے فون نمبر پر آنے والی کوئی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی کیونکہ الف سب کے علاوہ جو یہاں رہتے تھے صرف آزاد صاحب اس نمبر سے واقف تھے یا شاید جیرا بلیڈ جانتا ہوگا۔

فون کرنے والی عورت نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا کہ اسے آزاد صاحب کا فون نمبر نہیں مل رہا تھا چنانچہ اس نے یہاں اطلاع دی تھی۔ ہمارے ذہن نے از خود یہ تسلیم کرلیا کہ اسپتال سے فون کرنے والی اس عورت کو دونوں جگہ کا نمبر خود شبنم ہی بتا سکتی تھی۔

کاش ہم نے اس عورت سے یہ بات پوچھ لی ہوتی۔

اگر اسپتال کا فون نمبر انکوائری سے نہیں مل رہا تھا تو ہم ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کے ہی دیکھ لیتے۔

اب پچھتانا لاحاصل تھا۔ ملک رب نواز نے کسی مداری کی طرح ڈگڈگی بجا کے ہماری توجہ دوسری طرف کردی تھی۔ جسے لوگ جادو یا نظربندی سمجھتے ہیں۔ مداری کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ دیکھنے والوں کی توجہ ایک ہاتھ کی طرف رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ کی صفائی دکھادیتا ہے۔ جس پر کسی کی نظر ہی نہیں ہوتی۔

ملک رب نواز نے یہ چال بڑی ذہانت سے چلی تھی۔ اس نے انسان کے نفس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جال پھیلایا تھا جسے آدمی کی نظر دیکھ ہی نہ سکے۔ اس نے چانس پر ایک سازش کا تانا بانا تیار کیا تھا جسے ہم نہ سمجھ سکے۔

خوش قسمتی ہر بار ایک فریق کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس مرتبہ تقدیر ملک رب نواز پر مہربان ہوگئی تھی۔ اگر ہم اسپتال آنے سے پہلے تصدیق کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو ملک کا سارا کھیل چوپٹ ہوجاتا۔

تاہم ناکامی سے ملک کا کوئی نقصان نہ ہوتا۔ وہ مزید کیا ہارتا۔ اس کے لیے صورت حال جیسی تھی' ویسی ہی رہتی مگر اس نے ایک چال چل کے جو داؤ کھیلا تھا' اس میں بازی یقیناً اس کے ہاتھ رہی۔

اس تمام حوصلہ شکن مایوسی کے خیالات میں صرف ایک خیال تھا جس کا سہارا ناامیدی کے اندھیرے میں روشنی پھیلاتا تھا۔ فرید اور رخشی ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ انہیں گاڑی کو پارکنگ ایریا میں ذرا دور لے جانا پڑا تھا اور یوں وہ ہم سے الگ ہوگئے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے تو ہم سب ایک ساتھ پکڑے جاتے۔

شاید وہ پانچ سات منٹ کے بعد اسپتال میں داخل ہوئے ہوں گے اور ہمیں موجود نہ پاکے انہوں نے فرض کرلیا ہوگا کہ ہم نے شبنم کے بارے میں انکوائری سے معلومات حاصل کرلیں اور اس کے کمرے یا وارڈ میں چلے گئے پھر ایسا ہی انہوں نے بھی کیا ہوگا اور اچانک ان پر انکشاف ہوا ہوگا کہ شبنم نام کی کوئی خاتون جرنلسٹ اس اسپتال میں داخل نہیں ہے۔

فرید کا پولیس مین والا دماغ فوراً الرٹ ہوگیا ہوگا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ کسی پر کچھ ظاہر کیے بغیر وہ کچھ ایسا انتظام کرسکتا ہے کہ ہمارا سراغ

لگالے۔ وہ سمجھ گیا کہ ہم اسپتال میں ہی غائب ہوئے ہیں تو ہمیں یہاں قید میں نہیں رکھا جاسکتا۔ ملک رب نواز کے آدمی کسی نہ کسی طرح ہمیں اسپتال سے باہر لے جائیں گے۔ کیا وہ اس کوشش کو ناکام بنا سکتا ہے؟

آخر وہ کیا کرے گا؟ کیا وہ پولیس کو طلب کرے گا؟ ایمرجنسی پولیس اسکواڈ کو بلائے گا اور باہر جانے والے سارے راستوں پر کھڑا کردے گا۔ پولیس سب آنے جانے والوں پر نظر رکھے گی۔ ہر گاڑی اور ہر ایمبولینس کو دیکھے گی اور پھر ہر پرائیویٹ سیکی پرائیویٹ وارڈ کی تلاشی لے گی یا ہر وارڈ میں جائے گی؟ نہیں' یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید عملی طور پر ناممکن۔ اول تو پولیس اتنی جلدی کوئی کارروائی نہیں کرسکتی پھر اسپتال کی انتظامیہ انہیں کیوں اجازت دے گی؟ اس طرح تو اسپتال بھی بدنام ہوگا۔ مریض پریشان ہوں گے۔ قانونی الجھن پیدا ہوگی۔

پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ فرید اور رخشی کو بھی وہی نرس کسی کمرے میں بھیج دے۔ وہ الگ پکڑے جائیں۔ وہ نرس یقیناً اسپتال میں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے صرف نرس کی یونیفارم پہن لی تھی اور وہ کاؤنٹر کے قریب ہی موجود تھی تاکہ جیسے ہی کوئی شبنم کے بارے میں پوچھے' وہ اسے گمراہ کردے۔ اسپتال میں ہر نرس کا حلیہ ایک ہی ہوتا ہے اور سفید یونیفارم میں آتی جاتی نرسیں بھی ایک دوسرے کی صورت پر غور نہیں کرتیں۔ وہ اپنے کام میں مگن اور خیالوں میں محو ہوتی ہیں۔ انہیں کسی مریض کو دوا دینے کی' کسی کا ٹمپریچر بی پی لینے کی یا کوئی ایمرجنسی کال اٹینڈ کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔ ایسے ہی کوئی بھی ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ پکڑے اور سفید کوٹ پہن کے ڈاکٹر کا حلیہ بنا سکتا ہے اور کسی بھی اسپتال میں آزادانہ آجاسکتا ہے۔ اسپتال کے اسٹاف کو کسی اجنبی چہرے پر شک نہیں ہوتا اور اسپتال میں کسی مجرمانہ سازش کا خیال نہیں آتا۔

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ میں بہت دیر سے سوچ رہا ہوں۔ میرا دماغ پہلے سے زیادہ ایکٹو ہوگیا تھا۔ اگر مجھے نیند کا انجکشن لگایا گیا ہوتا تو پانچ منٹ کے اندر اندر میں سوجاتا۔ اب میں نے غور سے اسپتال کے اس کمرے کو دیکھا۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ وہی کمرا تھا' میں جس دروازے سے داخل ہوا تھا' وہ میرے بائیں ہاتھ پر تھا۔ میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس میں دو بجے تھے۔ یہ دن کے دو نہیں ہوسکتے تھے مگر کمرے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس میں ایک ہی کھڑکی تھی جس پر بھاری سوتی پردہ پڑا ہوا تھا۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے باہر کے اجالے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ شاید ادھر کوئی کوریڈور تھا جس میں ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ ایک ٹیوب لائٹ کمرے میں بھی جل رہی تھی۔

مجھے کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ میں نے بے ہوشی میں کتنا وقت گزارا ہے۔ خود میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ وہ شخص جسے میں نے ڈاکٹر سمجھا تھا' اب کمرے میں نہیں تھا۔ بیڈ کے قریب وہی عورت کرسی پر بیٹھی سہلا رہی تھی۔ اس کی گود میں چھوٹا سا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر پڑا تھا جس سے تار نکل کے بیڈ فون تک جارہا تھا۔

وہ تیس سال یا کچھ کم عمر کی فربہ بدن عورت تھی۔ اس نے انتہائی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔ ریشمی قمیص سکڑ کے تنگ نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ خود ہی سال چھ مہینے میں پہلے سے زیادہ موٹی ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے لمبا گہرا سانس لیا تو قمیص سامنے سے پھٹ جائے گی۔

اس کا ساتھی سوکھا کالا شخص کرسی کے پیچھے کھڑا آہستہ آہستہ عورت کے شانوں کو سہلا رہا تھا۔ اس نے عورت کے بالوں کو چھیڑا پھر جھک کے اس کے کانوں کی لو کو کاٹا۔ اس کے ہاتھ عورت کی گردن سے پھسلتے آگے بڑھے تو وہ بولی۔

"بس۔ اس سے آگے نہیں۔"

مرد خفت سے مسکرایا۔ "ارے خفا کیوں ہوتی ہے۔ اپن صرف ٹائم پاس کررہے ہیں۔"

عورت نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا "مجھے قیمت ادا کرسکتا ہے تو گھر آجانا مگر یہاں نہیں۔"

"آخر ہے نا کنجری۔ پیسے کے سوا کچھ نہیں سوچتی۔"

مرد نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

وہ بھڑک اٹھی "کیوں نہ سوچوں۔ تو کرتا ہے مفت میں کوئی کام۔ اپنے پاس تو بیس پانچ دس سال اور ہیں۔ پھر کوئی پانچ روپے تو کیا پانچ پیسے بھی نہیں دے گا۔ آج میں اپنے ٹائم کی خیرات دیتی رہوں تیرے جیسے مفت خوروں کو۔"

"اچھا اچھا۔ زیادہ لیکچر مت دے" بدصورت مرد نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کے سو کا ایک نوٹ نکالا۔

عورت نے نوٹ اچک لیا اور مسکرائی "دیکھ برا ماننے کی بات نہیں۔ سب اپنا دھندا کرتے ہیں۔ مجھے جس کام کے پیسے ملے تھے۔"

مرد قیمت ادا کرنے کے بعد دراز دستی کا حق دار ہوگیا تھا۔ اس نے عورت کو آگے بولنے نہیں دیا۔ اچانک مرد کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو جاگ رہا ہے۔" وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

عورت نے خود کو سنبھالا "کیوں جاگ رہا ہے؟" وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"انجکشن تو نے دیا تھا۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے" مرد نے خفگی سے کہا۔

"اثر نہیں کیا انجکشن نے تو کیا میرا قصور ہے؟ جعلی انجکشن ہوگا۔"

مرد نے کہا "بکواس نہ کر۔ کہاں ہے وہ خالی انجکشن۔" اس نے نیچے جھک کے پلاسٹک کی ٹوکری میں دیکھا۔

ہوش آنے کے باوجود میں شدید جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔ ایسی نقاہت میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میرے بدن میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ سر کے ساتھ جسم میں اٹھنے والے شدید درد کی لہریں اب تھم گئی تھیں مگر میرا سارا وجود سُن ہوگیا تھا۔ میں اپنی مرضی اور ارادے سے ہاتھ اٹھا کے کلائی کی گھڑی میں تاریخ تک دیکھنے سے قاصر تھا۔

"یہ ۔۔ یہ انجکشن لگایا تھا تو نے؟" مرد ایک دم سیدھا ہوگیا۔

"پتا نہیں ۔۔ لگایا ہوگا" عورت نے سرسری انداز میں کہا۔

"پاگل کی بچی۔ یہ درد کا انجکشن ہے۔ جو ڈاکٹر دے کر گیا تھا۔ مجھے کہا تھا کہ یہ پھینک دینا ہے۔" مرد برہم ہوگیا۔

"مجھے کیا معلوم۔ یہاں سے اٹھا کے تو نے ہی دیا تھا" عورت بھی بگڑ گئی۔

مرد بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں جھانکنے لگا۔ "نرس تو ہے یا میں ہوں۔ روز کرتی ہے یہی کام۔ تو نے نہیں دیکھا۔"

"اپنی غلطی میرے سر کیوں ڈال رہا ہے۔"

مرد کچھ پریشان نظر آنے لگا "بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے زینت۔ وہ دوسرا انجکشن پھینک دیا ہم نے غلطی سے۔"

"ہم نے نہیں۔ صرف تو نے۔"

"اچھا چھوڑ۔ یہ بتا اب کیا کریں' دوسرا انجکشن ملے گا؟"

عورت نفی میں سر ہلانے لگی "اسٹور بند ہے اور بازار والے پہلے ڈاکٹر کا نسخہ مانگیں گے۔"

"میڈیکل اسٹور بھی کہاں کھلے ہوں گے اس وقت۔ مال روڈ پر ایک اسٹور کھلا رہتا ہے رات بھر۔ یا میو اسپتال کے باہر" مرد سوچتے ہوئے بولا۔

"تُو لائی کرلے' شاید زیادہ پیسے لے کر کوئی کیمسٹ نسخہ نہ مانگے۔"

"میں یوں گیا اور یوں آیا" مرد نے چٹکی بجائی "خیر سے اپنے پیارے پاکستان میں سب کھیل پیسے کا ہے۔ میں انجکشن لے کر آتا ہوں۔ تو اس کا خیال رکھنا۔"

عورت نے ہاتھ آگے بڑھایا "پستول دے جا مجھے۔"

مرد نے ایک نظر مجھے اور پھر عورت کو دیکھا "چلانا آتی ہے؟"

"لے۔ سارے لاہور شہر میں گاڑی چلاسکتی ہوں' پستول کیا چیز ہے؟"

"ہے نا بے وقوف عورت کی ذات۔ گاڑی اور پستول کیا ایک چیز ہیں؟"

عورت نے کہا "بعد میں اس نے مجھ پر حملہ کردیا پھر؟"

مرد نے سوچ کے کہا "ویسے تو اس پر پچھلے انجکشن کا اثر ہوگا۔ بندہ ابھی اٹھ کے کھڑا نہیں ہوسکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوجائے تو مجھے مت کہنا۔"

مرد نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد پتلون کی جیب سے ریوالور نکالا "یہ لے پکڑ مگر دیکھ' یہ صرف تیری حفاظت کے لیے ہے۔"

عورت نے سر ہلایا "اس کو چلانا کیا مشکل ہے۔ ایسے پکڑا' ایسے نشانہ لیا اور یہ گھوڑا دبادیا۔"

مرد چلایا "پاگل کی بچی۔ ابھی گولی چل جاتی پھر۔ دھماکا سن کے سارا اسپتال آجائے گا یہاں۔"

"مجھے پتا ہے۔ تو جا۔" عورت کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھ' میری بات دھیان سے سن۔ ابویں گولی مت چلانا۔ بندے پر نظر رکھنا۔ اٹھنے لگے تو پہلے یہ ڈنڈا مارنا سر میں۔ اس کے باوجود خطرہ ہو کہ بندہ بھاگ جائے گا یا حملہ کردے گا تو پھر بے شک گولی ماردینا مگر اس کے بعد خود بھی یہاں مت رکنا۔"

"اوبابا' سب سمجھتی ہوں میں۔ میری فکر مت کر۔"

مرد نے جاتے جاتے کہا "فکر کیسے نہ کروں۔ ساری ذمے داری میری ہے۔ پیچھے کوئی معاملہ الٹا ہوگیا تو میں مارا جاؤں گا۔ تیرا کیا ہے؟"

میں نے اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی آنکھیں پھر بند کرلی تھیں مگر اب انہیں دھوکے میں رکھنا مشکل تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ میں نیند میں نہیں ہوں۔ تاہم وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں تھے۔ وہ میرے سامنے اطمینان سے باتیں کرتے رہے تھے اور ان کی باتوں سے میں نے کچھ نتائج اخذ کیے تھے۔

ایک یہ کہ میں ابھی اسپتال میں ہوں اور شاید سوئی بھی ہوگی۔

دوسرے یہ کہ وہ عورت جس کا نام غیر ارادی طور پر صرف ایک بار مرد کی زبان پر آیا تھا' ایک نرس تھی۔ اسی اسپتال میں ہی کسی اور جگہ مگر وہ نرسنگ کے مقدس پیشے کی آڑ میں جسم فروشی جیسا گھناؤنا کام کرتی تھی۔ ایسا ایک کیس میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ عورت اپنی ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں رکھتی تھی اور عام طور پر سیمی پرائیویٹ یا پرائیویٹ وارڈ میں رہتی تھی۔

تیسرا یہ کہ نہ جانے اب سے مجھے مسلسل انجکشن دے کر سلایا جارہا تھا اور شاید یہی سوئی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ ابھی تک ہمیں اسپتال سے باہر لے جانے کی کوشش میں ناکام تھے۔

اس خیال سے میرے تصور میں امید کی ایک کرن بڑھ کے سورج کا اُجالا بن جاتی تھی۔ شاید فرید عباسی نے اسپتال سے باہر جانے والے راستوں کی ناکابندی کررکھی تھی۔ پورے اسپتال کی تلاشی محض شک کی بنیاد پر لینے میں بہت سے قانونی مسائل کا سامنا ہوگا۔ فرید یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ کسی نے اسپتال سے غلط فون کیا تھا اور اسپتال کے عملے کے کسی لالچی شخص نے مجرموں کا آلۂ کاربن کے مجھے اور سوئی کو غائب کردیا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام اندر کے کسی آدمی کے تعاون کے بغیر ناممکن تھا مگر خود اسپتال کی انتظامیہ ایسے رسوا کن موقف سے کیسے اتفاق کرسکتی تھی۔

اسپتال کے ریکارڈ سے کسی شبنم نامی صحافی خاتون کے زیرِ علاج ہونے کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔ یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسپتال میں شبنم کی بیمار پرسی کے لیے آنے والے ایک مرد اور عورت پُراسرار طور پر غائب ہوگئے تھے۔ وہ اندر تو گئے مگر لوٹ کے واپس نہیں آئے۔ اسپتال والے سختی سے اپنے موقف پر قائم ہوں گے کہ اسپتال میں یہ ناممکن ہے۔ نہ اسٹاف کا کوئی ممبر مجرموں سے ملا ہوا ہے اور نہ اسپتال میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو غیر قانونی طور پر حبسِ بے جا میں رکھا جاسکے۔ انہوں نے پولیس کو تلاشی کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا ہوگا۔ پولیس بھی اسپتال میں ایسے نہیں گھس سکتی تھی جیسے غریب غربا کی بستیوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔

میں یہ فرض کرسکتا تھا کہ اب فرید اسپتال کے باہر مستعد تھا اور آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اور سوئی کو غائب کرنے والے کون تھے؟ کسی شک و شبے کے بغیر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ ملک رب نواز کے لوگ تھے جن کو بطورِ خاص اس مشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس خاص کام کے لیے خاص آدمی بہت خاص معاوضے پر حاصل کیے گئے ہوں گے۔ وہ آدھا کام کرچکے تھے۔ اب انہیں دوسرے مرحلے میں مجھے اور سوئی کو ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔

شاید یہ دوسرا مرحلہ فرید کی مستقل مزاجی نے مشکل کردیا تھا۔ وہ باہر محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ اندر والے بھی صبر کے ساتھ مورچا بند تھے۔ اب یہ کھیل گویا AND SEE WAIT والا ہوگیا تھا۔ اندر والے انتظار میں تھے کہ باہر والے بالآخر مایوس ہوکے ناکابندی ختم کرلیں اور باہر فرید منتظر تھا کہ اسپتال کے اندر کوئی کب تک مجھے اور سوئی کو قید میں رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تماشا غیر معینہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

جب بدصورت اور سیاہ فام شخص دروازہ بند کرکے گیا تو زینت نے اندر سے کنڈی لگائی پھر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے احتیاط سے دیکھا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔

مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ اس شخص کے میو اسپتال تک آنے جانے میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا تھا۔ رات کے وقت سڑکیں خالی ہوں گی۔ اگر اس کے پاس اپنی گاڑی ہوئی تو وہ آدھے گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ میں نے سوچا۔ آدھے گھنٹے سے میں کیا فائدہ اٹھاسکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے نیند کا انجکشن لگادیا جائے گا اور میں پھر دنیا و مافیہا سے غافل ہوکے سوجاؤں گا۔

میری جسمانی قوت کا گراف تقریباً صفر پر تھا۔ اگر میں اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کرکے کوئی بہادرانہ کارنامہ سرانجام دینے کی کوشش کرتا تو میرا یہ فعل خودکشی کہلاتا۔ رہائی کے لیے ضروری تھا کہ میں ایک ہی جست میں عورت کو دبوچ لوں۔ اس سے ریوالور چھین کے اسے ناک آؤٹ کروں اور پھر فرار ہوجاؤں۔ ان میں سے ہر مرحلہ میرے لیے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش میں ہی فرش پر ڈھیر ہوجاتا اور اس کے بعد زینت اپنے باس کی ہدایات کے مطابق میرے سر میں کوئی ڈنڈا رسید کرتی۔ جو وہیں کہیں موجود تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بدحواسی میں گولی چلادے۔

میں نے سوچ کے کہا "مجھے پیاس لگی ہے۔"

وہ سر پر ہیڈ فون چڑھاتے چڑھاتے رُک گئی "صبر کر' تھوڑی دیر۔"

میں نے کہا "زینت۔ کیا تم واقعی نرس ہو یہاں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بُری طرح چونکی "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔"

میں نے کہا "یہ جو کالو ولد بھالو ہے۔ جس نے تمہیں سو کے نوٹ میں بک کرلیا ہے۔ اس نے لیا تھا تمہارا نام۔"

"جونی ہے اس حرامی کا نام۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ خبردار جو یہاں نام لے کر بات کی۔" عورت میری توقع سے زیادہ بے وقوف ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "میں ایک لاکھ روپے دے سکتا ہوں تمہیں۔"

وہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتی رہی "ایک لاکھ پتا ہے کتنے ہوتے ہیں؟"

"یہ تم جیسی سو سو روپے کمانے والی عورت کے لیے ایک ہزار راتوں کی کمائی ہے مگر میرے لیے ہاتھ کا میل۔ جتنی دولت کا میں مالک ہوں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خدا نے مجھے مالک بنایا ہے۔ اس کی زکوٰۃ بھی اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ بولو' ایک لاکھ میں سودا کرو گی؟"

وہ میریس ہوگئی "یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"تمہارے لیے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے مگر بعض اوقات اتنا اہم نہیں رہتا" میں نے کہا۔

اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالا "ہاں۔ شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پھر بھی' آج تم اتنے پاگل ہو رہے ہو میرے لیے کہ ایک لاکھ دے رہے ہو۔ چند دن میں تمہارا دل بھر جائے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی تقدیر کو کوسا۔ ایک واجبی حد تک دلکشی رکھنے والی عورت کو اپنے حسن پر کتنا غرور تھا۔ اسے کتنی غلط فہمی تھی کہ کوئی شخص اس کو ایک نظر دیکھتے ہی عقل و ہوش سے بے گانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے حصول کی خواہش میں دیوانہ ہو کے ایک لاکھ لٹا سکتا ہے مگر زیادہ شکایت مجھے عورت کی عقل سے تھی کہ اس نے مجھے اتنا بدذوق سمجھا۔

میں نے کہا "ایک لاکھ میں تمہیں جس کام کے دے سکتا ہوں۔ وہ کچھ اور ہے۔ مجھے تمہارا جسم نہیں چاہیے۔"

وہ کچھ کھسیانی ہوئی "پھر کیا چاہیے؟"

میں نے کہا "تمہاری مدد۔"

"کیسی مدد؟ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "کر سکتی ہو۔ تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا۔ جلدی فیصلہ کرو۔"

وہ اضطرابی کیفیت میں اپنے ناخن کترنے لگی۔ وہ سخت ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ اسے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔ ابھی اسے مدد کی نوعیت کا بھی علم نہیں تھا مگر ایک لاکھ کی آفر نے اسے چکرا دیا تھا۔ وہ انکار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک لاکھ اسے کب ملیں گے اور کیسے۔ میں مذاق کر رہا ہوں' اسے بے وقوف بنا رہا ہوں یا واقعی اسے ایک لاکھ دے سکتا ہوں۔

میں نے ایک لاکھ داؤ پر لگا کے پانسا پھینکا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اتنی بڑی رقم سے میں اس عورت کا جسم تو کیا ایمان بھی خرید سکتا ہوں۔ جسم بہت سستا تھا مگر مجھے اس کے تصور سے گھن آتی تھی۔ اسی طرح جیسے پبلک ٹائلٹ استعمال کرنے کے خیال سے۔

اگر وہ کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کرتی تو میں رقم دگنی کر دیتا مگر ایک لاکھ کے خیال نے ہی اس کی مزاحمت ختم کر دی تھی۔ جو عورت اپنے جسم کی حرمت کو سکہ رائج الوقت کے مقابلے میں اہم نہ سمجھتی ہو اس کے لیے ایفائے عہد اور کسی کے وعدے کا پاس کیا۔ عام آدمی کے مقابلے میں ایک بے رشتہ' بے کردار اور بے مایہ شخص آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔

بالآخر اس نے کہا "کہاں ہیں یہ ایک لاکھ۔ کون دے گا مجھے ایک لاکھ۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے کہ میں دوں گا۔"

وہ کلنی سے مسکرائی "ایک لاکھ تمہارے گھر پر ہوں گے اور ان کے لیے مجھے تمہارے ساتھ تمہارے گھر بھی جانا پڑے گا؟"

"یہ بھی ظاہر ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میری زندگی کی قیمت صرف ایک لاکھ نہیں ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو کیا وہ مجھے چھوڑیں گے۔"

میں نے پوچھا "وہ کون؟"

"مجھے نہیں معلوم اور میں تم پر بھروسا کر کے اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لوں۔ اگر تم نے بھی بعد میں ایک لاکھ دینے سے انکار کر دیا۔ تو میں کیا بگاڑ لوں گی تمہارا۔ جو بگڑے گا میرا بگڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہارا ایسا سوچنا بھی صحیح ہے۔ اچھا فرض کرو' میں تم سے کچھ پوچھوں اور تم سے ایک کام کرنے کے لیے کہوں۔"

"کیسا کام؟"

"ڈرو نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے جانے دو لیکن ایک بات ہے۔ ایک لاکھ کے لیے تمہیں مجھ پر اعتبار ضرور کرنا ہوگا۔ اس میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں۔ کچھ لگائے بغیر تم ایک جوا کھیلو گی جس میں تمہارے ایک لاکھ جیتنے کے امکانات سو فیصد ہیں۔ تمہیں ایک لاکھ نہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جو لوگ تمہیں یہ انعام دیں گے۔ ان کی نظر میں میری زندگی کی قیمت اس سے ہزار گنا یا ایک لاکھ گنا سے بھی زیادہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی "پھر تو دس لاکھ بھی دے سکتے ہیں وہ لوگ۔ تمہارے پیسے بچے۔"

"ہاں۔ جیسا کام ویسے دام!" میں نے کہا "ایسے موقع بار بار نہیں آتے زندگی میں۔ یہ وقت گزر گیا تو ہمیشہ افسوس رہے گا تمہیں کہ ایک لاکھ یا دس لاکھ تمہارے ہاتھ میں تھے مگر تم نے سوچ بچار میں وقت گنوا دیا۔ کیسینو دنیا کا اصول ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔"

"زندگی کھو کے کچھ پایا تو وہ میرے کس کام کا؟"

"دس لاکھ کے بدلے میں بھی میں تمہاری زندگی کا سودا نہیں کر رہا ہوں۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ کچھ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں۔ اپنی جان دے کر اپنے پیاروں کی زندگی سستی کر جاتے ہیں۔ داؤ پر اپنی جان لگاتے ہیں اور بیوی بچوں یا ماں باپ اور بھائی بہن کے لیے عیش آرام کی ضمانت کا تحفہ دے جاتے ہیں مگر تمہارے تو ایسے رشتے نہیں ہو سکتے۔"

اس نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں نہیں ہو سکتے۔"

"اس لیے کہ جس کے پاس سب رشتے ہوں۔ وہ ان کی آبرو نہیں گنواتا۔ وہ سب نہیں کرتا جو تم کر رہی ہو۔"

وہ چڑ گئی "یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

میں نے کہا "ایک لاکھ کا سودا یہ ہے کہ تم مجھے چند سوالات کا جواب دو پھر میں ایک فون نمبر دوں گا۔ تم فون کال ریسیو کرنے والے کو میرا ایک پیغام دو گی اور بس۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے تم مجھے ایک لاکھ دو گے؟"

میں نے کہا "ہاں' دس لاکھ کے لیے تم کو تھوڑا سا رسک لینا پڑے گا۔ تم میری مدد کرو گی۔ مجھے یہاں سے فرار ہونے کا موقع فراہم کرو گی۔ اس کے لیے تمہیں جونی کو بے وقوف بنانا پڑے گا۔ تم مجھے نیند کا انجکشن ایسے لگاؤ گی کہ جونی کو پتا نہ چلے۔ وہ سمجھے کہ انجکشن لگا دیا گیا ہے مگر تم انجکشن کو استعمال کیے بغیر توڑ کے ڈسٹ بن میں ڈال دو گی۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف ارادے کی بات ہے کہ تم مجھ سے کتنا وصول کرنا چاہتی ہو۔ ایک لاکھ یا دس لاکھ۔ یہ ایک مشکل کام ہے مگر رقم بھی کم تو نہیں۔ دس لاکھ سے تم کیا کر سکتی ہو' یہ سوچو۔"

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" اس نے پُرخوف سرگوشی میں کہا۔

"نہیں' نہیں تمہارا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا۔ میرا پلان بھی ایسا ہے اور اس کے علاوہ۔ تمہاری حفاظت کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔"

وہ بولی "کوئی کسی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ سوائے خدا کے۔"

"اگر تمہارے پاس دس لاکھ ہوں تو تم اس شہر سے کیا اس ملک سے بھی جا سکتی ہو۔ کوئی تمہیں تلاش نہیں کر سکتا" میں نے اس کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔

وہ سخت ذہنی الجھن میں پڑ گئی تھی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ خیر' تم پہلے ایک لاکھ کی بات کرو۔ رقم مجھے کب ملے گی اور کیسے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ بینک صبح نو بجے کھلتے ہیں۔ میں تمہیں ایک فون نمبر دیتا ہوں۔ اسپتال کے کاؤنٹر سے فون کرو۔ کال ریسیو کرنے والا ہوگا میرا دوست رئیس۔ اس کو اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا دو۔ تمہارا کسی نہ کسی بینک میں اکاؤنٹ تو ہوگا۔ اس سے کہنا کہ یہ پیغام ناصر عظیم نے دیا ہے۔ ناصر عظیم میرا نام ہے۔ کہ تمہارے اکاؤنٹ میں صبح نو بجے ایک لاکھ روپیہ جمع کرا دیا جائے۔ نو بج کر پانچ منٹ پر تم اپنے بینک فون کر کے ان سے پوچھ سکتی ہو کہ ایک لاکھ روپے کیش تمہارے اکاؤنٹ میں آ گئے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے لیجر میں پوسٹنگ دیر سے ہوگی۔ ان سے کہنا کہ کیش وصولی کے رجسٹر میں دیکھ کے بتائیں۔"

وہ کچھ پُرسکون اور مطمئن نظر آنے لگی "کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میرے فون کرنے سے تمہارا دوست ایک لاکھ روپے بھیج آئے گا۔ یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں۔ میرا تم سے کیا تعلق ہے اور میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ۔"

میں نے کہا "تم آزما سکتی ہو۔ ایسے دوست ہوتے ہیں جو دوست کے نام پر ایک لاکھ روپے صدقہ کر دیں۔ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال کیے بغیر۔"

اس نے بے یقینی اور دکھ کے ساتھ کہا "اچھا؟ سب کے ہوتے ہیں۔"

میں نے سہلایا "سب کے نہیں ہوتے۔ میں زیادہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے رشتے میسر ہیں۔ صبح نو بج کر پانچ منٹ پر جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو پھر سوچ لینا۔ تم مجھے چند سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گی یا اسی طرح باقی نو لاکھ لینا۔ تمہارے لیے رسک کوئی نہیں۔ نہ کوئی گواہ ہوگا نہ ثبوت کہ تم نے مجھے کچھ بتایا ہے۔"

"کیا سوالوں کے جواب مجھے ابھی دینے ہوں گے۔"

"ہاں۔"

"اور تم نے بعد میں ادائیگی نہ کی۔ پھر۔"

میں نے کہا "اعتبار کا رسک تو میں بھی لے رہا ہوں۔ اگر ایک لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں چلے گئے تو صرف تمہارے دستخط سے ہی نکالے جا سکتے ہیں۔ رقم وصول کرنے کے بعد تم نے کچھ نہ بتایا۔ یا غلط بتایا تو میں کیا کروں گا۔"

"تم جونی کو بتا دو گے ایک لاکھ کے بارے میں۔"

"اس سے مجھے کیا ملے گا۔ جونی بھی لالچی ہے۔ وہ کہے گا شاباش زینت۔ اچھا بے وقوف بنایا تم نے اسے۔ لاؤ آدھے میرے۔ تم کو اعتبار کرنا پڑے گا میری زبان پر۔ یقین کرو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ صرف ایک لاکھ کے لیے کسی سے دھوکا کروں۔ ایسا کرنا میرے انٹرسٹ میں نہیں ہوگا اور پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم جو بھی کر رہی ہو۔ ضرورت سے مجبور ہو کے کر رہی ہو۔ جب تم نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کیا ہوگا تو تمہارے جذبات بہت مختلف ہوں گے۔ تم نے خدمت سے ثواب اور نیکی کمانے کا سوچا ہوگا مگر حالات آدمی کو شرافت کی زندگی گزارنے کے مواقع سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ اسے وہ کرنا پڑتا ہے۔ جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔"

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ دنیا میں ہر اخلاقی اور قانونی جرم کرنے والا اپنے آپ کو اسی طرح مطمئن کرتا ہے۔ وہ حالات کے جواز کو بہانہ بنا لیتا ہے۔ خوئے بد را بہانہ بسیار۔ پرانی کہاوت ہے۔

اس نے سرجھکا کے افسردگی سے ایک آہ بھری "بالکل سچ کہا تم نے۔"

میں نے کہا "جونی آجائے گا پندرہ بیس منٹ میں۔"

وہ سوچ میں پڑی رہی "ایک لاکھ ہوں تو میں سعودی عرب چلی جاؤں۔ وہاں نرس کو اچھی تنخواہ ملتی ہے۔"

میں نے کہا "تم عمرے اور حج کی سعادت حاصل کر سکتی ہو اور اس کے بعد اپنی موجودہ زندگی سے توبہ کر کے باقی زندگی شرافت سے گزار سکتی ہو۔"

اس پر نفسیاتی دباؤ بڑھ گیا "ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں شادی کر لوں۔ اپنا گھر ہو میرا اور بچے۔"

میں نے کہا "تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ جونی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہ تم کو کیسے تلاش کر سکتا ہے؟"

وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی "ٹھیک ہے۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "تم کیا چاہتی ہو۔ ایک کہ دس؟"

"پہلے ایک لاکھ کی بازی کھیلنا ہی بہتر ہوگا۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اوکے۔ تم میرے کچھ سوالات کے جواب دے سکتی ہو۔ پہلا سوال یہ ہے کہ مجھے یہاں کس کے حکم پر قید میں رکھا گیا ہے؟"

"یہ جونی جانتا ہے۔ میرا صرف اس کے ساتھ رابطہ ہے۔ پہلے سے ہے۔" وہ بولی۔

میں نے یہ سوال گول کر دیا کہ کیا اسی کی مدد سے اسپتال میں یہ مجرمانہ سازش ممکن ہوئی۔ اس کا جواب واضح تھا۔ جونی نے اپنے پرانے مراسم کا فائدہ اٹھایا۔ ان مراسم کی نوعیت غیر اخلاقی اور کاروباری تھی۔ جونی اس کا عاشق نہیں ایک خریدار تھا جو ضرورت پڑنے پر زینت کے پاس آجاتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زینت اس اسپتال میں نرس ہے۔ اس نے زینت کو لالچ دے کر ایک کام کرنے پر مجبور کیا۔ یا شاید بلیک میل کرنے کی دھمکی دے کر اور زینت کے تعاون نے وہ سب ممکن بنا دیا جو ایک اسپتال میں ناممکن تھا۔

زینت سے یہ پوچھنا لاحاصل تھا کہ اس کو جونی نے کیسے استعمال کیا تھا اور اس نے جونی کی کیا مدد کی تھی۔

میں نے کہا "میں کب سے یہاں ہوں؟"

اس نے کہا "کل شام سے۔"

"یعنی تقریباً چھتیس گھنٹے ہو گئے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی تھی۔"

اس نے سہلایا "سونی نام ہے اس کا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اسی اسپتال کے ایک اسٹاف کوارٹر میں۔"

میں نے کہا "کس کے نام پر ہے وہ کوارٹر۔"

اس نے ایک جھوٹ بولا "کسی نرس کے نام پر۔۔۔ میں نام نہیں جانتی اس کا۔"

میں سمجھ گیا کہ کوارٹر خود زینت کے نام پر ہوگا۔ یہ ناممکن تھا کہ اسے کوارٹر کا پتا ہو مگر اپنی ساتھی نرس کا نام

معلوم نہ ہو۔ اس کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اور فوری طور پر اسے یہی جواب سوجھا۔

"سونی ٹھیک ہے نا!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ جیسے تم ٹھیک ہو" وہ بولی۔

"مجھے اتنی وضاحت کی ضرورت کیوں ہو رہی ہے' یہ نیند کے انجکشن کا اثر نہیں ہو سکتا۔"

وہ بولی "یہ دوسرے انجکشن کی وجہ سے ہے۔ تمہارے سینٹرل نروس سسٹم نے۔ بلکہ موٹر NERVES کو بے کار کر دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ میں سوچ سکتا ہوں۔ دیکھ اور سن سکتا ہوں مگر اپنی مرضی سے اپنے جسم کو استعمال نہیں کر سکتا۔ عملاً میں مفلوج ہوں۔"

"ہاں۔ یہ ایک خطرناک انجکشن ہے اس سے مستقل نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم یہ جانتی ہو پھر بھی۔ خیر' کیا جونی یہی انجکشن لینے گیا ہوا ہے۔"

اس نے مجرمانہ انداز میں سر کو جنبش دی "میں مجبور ہوں۔"

میں اسے گھورتا رہا "پلیز! یہ انجکشن مت لگاؤ مجھے۔"

اس نے پھر کہا "میں مجبور ہوں۔"

میں نے برہمی سے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں بھی مجبور ہوں۔ میں تمہیں وہ فون نمبر ابھی نہیں بتا سکتا۔ جس پر کال کر کے تم ایک لاکھ لے سکتی ہو۔ تم نے خود کو اس کا نصف حقدار ثابت کر دیا ہے۔"

"پہلے تم نے یہ نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا "پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا خطرناک انجکشن لگانے والی ہو۔ جس سے میں ہمیشہ کے لیے بھی مفلوج ہو سکتا ہوں۔ یہ جاننے کے بعد بھی میں تمہیں ایک لاکھ دوں؟ ایسا تو پاگل ہی کر سکتا ہے۔"

"میں کیا کروں۔ جونی انجکشن لانے کے بعد اصرار کرے گا۔"

"کچھ بھی کرو لیکن مجھے انجکشن لگانے کے بعد تم سب گنوا دو گی۔ یہ موقع تمہارے لیے خوش قسمتی کی لاٹری کا ٹکٹ ہے۔ تم اسے پھاڑنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی" میں نے کہا۔

"اچھا۔ میں کوشش کروں گی۔۔۔ وعدہ نہیں کر سکتی۔"

"میں تمہیں صبح آٹھ بجے وہ فون نمبر بتاؤں گا۔ اس سے پہلے نہیں" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

خاموشی کا ایک بوجھل وقفہ آیا جو ہم دونوں کے لیے ایک سا اعصاب شکن اور صبر آزما تھا پھر اس نے کہا "تم دس لاکھ کی کوئی ضمانت دو۔۔۔ تو پھر میں۔۔۔ کوئی رسک بھی لوں۔"

میں نے کہا "تمہیں ہر ضمانت فراہم کی جا سکتی ہے۔ دس لاکھ کا چیک بے آرڈر۔ یا ڈرافٹ کسی تیسرے شخص کے پاس بھی رکھوایا جا سکتا ہے۔ جس پر تمہیں بھی اعتبار ہو اور مجھے بھی اور ہاں' تم چاہو تو جونی کو اپنے ساتھ ملا سکتی ہو۔"

"یعنی۔۔۔ آدھی رقم اسے دے دوں؟"

"پانچ لاکھ بھی کم نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

"وہ نہیں مانے گا۔ مجھے معلوم ہے" وہ بولی "شاید دس لاکھ اسے بھی ملتے تو مان جاتا۔"

میں سمجھ گیا کہ اب وہ مجھے EXPLOIT کرنے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ جو شخص اتنی آسانی سے ایک لاکھ یا دس لاکھ خود ہی دے رہا ہو اس سے سودے بازی کر کے دس کی جگہ بیس حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ کم سے کم اس کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

میں نے کہا "تم جونی پر لعنت بھیجو اور اگر تم نے ابھی مجھے انجکشن نہیں لگایا تو میں مان لوں گا کہ تم میرپس ہو۔ میرا ساتھ دے کر تم بہت فائدے میں رہو گی۔ جونی کیا چیز ہے' اس جیسے دس کو خرید کے خیرات کر سکتا ہوں میں۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ ایک بار میں یہاں سے نکل جاؤں پھر جونی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہاری حفاظت کی ذمے داری میری۔ تم باہر جاؤ یا ملک میں رہو۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

وہ مرعوب ہوئی "آخر تم کیا چیز ہو؟"

میں نے کہا "بہت بڑی اور خطرناک چیز ہوں میں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے۔۔۔ جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ یہ دو بڑے دشمنوں کی جنگ ہے۔ محاورے کے مطابق ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ جونی جیسے مینڈک بہت ہیں۔ اکثر مارے بھی جاتے ہیں مگر دنیا میں ہاتھی کم ہیں۔ مینڈک تو ایک تالاب میں سیکڑوں پیدا ہو جاتے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ایسے اچھل پڑی جیسے اندھیرے میں کار دوائی کرنے والا تخریب کار سرچ لائٹ کا اجالا پڑتے ہی اچھل پڑتا ہے۔ اس نے گھبرا کے ٹیپ ریکارڈ کا ہیڈ فون اپنے کانوں پر چڑھایا۔ اپنی بدحواس صورت پر خیر و عافیت کی خبر دینے والی مسکراہٹ سجائی اور اندر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنڈی کھول دی۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور سویا ہوا نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"بڑی جلدی آگئے آپ؟" زینت نے سر سے ہیڈ فون اتار دیا۔

وہ ہنس پڑا "آپ۔۔۔ کیا ہوگیا ہے تجھے۔ یہ آپ جناب کی زبان کیسے بولنے لگی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا "انجکشن مل گیا؟"

"ہاں۔ دو سو اوپر دینے پڑے۔ اب یہ چٹی مجھے پڑے گی تیری بے وقوفی کی وجہ سے" جونی نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو انجکشن تو نے دیا وہ میں نے لگادیا تھا۔ دوسرا پھینک دیا۔ غلطی تیری تھی" زینت نے کہا۔

"اچھا چل' دونوں کی برابر غلطی۔ نقصان بھی آدھا آدھا۔ لا سو نکال۔"

"واہ۔ یہ جرمانہ میں کیوں بھروں؟" وہ بولی۔

جونی نے کہا "ابھی تو دوسرے انجکشن کی قیمت نہیں لگائی میں نے اور آدھی رات کو رکشا میں آنے جانے کے چالیس روپے الگ دیے۔"

عورت نے کہا "اچھا' مرتا کیوں ہے۔ یہ لے اپنے سو۔"

مرد ہنسا "مجھے کہہ دیتی' میں خود ہاتھ ڈال کے نکال لیتا۔"

میں سمجھ گیا کہ عورت نے سو کا نوٹ اسی سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھا ہوگا جو قدرت نے صرف عورت کو دیا ہے۔ زینت تو وہاں پورا خزانہ چھپا سکتی تھی۔

"اب سو رہ گئے تیرے پاس۔ دو سو کے آدھے۔" جونی خباثت سے ہنس کر بولا "کل کا پروگرام پکا۔"

"چل بکواس نہ کر۔ انجکشن دے مجھے۔"

جونی نے انجکشن اسے دیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زینت کیا کرتی ہے۔ وہ ایک لاکھ کے جال میں بری طرح پھنس چکی تھی اور اس کے لیے یہ رقم سارے خوابوں کی تعبیر تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ جونی کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا رسک مول لے سکتی تھی۔

جونی نے پوچھا "یہ بندہ دیکھا ہوا لگتا ہے مجھے۔"

زینت نے انجکشن کی وائل کے اوپر والے حصے کو بڑی مہارت سے کھولا۔ اس کا محلول بالکل بے رنگ تھا۔ شیشی کو اوپر کی طرف اٹھا کے زینت نے سرنج میں آہستہ آہستہ بھرا۔ اس وقت مجھے وہ کچھ نروس لگی۔ اس کی سانس قدرے بے قابو ہو رہی تھی اور ہاتھوں میں بھی ہلکی سی لرزش تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ یہ ایک خطرناک کام تھا اور اس کی حالت عین تھانے کے سامنے کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے کی طرح ہوگئی تھی۔ میرا سسپنس کچھ کم ہوگیا۔ خدا نے مجھے ایک موقع دیا تھا کہ میں دشمن کی طاقت کو اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے توڑ سکوں۔ اس کے لیے میں نے پہیے کا استعمال اسلحے کی طرح کیا تھا۔

زینت اب میرے ساتھ تھی لیکن یہ بات جونی نہیں جانتا تھا۔ غلط انجکشن لگنے کو اب میں اپنے حق میں تائید غیبی کا اشارہ سمجھ سکتا تھا۔ شاید اس کے ساتھ ہی بازی پلٹ گئی تھی۔ یہ سب جس قادر مطلق کے حکم سے ہوا تھا اس کے بعد جونی جیسے کسی انسان کے لیے اپنی کوشش سے غلطی کا ازالہ کرنا نوشتۂ تقدیر کو بدلنے کی کوشش کے مترادف تھا مگر وہ لاعلمی کے اطمینان میں مبتلا تھا۔

عورت کا تریا چلتریا مکاری مشہور ہے۔ زینت بھی عورت تھی اور اس وقت اپنے مفاد کی جنگ لڑ رہی تھی۔ پہلے بھی پیسوں کے لیے اس نے غلط اور صحیح یا جائز و ناجائز کو بھلا دیا تھا۔ زیادہ پیسے کے لیے اس نے اعتماد کا خون کردینے میں بھی کوئی حرج نہ سمجھا۔ وہ سائڈ بدل کے جونی کی حریف اور میری حلیف بن گئی تھی۔

وہ انجکشن لگانے کے لیے جھکی تو میرے صبروضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ میں خاموش تماشائی بن کے یہ جان لیوا کھیل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں اب میری جسمانی توانائی بڑھ گئی تھی اور میں اس قابل ضرور تھا کہ ہاتھ مار کے انجکشن گرادوں۔ جونی بڑے اطمینان سے بازو اپنے سینے پر فولڈ کیے کھڑا تھا اور مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ زینت نے ایک آنکھ کو آہستہ سے دبایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زینت کو چھینک آئی اور اس کے بال بکھر کے چہرے پر آگئے۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رک گئی "یہ ریوالور تو اٹھالے۔ سامنے ہی رکھا ہوا ہے" وہ بولی "دروازہ بھی بند نہیں ہے۔ کوئی آگیا پھر؟"

جونی نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا "دماغ تو خراب نہیں ہے۔ دروازہ بند ہے۔ میں نے خود اندر آنے کے بعد کیا تھا" پھر اس نے کرسی پر رکھا ہوا ریوالور اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسے تھوڑا سا آگے جھکنا پڑا۔ اس وقت

زینت کی طرف اس کی پیٹھ ہوگئی۔

زینت کے لیے یہ دس سیکنڈ کی مہلت بھی بہت تھی۔ اس نے جھک کر انجکشن میرے بازو کے قریب بیڈ میں لگادیا۔ جب جونی پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ میرے بازو پر سرنج کے نشان کی جگہ اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی مل رہی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں سرنج ایسے تھام رکھی تھی جیسے ایک سیکنڈ پہلے بازو کی شریان سے سوئی کھینچی ہو۔ جونی کی طرف دیکھے بغیر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور عادت کے مطابق اس نے سرنج کو توڑ کے بیڈ کے نیچے رکھی ہوئی کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

میں نے دیکھا کہ زینت کے چہرے پر پسینے کی نمی قطروں کی صورت میں چمکنے لگی تھی۔ شاید اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہوگا۔ اس نے ایک ایسا سنگین جرم کیا تھا کہ وہ پکڑی جاتی تو شاید اس کی خدمات کا معاوضہ دینے والے اسے سزائے موت بھی دے سکتے تھے۔ اس کے جذبات کا تلاطم اس شخص کی طرح تھا جسے تجوری چراتے وقت ہر لحہ ڈر ہو کہ محافظ اسے دیکھتے ہی گولی ماردیں گے مگر وہ بچ کر نکل آیا ہو اور اس کو بے چینی ہو کہ تجوری میں سے کتنا مال ملے گا۔ اس کے وارے نیارے ہوجائیں گے یا محنت اکارت جائے گی اور تجوری خالی ملے گی۔

جونی ایک قدم آگے آیا "کیا بات ہے یہ ہوش میں ہے۔ بول سکتا ہے پھر بولتا کیوں نہیں؟"

زینت بولی "اسی سے پوچھو۔"

میں نے کہا "میں تم سے کیا بات کروں جبکہ میں جانتا ہوں' تم صرف حکم کے غلام ہو جو بھی کررہے ہو' پیسے کے لیے کررہے ہو۔"

"یہ تو ہے" جونی پُرتمسخر انداز میں بولا۔

میں نے کہا "پیسہ ہر شخص کی مجبوری ہے۔ جتنا بھی ہو' کم لگتا ہے۔ کروڑپتی ارب پتی اور ارب پتی کھرب پتی بننا چاہتے ہیں۔ جیسے ملک رب نواز۔"

وہ ایسے چونکا جیسے باتیں کرتے کرتے میں نے اس کو سوئی چبھوی ہو۔

"اس نے کیا معاوضہ ادا کرکے تمہارے سپرد یہ کام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ تمسخر لہجے میں بولا "یہ تمہیں کیوں بتاؤں میں۔۔۔؟"

میں نے کہا "مت بتاؤ۔ مجھے کچھ اندازہ ہے۔ ایسے کام میں نے بھی کرائے ہیں تم جیسے لوگوں سے۔"

"اگر تم میری وفاداری خریدنے کا سوچ رہے ہو تو بھول جاؤ یہ بات۔"

میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "ایسے دعوے کیوں کرتے ہو۔ ہم اس ملک میں رہتے ہیں جس کے صدر اور وزیراعظم سے لے کر سپہ سالار تک سب کی وفاداری اور حب الوطنی ہمیشہ برائے فروخت رہی ہے۔ خیر' تمہارے لیے میری ایک آفر ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں تم دونوں کو پانچ پانچ لاکھ نقد دوں گا۔"

"فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" وہ بولا مگر مجھے اس کے لہجے میں صرف کھوکھلا پن محسوس ہوا۔

میں زیادہ دیر تک باتیں کرتا تو اسے شک ہوجاتا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھول کے ایسے بات کی جیسے میری زبان میں لکنت آگئی ہے "میں۔۔۔ تمہاری حفاظت۔۔۔ بھی کروں گا۔۔۔ ڈرنے۔۔۔ کی ضرورت نہیں۔۔۔ سوچ۔۔۔ سوچ لو۔ یہ پانچ لاکھ کی۔۔۔ لاٹری ہے۔ بار بار۔۔۔ نہیں۔"

پھر میں نے ظاہر کیا جیسے انجکشن کے اثر سے مزید ایک لفظ بھی کہنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میں نے جونی سے وہ بات کہہ دی تھی جو شاید زینت نہ کہہ پاتی۔ میں نے اس کی مشکل آسان کردی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں نے اسے ناراض کردیا ہو۔ وہ رسک لے کر پورے دس لاکھ خود رکھنا چاہتی ہو۔ خیر' پانچ لاکھ بھی اس کے لیے اتنے کم نہیں کہ وہ ناراض ہو کے اپنا ارادہ بدل دے۔

اب مجھے سوتا بن کے دیکھنا تھا کہ میں نے جونی اور زینت کی وفاداری کے جذبات کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جو پتھر پھینکا ہے' اس کی لہریں کتنا تلاطم پیدا کرتی ہیں۔ قدرت کی طرف سے مجھے جو موقع عطا ہوا تھا' میں نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ میں نے خفیف سی حرکت بھی نہیں کی اور اشتیاق کے باوجود آنکھوں کو تھوڑا سا کھول کے یہ دیکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی کہ ان دونوں کے چہرے اب کیا کہتے ہیں۔ وہ خاموشی میں ایک دوسرے سے کیا پوچھ رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کی صورت پر جذبات کی تحریر پڑھی جاسکتی تھی مگر مجھے کوئی جلدی نہیں تھی کہ یہ رسک لوں۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد وہ کھل کر آپس میں بات کریں گے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا وجود اس کمرے میں میز کرسی یا دیواروں کی طرح ہوگیا ہے۔

بالآخر جونی نے ہی پہل کی "یہ سوگیا ہے نا؟"

زینت نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے' انجکشن فوراً اثر کرتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا مطلب تھا۔ مکر تو نہیں کر رہا ہے بندہ؟"

"اگر انجکشن اصلی تھا تو بے ہوشی بھی اصلی ہے" وہ بولی "تو چیک کر لے۔"

میں فوراً چیکنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ اگر جونی اچانک میرے گھٹنوں' کہنیوں یا ٹیلوں پر کچھ مار کے میرے REFLEXES دیکھتا تو میری جعلی بے ہوشی کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ میں غیر ارادی طور پر پاؤں ہلا تا۔ اب میں نے جسم کو ردِ عمل سے بچانے کے لیے سخت کر لیا تھا۔

جونی نے میرے ہاتھوں کو اوپر نیچے کیا۔ مجھے ہلا جلا کے دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ "ٹھیک ہے۔"

"میری بات کا اعتبار نہیں تھا" زینت بولی۔

"زینت۔ اس بندے کی بات پر غور کر رہا تھا میں" وہ شاید کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"کون ہے یہ بندہ؟"

"ملک صاحب کا کوئی دشمن ہے۔ ان کے دشمن معمولی لوگ نہیں ہو سکتے۔ شیر کا دشمن گیدڑ نہیں ہوتا۔ دوسرا شیر ہوتا ہے۔"

"تو نام نہیں جانتا؟"

"نہیں' نام معلوم ہو جائے گا لیکن تو دیکھ' میری بات سولہ آنے ٹھیک ہے یا نہیں۔ ایسے پانچ پانچ لاکھ دینے والا خود کیا ہو گا؟ کروڑ پتی ضرور ہو گا اور بندے میں دم بھی ہے مقابلے کا۔ دل بھی بڑا ہے۔ ہم جیسے تو پانچ کا نوٹ بھی ایسے نہیں پھینک سکتے۔"

زینت نے کہا "جانے دے جونی۔ لالچ میں مت پڑ' مارا جائے گا۔"

وہ تلخی سے ہنسا "او جعلی! ابھی ہم کون سے جیتے ہیں اور ایسے ہی کسی دن مارے بھی جائیں گے۔ ملک صاحب کی نظر میں ہماری کوئی حیثیت کیا ہے۔ بھاڑے کے ٹٹو ہیں ہم۔ بلکہ اس سے بھی برے۔ وہ کتے جن کو بڑے لوگ بڑی بڑی شرطیں لگا کے لڑاتے ہیں' مقابلے میں زخمی ہوں یا مر جائیں' انہیں کیا۔ ہماری جگہ دوسرا کتا آ جائے گا۔"

زینت نے کہا "نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تیرے لیے کیا بات ہے ڈرنے کی۔ تجھے کون جانتا ہے۔ جانتے ہیں میرے جیسے چاہنے والے مگر ملک صاحب سے تجھے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ خطرہ تو میرے لیے ہے۔"

"لگتا ہے تو خطرہ مول لینا چاہتا ہے؟"

"ہاں ــــ دیکھ زینت۔ آج بھی زندگی کون سی محفوظ ہے۔ فرض کر ہم پکڑے جاتے۔ واسطہ پڑ جاتا' اس بندے کے محافظوں سے۔ ہم ان کی گولی کا نشانہ بنتے یا پھر پولیس پکڑ لیتی تو جیل جاتے۔ خطرہ اس وقت کیا نہیں ہے؟ اس بندے کو تلاش کرنے والے بھی گھر میں بیٹھ کے نہیں رو رہے ہوں گے۔ ہمارا یہ اطمینان کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اپنے دل کی تسلی کے لیے ہے۔ وہ اچانک کسی وقت آ جائیں اور ہمیں یہاں کتے کی طرح مار کے اسے لے جائیں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔"

زینت نے کہا "ہاں۔ جنگ میں بازی پلٹتے دیر نہیں لگتی۔"

"ملک رب نواز تو اپنے محل میں سو رہا ہے مزے سے۔ اسے کوئی جگا کے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھے گا کہ جونی مارا گیا۔ کسی نے بتایا تو یہ بتائے گا کہ ملک صاحب' وہ اپنا بندہ لے گئے اور ملک کوئی ہمارے لیے مغفرت کی دعا نہیں کرے گا۔ وہ الٹا ہمیں گالیاں دے گا کہ وہ ہڈ حرام کیا سو رہے تھے یا چوڑیاں پہن کے بیٹھے تھے۔ اسے ہماری زندگی نہیں اپنے پیسے ضائع ہونے کا افسوس ہو گا۔"

"جونی۔ تو اتنا سمجھتا ہے تو پھر ایسے کام کیوں کرتا ہے؟"

"اور کیا کروں؟ ریلوے اسٹیشن پر جا کے قلی بن جاؤں؟ یا رکشا چلاؤں؟ کوئی کام نہیں آتا مجھے اور آتا بھی ہو تو اب محنت نہیں ہوتی۔ تو جو خطرے کی بات کر رہی تھی تو جعلی' ہم نے خطرہ وہی مول لے رکھا ہے مگر بہت کم میں۔ تجھے کیا ملے گا اگر تو لینے کے لیے زندہ رہی؟ وہی دس ہزار جو طے ہوئے تھے۔"

"اور تجھے؟"

"مجھے ــــ؟ پچاس ہزار ــــ دس تجھے دیے۔ پانچ اسے جس کی تو نے سفارش کی تھی۔ سب سے زیادہ فائدے میں وہ رہی۔ بس باہر ہی سے ان کو یہاں لے آئی کہ یہ ہے روم نمبر فور اور پانچ ہزار کھرے۔ ہمیں دیکھ' بیٹھے ہیں یہاں جان ہتھیلی پر رکھے' جان کا خطرہ مول لینا ہی ہے تو پانچ لاکھ کا مول کیوں نہ لیں۔"

"تو اچھی طرح سوچ لے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ نوکری بھی چل رہی ہے اور ــــ اپنا دھندا بھی۔ بعد میں ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے۔ تیرا وہ ملک رب نواز کیا چھوڑے گا ہمیں؟"

جونی سوچ میں پڑ گیا تھا "اس بندے نے کہا ہے کہ حفاظت بھی کرے گا ہماری۔"

"یہ کیا حفاظت کرے گا تیری جو اپنی حفاظت نہ کر سکا۔ باتوں میں مت آ' اگر یہ مر گیا بعد میں تو کیا ہو گا؟"

"ہم کہہ سکتے ہیں ــــ"

"کہ پیسے پہلے دو" زینت نے اس کی بات کاٹ دی "دماغ خراب ہے تیرا۔ اتنی بڑی رقم پہلے دینے والا کوئی پاگل ہی ہو گا۔ یہ بندہ سوچے گا کہ دس لاکھ حرام نہ جائیں۔ ہم دونوں پیسے لے کر بھاگ گئے تو کیا ہو گا؟"

جونی خاموش رہا۔ وہ شاید ایسے ہی خیالات کے جنگل میں بھٹکنے لگا تھا اور اپنے ذہن میں جنم لینے والے سوالوں کے جواب تلاش کر رہا تھا۔ پانچ لاکھ کی رقم کے تصور نے اسے مسحور کر لیا تھا اور اس کے لیے ترغیب کے مقابلے میں اصول پر قائم رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ بے غیرتی اور بے ضمیری کے کام میں اخلاقیات کی کیا حیثیت ہے۔ برائی یہ بھی ہے مگر اس کا معاوضہ ہے پچاس ہزار۔ دوسری برائی کا معاوضہ ہے پانچ لاکھ پھر نمک حلالی' وفاداری اور قول قرار کی بات پر کیا سوچ بچار کرنا۔ ملک رب نواز کی گالیوں کی کیا پروا کرنا۔ طوائف کے لیے سارے خصم ہیں۔ جو زیادہ دے وہ سب سے پیارا۔

لیکن کچھ دیر بعد صورتِ حال واضح ہو گئی۔ زینت بڑی مکاری سے اپنی بات پر اڑ گئی کہ وہ لالچ میں کوئی غلط کام نہیں کرے گی۔ جونی اسے سمجھاتا رہا کہ اب بھی وہ غلط کام ہی کر رہی ہے پھر اس نے کہا کہ اسے یہ دس ہزار بہت ہیں۔ آدھی چھوڑ پوری کو جائے پوری ملے نہ آدھی پائے۔ پانچ لاکھ کے چکر میں وہ مرنا نہیں چاہتی۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دس لاکھ میں جونی کو حصے دار بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے یہ آسان لگتا تھا کہ میری مدد کر کے ساری دس لاکھ کی رقم اپنے پاس رکھے۔ اسے جونی کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی کیونکہ دس کے آدھے اس کے نزدیک قارون کا خزانہ تھے جو وہ خوامخواہ جونی کی نذر کرنا غیر ضروری سمجھتی تھی۔

اب وہ جونی کو دور دھکیل رہی تھی کہ وہ ملک رب نواز کے ساتھ ہی رہے۔ اس کا وفادار بن کر۔ خود اس نے میرا ساتھ دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا لیکن جونی کو شک کا موقع دیے بغیر۔ اسے وہ اپنی قناعت پسندی کا فریب دیتی رہی کہ مجھے دس ہزار ہی کافی ہیں' میں پانچ لاکھ کے چکر میں نہیں پڑتی اور خود کو بے حد بزدل اور کم ہمت ثابت کرتی رہی کہ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔

زینت کی یہ سوچ خود میرے نقطۂ نظر سے زیادہ قابلِ قبول تھی۔ جونی ایک پروفیشنل جرائم پیشہ شخص تھا۔ وہ زیادہ خطرناک اور ناقابلِ اعتبار ثابت ہو سکتا تھا۔ زینت ایک عورت تھی۔ نرس کم اور طوائف زیادہ تھی۔ وہ اخلاقی جرم کا حوصلہ رکھتی تھی۔ قانونی جرم اس نے پہلے نہیں کیا تھا۔ میرے لیے اس سے نمٹنا آسان ہوتا۔

جونی کو سخت مایوسی ہوئی۔ ان کے درمیان اختلاف نے تلخ کلامی کی صورت اختیار کر لی۔ اعتماد کا رشتہ جواب تک قائم تھا' اچانک ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ یہ صورتِ حال خطرناک رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔ جونی کے لیے زینت کا وجود ہی دو طرح سے ناقابلِ قبول ہو گیا تھا۔ ایک اس لیے کہ وہ جونی کے لالچ اور اس کی نیت کے فتور کو سمجھ گئی تھی۔ دوسرے اس لیے کہ وہ جونی کے عزائم کی راہ میں دیوار بن رہی تھی۔ جونی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ کیوں نہ وہ زینت کو درمیان سے ہمیشہ کے لیے نکال دے۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا وجود بھی ختم ہو جائے گا اور پھر وہ اکیلا میری مدد کر کے سارے دس لاکھ کا حقیقی دعوے دار بن جائے گا۔ وہ ملک رب نواز کو چھوڑ کے میرا ساتھی بن جائے گا۔ سب پروفیشنل لوگ یہی کرتے ہیں۔ وکیل آج مدعی کی طرف سے پیش ہو رہا ہے۔ کل مدعا علیہ کی طرف سے بھی دلائل دے سکتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں تو بڑے نامی گرامی وکلا نے ایسا کیا ہے۔ آج حکومت کے وکیل' کل اس کے خلاف۔ پرسوں پھر وکیلِ سرکار۔

کشیدگی کے ایک طویل وقفے کے بعد ان میں صلح ہو گئی۔ وہ کتنی دیر خاموش اور ایک دوسرے سے خفا بیٹھے رہے۔ شاید ایک گھنٹا یا دو گھنٹے۔ میرے لیے وقت کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ میرے لیے تو انتظار کا ہر لمحہ ایک گھنٹے کا عذاب رکھتا تھا۔ منانے اور راضی کرنے کا یہ سلسلہ چالاک جونی نے شروع کیا۔ غالباً وہ اپنے ذہن میں کوئی پلان فائنل کر چکا تھا۔ وہ پھر ہنسنے بولنے لگے۔ جونی نے بظاہر زینت کی بات مان لی کہ لالچ بری بلا ہے اور جان ہے تو جہان ہے۔ پانچ لاکھ کے لیے جان جائے۔ انہیں ایسی بے وقوفی کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ دھوکا دینے کے اس خاموش کھیل میں بالآخر ہار جونی کی ہو گی۔ خود میری جوان سال زینت تھی۔ یہ عجیب مقابلہ ظالمانہ تھا جس میں میرے دشمن کے نمک خوار ایک دوسرے سے آگے بڑھ کے اپنی وفاداری مجھے فروخت کرنا چاہتے تھے۔ کہاں یہ کہ میں مجبور تھا اور کہاں دس لاکھ میں بدل جانے والی یہ صورتِ حال کہ میں اپنی مرضی سے انتخاب کر سکتا تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ اب صورتِ حالات مجموعی طور پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے کنٹرول میں آچکی ہے اور میں یہ کھیل کسی بھی وقت ختم کرسکتا ہوں۔ مجھے انتظار تھا اپنی جسمانی طاقت کے مکمل طور پر بحال ہونے کا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا' میرے اعصاب کی زائل شدہ قوت واپس آرہی تھی۔

نہ جانے اس وقت جونی نے پھر زینت سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور اس کے منع کرنے کے باوجود جونی کی پیش قدمی جاری رہی۔ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میرا وجود تو جونی کے لیے نہ ہونے کے برابر تھا جبکہ زینت جانتی تھی ایسا نہیں ہے۔ اسپتال کے اس کمرے میں کسی کی دخل اندازی کا امکان بھی نہیں تھا چنانچہ جونی کے لیے یہ سچویشن رومینٹک ہونے کے لیے بہترین تھی۔ زینت کوئی پارسا عورت نہیں تھی کہ ڈرتی یا شور مچانے کی دھمکی سے ڈرا سکتی۔ جونی کے حیوانی جذبات بھڑک اٹھے تھے اور زینت کی کمزور مزاحمت اسے روکنے سے قاصر تھی۔

شاید یہی موقع سب سے بہتر ہوگا۔ میں نے سوچا لیکن میں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو میرا جسم کانپنے لگا اور میں قدم بڑھانے سے پہلے ہی گر جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں وقت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ورنہ مجھ سے دو قدم دور فرش پر جونی کے کپڑے پڑے تھے اور ان میں ریوالور بھی تھا۔

اگر میں کوشش کرتا تب بھی آہستہ آہستہ اٹھتا۔ میں چیتے کی طرح جست لگا کے بیڈ سے فرش پر نہیں پہنچ سکتا تھا اور سلوموشن میں میرے اٹھ کر کھڑے ہونے سے پہلے ہی جونی کے رومینٹک جذبات کا بخار اتر جاتا۔ وہ مجھے سر پر ڈنڈا مار کے بیچ بچ بے ہوش کردیتا۔

مجبوراً میں نے صبر گوارا کیا لیکن جسمانی صحت کی بحالی کی یہ سست رفتاری میرے لیے باعث تشویش ہونے لگی۔ اگر یہی حال رہا تو شاید صبح تک بھی میں کچھ نہیں کرپاؤں گا۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے میں دن کا اجالا زمین پر پھیلنے والا تھا۔

پانچ بجے زینت نے بڑے ناز سے کہا "اب جا کے چائے لا میرے لیے۔"

"چائے۔۔۔ اس وقت کہاں ملے گی۔"

"کینٹین میں۔ اس وقت خود جا کے لانی پڑتی ہے۔"

جونی نے مستی میں انگڑائی لی "اچھا۔ جاتا ہوں سو ہنیو۔"

اس کے جاتے ہی زینت نے دروازہ اندر سے بند کیا اور میرے قریب آکے بولی "سرجی۔ جاگ رہے ہو؟"

اس کے باادب انداز تخاطب پر میں مسکرایا۔ وہ اب میری فرمانبردار ہوگئی تھی "ہاں' مگر بہت کمزوری ہے ابھی تک۔"

"فکر مت کرو۔ میں ایک انجکشن لگادوں گی۔ آدھے گھنٹے میں طاقت آجائے گی۔" وہ بولی "اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا جی۔ میں نے بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ جونی بڑا خراب آدمی ہے۔ چھوڑے گا نہیں مجھے۔"

میں نے کہا "انجکشن کہاں ہے؟"

"آپ فکر مت کرو۔ آجائے گا" وہ مسکرائی "اسی لیے تو۔۔۔ میں مان گئی تھی اب جونی میری مانے گا۔"

"اس وقت تم جونی کے ریوالور پر قبضہ کرسکتی تھیں۔"

"نہیں جی۔ اس کا کیا فائدہ۔ اسے کچھ پتا نہیں چلے تو اچھا ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" وہ بولی "آپ تھوڑا سا ہلو گے تو میں انجکشن منگوالوں گی۔"

"مگر اس وقت تمہارا اسٹور تو بند ہے۔"

وہ بولی "ایمرجنسی وارڈ میں مل جائے گا۔ میں جونی کو یہاں بٹھا کے خود لے آؤں گی۔"

میں نے اس کو مسکرا کے دیکھا "گڈ گرل۔ دس لاکھ پکے تمہارے لیے۔"

اس کے چہرے پر مسرت کی ایک روشن لہر سی آگئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جونی چائے کے دو مگ لیے اندر آگیا۔

"یہ تو کس سے باتیں کررہی تھی؟" اس نے شکی لہجے میں سوال کیا۔

وہ ہنس پڑی "تیرے خیالوں سے اور کون ہے میرے علاوہ یہاں؟"

اس نے چائے کا ایک مگ اسے پکڑا دیا "مجھے ایسا لگا۔ جیسے کوئی آگیا؟"

"یہاں کون آئے گا اور وہ بھی اس وقت؟ چائے میں زہر ملا کے تو نہیں لایا ہے نا؟" وہ بولی۔

"زہر۔۔۔ یہ خیال کیوں آیا تجھے؟"

"میں نے تیری بات نہیں مانی نا۔ تیرا بہت نقصان کردیا" وہ بولی۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تو پھر سوچ لے۔ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے تو نے پانچ لاکھ۔"

"یہ تو ہے" وہ آہستہ سے بولی "مگر جونی۔ مجھے ڈر ہے۔۔۔ تو مجھے کچھ بھی نہیں دے گا۔ سارے خود رکھ لے گا تو میں تیرا

کیا بگاڑ لوں گی۔"

وہ پھر تسمیں کھانے لگا۔ اسے یقین دلانے لگا کہ اس کے دل میں بے ایمانی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنا حصہ ڈائریکٹ وصول کرسکتی ہے۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جونی زیادہ پُرامید ہوگیا۔ غالباً اسے یقین آرہا تھا کہ وہ زینت کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

اچانک میں نے ایک ٹانگ ہلا کے آہستہ سے کراہنے کی آواز نکالی۔ اس نے چونک کے جونی کو مخاطب کیا "جونی۔ اس کی بے ہوشی پکی ہے۔"

"کچی کیوں ہے' ابھی انجکشن لگایا ہے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔ جب انجکشن بار بار لگایا جائے تو اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ جیسے بندہ نشے کی گولی یا ٹیکے کا عادی ہوجاتا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر نے کیوں نہیں بتایا تھا؟" وہ خفا ہو کے بولا۔

"مجھے تو پتا ہے۔ جب ایسا ہو تو ساتھ دوسرا انجکشن لگاتے ہیں" اس نے ایک مشکل سا نام لیا۔ "پھر ایک ہفتے گزارا ہوجاتا ہے۔"

"اور ایک ہفتے بعد۔۔۔"

وہ ہنسنے لگی "بندہ ہی کہاں رہتا ہے کہ انجکشن کی ضرورت پڑے۔ ایسے تو ایک دو دن روکا جاتا ہے کسی کو۔ زیادہ سے زیادہ تین دن۔"

"اب میں پھر جاؤں؟" جونی فریادی لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ میں ایمرجنسی وارڈ سے لے آتی ہوں۔ تجھے کوئی نہیں دے گا۔" وہ چائے کا مگ رکھ کے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

جونی کو اس کی نیت اور عزائم پر شک کیسے ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی اس کا دماغ دس لاکھ کے چکر میں گھوم رہا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بھی زینت کا پتا کاٹنے کے چکر میں ہو۔ اسے شک کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

زینت تقریباً بیس منٹ بعد آئی۔ اس وقت صبح کے پونے چھ بجے تھے۔ زینت نے مجھے انجکشن لگایا تو مجھے خیال آیا کہ اب آدھے گھنٹے کی بات ہے پھر یہ کھیل ختم ہوجائے گا جس کے تین کردار اپنا اپنا رول بڑی کامیابی سے ادا کررہے تھے مگر ایک کے دل کا حال دوسرا نہیں جان سکتا تھا۔ زینت کی نیت کا جونی کو اندازہ نہیں تھا۔ جونی کو میرے ارادے معلوم نہ تھے اور جونی کے دماغ میں کیا ہے یہ زینت نہیں جانتی تھی۔

مجھے یہ تو علم ہوگیا تھا کہ میں اسپتال کے اندر ہی کسی کمرے میں ہوں مگر یہ کمرا کہاں ہے' یہ تو میں نے پوچھا تھا نہ زینت نے بتایا تھا۔ کیا اسپتال کے کمرے ایسے خالی پڑے رہتے ہیں؟ ابھی تک کسی مریض کو یہاں نہیں بھیجا گیا۔ تو کیا یہ بھی حسن انتظام کا کرشمہ تھا۔ یہاں غلطی سے بھی کوئی ڈاکٹر نہیں آیا۔ کوئی نرس نہیں آئی۔ میں نے ڈاکٹروں کے حلیے والے ایک جوان اور خوبرو شخص کو ایک بار دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کون تھا' دوبارہ نظر نہیں آیا۔

میرا جسم دس منٹ بعد گرم ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے حرارت میرے جسم سے خارج ہونے لگی ہے۔ یہ بخار سے کچھ مختلف کیفیت تھی۔ اس میں حرارت کی لہر اندر ہی اندر پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں ایک نرس کے اناڑی پن کی وجہ سے میں انجکشن کے مضر اثر ری ایکشن کا شکار نہ ہوجاؤں۔ ڈاکٹرز سائڈ افیکٹ کو سمجھتے ہیں اور ان پر قابو بھی پالیتے ہیں۔ نرس تو بس انہیں دیکھ کے سیکھتی ہے اور نیم حکیم بن جاتی ہے۔

زینت نے اب جونی کا ساتھ دینے پر اتفاق کرلیا تھا۔ جونی اسے سمجھا رہا تھا کہ یہ کام کیسے ہوگا۔ وہ پانچ پانچ لاکھ کیسے وصول کریں گے اور اس کے بعد خود کو ملک رب نواز کے عتاب سے کیسے بچائیں گے۔ سات بجے زینت نے اسے بھوک کا بہانہ کرکے ناشتا لانے کے لیے کینٹین بھیج دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ وہ اپنا اطمینان کرلینا چاہتی تھی کہ شک کی بنا پر جونی باہر کھڑا ہو کے کچھ سننے کی کوشش تو نہیں کررہا ہے۔

دوبارہ دروازہ بند کرکے وہ میری طرف آئی۔ "ہاں جی اب کیسا لگ رہا ہے؟"

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم نے تو جادو کردیا ہے۔"

وہ مسکرائی "ابھی آدھا گھنٹا اور ٹھہر جاؤ۔ سب بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے دوبارہ لیٹ کے کہا "مجھے ایسی جلدی بھی نہیں۔"

"آپ جونی کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "وہی جو ایسے شخص کے ساتھ ہونا چاہیے' خاتمہ بالخیر۔"

"آپ۔۔۔ مار ڈالو گے اسے؟"

"وہ کون سا تمہارا چاہنے والا ہے یا تمہارا منگیتر کہ تم اس کے لیے پریشان ہو" میں نے کہا "اسے راستے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ گھر میں سانپ ہو تو اسے مار دینا چاہیے۔ باہر کا راستہ نہیں دکھانا چاہیے۔"

"آپ مجھے ... بتا دو ... فون کہاں کروں میں۔"

میں نے کہا "اتنی جلدی کیا ہے؟ اور میرا ایمان بھی اب بدل گیا ہے۔"

"کیا ...؟"

میں نے کہا "اب میں اور تم یہاں سے ایک ساتھ نکل جائیں گے۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "میں ... آپ کے ساتھ ... نہیں جی' پہلے آپ ایک لاکھ تو دو۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تم فون کرو' مگر رقم تو تمہارے اکاؤنٹ میں نو بجے سے پہلے نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔"

اس نے رحیم کا نمبر دہرایا۔ وہ اب سخت گھبراہٹ کا شکار تھی۔

میں نے کہا "یہ اسپتال کا کیسا کمرا ہے' جہاں کوئی نہیں آتا؟"

"یہ اسٹور تھا پہلے۔ ایک لانڈری کے پیچھے۔ لانڈری اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کا ٹھیکا دے دیا گیا ہے کسی کو۔ اسپتال کی لانڈری میں باہر والوں کے کپڑے دھلتے تھے۔ لانڈری چلانے والا خوب کمائی کرتا تھا۔"

"کیا تمہیں کسی نے بھی یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا ہوگا؟"

"مشکل ہے۔ سامنے والا دروازہ بند نظر آتا ہے باہر سے دیکھنے پر۔ دیکھو جی' اب ڈر لگ رہا ہے مجھے' کہیں تم ..."

میں نے کہا "کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ جلدی سے پوچھ لو۔ وہ آنے والا ہوگا۔"

"کہیں تم نے مجھے بھی ... جونی کی طرح ...؟"

میں نے اسے بازو پر تھپکی دی "تم نے میری مدد کی ہے۔ جونی نے کیا' کیا ہے۔ تمہارے احسان کی قیمت میں وعدے کے مطابق ضرور چکاؤں گا۔"

وہ پھر ٹیپ چلا کے اور سر پر ہیڈ فون چڑھا کے بیٹھ گئی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نروس ہے۔ اسے شاید میری بات پر پورا اعتبار نہیں تھا مگر اب وہ کیا کر سکتی تھی۔ جس راستے پر وہ اپنی مرضی سے قدم بڑھا چکی تھی اس پر لوٹ کے جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ جونی کو شریکِ راز کرتی تو آدھی دولت سے بھی محروم ہو جاتی اور جونی کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ الگ مول لیتی۔

جونی نے دستک دی تو وہ گانے پر سر ہلاتی ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے دروازے تک گئی۔ جونی نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔ وہ نئے سرے سے دس لاکھ وصول کرنے کے حق میں دلائل دینے لگا اور زینت کو قائل کرنے لگا کہ جیسے اس نے سوچا ہے' ویسے کرنے میں خطرے کی کوئی بات نہیں مگر زینت ذہنی طور پر غیر حاضر تھی۔ اس کا دماغ اپنی الجھنوں کا شکار تھا۔

جونی نے چٹکی بجائی "اے۔ کہاں ہے تو' میں نے کیا پوچھا تھا؟"

"کیا ... کیا پوچھا تھا؟"

"شادی کرے گی مجھ سے؟" جونی بولا۔

"تجھ سے ... تیری تو شادی ہو چکی ہے۔ دو بچے ہیں تیرے۔"

وہ بولا "پھر کیا ہوا۔ دو تیرے بھی ہو جائیں گے۔ ہم سب مل کے رہیں گے ایک ہی جگہ۔ دس لاکھ ہوں گے ہمارے پاس۔"

زینت گرم ہو گئی "میرا دماغ خراب نہیں ہے جونی کہ پانچ لاکھ تجھے دے کر تیری دوسری بیوی بنوں۔ تو اپنے پانچ لاکھ سے جو چاہے کر۔ میرے پیسوں پر نظر مت رکھ۔ میں خوب سمجھتی ہوں تیری چالاکی کو۔"

"اچھا اچھا۔ جو تیری مرضی۔ اب یہ بتا' اس بندے سے بات کیسے کروں میں؟ ابھی تو یہ ہوش میں نہیں ہے۔ کیا خیال ہے' اب اسے کوئی انجکشن نہ لگائیں تو کتنی دیر میں اسے ہوش آ جائے گا؟"

"آٹھ دس گھنٹے تو رکنا پڑے گا" زینت نے کہا۔

"آٹھ دس گھنٹے! یہ تو بڑا رسک ہے زینت!"

"رسک کیسا؟"

"اس سے پہلے ہی سونے کی چڑیا اڑ نہ جائے" وہ بولا "ملک رب نواز کو ابھی تک موقع نہیں ملا ہے ورنہ وہ اسے لے جاتا۔"

"کیا ابھی تک پولیس ہے باہر؟"

"ہوگی۔ میں نے دیکھا نہیں۔ سادہ کپڑوں میں ہو تو پتا کہاں چلتا ہے۔ تو سوچ کوئی طریقہ کہ بندہ ایک دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے۔"

"ہم اسے دوسرا انجکشن نہ لگاتے تو اچھا تھا۔"

"غلطی ہو گئی ہم سے۔ کوئی ایسا انجکشن نہیں ہوتا جسے لگانے سے پہلے کا اثر ختم ہو جائے؟"

"ہوتا ہے مگر تجھے پھر وہیں جانا پڑے گا' فضل دین اینڈ سنز۔"

وہ بولا "مال روڈ پر۔ وہ تو بہت دور ہے۔"

"ہاں۔ تھوڑی دیر ٹھہر جا۔ میں اسپتال کے اسٹور سے لے آؤں گی۔ اسٹور آٹھ بجے کھلتا ہے۔"

وہ بولا "دیکھ زینت! یہ بہت ضروری ہے ورنہ ساری عمر پچھتائیں گے۔ بہت اچھا موقع مل رہا ہے تقدیر بدلنے کا۔"

"ایسے بات کر رہا ہے تو جیسے سچ مچ دس لاکھ مل گئے ہیں۔ اتنا بھروسا ہے تجھے اس بندے پر؟"

جونی نے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ بندہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

"اٹکلیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں جونی!"

"یہ رسک تو لینا پڑے گا زینت۔ نو رسک' نو گیم۔"

زینت نے کہا "میرے ساتھ کوئی چار سو بیسی کی تو اچھا نہیں ہوگا جونی۔ میں اسے بتا دوں گی سب۔ وہ جو تیرا ملک رب نواز ہے۔"

جونی ہنسنے لگا "دھوکا کرتے ہیں شریف لوگ۔ چور ڈاکو اور ہم جیسے دھندے کرنے والے بے ایمانی نہیں کرتے آپس میں۔"

ان کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ زینت نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ وہ اب آدھی دولت جونی کو دینے پر راضی ہو گئی ہے۔ شاید وہ خود عورت ہونے کی وجہ سے عدم اعتماد کا شکار تھی اور اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں دس کے لالچ میں پانچ بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ اس کا دھندا کچھ اور تھا۔ ایسے معاملات میں جونی ماہر تھا اور اس کے تجربے پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ انگریزی کے ایک محاورے کا مطلب کچھ یوں ہوتا ہے کہ اس شیطان کے مقابلے میں جسے آپ نہیں جانتے وہ شیطان بہتر ہے جسے آپ جانتے ہیں۔

زینت نے اس محاورے پر عمل کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ اس کے پاس تھوڑی بہت عقل ضرور ہے۔ میرے لئے بھی جونی سے نمٹنا کچھ مشکل تھا۔ زینت شاید جونی کے قتل کے خیال سے بھی ڈرتی تھی۔ میری مدد کر کے اس نے صرف ملک رب نواز کے اعتبار کو دھوکا دیا تھا۔ یہ جرم تھا تو صرف رب نواز کی نظر میں۔ قانون کی نظر میں نہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جونی مارا گیا تو معاملہ سنگین ہو جائے گا پھر پولیس آئے گی اور تفتیش ہوئی تو اس کا نام بھی لیا جائے گا۔ ملک رب نواز نے اسے نہیں دیکھا مگر کیا پتا وہ زینت کے نام سے واقف ہو۔ جونی نے اسے مطمئن کرنے کے لئے سب بتایا ہوگا کہ یہ کام وہ کیسے اور ... کی مدد سے کرے گا اور پورا اطمینان کیے بغیر ملک نے یہ ذمے داری جونی کو نہیں سونپی ہوگی۔ وہ جانتا ہوگا کہ فلاں اسپتال میں فلاں نرس اس کی مدد کرے گی اور قیدی کو فلاں جگہ رکھا جائے گا۔

میرے لئے جونی بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب مجھے وہی کرنا تھا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اصل کام زینت نے کیا تھا اور ساری قیمت اس ایک انجکشن کی تھی جو زینت نے مجھے نہیں لگایا تھا۔ اس کا حکم ایک لاکھ کافی تھا۔ دس لاکھ والی بات صرف مداری کی ڈگڈگی تھی جس کا استعمال وہ صرف کھیل کا رنگ جمانے کے لئے کرتا ہے۔ جونی میری نظر میں اصل مجرم تھا اور ملک رب نواز کا مہرہ ہونے کی وجہ سے اس کا مارا جانا برحق تھا۔

جسمانی طاقت بحال ہونے کے بعد مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھے باندھ کر بے بس رکھنے والی آہنی زنجیریں کٹ گئی ہوں اور میں پوری طرح سے آزاد ہوں۔ اب نہ کوئی زبردستی مجھے انجکشن لگا سکتا تھا اور نہ میرا راستہ روک سکتا تھا۔ میں اس وقت بھی جا سکتا تھا اور جونی جیسے چار بھی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے مگر میں ایک خاص مقصد کے تحت نو بجے تک رکنے کا رسک لے رہا تھا۔ میں زینت کے احسان کا بدلہ ضرور چکانا چاہتا تھا۔

مجھے زینت کے ڈانوں ڈول ہونے پر حیرانی تھی۔ اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے حقیقی عزائم کیا ہیں۔ وہ جونی کو بے وقوف بنا رہی ہے یا مجھے' اور بالآخر وہ کیا کرے گی؟ آخری وقت میں پیچھے ہٹ کے جونی کو مروا دے گی یا خود پیچھے رہتے ہوئے دس لاکھ وصول کرنے کے لئے جونی کو آگے بڑھا دے گی۔ بہرصورت میں زینت کو ہر سزا سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

آٹھ بجے تک وہ دس ناکھ سے خوابوں کے محل تعمیر کرتے رہے۔ یہ سوچتے رہے کہ ملک رب نواز کے عتاب سے خود کو بچانے کے لئے انہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ جان کی سلامتی کے لئے کون سا لائحہ عمل سب سے محفوظ اور مؤثر ہوگا اور کیا اپنی وفاداریاں مجھ سے وابستہ کرنا سب سے بہتر دفاع نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

آٹھ بجے جونی نے کہا "جا' وہ انجکشن لے آ۔"

زینت نے کہا "ایسی کیا جلدی ہے۔ آٹھ تو بجنے دے۔ ابھی دو منٹ ہیں اور اسٹور کون سا ٹھیک آٹھ بجے کھل جاتا ہے۔ سوا آٹھ بجے جاؤں گی۔"

"میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ انجکشن یہاں نہ ملا تو پھر مجھے جانا پڑے گا۔ اس معاملے میں ہم اور دیر نہیں کر سکتے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زینت کو جانا پڑا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹے لیٹے تھک گیا اور صبر و سکون کا ہر لمحہ میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کے جونی سے کہوں "ہیلو برادر!" اور جب اسے ایک لاکھ ڈولٹ کا شاک لگے تو میں ایک جست میں اس کے پاس پہنچ کے اسے ناک آؤٹ کردوں۔ زینت لوٹ کے آئے تو کھیل ختم ہو چکا ہو۔

لیکن میں نے رسک لینے سے گریز کیا۔ جونی کے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا ہو۔ میرے اٹھتے ہی وہ ریوالور نکال لے اور جب میں جست لگاؤں تو وہ مجھے ایسے نشانہ بنالے جیسے ماہر شکاری اڑتی چڑیا کو گرا لیتے ہیں۔

زینت کتنی دیر بعد واپس آئی۔ اس کا اندازہ میں گھڑی دیکھے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ طوالت انتظار کے حساب سے وہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تھا۔ جونی بھی بے چینی میں کمرے کو اپنے قدموں سے ناپتا رہا تھا۔ جب دستک پر اس نے دروازہ کھولا تو میں نے آنکھیں کھول کے زینت کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس کی رئیس سے یا فرید عباسی سے بات ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر شکایت یا برہمی اور مایوسی نہیں تھی۔ وہ خوش اور مطمئن نظر آتی تھی۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے ذو معنی بات کی "میرا کام ہو گیا؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جونی نے اس کا دوسرا مطلب سمجھا "مل گیا انجکشن۔ ویری گڈ لگادے اسے فوراً۔"

میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا۔ جونی کو قابو میں کرنے کے لئے سب سے مناسب وقت وہی ہو گا جب زینت مجھے انجکشن لگائے گی اور جونی میرے قریب کھڑا ہو گا۔ انجکشن زینت کے ہاتھ میں تھا اور وہ سرنج بھر رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ محض بی کمپلیکس کا انجکشن تھا۔

زینت مجھ پر جھکی۔ میں نے جونی کو اس کے ساتھ ہی کھڑا دیکھا۔ اس کی ساری توجہ سرنج اور میرے بازو کی طرف تھی۔ میں ایک دم اٹھا اور میں نے جونی کی گردن دبوچ کے اسے زمین سے اوپر اٹھالیا۔ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے سامنے بیڈ پر دے مارا۔ جونی کے لئے یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کی ٹکر لگنے سے زینت دور جا پڑی اور اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔

جونی گرتے ہی سنبھل گیا۔ خلاف امید وہ اچھا فائٹر ثابت ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو اکڑا کے کمان کی طرح کیا اور ایک جھٹکے سے مجھے اوپر اچھالا۔ میرے پیچھے ہٹتے ہی وہ تڑپ کے اٹھا۔ میں نے اس پر جست لگائی مگر وہ بڑی پھرتی سے بیٹھ گیا۔ میں نے گرتے گرتے اس کے منہ پر لات ماردی۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ پیچھے کی طرف گرا۔

میرے اٹھنے تک اس کا ہاتھ اپنی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا لیکن اسے فائر کرنے کی مہلت نہ ملی۔ زینت میرے بہت قریب تھی۔ میں نے اسے اٹھا کے جونی پر پھینک دیا۔ اگر وہ سیفٹی کیچ ہٹا کے گولی چلانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا نشانہ زینت بنتی۔

زینت نے ایک اور چیخ ماری پھر جونی نے اسے گالی دے کر دھکیلا اور فرش پر پٹخ دیا۔ یہ مشکل سے پانچ سیکنڈ کا وقفہ تھا جس میں مجھے دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ڈنڈا نظر آگیا۔ یہ تقریباً ڈھائی فٹ لمبا اور ڈھائی انچ موٹا پکدار دھات کا اسپرنگ والا ڈنڈا تھا۔ اسپرنگ اس کے اندر تھا۔ اس کے دونوں کنارے زیادہ موٹے اور گول تھے۔ یہ بازو کے مسل کی ایکسرسائز میں استعمال ہونے والا ڈنڈا تھا جسے دونوں کناروں سے تھام کے موڑا جاتا تھا۔ اس میں بہت طاقت صرف ہوتی تھی اور اس کا وزن بھی کافی تھا۔ مجھے یہی ڈنڈا مار کے بے ہوش کیا گیا تھا۔

قریب جا کے ڈنڈا مارنے کے بجائے میں نے اسے گھما کے پھینکا۔ یہ ایک ساتھ جونی کے ہاتھ اور منہ پر لگا۔ اوپر والے حصے نے جونی کے سامنے والے دانت توڑ دیے اور نچلے حصے نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو کچل دیا۔ فولادی دستے والے ریوالور کی گرفت خود بخود ختم ہو گئی۔

جونی نے مجھے چلا کے ایک فحش گالی دی اور فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ وہ بلیک بیلٹ نہ سہی جوڈو کراٹے کی تربیت ضرور لے چکا تھا اور پریکٹس میں بھی تھا مگر اس کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔ میں نے اسے فرش پر قدم جمانے کا موقع نہیں دیا اور گھوم کے اس کا ایک پیر پکڑ لیا پھر میں خود گھوم گیا۔ جونی ہاتھ پھیلا کے تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ اس کی لمبائی پونے چھ فٹ کے قریب تھی اور دیوار مجھ سے پانچ فٹ دور بھی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس کا سر ایک دھماکے سے دیوار پر لگا۔ اس وقت جونی ایک دائرے میں سفر کر رہا تھا اور اس کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ سر کے دیوار سے ٹکراتے ہی اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی اور میں نے اسے چھوڑا تو وہ فرش پر گر کے ساکت ہو گیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کے ریوالور پر قبضہ کیا۔ زینت دیوار سے لگی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھ رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی "یہ ۔۔۔ کیا ۔۔۔ یہ ۔۔۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ مرگیا ہے۔ خود اپنی غلطی سے۔ اگر یہ مقابلہ نہ کرتا تو میں اسے بے ہوش چھوڑ دیتا۔"

"اب ۔۔۔ اب کیا ہوگا؟" زینت کانپنے لگی۔

"میں بتاتا ہوں" میں نے کہا "یہاں سے ہم جائیں گے سیدھے تمہارے کوارٹر میں جہاں تم نے سونی کو رکھا ہے۔"

اس نے بولنے کی کوشش کی "میں نے تو ۔۔۔"

میں نے کہا "شٹ اَپ۔ تم جونی کے ساتھ اس کے جرم میں برابر کی شریک تھیں۔ تمہاری مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ تمہارا دوسرا جرم زیادہ سنگین ہے۔ ایک اسپتال میں نرسنگ کے قابلِ احترام پیشے کی آڑ لے کر تم نے جسم فروشی کی دکان سجا رکھی ہے لیکن میری جان بچا کے تم نے وعدہ معاف گواہ جیسی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ تم سزا سے بچ گئی ہو اس بار ۔۔۔"

وہ رونے لگی "اس کا مطلب ہے تم نے دھوکا دیا مجھے؟"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "الو کی پٹھی۔ دھوکا دینا جرم ہے تیری نظر میں اور جو کچھ تو نے کیا؟ میرے اور سونی کی زندگی کی قیمت ہی۔ صرف دس ہزار روپے۔ اصولاً تو تجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہئے۔ وہ خود اعترافِ جرم کرالیں گے۔"

وہ لرزنے لگی "نہیں نہیں ۔۔۔ وہ بہت بے رحم لوگ ہوتے ہیں۔"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کے کھینچا "چل آگے ہو اور اپنی صورت ٹھیک رکھ کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے۔"

اس نے پلٹ کے جونی کی لاش کو دیکھا۔ "اس کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "تو اپنی فکر کر کہ تیرا کیا ہوگا۔ اسپتال کے آس پاس پولیس موجود ہے۔ ملک رب نواز کے بندے کھڑے ہیں اور میرے آدمی بھی۔ تینوں تیرے دشمن ہیں۔ ایک لاکھ لے کر اپنی نحوست زدہ صورت اور مکروہ جسم کے ساتھ کہیں دفع ہوجا جتنی جلدی ممکن ہو۔"

"ایک لاکھ ۔۔۔!"

"ہاں۔ میں نے وہ اپنی زندگی کا صدقہ سمجھ کے دیے ہیں لیکن آج کے بعد مجھے تیری شکل اس اسپتال میں نظر نہیں آنی چاہئے۔ جگہ ملتی ہے تو کسی کوٹھے پر چلی جا مگر یہ نرس کی یونیفارم اتار دے۔"

اس خیال سے وہ کچھ مطمئن ہوئی کہ ایک لاکھ بہرحال اسے مل گئے ہیں "میں چلی جاؤں گی استعفیٰ دے کر۔ آج ہی استعفیٰ دے دوں گی" اس نے دروازہ کھولا اور میں نے اپنے سامنے ایک وسیع ہال سا دیکھا جس میں ایک طرف بہت سا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ پرانے زنگ خوردہ گیزر، ٹوٹی ہوئی میزیں اور کرسیاں۔ ایک گیس سلنڈر جو یقیناً ناکارہ ہوگیا تھا۔ خراب ہوجانے والا سینیٹری کا سامان۔ بغیر ٹائروں والی ایک سائیکل اور بغیر پہیوں والی ایک موٹر سائیکل کا صرف ڈھانچا۔ ہر چیز پر مہینوں کی گرد نظر آرہی تھی۔

ہال کو ہم نے چوڑائی کے رخ کراس کیا۔ ایک دروازے کی کنڈی کھول کے زینت نے باہر جھانکا۔ "پولیس ہے باہر۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں۔ ہوسکتا ہے تمہاری فون کال کا پتا چلا لیا گیا ہو۔ میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "کیا ۔۔۔ میری آواز بھی ریکارڈ کرلی ہوگی انہوں نے؟"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے۔ تم نے اپنا اکاؤنٹ نمبر دیا تھا؟"

اس نے مردنی سے سر ہلایا "اس سے انہیں سب معلوم ہوجائے گا۔ میرا نام اور پتا۔"

میں نے کہا "میں کوشش کروں گا تمہیں بچانے کی۔ اب چلو۔"

اس نے کہا "ایک منٹ۔ میں منہ دھولوں ۔۔۔ اور میری اجازت سے پہلے ہی دروازے سے اس کونے کی طرف چل پڑی جہاں ایک واش بیسن لگا ہوا تھا۔ اس نے منہ دھوتے ہوئے تھوڑا سا پانی پیا اور نارمل نظر آنے لگی۔ ہال کی کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے میں دن کے اجالے کو دیکھ سکتا تھا جو ایک نئی زندگی کی نوید دیتا محسوس ہوتا تھا۔ دو دن تک میں ایک کال کوٹھری میں تھا جہاں سزائے موت کے خطرقیدی رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ ابھی میری زندگی باقی تھی اس لئے سزا کے فیصلے پر عمل درآمد کرانے والے کچھ نہ کرسکے۔ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست تھا کہ میں زندہ سلامت نکل آیا۔

اسپتال میں پولیس کا نظر آنا ایک معمول کی بات ہے لیکن زینت اس لئے ڈر گئی تھی کہ وہ مجرم تھی۔ پرانی لانڈری والا حصہ اسپتال کے پیچھے اسٹاف کوارٹرز کی تین قطاروں کے بعد تھا۔ یہ اسپتال کا شمال مشرقی کونا تھا۔ درمیان میں شعبۂ حادثات کی سڑک تھی جس پر صرف ایمبولینس یا مریض کو لانے والی گاڑی کو آنے کی اجازت تھی۔ سڑک کے پار

فارمیسی اور کینٹین کے بورڈ نظر آرہے تھے۔ زیادہ لوگ ادھر دکھائی دیتے تھے۔

اسٹاف کوارٹر بھی دو طرح کے تھے۔ ایک کمرے والے اور دو کمرے والے۔ پیچھے والی دو قطاریں چھوٹے کوارٹروں کی تھیں اور ان میں صرف نرسیں نہیں رہتی تھیں، پیرا میڈیکل اسٹاف، وارڈ بوائے، لیب ٹیکنی شن وغیرہ بھی رہتے تھے۔ یہ کوارٹر نچلے درجے کے اسٹاف کے لئے بنے تھے مگر ان پر وہ قابض تھے جو سفارش اور اثر رسوخ رکھتے تھے۔ نرسوں کے دو کمرے والے کوارٹروں میں ڈاکٹر رہتے تھے جو اکیلے تھے۔ یہاں اس وقت کوئی نظر نہیں آرہا تھا اس کی وجہ یہ بھی کہ دن کی ڈیوٹی والے جاچکے تھے اور رات پر ڈیوٹی دے کر آنے والے سو گئے تھے۔

زینت کا کوارٹر ایک قطار میں آخری تھا۔ وہ باہر کے دروازے کا تالا کھول رہی تھی کہ کسی عورت نے پیچھے سے چلا کے کہا "اے زینت۔ کہاں ہے تو؟ تیری تلاش ہو رہی ہے کب سے؟"

زینت اچھل پڑی "کیوں ۔۔۔ کون تلاش کررہا ہے؟"

"اپنے ایڈم صاحب اور کون؟" وہ بولی۔ ایڈم غالباً ایڈمنسٹریٹر کا مخفف تھا۔

زینت نے بڑی مشکل سے کہا "میں ۔۔۔ کل رات چلی گئی تھی۔ میرا ایک رشتے دار فوت ہوگیا تھا۔"

"تو کسی کو بتا کے جاتی، ڈیوٹی چھوڑ کے چلی گئی تھی۔"

"میرا ۔۔۔ میرا آف تھا کل۔ خیریت تو ہے نا؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ بھی کوئی نرس ہی لگتی تھی مگر زینت کے مقابلے میں وہ بہت بدصورت اور بھاری بھرکم تھی۔ وہ ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھے مجھے مشکوک نظروں سے تاک رہی تھی۔ مجھے اس خیال سے بڑی شرم آئی کہ زینت کے ساتھ دیکھنے والا مجھے ایک بدکردار شخص کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔

"کوئی گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔ تو چل لے ابھی جا کے ایڈم صاحب سے۔" موٹی نرس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یہ کون ہے؟"

"کزن ہے میرا۔ یہی خبر لایا تھا۔ مجھے چھوڑنے آیا ہے۔"

رشتے دار کی موت کی خبر پر اس نے ذرا بھی افسوس یا ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا اور میرے تعارف پر وہ ہنس پڑی۔ شاید ایسے جھوٹ وہ زینت سے سنتی ہی رہتی تھی۔ زینت نے دروازہ کھولا اور بند کرکے اسے ایک گالی دی "حرام زادی۔ کتی۔"

اندر والے ایک کمرے کو بھی باہر سے مقفل کردیا گیا تھا۔ میں نے زینت کی بات اَن سنی کرکے کہا "جلدی کھول اسے سؤر کی بچی! وقت ضائع کررہی ہے۔"

اس نے قفل کھولا ہی تھا کہ میں اسے دھکا دے کر اندر پہنچ گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک بستر خالی پڑا تھا جس پر سونی کو باندھ کے رکھا گیا تھا۔ ناکلون کی نئی رسی بھی وہیں موجود تھی۔ میں نے دل میں درد کے خنجر کو اترتا محسوس کیا۔ سونی جیسی نازک لڑکی کو کس سفاکی سے یہاں باندھ کے ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والا کون تھا؟ دو دن اس نے کیسے گزارے؟ اب وہ کہاں ہے؟ رسی کے لمس نے میرے ذہن میں ایسے بہت سے سوالوں کے انگارے بھردیے۔ خون میری رگوں میں تیزاب کی طرح سنسنانے لگا۔

میں نے پلٹ کے زینت کی گردن دبوچ لی "سونی کہاں ہے؟"

اس کی سانس رکنے لگی "مجھے ۔۔۔ خدا کی قسم ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے ہاتھ کی گرفت اور سخت کردی "میں معلوم کیے بغیر تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ بتا کون تھا یہاں سونی کے علاوہ؟"

وہ تڑپی اور نفی میں گردن ہلانے لگی "کوئی ۔۔۔ کوئی نہیں۔"

میں نے اسے بیڈ پر پھینک دیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک شیلف پر رکھی ہوئی چھری اٹھالی۔ "میں ذبح کردوں گا تجھے۔ تیری کھال اتار کے دروازے پر ٹانگ دوں گا۔ بتا سونی کہاں ہے؟ بول نہیں تو تیری یہ انگلی الگ کرتا ہوں۔"

وہ چیخی "میں ۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔ وہ ۔۔۔ جونی اسے لایا تھا۔ اس کا نام نہیں معلوم۔ انیس بیس سال کا لڑکا تھا۔ ڈرائیور ہے وہ۔ کسی پولٹری فارم کا ٹرک چلاتا ہے۔ یہاں مرغی سپلائی کرتا ہے کینٹین میں۔"

"پرل پولٹری پروڈکٹ کا ٹرک چلاتا ہے؟"

"مجھے ۔۔۔ مجھے یہ سب نہیں معلوم۔ جونی نے اسے کہا تھا ۔۔۔ یہ بہت خطرناک لڑکی ہے۔ اسے کھولنا مت ۔۔۔ ورنہ مارا جائے گا تو۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ٹیپ تھی۔ میں آتی تھی دن رات میں کئی بار اسے کھانا دینے۔ جونی میرے ساتھ آتا تھا۔ میں خود کھانا کھلاتی تھی اسے اپنے ہاتھوں سے۔"

"اس وقت میرے ساتھ کون ہوتا تھا؟"

"وہ لڑکا۔ ریوالور لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ رات کو باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوتا تھا صحن میں۔ دن کے وقت کوئی نہیں ہوتا تھا یہاں۔"

"او مائی گاڈ!" میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی "اسے بے ہوش کر کے نہیں رکھا گیا تھا میری طرح۔ وہ بڑی اذیت میں ہوگی۔"

"اسے نیند کی گولی دی جاتی تھی۔"

"تو نے کل رات دیکھا تھا اسے؟" میں نے زینت کے بال پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔

تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "دیکھا تھا۔ دس بجے کھانا کھایا تھا اس نے۔ اس وقت بالکل ٹھیک تھی وہ۔"

میں نے اسے گرا دیا "اس وقت وہ بھی تھا؟ وہ ٹرک ڈرائیور؟"

"ہاں۔ باہر چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کا ٹرک وہاں کھڑا تھا۔ کینٹین کے پاس۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم۔"

"اس تالے کی چابی تھی اس ڈرائیور کے پاس۔"

"ہاں۔ باہر والے تالے کی ایک چابی تھی۔ وہ اندر نہیں جا سکتا تھا۔ خود جونی نے۔۔۔ اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ حالانکہ دل بہت بے ایمان ہو رہا تھا اس کا۔" زینت بری طرح لرز رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ زینت جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ ایک لاکھ اس کو مل جائیں گے۔ وہ پہلے ہی ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اب اس کے لئے یہ ناگزیر تھا۔ وہ جان بچا کے فرار ہونے کی مہلت چاہتی تھی۔

میرے لئے سوچ بچار میں وقت گنوانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سونی کے بارے میں دو ہی باتیں فرض کی جا سکتی تھیں۔ یا وہ اپنی کوشش سے آزاد ہو کے نکل گئی یا اسے وہ ٹرک ڈرائیور لے گیا۔ پولٹری فارم کے ٹرک میں چھپا کے۔ پولیس نے اس پر شک نہیں کیا ہوگا مگر کیا فرید اور رئیس نے بھی پرل پولٹری پروڈکٹ کے ٹرک کو نہیں دیکھا تھا؟ وہ یہاں موجود ہوتے تو یہ ناممکن تھا کہ سونی کو اس ٹرک میں ڈال کے لے جایا جاتا اور انہیں پتا نہ چلتا۔

میں نے کہا "کینٹین میں ٹیلی فون ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔"

میں نے کہا "چل اٹھ۔ کچھ پیسے ہیں تیرے پاس تو مجھے ادھار دے دے۔"

اس نے خاموشی سے اٹھ کے شیلف پر بچھا ہوا اخبار اٹھایا اور اس کے نیچے سے سو کے دو نوٹ نکالے۔ میں نے دونوں لے لیے۔ میں نے دیوار پر نصب آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بہت بدلی ہوئی لگی۔ میرے سر اور داڑھی کے بال بڑھ کر بے ترتیب ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں میں وحشت تھی اور ان کے گرد حلقے دیکھ کے لگتا تھا جیسے میں برسوں کا بیمار ہوں۔ میرے کپڑے گندے اور پُرشکن تھے۔

شاید جونی کی دلیل نے زینت کو قائل کر لیا تھا کہ شیر کے مقابل دوسرا شیر ہی کھڑا ہو سکتا ہے ورنہ حلیے سے میں کوئی آوارہ گرد فقیر یا دیوانہ نظر آتا تھا۔ ابھی حلیہ درست کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں ان جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جو میرے حلیے کو مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار بناتے تھے۔ زینت کے گھر میں سر سے مردانہ کپڑے ہی نہیں تھے کہ میں بدل سکتا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے بالوں میں کنگھی پھیرنے میں ایک منٹ صرف کیا اور زینت کے ساتھ باہر آ گیا۔

کینٹین کی طرف چلتے ہوئے میں نے کہا "دیکھو۔ میں تمہیں ایک لاکھ دے چکا ہوں لیکن اس دولت سے اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے تمہارا زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔ اگر تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا یا مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا جیسے میں نے جونی کو مارا۔"

"میں۔۔۔ میں تم سے۔۔۔ تعاون کر رہی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جونی کا ساتھ دے کر اور پھر ساتھ چھوڑ کے تم نے کتنے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے اور وہ سب کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔ وہ بہت خطرناک دشمن ثابت ہو سکتے ہیں تمہارے۔"

"میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ کیا تم میری حفاظت کرو گے؟ جب تک میں باہر نہیں چلی جاتی؟"

"مجھ پر بالکل اعتبار مت کرنا۔ میں تمہارا ہمدرد یا دوست نہیں ہوں۔ وہ ایک ضرورت تھی جس نے وقتی طور پر ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ تم نے میری جان بچائی اور اس کے بدلے میں تم کو ایک لاکھ نقد مل گئے۔ میں نے تمہیں کوئی سزا بھی نہیں دی لیکن میں تم سے تمہارے دوغلے کردار سے اور تمہاری صورت سے نفرت کرتا ہوں۔"

وہ مایوس نظر آنے لگی "میں نے جو کیا مجبوری میں کیا۔"

"بکواس۔ کوئی شخص جسے دو میں سے ایک راستہ منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہو وہ کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ دوسری

بہت سی باکردار لڑکیوں کی طرح تو بھی صرف نرسنگ کر سکتی تھی اور مقدس پیشے کی محدود آمدنی میں قناعت سے بسر کر سکتی تھی۔ جسم فروشی خود تو نے عیاشی کی زندگی کے لالچ میں شروع کی۔ تو جونی کو انکار بھی کر سکتی تھی مگر تو نے دس ہزار کی خاطر ایک سنگین جرم میں اس کی مددگار بننا قبول کیا۔ ایسے لوگ کم نہیں جن کے لئے صرف ایک جھوٹ بول کے۔ غلط کو صحیح مان کے یا باطل کو حق تسلیم کر کے زندہ رہنے کا موقع مل سکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔"

وہ میری باتوں سے مرعوب اور متاثر نظر آنے لگی "ناصر صاحب! آپ کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "فضول ہیں یہ باتیں۔ یہ بتاؤ، کینٹین والا تمہیں جانتا ہے۔"

اس نے سر ہلایا "میں یہی فون استعمال کرتی ہوں۔ وہ میرے پیغامات بھی لیتا ہے۔"

"یعنی ایک طرح سے دلال ہے تمہارا۔ کیا یہاں سے فون کرنا ٹھیک ہوگا؟ اور کوئی فون نہیں ہے یہاں؟"

"باہر پی سی او ہیں لیکن نزدیک کوئی نہیں۔"

کینٹین کے اندر بہت شور تھا۔ لوگوں کی باتیں کرنے کا۔ ویٹرز کی چیخ پکار کا۔ برتنوں کے ٹکرانے کا اور کرسیوں کے گھسیٹے جانے کا۔ کینٹین کا مالک چالیس سال سے زیادہ عمر کا بھاری بھرکم شخص تھا جو کاؤنٹر کے پیچھے کرسی میں پھنسا ہوا اس وقت بھی کچھ کھا رہا تھا۔ مسلسل بیٹھنے اور کھانے سے اس کی توند قابلِ مذمت حد تک پھیل گئی تھی۔ اس کا سر استرے سے بالکل صاف کر دیا تھا۔

اس نے زینت کو بدمعاشی کی پُرہوس نظروں سے دیکھا تو اس کا کردار اور واضح ہو گیا۔ غالباً وہ ٹیلی فون کالوں کا مہینے بھر کا بل زینت سے ایک ہی رات میں وصول کر لیتا ہوگا۔ اس نے زینت کے سوال پر کہا "جان حاضر ہے جی۔ فون کیا چیز ہے، مگر بھئی یہ کیا چیز ہے۔" اور فون میری طرف کھسکا دیا۔

زینت نے پھر پہلے والی بات کی "کزن ہے میرا۔"

وہ بے شرمی سے ہنسا "اوجی کزن تو ہم بھی ہیں۔ بادے آدم کی ساری اولاد کزن ہی ہے۔ آپس کی بات ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس مرغیاں کہاں سے آتی ہیں؟"

وہ کچھ حیران ہوا "کزن صاحب جی۔ مرغی انڈے سے نکلتی ہے اور انڈا مرغی میں سے نکلتا ہے، آپس کی بات ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا، سپلائی کون کرتا ہے۔ دراصل مجھے اس لڑکے سے کام تھا جو پولٹری والوں کا ٹرک چلاتا ہے۔ پرل پولٹری پروڈکٹ کا۔"

"اچھا اچھا" اس نے اپنے صاف سر پر ہاتھ پھیرا۔ "شوکت کا پوچھ رہے ہو۔ ابھی تو اس کا ٹرک ادھر ہی کھڑا تھا۔"

میں نے کہا "اب نہیں ہے اور فون پر رئیس خانے کا نمبر ملانے لگا۔

فون رخشی نے اٹھایا "جی ہیلو!"

میں نے کہا "رخشی۔ کیا سونی واپس پہنچ گئی ہے؟"

میرا آدھا سوال سن کے ہی وہ چیخ پڑی تھی "ناصر۔۔۔ ناصر، کہاں ہو تم۔ کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

میں نے سخت لہجے میں کہا "میں نے کیا پوچھا تھا تم سے؟"

"سونی۔۔۔ نہیں، یہاں تو نہیں پہنچی مگر تم۔" وہ سخت نروس تھی۔

میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔ باقی بعد میں بتاؤں گا۔ فرید اور رئیس کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ جیک گئے تھے۔ کسی عورت نے فون کیا تھا اور تمہارا پیغام دیا تھا۔ زینت نام تھا اس کا۔ کون ہے یہ زینت؟"

میں نے کہا "پھر بتاؤں گا۔ کتنی دیر ہوئی انہیں گئے ہوئے؟"

"ایک گھنٹا، کچھ زیادہ۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو، وہ خود آئیں یا فون آئے ان کا تو انہیں بتا دینا کہ میں مرغی خانے جا رہا ہوں۔ پرل پولٹری پروڈکٹ۔"

"سب کتنے پریشان ہیں تمہارے لئے۔ دن رات بھاگے پھر رہے ہیں۔ اسپتال سے تم کہاں چلے گئے تھے" وہ ساری باتیں ابھی کرنا چاہتی تھی۔

"رخشی، میں جلدی میں ہوں۔ مجھے شک ہے کہ سونی کو وہ لوگ پکڑ کر لے گئے ہیں۔ نجم کی کوئی خیر خبر ملی؟"

"کوئی نہیں۔ آزاد صاحب نے اس کے اغوا کی ایف آئی آر لکھوائی ہے اور سارے اخبار حکومت کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ پولیس اور محکمہ داخلہ پر سخت دباؤ ہے۔ شاید آج صحافیوں کی طرف سے کوئی تنظیم ہائی کورٹ میں بھی رٹ دائر کرے گی، اداریے لکھے ہیں۔"

میں نے کہا "ایف آئی آر میں کس پر شک ظاہر کیا گیا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"منشیات کی ایک مافیا پر۔ ان کے کچھ رابطوں پر شبنم نے رپورٹ شائع کی تھی۔"

"رب نواز نے کچھ نہیں کیا۔"

"رپورٹ اس نے بھی لکھوادی ہے مگر شک کسی پر ظاہر نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم آزاد صاحب کو بتادینا میرے بارے میں۔"

کینٹین کا مالک میری طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ وہ زینت کے ساتھ ذومعنی الفاظ میں نہایت فحش قسم کی گفتگو کرکے محظوظ ہورہا تھا۔ ہر بے ہودہ مطلب رکھنے والے جملے کے آخر میں وہ کہہ دیتا تھا "آپس کی بات ہے" زینت اس طرز گفتگو کی عادی تھی اور شاید اس کے نزدیک فحاشی کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ میں نے فون کال کے پیسے دینے چاہے تو اس نے کہا "اوجی' جانے دو' آپس کی بات ہے۔ ہماری طرف سے یہ پیسے اس کھاس پھوس کی صفائی پر خرچ کردینا۔ نہانے کے لئے صابن کی چاکی خرید لینا۔ عید کو تو بہت دن ہوگئے۔"

میں نے اس کے مشورے کا برا نہیں مانا۔ ضرور میرے جسم سے ایسی بدبو اٹھ رہی ہوگی جیسے میں عید کے بعد سے اب تک نہایا نہیں ہوں اور میرے چہرے پر بال واقعی جنگلی گھاس کی طرح بے ترتیبی سے پھیل چکے تھے۔

میرے پاس صرف وہی دوسو روپے تھے جو مجھے زینت نے دیے تھے اور اب یہ رقم مجھے کم لگ رہی تھی۔ مجھے ٹیکسی میں شیخوپورہ روڈ پر اس مرغی خانے جانا تھا جہاں درپردہ بہت سے غیرقانونی دھندے چل رہے تھے اور ان سب کو چلانے والا ہاتھ ملک رب نواز کا تھا۔ شبنم کی بازیابی کے لئے ہماری ایک چھاپا مار کارروائی کی ناکامی کے باوجود مجھے شک تھا کہ سونی کو وہیں لے جایا گیا ہوگا۔ اس کارروائی کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کینٹین والے کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق شوکت نام کا وہ ٹرک ڈرائیور تھوڑی دیر پہلے وہاں موجود تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ آج مرغی خانے میں رب نواز سے ملاقات ہوگی۔ وہ میری طرف سے مطمئن تھا کہ جونی نے مجھے ہسپتال کے اندر ہی حنوط شدہ مصری ممی کی طرح بحفاظت اتار رکھا ہے اور میرا دنیا سے اٹھنا تو ممکن ہے مگر بیڈ سے اٹھنا ممکن نہیں۔ اتنی جلدی دوبارہ کسی کو مرغی خانے کا رخ کرنے کا خیال نہیں آسکتا۔ اس نے مجھے اور سونی کو اس لئے ٹھکانے لگوایا تھا کہ ہم سے اپنے بیٹے دلنواز کے بارے میں معلوم کرے کہ ہم نے اسے کہاں رکھا ہے۔ فرید کی رپورٹ پر یا کسی اور وجہ سے دو دن تک مجھے باہر لے جانا ممکن نہ تھا مگر آج صبح سونی کو اسپتال سے نکال لیا گیا تھا۔ اب یہ بات طے تھی کہ رب نواز خود اس سے پوچھے گا کہ دلنواز کہاں ہے؟

اس قسم کی تفتیش کے لئے مرغی خانہ سب سے موزوں جگہ تھی۔ رب نواز کو سونی کے ساتھ کچھ پرانے ذاتی بدلے بھی چکانے تھے چنانچہ اس تفتیش کے آخری نتیجے میں سونی ایک پرازیت موت سے دوچار ہو تو یہ رب نواز کی نظر میں اس کے کرتوتوں کی بہت مناسب سزا ہوگی۔ شاید شبنم نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ شبنم کے معاملے میں وہ کسی انتہا تک جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور محتاط تھا۔ اب اس کی بازیابی کے لئے دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ شبنم کو چھوڑ دیتا مگر اس سے پہلے رب نواز کا بیٹا دلنواز اغوا کرلیا گیا اور اغوا کرنے والوں نے بدلے میں شبنم کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اب اسے دونوں طرف سے پریشانی تھی۔ وہ شبنم کو غیرمعینہ مدت تک اپنی قید میں نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے بھی کہ آزاد صاحب جیسا بااثر صحافی اس معاملے میں ایک فریق تھا اور یہ جانتا تھا کہ شبنم کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے۔

آزاد صاحب نے جانتے بوجھتے ایف آئی آر میں رب نواز کو ملزم نامزد نہیں کیا تھا۔ یہ اسے ایک رعایت دینے کے مترادف تھا کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شبنم کو چھوڑ دے ورنہ قانون کہاں تک اس کے خلاف کارروائی کے لئے سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرے گا۔ رب نواز کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اب اسے زیادہ پریشانی اپنے بیٹے کی طرف سے تھی۔ اس کا پتا چلانے کے لئے رب نواز نے بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے ایک جال پھیلایا تھا اور یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس میں میرے ساتھ سونی پھنس گئی۔ دل نواز کو اغوا کرنے والوں میں سے وہ سونی کو جانتا تھا۔ دوسرے کو اس نے شبنم کے ڈرائیور کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔

اب اسے موقع ملا تھا کہ سونی سے ہر بات پوچھ لے۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ اطلاع ملنے پر مرغی خانے کا رخ کرے گا اور خود سونی سے پوچھے گا کہ بتاؤ' دلنواز کہاں ہے؟ تیرے ساتھ وہ داڑھی والا یار کون آیا تھا؟ اس کا شبنم سے کیا تعلق ہے؟ ویسے تو سونی دیکھنے میں ایک معصوم سی نازک لڑکی ہے مگر اندر سے وہ چٹان کی طرح مضبوط ہے اور اس کے جسم کی لچک فولاد کی پٹی جیسی ہے جسے موڑا نہیں جاسکتا۔ صرف توڑا جاسکتا ہے۔ اس کی قوتِ ارادی کو شاید موت بھی آسانی سے شکست نہیں دے سکتی۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے پتا سمجھنے کے بعد ڈھائی

سو مانگے جو فاصلے کی مناسبت سے یقیناً بہت زیادہ تھے مگر اس کا عذر تھا کہ اس ویران جگہ سے واپسی کی سواری نہیں ملتی۔ بالآخر وہ دوسو میں مان گیا۔ میری جیب میں کل دوسو تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ زینت سے کچھ رقم اور ادھار لے لوں مگر اس کے لئے مجھے لوٹ کے پھر کوارٹر تک جانا پڑتا۔ دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ ٹیکسی کو رئیس خانے کے راستے لے جاؤں اور وہاں سے کوئی گاڑی لے لوں۔ فرید اور رئیس اگر چھوٹی کار لے گئے ہوں گے تو بیجرو کھڑی ہوئی ملے گی۔ میں رخشی سے دو چار ہزار کی رقم بھی لے سکتا تھا مگر اس میں بھی دیر ہوتی۔ آخری خیال مجھے یہ آیا کہ واپسی کی فکر کرنا عبث ہے۔ اول تو فرید یا رئیس وہاں پہنچ جائیں گے ورنہ آزاد صاحب کے کہنے پر پولیس چھاپا مارنے پہنچے گی۔

زینت ابھی تک میرے احکامات کی منتظر تھی "کیا میں جاؤں؟"

میں نے سوچا تو اسے ساتھ رکھنا لاحاصل نظر آیا "جاؤ اور دیکھو' اگر سونی کو کچھ ہوا تو میں اس کا ذمے دار تمہیں ہی سمجھوں گا پھر تمہاری مجبوری کا عذر مجھے نہیں روک سکے گا۔ اب موقع سے فائدہ اٹھاؤ' اور بھاگ جاؤ۔"

اس نے شکرگزاری کے ساتھ سرہلایا اور اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کے کچھ نوٹ نکالے جو پسینے میں بھیگے ہوئے تھے "یہ پانچ سو ہیں' رکھ لو۔"

"میں تمہارا ادھار چکانے نہیں آسکتا۔ آیا تو تمہیں قتل کرنے آؤں گا۔"

وہ بولی "یہ ادھار نہیں ہے۔"

نوٹ لے کر میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ اسپتال کے جنگلے سے ملے ہوئے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی اور شاید اس وقت تک کھڑی رہی جب تک ٹیکسی اسے نظر آتی رہی۔ اس کے بارے میں میرا دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے اخلاقی اور قانونی جرائم کی سزا معاف کرکے اور ایک لاکھ انعام دے کر میں نے اچھا کیا تھا یا برا۔ جذباتی دلائل زینت کے حق میں جاتے تھے تو عقل کے میرے بھی خلاف تھے۔

جونی کا ریوالور بہت اچھا تھا۔ یہ ایک پروفیشنل کا ہتھیار تھا جو مارشل آرٹ بھی جانتا تھا۔ یہ فن بدمعاشی کو طاقت دینے کے لئے نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہتھیار دفاع کے لئے بنائے جاتے ہیں مگر یہ استعمال کرنے والے کے کردار کی بات تھی کہ جرم اور جارحیت کا پیشہ اختیار کرنے والے اسلحہ اور مارشل آرٹ کا ایک ساغلط استعمال کررہے تھے۔

اس وقت میری اصل طاقت یہی ریوالور تھا۔ اسے محسوس کرکے میں نے جونی کا تصور کیا۔ اس کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوگی اور پڑے پڑے اکڑ جائے گی۔ خود زینت کو کیا پڑی ہے کہ اس کا سراغ دے۔ وہ ایک غیرانسانی بے موتی اور اجنبیت کا انداز اختیار کرے گی حالانکہ چند گھنٹے قبل اس نے کتنی شدت کے ساتھ اپنے قرب کو تسلیم کرایا تھا اور زینت نے بھی اسے تسلیم کیا تھا۔

رب نواز کے حوالے سے میری جونی سے کوئی شناسائی نہ تھی مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ بلحاظ افادیت رب نواز کے لئے بہت اہم ہوگا۔ تقدیر اسے شکست نہ دیتی تو وہ اپنے پلان میں کامیاب رہتا اور رب نواز یقیناً اسے انعام سے نوازتا۔ اس کا نقصان رب نواز کے لئے بہت بھاری ہوگا لیکن دنیا میں قانونِ قدرت سے اپنا ایک توازن قائم ہے کہ جیسا بوؤ گے' ویسا کاٹو گے۔

تقریباً چالیس منٹ تک دوڑنے کے بعد ٹیکسی بالآخر اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں ایک طرف مرغی خانے تھے اور دوسری طرف زرعی فارم۔ آگے کا نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے ٹیکسی کو گیٹ سے کچھ دور ہی رکوالیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو دوسو روپے دے کر رخصت کردیا۔

خلاف امید گیٹ پر آج کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ میں نے براہ راست گیٹ تک جانے سے گریز کیا۔ اس کا سامنے والا حصہ خفیہ کیمروں کی نظر میں رہتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے میری تصویر اندر پہنچ جائے۔ سامنے والے حصے میں فصیل کے اوپر تاروں کی باڑھ کے اوپر سے اندر جانا بھی خطرناک تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا الٹے ہاتھ کی طرف گھوم گیا۔

آگے ایک جگہ وہ تار ابھی تک کٹے پڑے تھے جو سونی نے کاٹے تھے۔ ان تاروں کو چھوئے بغیر میں نے دیوار کے اوپر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ادھر اُدھر سے اینٹوں کو اٹھا کے جمایا۔ یہ اینٹیں شاید اس وقت سے یہاں بکھری پڑی تھیں جب یہ دیوار تعمیر ہوئی تھی۔ ایک فٹ کی اونچائی سے میں ایک فٹ اوپر اچھلا تو میرے ہاتھ دیوار کے کنارے پر جم گئے۔ خود کو ہاتھوں کے بل پر اونچا اٹھا کے میں نے دیوار عبور کرلی۔

بیرک میں سناٹا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اب یہاں پولٹری فارم بھی بند کردیا گیا ہے۔ بیرک کی پوری لمبائی کو طے کرتے ہوئے میں نے اپنی گزشتہ چھاپا مار کارروائی کی بہت سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشانیاں دیکھیں۔ ایک کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے جھانکنے پر مجھے مرغیاں بھی نظر آئیں اور میرے کانوں نے مرغیوں اور چوزوں کی آوازوں کا ملا جلا شور بھی سنا۔

سامنے والے حصے کا دروازہ بند تھا۔ یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی۔ گزشتہ بار یہاں ہمارا مقابلہ مسلح محافظوں سے ہوا تھا اور چار میں سے تین مارے گئے تھے۔ کیا اب ان کی جگہ نئے محافظ لے چکے ہوں گے؟ میں نے سوچا اور پھر دروازے کو آہستہ سے چھوا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ایک اشارے کا منتظر تھا۔ جب دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہوا تو میں نے اسے ایک لات ماری اور ایک دھماکے سے اندر پہنچ گیا۔

اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ کلوز سرکٹ ٹی وی' الارم سسٹم اور سیکیورٹی کا سارا نظام جو ہم نے تباہ کردیا تھا' ابھی تک اسی حالت میں ناکارہ پڑا ہوا تھا۔ شاید رب نواز کو ابھی ادھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ مرغی خانے کے پنجروں کی قطاروں سے بننے والی گلی میں چلنا شروع کیا۔ میرے کان خفیف سی آہٹ سننے کے لئے بھی مستعد تھے مگر وہاں مرغیوں کی کڑکڑاہٹ اور چوزوں کی چوں چوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہاں آ کے میں نے پھر اپنا وقت ضائع کیا ہے اور میرا یقین کہ سوئی کو یہاں لایا گیا ہوگا' میری عقل کی کج فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے تو پہلے بھی یہ سمجھا تھا کہ شبنم کو اغوا کرنے والوں نے اسی جگہ قید کر رکھا ہے مگر ہماری محنت اور تگ و دو رائگاں گئی تھی۔ ہمارے ہاتھوں کچھ لوگ بے سبب مارے گئے تھے اور نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی پشیمانی کی کیفیت میں ہمیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا تھا۔ آج میرے یقین نے پھر مجھے گمراہ کیا تھا تو احساسِ زیاں دوگنا ہو چکا تھا۔ لیکن اسی وقت جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایک ساتھ دو افراد نے پنجروں کے اوپر سے کود کے مجھے دبوچ لیا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میں فرش پر گرا اور وہ مجھ پر سوار ہو گئے۔ وہ بہت تنومند اور اپنے کام میں ماہر لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے بے بس کردیا۔

اپنی وردی سے وہ کسی سیکیورٹی کمپنی کے فراہم کیے ہوئے گارڈز لگتے تھے مگر یہ بات مجھے عجیب لگی کہ مین گیٹ پر ایک بھی گارڈ نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ بیرک میں داخلے کے راستے پر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ وہ مرغی کے پنجروں کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری تاک میں تھے۔ کیا انہیں پہلے سے میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا یا انہوں نے مجھے دیوار عبور کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ریوالور ابھی تک میری گرفت میں تھا۔ ان کا لہجہ اور دشمن کو قابو کرنے کا انداز سابق فوجیوں جیسا تھا۔ "اوئے' خبردار! ہل جل مت کر" ایک نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

"ریوالور چھوڑ دے۔" دوسرے نے کہا جو میری ٹانگوں پر چڑھا بیٹھا تھا۔

پہلے مجھ پر گرنے والا اب جیب سے ہتھکڑی نکال رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ پیچھے کر کے کلائیوں میں ڈال دے مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ میں نے سنبھلتے ہی جسم کو زمین سے لگا کے اوپر ایک جھٹکا دیا۔ اس سے میرے پیروں پر چڑھا ہوا گارڈ کچھ غیر متوازن ہو گیا۔ میں نے دوسرا جھٹکا زیادہ قوت کے ساتھ دیا اور اپنے ایک پیر کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب رہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ٹانگ کو موڑ کے پاؤں کو کسی طاقتور پسٹن کی طرح چلایا۔ جوتے سمیت میرا پنجہ اس کے منہ پر یوں لگا جیسے کسی باکسر کا پنچ۔ وہ بلبلا کر پیچھے گرا۔ میری گردن دبوچ کے بازوؤں کو لاک کرنے والے نے اپنا گھٹنا میری کمر پر مارا۔ میں اپنے بازو سمیٹے فرش سے چمٹا ہوا تھا کیونکہ ریوالور میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ گارڈ نے پھر مجھے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ میرا سانس رکنے لگا۔

اب میں نے ایک پُرخطر داؤ کھیلا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر اپنے پچھلے دھڑ کو اوپر اٹھالیا اور آگے کی طرف ایک جھٹکے سے دھکیلا۔ جب میں اٹھا اور کہنیوں کے بل سیدھا ہوا تو ایک محافظ میرے اوپر سوار تھا۔ میں پلٹ کر دوسری طرف گرا تو وہ میرے نیچے آگیا۔ وہ فرش پر چت گرا تھا اور میں اس کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے چلا کے کہا "ہائے او ربا۔"

اس کا دوسرا ساتھی اب میرے سر پر اپنے ریوالور کا بٹ مارنے کے ارادے سے ہاتھ اٹھا چکا تھا کہ میں درمیان سے نکل گیا۔ اس کا وار اپنے ہی ساتھی کی گردن پر لگا جو اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کمر کی چوٹ نے اسے اٹھنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو گیا۔

میں اپنے ریوالور کی طرف جھپٹا جو فرش پر ہی پڑا رہ گیا تھا۔ دوسرا محافظ پلٹ کے مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے ایک ایڑی پر گھوم کے لات ماری اور اس کا ریوالور دھماکا ہوتے ہی چھت کی طرف پرواز کر گیا۔ یہ ریوالور ایک پنجرے کی چھت پر گرا۔ میں نے اس کی پیش قدمی روکنے کے لئے

ریوالور کا رخ اس کی طرف کردیا "رک جاؤ وہیں" میں نے کہا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

دھماکا سن کے نہ جانے کہاں سے تیسرا گارڈ میرے پیچھے آگیا اور اس نے ایسا ہی حکم مجھے دیا "میرے پاس کلاشنکوف ہے۔ چھلنی کردوں گا۔ ریوالور پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ کہیں وہ مجھے بلف تو نہیں کر رہا ہے مگر رسک لینے میں جان جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ دوسرا گارڈ آگے بڑھا اور اس نے میرا ریوالور اپنے قبضے میں کرلیا۔

اور اس وقت میں نے رب نواز کی آواز سنی "اس سورما کو نیچے لے آؤ۔ اچھا ہوا جو یہ خود ہی مرنے آگیا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "جب تک دلنواز میرے قبضے میں ہے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بیٹے" میں نے کہا۔

دوسرے گارڈ نے کہا "اوئے ہاتھ پیچھے کر' بک بک نہ کر۔"

اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی پھر وہ مجھے آگے دھکیلنے لگا۔ میں آخری حصے میں اس دروازے سے گزرا جہاں سے تہ خانے میں جانے والا زینہ شروع ہوتا تھا۔ فی الحال میں کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ پولسٹری فیڈ کی بوریوں کے درمیان سے گزار کے وہ مجھے آخری دروازے تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ یہ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔

اندر قدم رکھتے ہی میں نے سب سے پہلے رب نواز کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر بڑے کروفر کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر چھت کو سہارا دینے والے ایک ستون کے ساتھ سوئی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ستون کے پیچھے کی طرف سے باندھے گئے تھے اور ایسے ہی دونوں پیروں کو ملا کے ستون سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس پوز میں وہ بالکل سیدھی کھڑی رہنے پر مجبور تھی۔ اس کے جسم پر مجھے لمبے لمبے نیل نظر آئے۔

یہ نیل چمڑے کی ایک بیلٹ کی ضرب سے آئے تھے۔ سوئی کے قریب ہی ایک حکم کا غلام یہ بیلٹ لیے کھڑا تھا اور اپنے آقا کے اشارے کا منتظر تھا۔ اذیت اور ذلت کے احساس سے سوئی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ غالباً یہ بے رحمی کا کھیل شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

رب نواز نے اسے ایک گالی دے کر کہا "لے آگیا تیرا یار بھی۔"

میں نے دماغ میں اٹھنے والے غیظ و غضب کے آتشیں بگولے پر قابو پالیا۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس حالت میں رب نواز کے اشتعال کی آگ کو بھڑکانے سے میری یا سوئی کی جان جاسکتی تھی۔ اپنی موجودہ حالت کے ساتھ میں کسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے رب نواز سے مہلت لینی تھی۔ میری آس اب رئیس اور فرید کی مدد پر تھی یا آزاد صاحب کی قانونی کارروائی پر۔

میں نے کہا "ملک صاحب! ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک آپ جیسے مردوں کے شایانِ شان نہیں۔"

اس نے حقارت سے کہا "اس بکواسی کو بھی باندھ دو ادھر۔"

حکم کے دو غلاموں نے ذرا سی دیر میں میرا لباس تار تار کردیا۔ مجھے دوسرے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ جانتے بوجھتے میں سوئی کی طرف دیکھنے یا اس سے بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ مجھے اس حالت میں کوئی بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ میرے آنے سے سوئی کو کچھ دیر کے لئے تفتیش کی اذیت سے نجات مل گئی تھی۔

رب نواز اٹھ کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا "میرے بیٹے کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "وہ جہاں بھی ہے بڑے آرام سے ہے ملک صاحب!"

اس نے میرے پیٹ میں مکا مارا "سیدھا جواب دے میری بات کا؟"

میں تڑپ کے رہ گیا "پتا نہیں بتاؤں گا میں' جب تک شبنم بی بی۔۔۔!"

اس نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اپنا غصہ مجھ پر اتارنا شروع کردیا۔ یہ اس کی بے بسی کا اعتراف تھا۔ اس نے میرے منہ پر طمانچے مارے۔ ہر طمانچے کے ساتھ میرا منہ دائیں بائیں ہو جاتا تھا۔ میرے گال تپنے لگے تھے اور یقیناً لال بھی ہو گئے ہوں گے۔ ایک جنونی کیفیت میں وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ میں نے دلنواز کا پتا نہ بتایا تو وہ میرے ساتھ کیا کر سکتا ہے اور شبنم کا کیا حشر کر سکتا ہے۔ اس نے میرے پیٹ میں مسلسل مکے مارے مگر اب میں ہر قسم کے تشدد کے لئے تیار تھا۔ میں نے اپنے پیٹ کو مارشل آرٹ کی تربیت کے مطابق سخت کرلیا تھا۔ اب مکے کیا' وہ ہتھوڑے بھی برساتا تو مجھ پر اثر نہ ہوتا لیکن رب نواز کے اطمینان کے لئے تڑپتا اور چیختا چلاتا رہا۔ سب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھی بات یہ تھی کہ رب نواز نے مجھے شبنم کا ڈرائیور ہی سمجھ رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے گردن ڈال دی۔ خود رب نواز بھی تھک گیا تھا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا "جونی کا کچھ پتا چلا؟" اس نے کسی سے پوچھا۔

"نہیں جناب عالی!"

وہ بگڑ گیا "نہیں کا کیا مطلب ہے۔ کسی کو کہو کہ جا کر دیکھے اور بتائے۔ آخر یہ۔۔۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"وہ نرس بھی اسپتال میں نہیں ہے جی!"

"یہ کسی کے ساتھ آیا تھا یا اکیلا تھا؟" ملک نے پوچھا۔

"ہم نے جب دیکھا تو یہ دیوار کے اوپر سے اندر آگیا تھا۔ باہر اور کوئی ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

ملک نے جھنجلا کے کہا "اوئے پاگل دے پتر۔ یہاں تک یہ پیدل تو نہیں آیا ہوگا۔ اچھا میرے گھر فون کرو۔ عاشق سے کہو اسپتال جائے فوراً اور اس نرس کو اٹھا لائے۔ زینت نام ہے اس کا۔ ضرور جونی بے پردا ہوگیا ہوگا۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ خود کو ٹارزن نہ سمجھے' بندہ بہت خطرناک ہے۔"

"بندہ جونی بھی کم نہیں جناب عالی!"

"پھر یہ کیسے نکل آیا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ انجکشن بندے کو مردے کی طرح کر دیتا ہے۔ انگلی بھی اپنی مرضی سے نہیں ہلا سکتا۔"

"انجکشن بھی جعلی آنے لگے ہیں جناب عالی!"

"بکواس مت کر۔ وہ عام استعمال کے انجکشن ہوں گے۔ یہ آسانی سے ملنے والا انجکشن نہیں' جونی نے خود بتایا تھا۔"

"پھر کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے جی!"

وہ گرم ہوگیا "جونی لاپتا ہے۔ یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ بندا جیسے ملے اڑا دیتا ہے عورتوں کے چکر میں۔ شکر ہے شراب کا چسکا نہیں پڑا اسے ورنہ برباد ہو جاتا۔ وہ نرس بھی ٹیکسی ہے۔ اسپتال میں بھی دھندا چلا رہی ہے اپنا۔ جونی کی ساری کمائی آج کل اسی پر خرچ ہوتی ہے۔ اس سے شادی کے چکر میں ہے۔ مجھے معلوم ہے سب۔"

کسی اور نے کہا "اس کے لئے کیا حکم ہے سرجی؟"

ملک نے کہا "یہ ایسے نہیں بتائے گی۔ ذرا اس کا یار ہوش میں آجائے تو پوچھیں گے۔ تم تھانے میں کیا کرتے ہو؟ بڑا دعویٰ کرتے ہیں سب کہ پتھر بھی بولنے لگتا ہے وہاں جا کے شیر خان!"

میں سمجھ گیا کہ تفتیش کے لئے کسی تھانے سے ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ رب نواز کے ملازم اسے جناب عالی سے مخاطب کرتے تھے۔ اس ماہر نے سرجی کہا تھا۔ وہ اپنے افسرانِ بالا سے ایسے ہی بات کرتا ہوگا۔

"ابھی تو بسم اللہ ہے سرجی! تھانے میں بڑے بڑے پھنے خاں آتے ہیں جو چھتروں پر کہتے ہیں کہ اچھی مالش ہو رہی ہے بدن کی مگر جب خاص طریقے آزماتے ہیں تو دونوں طرف سے بولنے لگتے ہیں۔ یہ تو عورت ہے' آپ اجازت دو تو۔"

رب نواز نے بے زاری سے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے کب کہا ہے کہ لحاظ کرو۔ اتنا ٹائم نہیں ہے میرے پاس کہ سارا دن ادھر ہی لگا دوں۔ ختم کرو اپنی تفتیش فٹافٹ مگر جو کرنا ہے اس کے یار کے سامنے کرنا۔"

"ابھی لو سرجی!" وہ بولا "اوئے بالٹی لا۔"

دو منٹ بعد میں نے پانی کے ریلے کو اپنے اوپر سیلاب کے تھپیڑے کی طرح محسوس کیا۔

"چل اوئے۔۔۔" شیر خان نے مجھے ایک خش ترین گالی سے نوازا۔

میں نے کراہتے ہوئے سر اٹھایا "خدا کے لئے۔۔۔"

"اوئے ابھی سے خدا یاد آگیا۔ پہلے تو بے بے یاد آئے گی پھر نانی یاد آئے گی" اس نے میرے ساتھ ایک ایسی بے ہودہ حرکت کی کہ میں چلا اٹھا۔ اس کا ہاتھ کسی شکنجے کی طرح سخت تھا اور جسم کے نازک حصے معمولی سے تشدد پر بھی ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ باقی لوگ ہنسنے لگے۔

سونی مجھ سے زیادہ بے بس تھی اور میں اس سلوک کا تصور کر کے لرز گیا جو میرے سامنے ایک ماہر تشدد اس کے نازک جسم پر کر سکتا تھا۔ اچانک سونی نے چلا چلا کے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ یہ اس کے نروس بریک ڈاؤن کی نشانی تھی۔ خوف نے اس کے اعصاب کو شکست دے دی تھی لیکن وہ اپنے بہادر ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

شیر خان نے ایک بے شرمی کا قہقہہ لگایا "دیکھا سرجی۔ کیسی تیکھی لڑکی ہے۔ آپ ذرا یہ سگریٹ عنایت کرو۔"

ملک نے ایک کش لے کر آدھا سلگتا ہوا سگریٹ شیر خان کو دے دیا۔ اگر میں اپنے کان بند کر سکتا تو ضرور کر لیتا کیونکہ اب سونی کی کربناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے سونی کی طرف دیکھا نہیں۔ میں کشیدہ اعصاب کے ساتھ اس کے ردِ عمل کا منتظر رہا۔

"ہاں' میری سوہنی بلبل۔ اپنے ملک صاحب کو جلدی

ہے۔ شاباش' فٹافٹ بتا دے کیا ہوا تھا تجھے وہ کبڑا جوان۔ اتنی راتیں گزار لیں اس کے ساتھ۔ ابھی دل نہیں بھرا۔ تیری تسلی ہم کر دیں گے۔۔۔" وہ انتہائی فحش زبان بولنے لگا۔

ابھی تک میرے کانوں نے کوئی چیخ نہیں سنی تھی۔ میں نے دل پر جبر کر کے سونی کی طرف دیکھا۔ شیر خان اس کے جسم پر کئی جگہ جلتی ہوئی سگریٹ سے داغ چکا تھا اور یہ جسم کے وہ حصے تھے جو نازک شمار ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود سونی نے اذیت کو برداشت کیا تھا۔ اس کا منہ سختی سے بند تھا۔ ہر بار جب سگریٹ کا سلگتا ہوا انگارہ اس کے بدن کو چھوتا تھا تو وہ نیچے سے اوپر تک ہل جاتی تھی مگر اس نے آواز نہ نکالنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اس کا یہ عزم شیر خان کے وحشیانہ عزائم کو فرسٹریٹ کر رہا تھا۔

خود میں اندر سے اٹھنے والی اشتعال کی ہر طوفانی لہر کے سامنے ٹوٹ رہا تھا۔ میری برداشت کی قوت ختم ہو رہی تھی۔ شیر خان اپنے آقا رب نواز کے سامنے جلد از جلد یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ایک ماہر تفتیش کی حیثیت سے اس کی شہرت بے سبب نہیں اور ملک صاحب نے اسے موقع دیا ہے تو وہ بھی انہیں مایوس نہیں کرے گا۔ لڑکی پتھر ہوگئی ہے تو کیا۔ ابھی پتھروں کے بولنے والی بات بھی سچ ہوگی اور سب دیکھیں گے۔

شیر خان نے کچھ آلاتِ تفتیش طلب کیے "ہم نے سوچا سرجی' آپ کے پاس یہ چیزیں کہاں ہوں گی۔"

ملک نے بے زاری سے کہا "پہلے اس پر ٹرائی کرو۔"

اس کا اشارہ میری طرف تھا' شیر خان نے کہا "جیسا حکم سرجی!" پھر اس نے چمڑے کی بیلٹ سے مجھے مارنا شروع کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی کیفیت دیکھ کے یوں لگتا تھا جیسے اس کام میں اسے بہت لطف مل رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کرکٹ میں بیٹسمین کو بھرپور جسمانی قوت کے ساتھ بال کو چوکے چھکے مار کے باؤنڈری کو اپنے حریف پر مکے برسا کے ملتا ہے۔ یہ اس کے لیے کسی اسپورٹ کی طرح مشق اور مہارت کا مظاہرہ تھا۔ وہ بڑے اسٹائل سے ایک پاؤں آگے بڑھا کے اور تھوڑا سا جھک کے بیلٹ کو پیچھے سے آگے لاتا تو ہاتھ کو ایک جھٹکا دیتا تھا۔ بیلٹ ہوا میں لہراتی تھی اور میرے جسم پر پڑتی تھی تو اس کا آخری سرا بل کھا کے دوسری طرف لپٹ جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پُراطمینان مسکراہٹ آجاتی تھی اور وہ آسودگی کی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ بیلٹ کو پھر اپنی طرف بلا لیتا تھا۔

میرے جسم پر چمڑے کی ہر ضرب ایک جلتی ہوئی لکیر چھوڑ جاتی تھی اور ابھی اس کا درد جاگ رہا ہوتا تھا کہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ بیلٹ دوسری جگہ کو داغ دیتی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میرا بدن ہر وار پر نیچے سے اوپر تک لرز جاتا تھا۔ سونی کی طرح میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ آواز نہیں نکلنے دوں گا بلکہ دو وار برداشت کرنے کے بعد میں نے مسکرا کے کہا "اوئے گیدڑ کے بچے' بس۔۔۔ اتنی ہی جان ہے اور نام ہے شیر خان" میں نے اس کے علاوہ جو کہا وہ یہاں نہیں بیان ہو سکتا۔ رب نواز کے ملازم مسکرانے لگے۔

شیر خان کو سخت تذلیل کا احساس ہوا۔ اس کے منہ سے جواب میں مغلظات کا طوفان امڈ پڑا اور اس نے دانت پیس کر مجھ پر زیادہ طاقت سے بیلٹ کے وار کیے پھر کسی نے کہا "یہ لو شیر خان!"

میں نے ایک ملازم کے ہاتھ میں دھونی دینے کے لوازمات دیکھے۔ ایک کڑچھا جس میں انگارے دہک رہے تھے اور کاغذ کا ایک لفافہ جس میں مرچوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ شیر خان کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔ اس نے بیلٹ پھینک دی اور کڑچھا لے کر سونی کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی تھی۔

"ہاں میری کبوتری۔ ڈانس تو دکھاؤ ذرا اپنا۔ اوئے' اس کے پیروں کو کھول دو۔ گھنگرو باندھ دو ذرا۔"

ایک ملازم نے اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی رسی کھول دی اور مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے واقعی سونی کے پیروں میں گھنگرو باندھ دیے۔ اس کوشش میں اسے سونی کی لات بھی منہ پر کھانی پڑی مگر پھر دوسرے کی مدد سے وہ یہ کام پورا کرنے میں کامیاب رہا۔ اب شیر خان نے انگاروں پر مرچیں چھڑک کے کڑچھا سونی کی ناک کے نیچے رکھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ شیطانی انداز میں سونی کے جسم سے بے ہودگی میں مبتلا رہا۔ سونی نے کچھ دیر ضرور سانس کو روکے رکھا ہوگا مگر بالآخر دھاس دینے والا دھواں اس کے پھیپھڑوں میں بھر گیا۔ وہ بری طرح چھینکنے اور کھانسنے لگی۔ شیر خان نے کسی سے کہا "اوئے' وہ گلاب جل بھی تو لاؤ۔"

گلاب جل شاید نمک ملا پانی تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے سونی کے زخموں پر یہ پانی ڈالنا شروع کیا۔ اتنی شدید اذیت پر سونی کا اپنے جسم کے ردِ عمل پر کنٹرول ناممکن سی بات تھی۔ وہ چیخنے اور تڑپنے لگی۔ اس کے ہاتھ اب بھی ستون کے ساتھ بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ ایک ہی جگہ ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح پھڑک سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے آتی گئی اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پیر زمین پر رگڑ کھانے لگے۔ پیروں کی حرکت کے ساتھ گھنگھرو بول رہے تھے مگر ان کا بجنا بھی ایک پُر وحشت ماتمی صدا رکھتا تھا۔ سونی کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔ وہ رب نواز کو ایسی گالیاں دے رہی تھی جو شاید آج تک اسے کسی نے دینے کی جرأت نہیں کی تھی مگر اس وقت وہ گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا۔ اس کے لیے یہ ایک تماشا تھا۔

بالآخر سونی بے ہوش ہوگئی۔ اس کی چیخ پکار تھم گئی اور ہال میں ایک بھیانک سناٹا مسلط ہوگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ کسی ارادے کے بغیر یہ آنسو خود نکل آئے تھے۔ سونی کی اذیت میں نے بھی اپنے احساس میں جھیلی تھی۔ سونی نے بربریت کا یہ راؤنڈ بھی برداشت کرلیا تھا۔ جب تک قوتِ برداشت نے ساتھ دیا' مگر اس نے دلنواز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس وقت جب وہ سفاک درندگی کے اس کھیل میں تماشائے رسوائی بنی ہوئی تھی' ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے سوچا کہ سب بتادوں۔ سونی کو بچانے کے لیے دلنواز کی رہائی کی شرط پوری کردوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ سونی کی ہمت اور اس کی قربانی کے بے غرض جذبے کی توہین کے مترادف ہوگا۔ وہ بعد میں میری کمزوری پر لعنت بھیجے گی۔ یہ ہرگز نہیں کہے گی کہ تمہارا شکریہ' تم نے مجھے اس عذاب سے نجات دلادی۔ وہ کہے گی کہ مرجانے دیتے مجھے تو میری محنت اکارت نہ جاتی۔ مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساس ہوتا بہ اس کے علاوہ دلنواز کا پتا بتانے کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ پھر مجھے اور سونی کو "باعزت" طور پر رہا کردیا جائے گا۔ سونی کے ساتھ رب نواز کو دوسرے حساب بھی چکانے تھے اور میری تو اس کی نظر میں کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔

جب شیر خان پھر میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے رب نواز سے کہا "کیوں اپنا وقت برباد کررہا ہے کتے' حاصل تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

شیر خان بولا "ابھی دیکھتے ہیں۔ ہم تو مداری ہیں پتر۔ جب ہم ڈگڈگی بجاتے ہیں تو ہاتھی بھونکنے لگتا ہے اور گتا نکالتا ہے چوزے کی آواز۔ ہم کٹا چوہ سکتے ہیں اور پتھر سے اورنج جوس نچوڑ سکتے ہیں۔"

"جلدی شیر خان' جلدی۔۔۔ اور بھی کام ہیں مجھے۔ دلنواز کا ابھی تک پتا نہیں چلا" رب نواز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"دلنواز ایسے نہیں ملے گا تمہیں۔ ہم سب کو جیسے چاہو مارو مگر اس کی لاش وصول کرنے کے لیے تیار رہو" میں نے چیخ کے کہا۔

شیر خان تھانے کے "ڈرائنگ روم" سے وہ سب آلات تشدد اور وہ بھی جن کے بارے میں مجھے بہت کچھ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ سب آج یہاں مجھ پر آزمائے جانے تھے۔ وقت کا ہر سفاک لمحہ گزرتا جارہا تھا۔ رئیس اور فرید کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے چیرا لگایا جاسکتا تھا۔ ناخن کھینچے جاسکتے تھے۔ میرا پیشاب بند کیا جاسکتا تھا۔ میرے نازک حصوں کو شکنجے میں دبایا جاسکتا تھا اور بجلی کے جھٹکوں سے جلایا جاسکتا تھا۔ سونی کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا ہوسکتا تھا۔ ابھی تک میں اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھا مگر دیکھنا یہ تھا کہ مرنے سے پہلے میری زبان کھلتی ہے یا نہیں؟

اگلے آدھے گھنٹے تک میں نے بھی بڑا عذاب جھیلا۔ شیر خان ایک ہاتھ سے میری کھال پر کٹ لگاتا رہا اور اس پر نمک مرچ والا پانی ڈالتا رہا۔ اس نے مجھے بھی دھوئی دی۔ میں دو بار بے ہوش ہوا مگر ان کے ہر سوال کے جواب میں میرے منہ سے گالیاں نکلتی رہیں۔

اچانک اوپر سے ایک شخص بڑی افراتفری میں نمودار ہوا اور اس نے رب نواز کے پاس جاکے اس کے کان میں کچھ کہا۔ رب نواز کا چہرہ پھر آگیا۔ وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے میرے قریب آکے وہ بیلٹ اٹھائی جو شیر خان نے کوڑے کی طرح استعمال کی تھی۔ رب نواز کا چہرہ غیظ و غضب کی تصویر بن گیا۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں مجھ پر پل پڑا "تو نے جونی کو مارا دیا۔ اس حرام زادی زینت نے دھوکا دیا ہوگا اسے۔ کنجری ذات پر اعتبار کیا تھا جونی نے۔"

شاید وہ میری جان لے لیتا مگر اچانک اس کا ہاتھ رک گیا اور وہ منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ دو ملازم دوڑ کے آگے آئے اور انہوں نے رب نواز کو سنبھال لیا۔ وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ ایک نے اس کی جیب میں سے کوئی شیشی نکالی' اس نے پہلے پانی پیا اور پھر گولی منہ میں رکھ لی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ انجائنا کا مریض ہے اور بلڈ پریشر بڑھ جانے سے اس کے دل میں درد اٹھا ہوگا۔ اس کی عمر کے لوگ جو عیش آرام کی زندگی گزارتے ہیں' سگریٹ کے ساتھ مے نوشی کرتے ہیں اور رنگین مزاجی میں روز و شب میں اعتدال اور توازن نہیں رکھتے' تو دل قبل از وقت جواب دینے لگتا ہے۔

دس منٹ بعد اس کی طبیعت بحال ہوگئی مگر اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں شیر خان کو مخاطب کیا "چھوڑ' جانے دے شیر خان۔ تجھ سے نہیں ہوگا کچھ۔"

شیر خان کی سبکی ہوگئی "سرجی۔ ابھی دس منٹ میں رزلٹ نہ دیا تو پیشاب سے مونچھیں منڈا دوں گا۔"

"ہاں اور تو فکر مت کر جان کی۔ اس کتیا کو میں نے ایسے ہی تڑپا تڑپا کے مارنا تھا۔ مرتی ہے تو مرجانے دے۔" رب نواز بولا۔

ایک ملازم نے اسے چائے کی پیالی پیش کی اور دوسرے نے پلیٹ آگے بڑھائی۔ اس نے کچھ اٹھا کے منہ میں ڈال لیا۔

شیر خان نے فرمان جاری کیا "اس کنجری کو لمبا ڈالو۔ اچھی طرح باندھ کے اور جو اپنے کو جوانمرد کا بچہ سمجھتا ہے آجائے لائن میں۔ آخر میں آئے گا استاد مولا بخش۔"

رب نواز کی دلچسپی کچھ بڑھ گئی۔ اس کے دو ملازموں نے سونی کے ہاتھ کھول دیے اور مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ اب جو کچھ ہونے والا تھا وہ میری نظریں نہیں دیکھ سکتی تھیں اور میری غیرت بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ یہ شاید کسی عورت کی قوتِ ارادی کو شکست دینے کا آخری حربہ ہے کہ ایک ساتھ وحشی درندوں کا ایک غولِ بیابانی اس کی آبرو کی دھجیاں بکھیر دے۔ خود شیر خان ایک حیوان کی طرح اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے چلّا کے کہا "رب نواز۔ اسے جانے دو' میں بتاتا ہوں تمہیں۔"

رب نواز نے اسے اشارے سے روک دیا "شیر خان۔ ملاحی کچھ فرمانا چاہتے ہیں۔"

"ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں سرجی!" شیر خان نیچے جھکا "اس کا تو باپ بھی بولے گا' آپ تماشا دیکھو۔"

اور پھر تماشا صرف رب نواز نے ہی نہیں' ان سب نے دیکھا جن کی زبان کتے کی طرح باہر آگئی تھی۔ سونی نے تڑپ کے ایک لات رسید کی جو شیر خان کی بھینسے جیسی گردن پر بائیں شانے کے اوپر پڑی۔ شرمناک خاموشی میں ایک بھیانک آواز کی گونج سنائی دی۔ یہ شیر خان کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز تھی اور اس کی آخری کراہ بھی پھر اس کا ریچھ جیسا وجود دھپ سے زمین پر گرا۔ پھانسی پانے والے شخص کی طرح سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ احساس کا رشتہ منقطع ہوگیا تھا جس میں جتنی جان تھی وہ نکل رہی تھی۔ بھیانک خرخراہٹ کی آوازوں کے ساتھ شیر خان فرشِ خاک پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ زمین پر پیر رگڑ رہا تھا اور ہاتھ مار رہا تھا پھر اس کا بول و براز خطا ہوگیا اور وہ گندگی میں لتھڑ گیا۔ دو منٹ بعد وہ ساکت ہونے لگا۔ اس کا پھڑکنا رک گیا۔

سکتے جیسی کیفیت میں شیر کی طرح دھاڑنے والے شیر خان کا یہ بھیانک انجام دیکھنے والے ایک ساتھ سونی پر جھپٹے۔ رب نواز نے چیخ کر حکم دیا "باندھ دو اسے اور اتنا مارو کہ اس کی کھال اتر جائے۔ ہڈیوں سے گوشت الگ ہوجائے پھر اسے گاڑو شیر خان کے ساتھ۔"

سونی پاگل ہو کے ہنس رہی تھی' قہقہے لگا رہی تھی "رب نواز۔ تماشا دیکھنا ہے تو اپنی بیوی کو بلالے۔ کتنے جوانمرد کھڑے ہیں لائن میں۔ بیٹی کو بلالے۔"

میری کسی نے نہیں سنی۔ میں مسلسل چلّا رہا تھا۔ "سونی کو چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں رب نواز تیرا بیٹا کہاں ہے۔ بے شک مجھے مار ڈالو۔ خدا کے لیے' میری سنو۔"

رب نواز اٹھ کے میرے پاس آیا "بول۔ جلدی بول۔"

میں نے کانپتے ہوئے کہا "مجھے فون۔۔۔ فون پر بات کرنے دیں۔۔۔ آپ کا بیٹا دلنواز بات کرے گا آپ سے۔۔۔ وہ گھر پہنچ جائے گا آدھے گھنٹے میں۔"

"کہاں رکھا ہے تو نے اسے۔۔۔ پتا بتادے۔ سونی کو چھوڑ دیں گے ہم" اس نے میرے بال پکڑ کے میرا سر ستون پر مارا۔

اس وقت تک سونی کو پھر دوسرے ستون کے ساتھ باندھا جاچکا تھا اور وہ اب بھی دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی' گالیاں بک رہی تھی۔ رب نواز کی ماں بہن ایک کررہی تھی۔ اسے اپنی جسمانی اذیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ واقعی پاگل ہوگئی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ایک ساتھ دو شخص کے غلام اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بل دیا ہوا موٹا بجلی کا تار تھا۔

پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا' بجلی کے تار کا ہنٹر ہاتھ میں رکھنے والا آگے بڑھا اور سونی کے قریب جاکے رک گیا۔ اس نے ہنٹر تھما کے اپنے ہی ساتھی کو مارنا شروع کردیا۔ وہ بھی گالیاں بکنے لگا' اس نے بیلٹ سے سونی کو مارنے والے کو نیچے گرادیا اور اس پر ہنٹروں کی بارش کردی۔ نیچے پڑا ہوا شخص مدد کے لیے چلانے لگا کیونکہ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا "ملک صاحب جی' مجھے بچاؤ۔"

ملک نے چلّا کے کہا "اوئے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو' پکڑو اسے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو ملازم آگے بڑھے مگر پاگل ہو کے بغاوت پر اتر آنے والا ہر طرف ہنٹر گھما رہا تھا۔ بجلی کے تار کو دہرا کر بنایا جانے والا ہنٹر شائیں شائیں لہرا رہا تھا اور جسے چھو لیتا تھا وہ تڑپ کے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سوئی کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ ظلم نے اس کے اعصاب کو شکست دے دی تھی۔ شاید اس نے ایسا ظالمانہ تماشا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس کے اندر کہیں اب بھی انسانیت کی کوئی رمق زندہ تھی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ عورت ماں بیٹی اور بہن بھی ہوتی ہے۔ شاید اس کے ماضی کا کوئی زخم ہرا ہو گیا تھا۔

وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو۔ اس کا دماغ الٹ گیا تھا اور وہ بھول گیا تھا کہ اس کے حق نمک کے تقاضے کس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ اپنا فرض اور اپنی فرمانبرداری اور اپنا عہد غلامی سب بھول گیا تھا اور اسے صرف یہ یاد رہا کہ یہاں ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے اور اسے ضمیر نے مجبور کر دیا کہ وہ ساری زندگی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے زندگی کو داؤ پر لگا کے مظلوم کے حق میں ظالم کے خلاف ڈٹ جائے۔

رب نواز کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ وہ غصے میں اپنے حکم کے غلاموں پر برس پڑا "بے غیرت کتو، نمک حرامو! نامرد ہو گئے ہو سب۔ اوئے کوئی مارو دو اس پاگل کتے کو۔"

ایک دھماکا ہوا اور پاگل کتا فرش پر لوٹنے لگا۔ چلانے لگا اور زور زور سے کلمہ پڑھنے لگا۔ اس کا خون سارے فرش پر پھیلنے لگا اور وہ اونچی آواز میں بولنے لگا "یا رب جی، یا رب جی، سینوں مانی دے۔ یا رب جی، سینوں مانی دے۔" اس نے پھر کلمہ پڑھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز کمزور پڑنے لگی اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ مبہم اور غیر واضح ہونے لگے۔

سوئی پہلے ہی بے ہوش تھی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر مجھے کئی خونی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک میری نظروں کے سامنے وہ ہال گھومنے لگا اور مجھے ایک زبردست ابکائی آئی۔ ایک پاگل کتے کو گولی مارنے والے بھی اب ساکت کھڑے تھے۔ اس اینٹی کلائمیکس نے رب نواز کو بھی نروس کر دیا تھا۔

وہ میری طرف ہو کے ٹھہر گیا "ہاں، کیا کہہ رہا تھا تو، کہاں ہے دلنواز؟"

مجھے ابکائی کے ساتھ الٹی آئی اور اندر سے نکلنے والا سارا مواد رب نواز کے اوپر گرا۔ وہ ایک گالی دے کے پیچھے ہٹا۔ اسی وقت اوپر سے ایک محافظ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے چلا کے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس وقت تک مجھ پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے دھندلاتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میں اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ایک بار پھر مجھے ہوش آیا تو میں نے ایک خواب کا منظر دیکھا۔ میں صاف ستھرے بستر پر رئیس خانے کے بیڈ روم میں آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ میرے ساتھ ہی مجھ سے بہت قریب شبنم تھی۔ اتنے قریب کہ میں اسے چھو سکتا تھا اور اس کے قرب کی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ خوشبو جو کسی پرفیوم یا سینٹ اور عطر کی نہیں، شبنم کی تھی۔ اس کے سوا کہیں اپنا وجود نہیں رکھتی تھی۔ شبنم کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور وہ آدھی آستینوں والی اور مردانہ کالر والی سیاہ شرٹ میں تھی۔ جس کے گریبان کا ایک بٹن وہ پہلے ہمیشہ کھلا رکھتی تھی اور اس کے تراشیدہ بالوں کی ریشم کی مچلتی لریں چہرے پر ادھر سے ادھر ہو رہی تھیں۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ خواب ٹوٹے۔ شبنم کو میں نے پہلے پہل اسی روپ میں دیکھا تھا۔ ایسی ہی سیاہ شرٹ اور پاجامہ۔ کندھے پر ایک بیگ۔ پیروں میں جوگرز۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ

ہاں دکھا دے اسے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

سیاہ شرٹ میں اس کا اجلا پن کیسے دمکتا تھا۔ اس کی گردن کی سپیدی کیسے جگمگاتی تھی اور پھر وہ سادگی و پرکاری، گریباں کا ایک ٹوٹا بٹن، ایک عالم کو دیوانہ بنانے والا۔

میرے ماتھے پر اس کے ہاتھ کا لمس آیا تو میں چونکا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو خواب کا منظر پھر میرے سامنے تھا۔ اس کی خوشبو بھی وہیں ٹھہری ہوئی تھی اور وہ میرے اوپر جھک آئی تھی۔ اس کے لب میرے ماتھے کو چوم رہے تھے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "شبنم۔ شبنم۔ یہ تم ہو۔ میرے پاس۔"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "ناصر تم ٹھیک ہو۔"

میرے بازو اس کے گرد لپٹ گئے "مجھے یقین نہیں آتا۔ میں تو اسے خواب سمجھ رہا تھا۔"

شبنم کے آنسو میرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ وہ مجھے دیوانہ وار چوم رہی تھی "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے اس کا چہرہ تھام کے اس کی آنکھوں کو ہونٹوں کو اور گالوں کو چوما "مجھے کیا ہو سکتا تھا جان۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں نے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں؟"

"مجھے۔ مجھے سب پتا ہے" اس نے خود کو سمیٹا اور

آنسوؤں میں مسکرائی۔

"یہ سب کیسے ہوا شبنم؟" میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرا سارا بدن درد سے تڑپ رہا تھا، چلا رہا تھا۔

"بس ہو گیا لیکن ابھی نہیں، سب بتا دوں گی بعد میں" اس نے مجھے اٹھنے سے روک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میں ٹھیک ہوں جان۔ بس ذرا درد ہے جسم میں۔ ٹھیک ہو جائے گا وہ بھی۔ یہ بتاؤ سوئی کہاں ہے، کیسی ہے وہ؟"

"سوئی بھی ٹھیک ہے، دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔"

میں نے کہا "میں اسے دیکھوں گا۔"

"دیکھ لینا۔ میں جو بتا رہی ہوں کہ ٹھیک ہے وہ۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "نہیں۔ میں ابھی دیکھوں گا۔"

"اُفوہ۔ بھئی ضد کیوں کرتے ہو، گر جاؤ گے" شبنم نے مجھے دوبارہ لٹانے کی واجبی سی کوشش کی۔

"نہیں گروں گا، تمہارا حسین سہارا جو ہے۔"

"ڈائیلاگ مت مارو۔ اچھا ٹھہرو، میں رئیس کو بلاؤں۔ میرے اوپر گر گئے تو مجھے کون اٹھائے گا؟" وہ ہنسی۔

میں سیدھا کھڑا ہو گیا "دیکھو۔ تمہارے سوا کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے مجھے، چلو۔"

اس نے ایک ہاتھ میری کمر کے گرد ڈال دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کو قریب کر لیا۔ میں نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ رئیس اندر آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے یہ جلوس!" وہ خفا ہونے لگا۔

میں نے کہا "رئیس۔ اُلّو کے پٹھے! میرے پاس آ، مجھے پھر دیکھ کے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ وہ کہاں ہے۔ فرید۔ اور رخشی؟"

رئیس نے مجھے سنبھال لیا اور شبنم دوسری طرف آ گئی "سب ٹھیک ہیں۔ سب زندہ سلامت ہیں۔ تو آرام سے نہیں لیٹ سکتا؟"

شبنم نے دروازہ کھولا "سوئی کو بقلم خود دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار، میں کیا بتاؤں۔ اس لڑکی پر کتنا ظلم ہوا اور کتنا ظلم برداشت کیا اس نے۔ اس کے حوصلے کی کوئی مثال نہیں۔"

"اس کی حالت بہت خراب تھی" رئیس بولا۔

میں نے کہا "وہ تو پاگل ہو گئی تھی۔ نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اس کا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ زیادہ خرابی نہیں ہوئی۔ ہم وقت پر پہنچ گئے تھے۔" رئیس نے دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ "لے، دیکھ لے۔"

سوئی گہری نیند میں تھی۔ میں نے اس پر جھک کے آہستہ سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور ایک دم وہ سب، جو اس کے ساتھ ہوا تھا، اپنی تمام اذیت ناک تفصیلات کے ساتھ میرے تصور میں زندہ ہو گیا۔ میں بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گیا۔

"ویسے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن سوئی کے ذہن پر ابھی تک اثر ہے" شبنم نے کہا "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گی۔"

"ابھی کیا SEDATION لیا ہے؟" میں نے کہا۔

شبنم نے سر ہلایا "وہ ضروری تھا۔ اثر کم ہوتا ہے تو بے چین ہوتی ہے۔ کبھی رونے لگتی ہے، الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔"

"گالیاں بکتی ہے ایسی کہ سن کر مزہ آ جاتا ہے قسم اللہ کی۔ اب چل اٹھ۔"

میں نے کہا "اس کے بدن پر بھی زخم ہوں گے۔"

"سب دیکھ رہی ہے ڈاکٹر۔ اس نے کہا ہے کہ ہفتہ دس دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شبنم نے کہا "تم چلو، اپنے بیڈ پر۔"

میں واپس اپنے بیڈ تک گیا تو تھکن سے میرا حال خراب ہو گیا تھا اور میری جسمانی طاقت زائل ہو چکی تھی۔ میں سانس بحال ہو جانے کے بعد باتیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے تیمارداروں نے میری ایک نہ سنی۔ رئیس نے مجھے دھمکی دی "شرافت سے نہیں لیٹے گا پیارے تو قسم اللہ کی رسی سے باندھ دوں گا اور منہ پر لگا دوں گا ٹیپ۔"

"یار، لیٹ کر باتیں کرنے میں کیا حرج ہے؟"

شبنم نے کہا "آج کا دن اور خاموش لیٹ کر گزارنے میں کیا حرج ہے؟"

"اچھا تم بولو۔ میں صرف سنوں گا" میں نے کہا۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔ باتیں نہیں کر سکتی" وہ بولی "میں تمہارے لیے سوپ تیار کر کے لاتی ہوں۔ چاہو تو دودھ پی لو۔"

میں نے کہا "کافی نہیں مل سکتی؟"

"تو اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ نخرے نہیں چلیں گے بالکل۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے رئیس سے کہا "یار، یہ فرید اور رخشی کہاں ہیں؟"

"فرید گیا ہے آزاد صاحب کے پاس پھر جائے گا پولیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسٹیشن۔"

"پولیس اسٹیشن میں کیا ہے؟"

"ابے پڑا رہ چپ کر کے ورنہ قسم اللہ کی رسی سے باندھ کے ڈال دیں گے اور منہ پر لگا دیں گے ٹیپ" وہ بگڑ کے بولا "سالے صبر نہیں ہوتا ایک دو دن۔"

میں نے اس کی منت کی "یار بس ایک بات بتا دے۔ وہ ولد الحرام دلنواز کہاں ہے۔ کیا اسے چھوڑ دیا تم نے؟"

"چھوڑنا پڑا یار۔ شبنم کے بدلے میں۔ آزاد صاحب کے کہنے پر۔"

"چل یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ خود رب نواز نے کیا ہو گا۔"

"اس سالے کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ آزاد صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ابھی تک تمہارا نام نہیں ہے ایف آئی آر میں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمہیں چھوٹ مل گئی ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شبنم واپس نہ آئی تو دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ وہ ڈر گیا' اخباروں نے ویسے ہی واویلا مچا رکھا تھا۔"

شبنم سوپ کا مگ لیے اندر آئی "چلو' یہ پیو اور لیٹ جاؤ۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگا لیا "تم جیسی نرس ہو تو میں سارا سال بستر علالت پر لیٹنے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے ہاتھ چھڑا کے جاتے ہوئے کہا "ایک ہفتے کی سہلت ہے آپ کو' زیادہ سے زیادہ۔"

"اس کے بعد کیا ہو گا؟"

"ابھی ایک نرس آئے گی انجکشن لگانے اور آپ کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ دوسرے دن اٹھ کے دوڑتے نظر نہ آئے تو کہنا۔"

اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ دوائیں کھانے کے بعد میں سوپ اور اس کے بعد دودھ کا گلاس شبنم کے حکم پر حلق سے اتار رہا تھا کہ نرس نمودار ہوئی۔ وہ بلاشبہ ایسی ہی چیز تھی کہ اسے دیکھ کے مرض اور مریض دونوں بھاگ جائیں۔ پونے چھ فٹ قد کے ساتھ اس کی چوڑائی بھی لرزہ خیز تھی اور اوپر سے اس کا رنگ جسے دیکھ کر توا شرمائے۔ وہ انتہا درجے کی خوش اخلاق بھی تھی اور بات بات پر منہ پھاڑ کے ہنستی تھی تو اس کے جسم کا ہر حصہ تھرتھرانے لگتا تھا اور کمرے میں زلزلہ سا آ جاتا تھا۔ ستم مزید یہ کہ اس کا نام روزی تھا۔

اس کے جانے کے بعد شبنم نے پوچھا "پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں مار خان کے ساتھ اس کی جوڑی زیادہ اچھی رہے گی۔ دو بول پڑھ کے اتنی بڑی چیز ملتی ہو تو چھوٹی کو قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھ سے کہہ رہی تھی تمہارا ینگ مین بہت ہینڈسم ہے۔ میں نے کہا تمہیں اتنا پسند ہے تو ابھی وقت ہے' پسادو منگنی کی انگوٹھی بے ہوشی میں" شبنم ہنسی۔

رات تک میں سوتا رہا پھر آنکھ کھلی تو شبنم میرے قریب کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے نیند میں بولنا شروع کیا "آئی ۔۔۔ آئی لو ۔۔۔ یو ۔۔۔ روزی ۔۔۔ روزی ڈارلنگ!"

شبنم نے رسالہ کھینچ کے میرے منہ پر مارا اور ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی کے ساتھ میں نے دوسری لرزہ خیز ہنسی روزی کی سنی۔ میری روح فنا ہو گئی۔ وہ بیڈ کے دوسری طرف موجود تھی اور میرے چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ میری نظر نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ مجھ پر جھک کر بولی "ریئلی! سوئٹ ینگ مین۔ ہم بھی تم کو دیکھا اور دل دیا۔ ابھی ہم میرج بنائے گا۔"

شبنم نے کہا "میں نے تو کہا تھا کہ انگوٹھی پسادو فوراً۔"

"وائے ناٹ۔ ابھی یہ رنگ ہے۔ ہم کو جارج دیا' مگر ہم اس کو چھوڑ دے گا۔" اس نے اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "روزی۔ یہ انگوٹھی نہیں' میرے لیے تو چوڑی ہے۔ میں اپنی کلائی میں پہن لوں گا۔ بائی دا وے' تمہارا یہ جارج بھی کیا تمہاری طرح حسین ہے؟"

"اوہ نو۔ وہ ایک دم سفید ہے۔ بالس کا مالک پتلا اور چھوٹا ہے۔ ایک دم لائٹ ویٹ۔ ہم بہت عقلمند ہے۔ وہ ایک دم ایڈیٹ۔ ہم ہنستا ہے تو دی ٹائم' وہ روتا ہے۔"

میں نے کہا "بالکل OPPOSIT SEX پھر تو بہت آئیڈیل جوڑی ہے تمہاری۔ یو سی' میاں بیوی کو ایک دوسرے کی ضد ہونا چاہیے۔ ایک بولنے والا تو دوسرا سننے والا۔ ایک لڑاکا تو دوسرا امن پسند۔ ایک ڈکٹیٹر تو دوسرا حکم کا غلام۔ نیگیٹو پازیٹو ملتے ہیں تو روشنی ہوتی ہے۔"

وہ دن بھر کی رپورٹ لے کر چلی گئی تو میں نے کہا "یہ ڈاکٹر کون ہے میرا۔ ابھی تک میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

"دیکھ لو گے تھوڑی دیر میں۔" شبنم بولی "دونوں رات کے وقت آتے ہیں۔ ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔"

میں نے کہا "میں سوئی سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ جاگ رہی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ شاک میں ہے۔ ایک

دو روز میں اس کے اثرات کم ہو جائیں گے۔ تب تک اسے مکمل سکون چاہیے۔"

میری جسمانی حالت دوپہر کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ میں کسی سہارے کے بغیر دوسرے کمرے تک گیا۔ سوئی آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے خوراک کے نعم البدل کے طور پر گلوکوز کی ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ اس سے یہ آسانی بھی تھی کہ بحالی صحت کے لیے ضروری دوائیں جو انجکشن سے دی جاتی تھیں' گلوکوز کے ساتھ قطرہ قطرہ اس کے خون میں شامل ہو رہی تھیں۔ دو مریضوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری رخشی اور شبنم نے سنبھال لی تھی۔ شبنم میرے ساتھ تھی اور سوئی کے ساتھ رخشی۔

میرے جسم پر بھی زخم تھے جن کی ڈریسنگ چھ چھ گھنٹے بعد ہوتی تھی۔ میں مسلسل ایک ہی کروٹ پر نہیں لیٹا رہ سکتا تھا۔ زخموں کی صفائی سے بیڈ کی چادر بدلنے تک ساری ذمے داری نرس کی تھی مگر اس سے شبنم نے لے لی تھی۔ سکون بخش دواؤں کے ساتھ مجھے درد کا احساس مٹانے والی دوائیں بھی مسلسل دی گئی تھیں چنانچہ میں نقل و حرکت میں کچھ سست تھا اور درد جو اٹھتے بیٹھتے ہوتا تھا میرے لیے قابل برداشت تھا۔

میرے کھانے پینے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی چنانچہ رات کو جب شبنم نے پھر مجھے بیماروں والی خوراک دینے کی کوشش کی تو میں نے احتجاج کیا۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی اور میں سب کے ساتھ بیٹھ کے نارمل کھانا کھانے کے موڈ میں تھا۔ شبنم نے کہیں فون کیا اور ڈاکٹر سے اجازت لی۔ اس کے باوجود سب نے اتفاق رائے سے میرے کسی سوال کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ فرید' رخشی اور رئیس سب کھانا اٹھا کے میرے کمرے میں آ گئے اور ہنسی مذاق بھی کرتے رہے لیکن انہوں نے قانونی مسائل پر بات نہیں کی۔ وہ مجھے اور سوئی کو اس عقوبت خانے سے کیسے نکال کر لائے۔ رب نواز کا کیا ہوا' شبنم کے ساتھ رب نواز کی قید میں کیا ہوا اور اس کی رہائی کے معاملات کیسے طے پائے۔ ان سوالات کا جواب انہوں نے موخر کر دیا۔

"یار' جلدی کیا ہے؟ آج آرام کرو؟" فرید نے کہا "کل بات کریں گے۔"

"بات تم کرو گے۔ میں صرف سنوں گا اور میرے کان بیمار نہیں ہیں۔ کوئی آواز کان میں جانے سے میری حالت نازک نہیں ہو جائے گی" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی ڈاکٹر آنے والا ہے۔ اس کی رائے پوچھ لینا" شبنم نے کہا "وہ بالکل صحیح جواب دے گا تمہیں۔"

رات نو بجے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں پھر اچانک ڈاکٹر کمال فاروقی نے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے پیچھے فرماندر آ گئی۔

بے اختیار میں نے کہا "الو کے پٹھے ۔۔۔ تو!"

اس نے بیٹھنے سے پہلے کہا "سور کے بچے۔ تو زندہ ہے ابھی تک۔ میں تو آیا تھا جنازے میں شریک ہونے۔"

میں نے کہا "تجھے گاڈ کے مرتا میں مگر اب تو زہر کا انجکشن لگائے گا مجھے۔"

فرحانی "بھائی' یہ کیا طریقہ ہے' اتنے دن کے بعد ملے ہو' کوئی اچھی بات کرو۔"

میں نے اسے گلے لگایا اور اس کی گود سے بچے کو لے لیا "یہ ہوا نا اسم بامسمّیٰ الو کا پٹھا۔ کوئی نام رکھا ہے تم نے اس کا یا نمبر چلیں گے؟"

فرحانی ہونے لگی "عمران ہے اس کا نام۔ نمبر کیوں ہو گا بھائی؟"

میں نے کہا "سولہ رہتی' نمبر تراوے' چوراوے' پچاوے۔ یاد رہتا ہے کہ کون کس سال کا ماڈل ہے۔ کتنے سال پرانا ہو گیا۔"

کمال ہنسنے لگا "سن دو ہزار میں آتا نمبر زیرو زیرو پھر زیرو ون۔"

"اللہ اسے عمران خان سے زیادہ نیک نامی اور عزت دے۔ پاکستان کا نام روشن کرے۔ اپنے باپ پر نہ جائے" میں نے اسے ملاحظہ کیا "ویسے ڈیزائن وہی ہے۔"

"بھائی' دعاؤں کی زیادہ ضرورت آپ کو ہے۔ یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں۔ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ جو کام کر رہے ہیں الٹا" فرحانی بگڑنے لگی۔

"بستر مرگ پر پڑے بھائی کو ڈانٹ رہی ہے' ظالم بہن!" اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا "مت کریں ایسی دل دکھانے کی باتیں۔ پتا ہے آج کتنے عرصے بعد دیکھا ہے آپ کو۔ خون کتنا سفید ہو گیا ہے تمہارا بھائی۔ ایک بہن ہے' اس کو فون تک کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسی کیا مصروفیت ہے آخر تمہاری۔ پہلے لگا جاتے تھے مہینے میں ایک دو چکر۔ اب تو خان جی کے چہلم پر بھی صورت نہیں دکھائی۔ دو مہینے ہو گئے۔ تمہیں سالگرہ بھی یاد نہیں رہی۔"

میں نے کہا "سالگرہ میں آیا تھا' رومت۔ اگر تو سال میں دو بار منانے لگی ہے تو مجھے کیا معلوم۔"

"میری شادی کی سالگرہ تھی" اس نے احتجاج کیا۔

"اوہ' یعنی شادی ہو گئی ہے تیری' بھئی مبارک ہو" میں نے کہا "کب ہوئی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ہنسنے لگی "بہت ڈھیٹ بھائی ہو۔ ابھی تک ایک روپیہ نہیں نکلا تمہاری جیب سے' کنجوس ماموں۔"

میں نے کہا "روپیہ ہاتھ کا میل ہے بھانجے اور تیری ماں تجھے کمائی کا ذریعہ بنا رہی ہے ابھی سے۔ ضرور تیرا باپ اسے پٹی پڑھا کے لایا ہوگا کہ میکے والوں سے مال لے کر آؤ۔ وہ کمینہ بڑا لالچی ہے۔" بچہ چلانے لگا تو میں نے واپس کردیا۔

قمر نے اسے مجھ سے لے لیا "کچھ شرم کرو بھائی!"

فاروقی نے میرا معائنہ شروع کیا "افسوس کہ تو ٹھیک ہو رہا ہے۔ ہارٹ فیل ہونے کا بھی کوئی چانس نہیں۔ ہڈیاں بھی سلامت ہیں۔"

میں نے کہا "سونی کو دیکھنے کون آیا ہے' کوئی لیڈی ڈاکٹر ہے؟"

"کوالیفائڈ ڈاکٹر تو نہیں ہے' مگر تجربہ ہے" وہ بولا۔

شبنم خاموشی سے سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ رئیس چائے بنوانے چلا گیا تھا۔ رخشی اپنے مریض کے ساتھ تھی اور فرید اس کے ساتھ تھا۔

میں نے کہا "کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی تمہارے اسپتال میں؟"

قمر نے کہا "ڈاکٹرز تو ہیں' مگر رئیس بھائی نے کہا کہ معاملہ رازداری کا ہے تو یہ خود آگئے تھے اور چاندنی کو ساتھ لے آئے تھے۔ وہ بھی آدھی ڈاکٹر تو بن گئی ہے مریضوں کو دیکھ دیکھ کے۔ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "چندا آئی ہے؟"

"دوا تو میں نے ہی لکھی تھی۔ اس نے ڈریسنگ کی' زخم خاصے خطرناک تھے۔ سیپٹک ہوجاتا تو مشکل پڑجاتی" فاروقی نے میرا معائنہ جاری رکھا "ساری کہانی تو میں نے نہیں سنی لیکن بہت اسٹرانگ پولیس کیس بنتا ہے رب نواز کے خلاف۔ رئیس نے فون پر کہا کہ پولیس کو AVOID کرنا ہے۔"

"ٹھیک کہا ہے اس نے۔ قانونی پیچیدگی ہمارے لیے مسائل میں اضافہ کرتی۔ سونی کے بارے میں کیا خیال ہے تیرا؟"

"میں چاہتا تھا کہ اسے اسپتال میں شفٹ کردیا جائے۔ اسے زیادہ کیئر کی ضرورت ہے" فاروقی بولا۔

"بھائی' ہم اس کا خاص خیال رکھیں گے۔ اپنے گھر لے جائیں اگر تم کہو۔"

میں نے کہا "کیسے لے جاؤ گے؟"

"ہم ایمبولینس میں آئے ہیں" فاروقی بولا "کوئی اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ہمارے ساتھ چلے۔"

"میں چلتا ہوں" رئیس بولا۔

قمر ہنسنے لگی "آپ اپنے دوست کو دیکھیں' وہاں میں ہوں' چندا ہے۔"

"رخشی کو لے جاؤ۔ تمہارے ذمے اسپتال کے دوسرے بہت سے کام ہیں" میں نے کہا "پہلے صرف الّو پال رکھا تھا۔ اب الو کا پٹھا بھی ہے۔"

چندا آہستہ سے اندر آئی۔ ایک لمحے کے لیے ایک عجیب سی خلش نے اپنا تسلط جمالیا پھر شبنم نے کرسی سے اٹھ کر کہا "چندا! ادھر آجاؤ۔"

چندا نے اس سے ہاتھ ملا کے میری طرف دیکھا "کیسے ہو ناصر!"

میں نے کہا "تم دیکھ ہی رہی ہو۔ یہ بتاؤ' سونی کیسی ہے؟"

"اسے اسپتال لے جانا ہی ٹھیک ہے بلکہ ضروری ہے" وہ کمال سے بولی۔

چندا وہی تھی۔ اس کا حسن وہی تھا لیکن اس کے انداز بہت بدل گئے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اس کی صورت پر شگفتگی کی جگہ ایک افسوسناک تھکن نظر آنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں' جو پہلے شوخی اور اندر کی خوشی سے روشن نظر آتی تھیں' بجھے ہوئے چراغوں کی طرح لگتی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ بھی سپاٹ اور بے جان ہوگئی تھی۔ میرے لیے اس کے جذبات کا بہتا دھارا ابھی جیسے منجمد ہو کے برف کی چٹان بن گیا تھا۔ اس کے لیے میں' رئیس یا فرید سب محض آشنا تھے۔ کسی کے ساتھ اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی اسی لیے وہ کمال فاروقی کے ساتھ یہاں آگئی تھی۔ اسے نہ مجھ سے کوئی شکایت تھی اور نہ شبنم سے رقابت۔ وہ پہلے والی چندا ہی نہیں تھی۔

مجھے افسوس بھی ہوا' ندامت بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ حالات نے ہمیں کتنا دور کردیا تھا۔ جہاں سے ہم ایک دوسرے کو یادوں کے کسی آئینے میں بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان حالات کو اب تقدیر سے منسوب کیے بنا چارہ نہ تھا ورنہ اس میں میری غلطی کم تھی' چندا کی زیادہ۔ میں نے اپنی خوشی نیت یا ارادے سے شاہ عالم بننا نہیں چاہا تھا۔ مجھے شاہ عالم بننا پڑا تھا لیکن چندا نے میری مجبوری کے عذر کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے مجھے اعتبار کے قابل بھی نہیں سمجھا اور میری کسی بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ اس مفروضے پر قائم رہی کہ میں ہوسِ اقتدار میں شاہ عالم بنا تھا۔ میں نے شاہ عالم بن کے رخشی کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرلیے تھے اور شبنم کے ساتھ ناجائز مراسم کا رشتہ بھی قائم رکھا تھا۔ اس وقت یہ سب ایسے نہیں تھا۔ یہ میں جانتا تھا یا میرا خدا کہ میں

نے رخشی کو بری نیت سے دیکھا تک نہیں تھا اور اس کی ترغیب کے جال سے بھی نکل گیا تھا لیکن چندا نے اس سچائی کو قبول نہیں کیا تھا اور اس یقین کی نفی کرنے میں ناکام رہی تھی کہ ایک گھر کی چھت کے نیچے اور ایک ہی بیڈ روم میں رہنے والے دو مرد اور عورت ایک دوسرے کے قرب کو کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں کہ انہیں دنیا کی طرف سے ایسا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔

میرے لیے یہ بہت شرم کی بات تھی اور اس سے میری عزتِ نفس بری طرح مجروح ہوئی تھی کہ چندا کی میرے بارے میں اتنی خراب رائے ہے مگر بعد میں اس کا رویہ روز بروز زیادہ رسوا کرنے والا ہوتا چلا گیا تھا۔ انتہا یہ ہوگئی کہ اس نے خان جی کے معاملے میں کسی حد تک مجھے ان کی موت کا ذمے دار سمجھا۔ اس کا رویہ میرے اور اس کے رشتوں کی خلیج کو پھیلاتا گیا۔ میں بے عزتی کے ساتھ دل شکستگی کے اس دور میں اتنا اکیلا اور لاوارث ہوگیا تھا کہ شبنم نے بڑی آسانی سے میری زندگی کے خلا کو پُر کردیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مجھے ہوس نہیں' محبت دی جس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہوگئی تھی۔

آج میں یہ بات برملا کہہ سکتا تھا کہ چندا کی محبت میں بڑی خودغرضی اور تنگ دلی تھی۔ شبنم کی محبت میں وسعت تھی اور لچک تھی۔ چندا کی محبت کا آئینہ شک کی ایک کنکری سے چور چور ہوگیا۔ شبنم کی محبت مجھے کسی طرح بھی پابند نہیں کرتی تھی اور حسد کے جذبات سے بالاتر تھی۔

جب چندا اور کمال اپنے ساتھ سونی کو لے گئے تو میں نے اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے آنے سے مجھے کچھ پشیمانی اور پریشانی کے جذبات نے مغلوب کیا تھا مگر پھر میں نے مغائرت کے اس رشتے کا وجود تسلیم کرلیا اور سوچا کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ آج سامنا بھی ہوگیا۔ اب زندگی میں جب ملیں گے ایک دوسرے کے لیے غیر ہوں گے۔ پرانے وقتوں کی کسی یاد کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی کیونکہ آج کی حقیقت اٹل اور ناگزیر ہے۔ شاید چندا بھی یہی احساس دلانے آئی تھی کہ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا' اسے میں نے بھلا دیا ہے اور اب میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ تم کس شبنم کو جانتے ہو یا کس شعلے کے پجاری ہو۔

شبنم نے چندا کی موجودگی میں اور اس کے جانے کے بعد بھی کسی قسم کے جذباتی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی یہی کشادہ دلی مجھے حیران کرتی تھی۔ اس نے کبھی مجھے وفا کی زنجیر سے پابند نہیں کیا تھا اور کسی عہد وپیماں کا قیدی نہیں بنایا تھا۔ وہ میرے جذبات یا میرے جسم پر اجارہ داری کی کبھی قائل نہ تھی۔ اس کا سیدھا سادہ اصول یہ تھا کہ محبت مجھے تم سے ہے۔ ضروری نہیں کہ جواب میں تم بھی مجھے چاہو یا کوئی اور تمہیں نہ چاہے۔ اس آزادی کے بعد میں خود کو زیادہ اسیر محسوس کیسے نہ کرتا۔

فرید اور رئیس نے میرے آرام کا خیال رکھتے ہوئے رات کو مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شبنم بھی تیمارداری میں لگی رہی اور پھر لائٹ آف کرکے صوفے پر دراز ہوگئی۔

میں نے خود ہی اسے چھیڑا "تم کچھ چپ ہو۔ کیا تمہیں چندا کا آنا اچھا نہیں لگا؟"

"ہاں۔ اس کا آنا خالی از علت نہیں تھا" مجھے اس کے جواب نے حیران کردیا۔

"تم ایسا سمجھتی ہو؟"

"ڈاکٹر کمال فاروقی کو ہم نے ایک مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے بلایا تھا مگر چندا کیوں آگئی' ڈاکٹر بن کے؟ اسے کیا ہمدردی ہے سونی سے' جسے وہ جانتی بھی نہیں۔ اس کی لاتعلقی میں بھی کوئی تعلق ہے۔"

"کیسا تعلق؟"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ممکن ہے میری سوچ غلط ہو۔"

میں نے کہا "تم کو شک ہے کہ وہ پھر تعلق بحال کرنا چاہتی ہے؟"

"کیا اس کا یوں سوچنا' اور ایسا چاہنا غلط ہے یا ناممکن۔؟"

میں نے کہا "تم بلاوجہ ڈر رہی ہو۔"

وہ اٹھ بیٹھی "ڈرنے کی بات مت کرو۔ میں نے تمہیں قسموں وعدوں کی کسی زنجیر سے باندھ کے نہیں رکھا ہے۔ تم شادی کرلو چندا سے تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا تم سے جو رشتہ ہے۔ وہ کوئی عورت ختم نہیں کرسکتی۔ وہ خود اپنی ہی حسد کی آگ میں جل کے مرجائے گی۔"

میں نے اسے اپنے پاس کھینچ لیا "اگر میں کہوں کہ ایسا ہی میرے جذبات کا رشتہ ہے تم سے۔"

وہ مسکرائی "تو میں سمجھوں گی کہ یہ ایک بدل جانے والا سچ ہے۔ مجھے تمہارے کسی بھی جھوٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"مجھے جھوٹ بول کے کیا ملے گا؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ تم کسی ضرورت یا مصلحت کے دباؤ میں جھوٹ بولو گے۔ نہیں۔ لیکن تم نے چندا سے بھی سچ بولا تھا۔ اس سے پہلے شادو سے بھی۔"

"مگر چندا خود مجھے چھوڑ گئی۔ موت نے شادو کو مجھ سے چھین لیا تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا میں مر نہیں سکتی" وہ ہنسی۔

"یہ اور بات ہے کہ موت مجھے تم سے دور لے جائے مگر زندگی میں تمہیں مجھ سے کوئی چندا نہیں چھین سکتی۔"

"یہ کسی چندا کے بس کی بات ہی نہیں۔ میں جانتی ہوں' اور چندا اگر عام عورت کی طرح اپنی مجروح انا کی تسکین کے لیے کچھ سوچ کے پھر سامنے آئی ہے تو وہ خود کو اور دکھی کرے گی۔ شاید وہ محسوس کرتی ہو کہ ایسے شکست تسلیم کر کے اس نے غلطی کی۔ مجھے واک اوور مل گیا۔ اس نے سوچا ہو کہ آخر کیا نہیں ہے میرے پاس ناصر عظیم کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے۔ اس پر پہلا حق تو میرا ہی ہے۔ ایسی کی تیسی شبنم کی۔ میں اس کے غرور کو خاک میں ملا دوں گی۔"

"پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل!"

"یہ چندا کو سمجھنا چاہیے کہ وہ تمہیں حاصل کر سکتی ہے مگر میرے اس پاگل پن کو کیسے دور کر سکتی ہے۔"

میں نے کہا "اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا۔ تم کو اندیشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔"

شبنم نے کچھ دیر بعد کہا "یہ چندا تو برطانیہ جا رہی تھی۔ اس کا کوئی کزن دریافت ہوا تھا وہاں۔"

"ہاں جا تو رہی تھی مگر اس کے بعد کا مجھے علم نہیں کہ یہ پروگرام کیوں بدل گیا۔ پتا چل جائے گا۔ تم اس کے بارے میں اور مت سوچو۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے سوچنے کی؟" وہ بولی۔

مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ سوچ رہی ہے۔ انکار کرنے سے احساس کی نفی نہیں ہوتی۔ میں خود سونے کی کوشش میں جاگتا رہا اور اگرچہ میرے ذہن میں بھی کنفیوژن کوئی نہیں تھا مگر شبنم نے مجھے احساس دلایا تھا کہ وہ اب بھی خود کو غیر محفوظ اور جذباتی طور پر INSECURE محسوس کرتی ہے۔ شاید محبت کے معاملے میں ہر عورت دوسری عورت سے ڈرتی رہتی ہے۔ مرد بہت کم ایسا سوچتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ مرد آسانی سے چھینے جا سکتے ہیں اور وہ چھن جانے کو اپنی مردانگی کی سند سمجھتے ہیں اور چھیننے والی عورت کو اپنی قوتِ تسخیر پر غرور کی ضرورت ہوتی ہے۔

صبح میں جاگا تو رئیس غائب تھا۔ وہ کمال کے پاس چلا گیا تھا۔ فرید کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ بھی "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کے نکل گیا۔ شبنم نے مجھے بتایا کہ اسے آزاد صاحب نے قانونی مشاورت کے لیے طلب کیا تھا۔

میں نے کہا "خاتون۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گی کہ ان قانونی معاملات کی نوعیت کیا ہے؟"

اس نے کہا "کیوں نہیں لیکن پہلے ناشتا۔ تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ گھڑی دیکھو۔"

عرض کیا ہے۔

گھڑی گھڑی گھڑی کیوں دیکھوں
ہر گھڑی جب تم کو دیکھوں

ناشتے کے بعد اور دوائیں کھانے کے بعد شبنم نے بتایا "کل ملک نے ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے درخواست دی تھی لیکن وہ مسترد ہو گئی تو وہ بھاگ گیا۔ پولیس نے اسے فرار ہونے میں پوری مدد دی۔"

"کس کیس میں ضمانت چاہتا تھا؟"

"ایک کیس تو آزاد صاحب نے کیا تھا' میرے اغوا کا۔ اس میں رب نواز کا نام نہیں تھا۔ انہوں نے بعد میں درخواست دے کر شامل کیا۔ اس میں واضح شک کا اظہار کیا گیا ہے اور وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جن کی بنا پر رب نواز کو مجھ سے ذاتی پرخاش تھی۔ دوسری ایف آئی آر میں نے لکھوائی تھی جو آزاد صاحب کے کیس کو سپورٹ کرتی ہے۔ میں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مجھے کیسے کب اور کہاں سے اغوا کیا گیا۔ کہاں رکھا گیا اور مجھے حبسِ بے جا میں رکھنے والے کون تھے؟"

"تم نے رب نواز کے علاوہ کس کو ملزم بتایا ہے؟"

"میں نے چار نامعلوم افراد کو نامزد کیا ہے جن کو میں جانتی نہیں مگر سامنے آنے پر شناخت کر سکتی ہوں۔" وہ بولی "پھر جب رئیس اور فرید نے پولیس کے ساتھ مل پولٹری پروڈکٹ کے مرغی خانے پر چھاپا مارا تو وہاں سے تین افراد پکڑے گئے تھے۔ جو اب پولیس کی تحویل میں ہیں۔"

"رب نواز سمیت؟"

"رب نواز وہاں نہیں تھا" شبنم نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم!"

"سرکاری رپورٹ کے مطابق تم بھی وہاں نہیں تھے اور سونی بھی نہیں تھی۔ وہاں سے پولیس نے دو لاشوں کو قبضے میں لیا۔ ایک کو قریب سے گولی ماری گئی تھی' دوسرے کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی" شبنم نے کہا۔

میں نے بڑی مسرت سے اطلاع دی "وہ کسی تھانے کا کانسٹیبل شیر خان تھا۔ اسے سونی نے بڑی شاندار کک مار کے ڈائریکٹ جہنم میں ارسال کیا۔"

"بات یہ ہے کہ پریس نے میرے معاملے میں بہت واویلا مچا رکھا تھا چنانچہ صوبائی اور وفاقی محکمہ داخلہ کی سخت ہدایات تھیں پھر آزاد صاحب نے ڈی آئی جی کرائم پر دباؤ

ڈال رکھا تھا۔ یہ کارروائی اعلیٰ افسران کے حکم پر ہوئی تھی اور اس معاملے میں رب نواز کا سیاسی اثر رسوخ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔"

"یعنی میرا پیغام مل گیا تھا رئیس اور فرید کو؟"

"ظاہر ہے اسی پر فوری کارروائی کے احکامات جاری ہوئے۔ تمہارا فون رخشی نے وصول کیا تھا جیسے ہی وہ بینک سے لوٹے۔"

"ایک لاکھ جمع کرا دیے اس کے اکاؤنٹ میں؟"

"ہاں۔ ٹیلی فون آپریٹر ویشن پر تھا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ کال اسپتال سے کی گئی تھی۔ زینت بیگم نام تھا اکاؤنٹ ہولڈر کا۔ فرید نے اس سے واجبی سی جرح کی تھی۔ وہ زیادہ بتانے پر آمادہ نہ تھی مگر جتنا معلوم ہوا اس سے اندازہ کر لیا تھا سب نے کہ کال جینوئن ہے۔ کوئی فراڈ نہیں کر رہا ہے۔ فرید نے فوراً آزاد صاحب کو مطلع کیا۔ وہ اخبار کے دفتر سے جانے ہی والے تھے۔ ڈی آئی جی نے تین تھانوں کی نفری فراہم کر دی۔ انچارج تھا ایک ڈی ایس پی۔ جو سپاہی بھرتی ہو کے تیس سال میں ترقی کرتا ہوا اس عہدے پر پہنچ کے ریٹائر ہونے والا تھا۔ تم جانتے ہو اس قسم کے گھسے پٹے افسروں کی ذہنیت کو۔ وہ ٹرخانے اور ہیرا پھیری کرنے کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ڈی ایس پی بھی ملازمت کے آخری سال کا ہر دن کیش کرانے پر کمربستہ تھا۔ اس نے کسی طرح رب نواز کے گھر پر پیغام دے دیا کہ ملک صاحب سے کہو ہوشیار ہو جائیں۔ اس کی بدقسمتی کہ فون اٹھایا کسی بچے نے۔ بڑا بیٹا سو رہا تھا اور ملکانی باتھ روم میں تھی۔ پیغام آدھے گھنٹے بعد رب نواز تک پہنچا جب پولیس نے مرغی خانے کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ رب نواز نیچے اسٹور میں چھپ گیا۔ پولٹری فیڈ کی بوریوں کے درمیان لیکن وہ گاڑی لے کر مرغی خانے سے نہیں نکل سکتا تھا۔"

"تم بھی ساتھ تھیں چھاپا مارنے والوں کے؟"

"ہاں۔ مجھے باہر چھوڑ دیا گیا تھا کہ ہر طرف نظر رکھوں اور ہر بات ریکارڈ کروں' میں دو کیمرے استعمال کر رہی تھی۔ ایک وڈیو کیمرا اور ایک عام فوٹو گرافی والا آٹو فوکس کیمرا۔ رب نواز کی گاڑی وہاں موجود تھی۔ فلم میں بھی ہے اور فوٹو میں بھی۔ چار سیکیورٹی گارڈ تھے مگران پر کوئی الزام نہیں۔ وہ ایک مقامی سیکیورٹی فرم کے ملازم تھے اور ان کا یہی کام تھا۔ جو انہوں نے کیا۔ رب نواز کے تین ملازم گرفتار ہو گئے لیکن سونی کو اور خود تمہیں جس حالت میں پایا گیا' اس کے بعد صورتِ حال کچھ ایسی ہو گئی کہ فرید کو تو مکا کر نیارا۔ رب نواز کا وہاں سے عزت آبرو کے ساتھ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ مشکل یہ ہو گئی کہ پولیس تم دونوں کو بھی حراست میں رکھنا چاہتی تھی اور تمہیں ان کی نگرانی میں میو اسپتال پہنچانے کے بعد پہرے میں رکھا جاتا۔ جب تک تمہاری حالت اس قابل نہ ہو کہ بیان دے سکو' ہم میں سے کوئی بھی تم سے نہ مل پاتا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسپتال میں کیا ہو جاتا۔ رب نواز کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم سے نہ سہی سونی سے اس کی ذاتی عداوت ہے۔ اسے اسپتال میں بھی ختم کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں سرکاری بیان یہی ہوتا کہ اسے نازک حالت میں لایا گیا تھا مگر ڈاکٹروں کی انتھائی کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اسپتال میں ہزاروں لوگ آتے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اسپتال کے عملے کا بھیس بدل کے سونی کو ایک مہلک انجکشن لگا جاتا تو پولیس کو بھی پتا نہ چلتا۔ اس کے علاوہ یہ بدنامی کی بات تھی۔ اخبار میں سب آجاتا۔ فرید نے بڑی عقلمندی دکھائی اور ڈی ایس پی سے بات کی۔ نتیجہ یہ کہ رب نواز وہاں سے نکل آیا جہاں چھپا ہوا تھا' یہ نہیں معلوم کہ اس نے ڈی ایس پی کو کیا قیمت ادا کی لیکن بالآخر یہ ہوا کہ فرید نے یہ سودا کر لیا کہ رب نواز کے بدلے میں نے اپنے دو آدمی مانگے کہ وہ جائے گا تو یہ بھی جائیں گے۔ ایک کی عزت کا معاملہ ہے تو دوسرے کی عزت کا بھی ہے۔ رب نواز اس وقت بڑی بری طرح پھنس گیا تھا اور ہر شرط منظور کر سکتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی کو اس نے اپنی رہائی کی قیمت بھی ادا کی ہو گی تم دونوں کے لیے بھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "اس کے دل پر تو چھریاں چل گئی ہوں گی کہ ہماری جان لینے کے بجائے وہ ہماری جان بچانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔"

فرید نے مجھ سے کہا کہ انہیں لے جاؤ تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ اس وقت تک رب نواز بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ یہ خطرہ مجھے شروع سے تھا کہ پولیس مجھ سے کیمرا نہ چھین لے۔ انہیں خطرہ ہو تو وہ ایسی کارروائی کر جاتے ہیں۔ بعد میں صحافی احتجاج کرتے ہیں تو کوئی سینئر افسر معذرت کر لیتا ہے یا اشک شوئی کے لیے ذمے دار پولیس افسر کو معطل کرنے کا ڈراما دکھا دیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ڈی ایس پی کے حکم پر میرا کیمرا چھین لیا گیا۔ اس نے کہا کہ چھاپا مار کارروائی خفیہ تھی۔ آپ کیسے آگئی ہو۔ میں نے ہنگامہ کیا تو فرید نے الٹا مجھے ڈانٹا کہ شور مت کرو اور جاؤ۔"

میں نے کہا "وہ خود پولیس والا رہا ہے۔ جانتا ہو گا کہ ہمارے ساتھ بعد میں کیا ہو گا؟"

شبنم نے سہلایا "اصل کہانی پہلے ہی بدلی جا چکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پولیس ثابت کردیتی کہ کانسٹیبل شیر خان کو سونی نے مارا تھا۔ خواہ اپنے دفاع میں قتل کیا جائے مگر قتل تو ہوتا ہے اور یہ فیصلہ عدالت ہی کرتی ہے کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ شیر خان کی لاش کے ساتھ جو دوسری لاش ملی تھی۔ اسے گولی کس نے ماری تھی؟"

"خود رب نواز نے۔ یا شاید اس کے کسی ملازم نے۔"

"اسے کس جرم کی سزا دی گئی تھی؟"

میں نے کہا "اچانک اس کو ضمیر صاحب نے خودکشی پر مجبور کردیا۔ اس پر دباؤ پہلے سے ہوگا۔ بس ایک ایسا وقت آیا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ جو ظلم کا غلام سونی پر مشقِ ستم کررہا تھا' وہ اسی پر ٹوٹ پڑا۔ ملک نے کہا کہ یہ کتا گلی ہوگیا ہے' اسے گولی ماردو۔"

"بعد میں یہ قتل تمہارے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔ یہ ثابت ہوجاتا کہ جس ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی اس پر تمہارے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔ صرف تمہارے' وہ تمہاری ملکیت بھی تھا۔ کوئی گواہ آجاتا یہ تسلیم کرنے کہ اس نے ریوالور تمہارے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ فرید نے تم دونوں کو قانونی چکر دلوا سے نکال لیا۔"

"یعنی کیس ختم ہوگیا۔ مرغی خانے میں کچھ ہوا ہی نہیں۔"

شبنم نے کہا "یہ بات نہیں۔ باقی کارروائی قانون کے مطابق ہوئی اور فرید نے مدعی بن کے ایف آئی آر لکھوائی۔ رب نواز کے تینوں نمک خوار پکڑے گئے اور اب وہ بتائیں گے کہ کانسٹیبل شیر خان کی موت کیسے واقع ہوئی اور دوسری لاش کس کی ہے۔ اسے کس نے گولی ماری۔"

"اس کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی رپورٹ تیار کرے گی۔"

شبنم نے کہا "ہاں۔ رب نواز ایسا پھنس گیا تھا کہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے خود کو بچانا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس نے تینوں نمک خواروں کو جاں نثاری کے لیے کہا۔ ان سے وعدہ کیا کہ انہیں پورا قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن اس جاں نثاری کے صلے میں انہیں اتنا دیا جائے گا کہ وہ ساری عمر عیش کریں گے۔ وہ سب لوگ انکار تو ویسے بھی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ راضی خوشی پولیس کے ساتھ چلے گئے۔ اب جو بیتے گی' ان پر بیتے گی۔ وہ پولیس اور وکیلوں کی کٹھ پتلی بنے رہیں گے۔"

میں نے کہا "چلو' اس کیس میں ہم نہ مدعی نہ گواہ۔ رب نواز جیسے چاہے نمٹے' لیکن دیگر مقدمات میں کیا ہوگا؟"

"اسپتال کے خلاف قانونی چارہ جوئی مشکل ہے۔ فرید نے کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اسپتال کا ایڈم صاحب بڑی چیز ہے۔"

"تو تم بھی واقف ہو ایڈم صاحب سے؟"

"میں نے دیکھا نہیں اسے۔ فرید نے بتایا کہ جب تم اور سونی اسپتال میں غائب ہوئے تو سب سے پہلے ایڈم صاحب سے ہی رابطہ کیا گیا تھا۔ وہ بہت خردماغ آدمی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ جب شبنم نام کی کوئی مجرم خاتون ہمارے پاس داخل نہیں تو اس کے ملنے والے کہاں سے آگئے اور تمہاری طرح کوئی آیا ہو تو مجھے کیا معلوم کہاں گیا۔ بعد میں فرید نے آزاد صاحب سے مشورہ کیا اور پولیس سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی انکار کردیا کہ کسی ثبوت کے بغیر اسپتال پر چھاپا کیسے مارا جاسکتا ہے؟"

"باہر پولیس کس کے حکم سے متعین تھی؟"

"باہر کوئی پولیس نہیں تھی۔ ایک تو تمہارا دوست جیرالڈ ایڈ انسپکٹر نذیر بنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ رئیس تھا اور ان کے کچھ پرانے ساتھی تھے۔ سب خدائی فوجدار بنے آتی جاتی گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ مشہور کردیا گیا تھا کہ سخت ناکابندی ہے اسپتال کے آس پاس اور سادہ کپڑوں میں پولیس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں اور سونی کو دو دن چھپا کے رکھا گیا۔ سونی کو آج صبح نکالنے کا موقع ملا تھا۔ تم خود نکل آئے' یہ زینت بیگم کون ہے؟"

میں نے اسے مختصراً زینت کے اور جونی کے بارے میں بتایا "اس کی لاش تو مل گئی ہوگی اب تک؟"

"اخبار میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ غالباً اسپتال والوں نے خبر دبادی۔ اگر زینت بیگم کو گرفتار کیا جائے تو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ پکڑی گئی تو ماری جائے گی۔ اسے نکل جانے دو۔ کیا رب نواز کے خلاف اور کوئی کیس نہیں بنتا۔ جعلی نوادرات بنانے اور اصلی کے ساتھ اسمگل کرنے کا اور نوادرات میں ہیروئن چھپانے کا۔"

"کیس کیسے بن سکتا ہے۔ جب تک کہ کوئی ثبوت شہادت نہ ہو۔ تم نے وہاں کس عورت کو پانچ بچوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بچے بھی اسمگل کیے جارہے تھے مگر مرغی خانے میں پولیس کو کچھ بھی نہیں ملا۔"

میں نے کہا "ایک خفیہ راستہ بھی ہے وہاں۔ ہم تو دیوار توڑ کے دوسری طرف گئے تھے۔"

"رئیس نے بتایا تھا چھاپا مارنے والوں کو مگر انہوں نے یقین نہیں کیا اور دیوار توڑنے پر راضی نہیں ہوئے۔ جہاں سے تم نے راستہ بنایا تھا وہ شگاف برابر کردیا گیا تھا۔ پرانے سکے' مجسمے یا تصاویر بنانے کا کوئی سامان نہیں ملا۔ رب نواز کو

ٹرپ کرنا پڑے گا بہت ہوشیاری سے۔"

"کیا اس نے سونی کے خلاف یا تمہارے اس ناچیز شوفر کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی کہ وہ گن پوائنٹ پر میرے گھر میں داخل ہوئے اور میرے بیٹے کو اغوا کرکے لے گئے۔"

"لکھوائی ہے۔ سونی کو وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ بات سونی کے لیے آئندہ بھی مسائل پیدا کرے گی۔ اس کی آزادی ختم ہوجائے گی' تم نے تو حلیہ بدل لیا۔"

میں نے کہا "اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں' بس ایک بار وہ مشرقی خاتون بن جائے۔ باہر جاتے وقت برقع میں روپوش ہو۔"

"ہاں۔ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ تمہارا نام بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ سونی کے ساتھ مس شبنم کا شوفر تھا۔ بس یہ لکھوادیا ہے کہ سونی نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے میرے بیٹے کو گھر سے اغوا کرلیا اور میری گاڑی بھی لے گئی۔ چنانچہ سونی کے خلاف بہت سنگین الزامات ہیں۔ مجرمانہ نیت کے ساتھ گھر میں گھسنا' اغوا' چوری ڈکیتی' ناجائز اسلحے کا استعمال۔ رب نواز نے اس پر بس نہیں کی۔ اس نے لکھوایا ہے کہ سونی مشتبہ کردار کی عورت ہے جس کا ایک مجرمانہ ماضی ہے۔"

"اسے وہ ثابت کرسکتا ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"اس نے لکھ کر دیا ہے کہ سونی کی ایک بہن میرے ڈرائیور کی بیوی تھی مگر اس کا چال چلن بھی اچھا نہیں تھا اور وہ پراسرار حالات میں قتل کردی گئی تھی۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر سونی اور اس کا بہنوئی فیکا ایسا سمجھتے تھے کہ اس قتل کی واردات سے ہماری فیملی کا بالواسطہ تعلق ہے۔ انتقام کی خواہش سے پاگل ہوکے سونی نے اپنے بہنوئی کے ساتھ مل کے میری کوئٹہ جانے والی بس کو ہائی جیک کیا اور اسے ایک ویرانے میں لے جاکے نذرِ آتش کردیا۔ اس کے گواہ سب مسافر ہیں جن کو بس سے اتارنے سے پہلے لوٹ لیا گیا تھا۔"

"یہ اپنی طرف سے۔ زیبِ داستاں کے لیے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہوتا ہے۔ رب نواز کے بیان کے مطابق بس کے کچھ مسافروں کے نام پتے حاصل کرلیے گئے تھے جن کو عدالت میں گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ سونی کو شناخت کرلیں گے۔ سونی کا ساتھ دینے والا اس کی بہن کا شوہر فیکا اس واردات میں مارا گیا تھا مگر سونی فرار ہوگئی تھی اور تب سے روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ رب نواز نے سونی کے ڈاکوؤں کے ساتھ تعلقات کا بھی حوالہ دیا ہے اور اس شک کا اظہار کیا ہے کہ دلنواز کے اغوا میں سونی نے انہی ڈاکوؤں کے گروہ سے مدد لی ہوگی۔ سونی پر بلوا' آتش زنی اور لوٹ مار کے مقدمات بھی بنادیے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا۔ ایسے مقدمات سے گلوخلاصی آسانی سے نہیں ہوتی۔ کیا حرج ہے اگر سونی کو ماردیا جائے۔"

وہ چونکی "میں مطلب نہیں سمجھی۔"

"قانونی طور پر اسے ماردیا جائے تو اس کے خلاف مقدمات خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ ایک نئے نام کے ساتھ وہ محفوظ ہوگی۔"

"یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ ابھی تک شناختی کارڈ نہیں ہے اس کے پاس۔ شناختی کارڈ بنوانے کے بعد اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ سونی پولیس ریکارڈ کے مطابق مرچکی ہو۔ یہ کام مشکل ضرور ہے۔ ناممکن نہیں مگر مجھے ایک بات پر حیرانی ہے ناصر!"

میں نے کہا "میں تو ہر بات پر حیران ہوں۔ تم کو حیران کرنے والی ایک بات کیا ہے؟"

وہ مجھے دیکھتی رہی "تم نے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟"

میں نے کہا "کل سے تو مجھ پر حکم زباں بندی کا نفاذ ہے۔ آج بات کرنے کی اجازت ملی ہے۔ دراصل جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے' میرے دل کو ایک اطمینان حاصل ہے کہ تمہارے اغوا کرنے والوں نے تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کیا۔"

"یہ کیسے فرض کرلیا تم نے؟"

"تمہاری حالت بتاتی ہے۔ تم ذہنی و جسمانی طور پر بالکل ڈسٹرب نہیں ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ دو دن کہیں نظربندی میں بڑے آرام سے گزرے۔"

وہ خفا ہونے لگی "ایسا نہیں ہے ناصر صاحب۔ اغوا کرنے والے مجھے سیرو تفریح کرانے نہیں لے گئے تھے۔"

میں نے کچھ شرمندگی سے کہا "تم کو بتایا تو ہوگا رئیس اور فرید نے کہ میں نے تمہاری تلاش میں زمین آسمان ایک کردیے تھے۔"

"معلوم ہے مجھے تم پاکستانی شرلاک ہومز کی طرح میرا سراغ لگاتے ہوئے ٹھیک اسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں میں نہیں تھی۔"

"تم کہاں تھیں؟"

وہ بولی "ملک رب نواز کے گھر میں اور کہاں؟"

میں نے کہا "جب ہم نے فون کیا تھا تو تم وہیں تھیں؟"

"ہاں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یعنی ملکانی نے ہم سے جھوٹ بولا تھا؟"

شبنم نے کہا "وہ سچ بول کے مصیبت کو دعوت کیوں دیتی۔ اسے بھی اپنے گھر کی اور شوہر کی عزت کا خیال تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ سوئی سے فون پر بات کرنے سے پہلے سے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب اس نے اپنے ہی گھر کی خانہ تلاشی شروع کی تو اس نے مجھے نہ خانے کے ایک اسٹور میں دریافت کرلیا۔ اس سے پہلے ملک دو گھنٹے تک مجھ سے اس بارے میں تفتیش کرکے جا چکا تھا جسے وہ شرافت کی زبان کہہ رہا تھا۔ جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ ابھی وقت ہے۔ سوچ لو ورنہ رات کو تم سے دوسری زبان میں بات کریں گے۔"

میں نے کہا "اس کی تفتیش کا مقصد کیا تھا۔ وہ کیا پوچھنا چاہتا تھا؟"

"سب سے پہلے تو یہی کہ وہ منحوس مورتی کا سر کہاں ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ اس کا سیکرٹ ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ وہ پلاسٹر آف پیرس میں ہیروئن ملا کے بنایا گیا تھا اور اب نسدادِ منشیات والوں کے پاس ہے۔"

"اور اس نے مان لی تمہاری بات؟"

شبنم ہنسی "میں نے بتایا کہ آزاد صاحب نے وہ مورتی کا سر تاریخی اور علمی تحقیق کے لیے آثارِ قدیمہ والوں کے حوالے کیا تھا۔ انہوں نے فوراً بتادیا کہ یہ کوئی تاریخی چیز نہیں۔ نہایت فضول چیز ہے۔ آزاد صاحب نے بتایا کہ مالیت اس کی کروڑوں میں ہے۔ آثارِ قدیمہ والوں نے پھر تفتیش کی اور بالآخر پتا چلالیا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کے ساتھ ہیروئن کو ایسے ملایا گیا ہے کہ مورتی کے سر کو پہلے خالص پلاسٹر آف پیرس سے بنایا گیا پھر اس کے اوپر ہیروئن کی ایک کچ موٹی تہ جمائی گئی اور اس کے اوپر پھر پلاسٹر آف پیرس۔ پلاسٹر آف پیرس کی دو تہوں کے درمیان ہیروئن بالکل محفوظ ہے۔"

"کیا واقعی ایسا ہے؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے چنانچہ میری بکواس پر ملک رب نواز نے میرے ایک جھانپڑ رسید کیا اور بہت گالیاں دیں کہ میں سچ اگلوالوں گا خواہ اس کے لیے مجھے تمہارا یہ سر اتار کے آزاد صاحب کو ارسال کرنا پڑے۔ دوسرا مسئلہ شاہ عالم کا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ رب نواز کا کہنا تھا کہ وہ لندن میں نہیں ہے۔"

"کیا اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟"

وہ بولی "ہاں۔ اس نے خبر کے حوالے سے خبر رساں ایجنسی سے رابطہ کیا تو اسے ناکامی ہوئی پھر اس نے اس ماڈل کا پتا چلانے کی کوشش کی جس سے شادی کی خبر تصویر کے ساتھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔"

"سب اخباروں میں؟"

"یہی تو غلطی ہوئی۔ وہ خبر صرف آزاد صاحب کے اخبار میں چھپی تھی۔ رب نواز کا کہنا تھا کہ یہ سب میں نے شاہ عالم کو چھپائے رکھنے کے لیے کیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کا پتا معلوم نہ ہو۔ اس نے مجھ پر واضح کردیا تھا کہ وہ میرے صحافی ہونے سے نہیں ڈرتا۔ میں ایک عورت ہوں، ایک خوبصورت لڑکی۔ جس سے اسے ذاتی طور پر تفتیش کرکے بہت خوشی ہوگی۔ کئی راتیں اچھی گزریں گی میری۔"

"حرام زادہ، کتے کا بچہ!"

شبنم نے کہا "یہ تو ہونا تھا۔ تم نے بچالیا۔"

"میں نے؟" میں حیران ہوا۔

"ہاں۔ تمہارا فون نہ آتا تو وہ سب ہوتا۔ جو تفتیش میں ہوتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ اس وقت رب نواز نہیں تھا اور فون ملکانی نے ریسیو کیا۔ اسے پتا چلا تو اس نے کوٹھی کی تلاشی لی اور میرے پاس پہنچ گئی۔"

"کوئی محافظ یا چوکیدار نہیں تھا وہاں؟"

"تھا مگر ملکانی کے سامنے کیسے بولتا۔ اس نے واجبی سے انداز میں کہا کہ ملک صاحب ناراض ہوں گے۔ ملکانی نے کہا کہ ان کے آنے سے پہلے میں الٹا لٹکا کے تیری کھال ادھیڑ دوں گی۔ ملک صاحب کا بچہ! اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے ملکانی کو بتادیا کہ مجھے کیسے اغوا کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر مت کرو۔ جسمانی طور پر اب تم محفوظ ہو پھر اس نے ملک کو فون کیا اور پتا نہیں ان کے درمیان کیا بات ہوئی مگر اس کے بعد ملک صاحب کے گارڈ کی جگہ لالی آگئی۔"

"وہ ویوزا حسینہ۔ ڈریکولا کی خالہ!"

"ہاں۔ وہ ملکانی کی کنیز خاص ہے اور بڑی خطرناک چیز ہے۔" شبنم بولی۔

شبنم کی بات درمیان میں رہ گئی۔ تیمیں مارخان نے بڑی شرافت سے مطلع کیا "جناب رئیس خان صاحب گفت و شنید فرماتی۔ بذریعہ ٹیلی فون۔ وہ سخت تشویش کا اظہار فرماتی۔ بہت پریشان ہوتی۔ ایسا ام اندازہ کرتی۔"

میرے آرام کے خیال سے فون یہاں نہیں رکھا گیا تھا۔ شبنم اٹھ کے لاؤنج تک گئی۔ جب وہ بہت دیر تک نہ آئی تو مجھے فکر ہونے لگی۔

وہ لاؤنج کے فون پر بہت آہستہ آواز میں بات کررہی تھی اور بار بار اس کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہے اور اسے ڈر ہے کہ کہیں میں اس کی یک طرفہ گفتگو سن کے ساری بات نہ سمجھ جاؤں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا "اچھا ٹھیک ہے" اور ریسیور رکھ دیا۔

"تم کیوں اٹھ کر آگئے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "اب اتنا برا حال بھی نہیں ہے میرا کہ بستر سے بھی نہ اٹھوں۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا "اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ آپ بٹے کٹے ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "رئیس کیا کہہ رہا تھا؟"

اس نے سرسری لہجے میں کہا "کوئی خاص بات نہیں۔"

میں نے کہا "تیمیں مارخان جیسے شخص نے صرف لہجے سے اندازہ کرلیا تھا کہ رئیس پریشان ہے۔"

"اب ظاہر ہے کہ پریشانی کے اسباب سب کے لیے ہیں۔"

میں نے اسے پکڑ کے اپنی طرف گھمایا "اے لڑکی۔ ادھر دیکھ، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر، کیا چھپا رہی ہے تو مجھ سے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرا کے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا "ناصر یہ ہم نے کیا عذاب پال لیے ہیں، کن کھجیڑوں میں الجھ گئے ہیں ہم۔"

میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا "تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ مجھے تو ناز تھا تمہاری ہمت اور حوصلے پر۔"

"پتا نہیں کیوں۔ میں وہ پہلے جیسی شبنم نہیں رہی۔ خود مجھے احساس ہوتا ہے اس تبدیلی کا۔"

"کب سے آئی ہے یہ تبدیلی؟"

"جب سے تم ناصر عظیم کے روپ میں میرے سامنے آئے ہو" وہ بولی "میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ سب جھمیلے چھوڑ دوں۔ یہ صحافت کا کریز، جنون، ایڈونچر اور خطرات کے چیلنج کو قبول کرنے کا خبط۔ حق اور انصاف کے لیے لڑنے کا عزم۔ اصولوں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے لیے جدوجہد، یہ سب چھوڑ دوں۔"

میں اسے اندر لے آیا اور خود بھی اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا "اور یہ سب چھوڑنے کے بعد؟"

"اس کے بعد کیا، بس ایک گھر ہو میرا جو میری ساری کائنات ہو۔ اسے میں بناؤں، سنواروں، سجاؤں اور اس میں سکون، حسن اور خوشی کے سارے رنگ بھروں۔ اس کی تحفظ دینے والی دیواروں سے کبھی باہر نہ جاؤں۔ گانے سنوں، فلمیں دیکھوں اور کتابیں پڑھوں اور انتظار کروں۔"

"انتظار، کس کا؟" میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

وہ ہنس پڑی "تمہارا اور کس کا۔ تمہارے لوٹ کر آنے کا۔"

"کہاں سے لوٹ کر آنے کا؟" میں نے کہا "پردیس سے یا جیل سے؟"

"بھئی تم کچھ کرو گے یا نہیں، کوئی کام کاج؟"

میں نے کہا "ہاں مگر اس کام کے لیے گھر سے بلکہ بیڈ روم سے بھی باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ویسے یہ سب عورتیں ایک جیسے خواب کیوں دیکھتی ہیں؟"

"کیسے خواب؟"

"وہی زنانہ رومانی ناولوں والے۔ ایک چاکلیٹ ہیرو ٹائپ شوہر جو شادی کے بعد ذرا نہیں بدلتا۔ پہلے کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پیار بھرے ڈائیلاگ بولتا رہتا ہے اور ہر گھنٹے کے بعد کلاک کی طرح اعلان کرتا رہتا ہے کہ آئی لو یو۔ آنگن میں کھلنے والے پیار کے پھول دو پیارے پیارے بچے۔ میرا گھر میری جنت۔"

"آخر کیا خرابی ہے ایسے خواب دیکھنے میں؟"

"خرابی یہ ہے کہ بعد میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو واسطہ پڑتا ہے ایک خوفناک ساس سے جو طعنوں سے جینا حرام کردیتی ہے۔ ایک دو ظالم نندیں رہی سہی کسر پوری کردیتی ہیں۔ شوہر کام میں گھن چکر بن کے بھول جاتا ہے کہ گھر میں ایک بیوی بھی باندھ رکھی ہے۔ اللہ میاں کی گائے۔ دو چار سال میں وہ گنجا، موٹا اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور بچے تو ماشاء اللہ خود رو پودوں کی طرح بڑھتے جاتے ہیں۔ روتے بسورتے کالے کلوٹے۔ جن کی ناک بہتی رہتی ہے یا وہ خود کچھ بہاتے رہتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی "اور مرد کیسے خواب دیکھتے ہیں؟"

"سوری۔ وہ بیان نہیں کیے جاسکتے۔ سنسر والے پکڑ لیں گے" میں نے کہا۔

وہ بولی "میرے خواب کچھ اور تھے اور ان کی تعبیر پانے کے لیے میں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کسی طرح بھی مثبت اور صحت مند نہیں تھا۔ میں نے بدنامی میں نام پیدا کرکے یہ سمجھا کہ میں نے سماج کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ میں بے شرمی کی حد تک بے باک تھی۔ مرد مجھ سے گھبراتے تھے۔ میں ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انتقامی جذبے کے ساتھ لوگوں کی نجی زندگی — اسکینڈل چھاپ کے سمجھتی تھی کہ یہی صحافت ہے۔ ہر خطرے میں کود پڑتی تھی۔ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔"

"اب تمہیں وہ سب غلط لگتا ہے؟"

"ہاں۔ شاید وہ ایک احساس محرومی کا ردعمل تھا۔ بچپن میں مجھے کسی کا پیار نہیں ملا۔ نہ ماں باپ یاد ہیں نہ بھائی بہنیں۔ جو پیار ملا وہ بھی ایسے جیسے ترس کھا کے لوگ خیرات دیتے ہیں۔ آزاد صاحب جیسے لاوارث شخص نے پال لیا۔ شاید شاہ عالم کے ساتھ میرا عشق بھی ایسا ہی تھا۔ ایک پُرخطر ایڈونچر۔ ایک بدنامی کی ہیڈلائن۔ وہی بغاوت کا جذبہ۔"

"ANGRY YOUNG WOMEN" میں نے کہا

"خیر' اب پرانی باتوں کو کیا یاد کرنا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ اب اس رویے کی تلافی ہو گئی ہے تو ٹھیک ہے۔"

"میری قسمت اچھی تھی کہ مجھے اپنے ماضی کی ہر غلطی کی تلافی کا چانس ملا۔ مجھے پچھتانا نہیں پڑا۔ کوئی کفارہ نہیں ادا کرنا پڑا۔ اب میں اپنی زندگی جی سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "میں تو کفارہ ادا کر رہا ہوں ابھی تک۔ اپنی زندگی جینے کا ہر موقع میں نے گنوا دیا۔ پہلے شادو کو موت نے چھین لیا پھر چندا نے مجھے اپنی زندگی سے ایسے خارج کر دیا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ میں بہت زیادہ انحصار کرتا تھا ان پر۔ اتنا کہ اپنے آپ سے زیادہ انہیں میری زندگی پر اختیار حاصل تھا۔ انجام پھر وہی اکیلا پن۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "پرانی باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ پرانی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ رئیس نے کیا نئی بات کی تھی تم سے۔"

"سونی کا مسئلہ ہے کچھ۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نئی کیا۔ وہ شاک کی کیفیت سے باہر نہیں آ رہی ہے۔ ذرا ہوش میں آتی ہے تو گالیاں بکنے لگتی ہے۔ چلاتی ہے اور کپڑے پھاڑتی ہے۔"

"اوہائی گاڈ۔ چلو جا کے دیکھتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہمارے دیکھنے سے کیا ہو گا۔ کمال کو کرنے دو جو کرتا ہے۔ اس کا اتنا بڑا اسپتال ہے اور اتنے لوگ ہیں مدد کرنے والے۔ رئیس کہہ رہا تھا کہ سونی کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہو گی۔ جو کچھ لمبا ہو گا۔ پہلے خیال تھا کہ اسے وہیں بھیج دیا جائے جہاں میں رہی تھی۔"

"وہ اچھی جگہ ہے۔ وہ میاں بیوی بہت لگن سے کام کرتے ہیں۔ صحیح انسانی خدمت کا جذبہ ہے ان کے پاس۔"

"لیکن کمال اب کسی نفسیاتی علاج کے ماہر کو اپنے اسپتال میں بلائے گا۔ رئیس نے اور فرید نے کہا کہ سونی کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آتے جاتے کوئی اسے دیکھ لے۔ اس کی وجہ سے کلینک پر بھی مصیبت آئے۔ وہ رب نواز کے لیے پرائم ٹارگٹ ہے۔ تمہیں تو وہ جانتا نہیں' چنانچہ سونی کو اس نے ہر جرم میں ملزم نمبر ون بنا دیا ہے اور اس کے خلاف جرائم کی نوعیت بھی بہت سنگین ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے طور پر سونی کی کوئی تصویر ہر اخبار میں شائع کرا دے۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتی ہو تم۔ اگر اس کے پاس تصویر ہوئی۔"

"تصویر ضرور ہو گی اس کے پاس۔ پہلے اس کی بہن اور بعد میں خود سونی کا رب نواز سے قریبی تعلق رہا ہے۔ دوسرے الزامات میں تو عدالت بھی اشتہاری مجرم قرار دے سکتی ہے کسی کو ضابطے کی کارروائی کے بعد لیکن بس کو آگ لگانے کے کیس میں رب نواز دونوں کی تصویر دے سکتا ہے۔ فیکا تو مر چکا ہے۔ سونی کے بارے میں ابھی تک اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ زندہ ہے یا مر گئی مگر اس نے دلنواز کے اغوا کو بھی ذاتی انتقام کی کارروائی بنا دیا۔"

میں نے کہا "حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تو گئے تھے تمہیں برآمد کرنے اور یہ ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ بس اچانک سوجھ گئی سونی کو۔ سوجھی بہت اچھی مگر ملک رب نواز کے سامنے وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ ویسے بھی ملک نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"اب اسے چھپا کے رکھنا پڑے گا کچھ عرصہ اور اس کے لیے وہی جگہ سب سے مناسب ہو گی جہاں وہ اب ہے۔"

میں نے کہا "رئیس کا فون آنے سے پہلے تم مجھے ملک ہاؤس میں اپنی اسیری کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

شبنم نے کہا "میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔ ہم ملک رب نواز کی گاڑی سروس اسٹیشن سے لینے کے لیے ایک ساتھ ہی گئے تھے۔ میں نے گاڑی لینے کے بعد ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی گاڑی لینے آیا ہو تو گاڑی اس کے حوالے کر کے خود تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ تم اس وقت تک سروس اسٹیشن اور پیٹرول پمپ کے علاقے سے نکل گئے تھے۔ تمہارا خیال ہو گا کہ شبنم پیچھے آ رہی ہے پھر جب تم نے

دیکھا کہ میں بیک ویو مرر میں نظر نہیں آ رہی ہوں تو تم بھی ٹھہر گئے۔ دراصل میری نظر فیول میٹر کی سوئی پر گئی تو وہ خالی یعنی E پر تھی۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ گاڑی سروس اسٹیشن پر چھوڑتے وقت اس میں کتنا پیٹرول تھا۔ اپنی گاڑی ہو تو آدمی کو پتا ہوتا ہے۔ وہ گاڑی ملک نے دی تھی۔ اپنی طرف سے مجھ پر احسان کیا تھا کہ بی بی' آپ کی گاڑی ہمارے گھر کے دروازے پر سے چوری ہوئی ہے تو ہمارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہے۔ جب تک وہ برآمد نہیں ہوتی' آپ یہ گاڑی رکھو۔ اصل مقصد اس کا کچھ اور تھا۔ وہ گاڑی کے ذریعے میرا سراغ لگانا چاہتا تھا کہ آج کل میں کہاں ہوں' خیر!

جب میں نے دیکھا کہ پیٹرول ختم ہو گیا ہے تو میں نے سوچا کہ اس میں دس لیٹر پیٹرول بھی ڈلوا لوں۔ یہ مکینک اور سروس اسٹیشن اس معاملے میں بڑے حضرت ہوتے ہیں۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا اور ہر گاڑی میں سے پیٹرول نکل جاتا ہے۔ فیول کیپ لاک رہتی ہے اور گاڑی کا مالک مطمئن ہو کے گاڑی لے جاتا ہے۔ اس وقت تک ملک رب نواز کا کوئی آدمی بھی گاڑی لینے نہیں آیا تھا۔ میں گاڑی کو پیٹرول پمپ کی طرف لے گئی۔

جب ایک سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان لڑکا پیٹرول ڈال رہا تھا تو میں نے دیکھا' تم سڑک پر گاڑی روکے میرا انتظار کر رہے تھے اور کھڑکی سے پیچھے پمپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم نے مجھے دیکھ لیا ہو گا کیونکہ میں نے ہاتھ ہلا کے تمہیں متوجہ بھی کیا تھا۔

مجھے بڑی خوشی تھی کہ میری گاڑی واپس مل گئی ہے۔ میں نے وہ گاڑی اپنی محنت کی کمائی سے پیسے بچا کے خریدی تھی۔ تم تو اسے کھٹارا کہتے ہو مگر تمہیں کیا معلوم کہ اس کے ساتھ میری کیسی جذباتی وابستگی تھی۔ ایک تو وہ مجھے اتفاق سے بہت سستی مل گئی تھی۔ شاید میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا ایک دوست باہر جا رہا تھا۔ دوست کا غلط مطلب مت لینا۔ وہ بھی ایک صحافی تھا اور بس۔ وہ جاتے جاتے گاڑی مجھے دے گیا۔ اس نے کہا کہ جتنے پیسے ہیں وہ دے دو۔ باقی میں نے اسے ماہانہ قسطوں میں ادا کیے تھے۔ اس کے بعد تو ایسے مواقع بہت آئے جب رشوت میں مجھے بالکل نئی کار کی چابی پیش کی گئی مگر میں نے نہیں لی۔ ایک سرکاری افسر نے ٹھیکوں میں بڑی گڑبڑ کی تھی۔ اس نے ایک سڑک اور پل کی تعمیر کا ٹھیکا اپنے سالے کو دے دیا تھا اور سالے صاحب نے ایسا کام کیا کہ لگتا تھا ریت میں تارکول کے بجائے کالا رنگ ملا کے سڑک پر بچھا دی اور رولر پھیر دیا۔ پہلی بارشوں میں پل بیٹھ گیا اور سڑک بہہ گئی تو انکوائری شروع ہوئی۔ انکوائری کیا۔ وہ اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے اور ذمے دار ٹھہرایا طوفانی بارش کے ریلے کو ورنہ سڑک تو بہت معیاری بنی تھی۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں تو بالکل مختلف صورت حال سامنے آئی۔ وہ سرکاری افسر اس کا سالا اور تفتیش کر کے سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دینے والے بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے ایک نئی سوزوکی ایف ایکس پیش کی تھی۔ یہی ماڈل تھا مگر یہ بات ہے چھ سال پہلے کی۔ چنانچہ جب ملک نے فون پر بتایا کہ میری "چوری" ہو جانے والی گاڑی برآمد کر لی گئی ہے تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ ملک نے اس میں بھی کوئی ٹریکنگ دینے والا آلہ نصب کرا دیا ہو گا مگر اب اس کی چالاکی ہم پر ظاہر ہو گئی تھی کہ ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔

دس لیٹر پیٹرول ڈالنے کے بعد لڑکے نے مجھے چابی دی تو میں نے پیسے دینے کے لیے بیگ کھولا۔ اتفاق سے کھلے پیسے نہیں تھے۔ میں نے اسے پانچ سو کا نوٹ دیا جو پیٹرول ڈالنے والے نے کیشئر کو دے دیا۔ اس وقت ایک اور گاڑی میرے پیچھے آ گئی تھی۔ پیٹرول پمپ کے اٹینڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ میں گاڑی کو تھوڑا سا آگے کر کے روک لوں۔ کیشئر مجھے وہیں باقی رقم لوٹا دے گا۔ میں نے دیکھا کہ کیشئر باقی رقم کے نوٹ گن رہا ہے۔

اچانک میرے ساتھ بھی ایک ٹرک آ کھڑا ہوا جس میں مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ پیٹرول ڈالنے والے لڑکے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ادھے یہاں ڈیزل نہیں۔ پیٹرول ہے۔ ادھر جا" مگر ٹرک ڈرائیور نے اس کی نہیں سنی۔ ٹرک میں بیٹھا ہوا ایک اور شخص نیچے اترا اور اس نے کہا "مجھے ملک صاحب نے گاڑی لینے بھیجا ہے جی۔"

میں نے کہا "بڑے وقت پر آئے تم۔ یہ لو چابی" اور گاڑی سے اتر گئی۔

اس نے چابی کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ایک دم مجھے اٹھا کے ٹرک کے کھلے دروازے سے اوپر چڑھا لیا۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی دروازہ بند ہوا اور ٹرک چل پڑا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس بدمعاشی کی کارروائی کو پیٹرول ڈالنے والے لڑکے نے بھی دیکھا ہو گا اور اس کار کے ڈرائیور نے بھی جو میرے بالکل پیچھے تھی۔ یہ بظاہر ناممکن لگتا تھا کہ انہیں پتا بھی نہ چلا ہو۔ اگر وہ اس وقت پیٹرول پمپ کے میٹری طرف دیکھ رہے تھے تب بھی یہ ایسے ہو سکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ بالکل سامنے سے ایک عورت کو اغوا کے ٹرک میں ڈال دیا جائے اور کسی کی نظر کچھ نہ دیکھے۔

مجھے تم سے بہت امید تھی کہ تم نے بھی سب دیکھ لیا ہوگا اور ٹرک والا مجھے اغوا کرنے کے بعد بھاگ کے کہاں جاسکتا ہے مگر مجھے بعد میں بڑی مایوسی ہوئی۔ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ تم اس وقت انجن اسٹارٹ کیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ تمہیں یقین ہوگا کہ دو چار منٹ بعد میں بھی پیٹرول ڈالوا کے آجاؤں گی تو ہم پروگرام کے مطابق رب نواز کے گھر جا کے اس کی گاڑی اس کے حوالے کریں گے اور میں اپنی پیاری ایف ایکس لے کر خدا کا شکر ادا کروں گی۔

جب مجھے ٹرک میں ڈالا گیا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ یہ ساری کارروائی مشکل سے تیس سیکنڈ میں پوری ہوگئی تھی۔ کسی نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا باہر دیکھنے والوں نے بزدلی یا بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہنا بہتر سمجھا تھا۔ ورنہ کار والا چاہتا تو پیچھا کر کے ٹرک کو وہیں روک لیتا مگر قانونی پیچیدگی اور تھانہ کچہری میں گواہی کے چکر سے لوگ اتنا ڈرتے ہیں کہ ان کی نظر کے سامنے کسی کی آبرو لٹ جائے یا خون ہو جائے' وہ انجان بن کے نکل جاتے ہیں۔ یہ بزدلی ہی نہیں' بے ضمیری اور بے غیرتی بھی ہے۔

مجھے ٹرک میں ٹھونستے ہی کسی نے میری ناک پر کلوروفارم یا کسی بے ہوشی کی دوا میں بھیگا ہوا رومال میری ناک پر رکھ دیا تھا۔ اس کی بہت تیز بو تھی جس نے میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری مزاحمت کی قوت ایسے ختم ہوگئی جیسے بجلی کا سوئچ آف کرنے سے چلتی ہوئی موٹر رک جاتی ہے۔ نظر میری نظر میں دھندلا گیا اور میں بے بسی کے ساتھ خود اپنے آپ سے غافل ہوگئی۔ شاید مجھے اغوا کرنے والے جانتے تھے کہ اور کسی طریقے سے مجھے قابو میں نہیں کیا جاسکتا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں آٹھ بائی دس کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ موزیک کے سخت چکنے اور ٹھنڈے فرش پر۔ کلوروفارم کے اثرات فوراً ختم نہیں ہوئے۔ مجھ پر شدید نقاہت کا غلبہ تھا۔ میرے سر میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں ایک ٹیوب لائٹ مجھے جلتی بجھتی نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد میری حالت بہتر ہوئی تو میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھی مگر مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے اور میری جسمانی طاقت بھی لوٹ آئی۔

کھڑے ہونے کے بعد میں نے بند دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے نہیں باہر سے مقفل تھا۔ میں نے دروازے پر مکے مارے اور چلا چلا کے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کمرے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کمرے میں کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ شاید اسے میرے لیے ہی خالی کیا گیا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور اس میں ایک ہی باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی اسٹور روم ہوگا۔ شاید رب نواز کی کوٹھی کے تہ خانے میں۔ میں نے سوچا مگر ملک صاحب اتنے بے وقوف تو نہیں ہو سکتے کہ اغوا کرانے کے بعد مجھے اپنے ہی گھر میں لے آئیں۔

تاہم یہ اس کی بے وقوفی نہیں' چالاکی تھی۔ اس نے مجھے وہاں رکھا تھا جہاں کسی کو میری موجودگی کا خیال آئے تو وہ یہی سوچے کہ ملک رب نواز کو جلد کی کیا کمی' پھر وہ مجھے اپنے گھر میں رکھنے کا رسک کیوں لے گا۔ چراغ تلے اندھیرا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

شام تک کسی نے بھی میری خبر نہیں لی۔ ہوش و حواس پوری طرح بحال ہونے کے بعد میرے لیے قید تنہائی کا ایک ایک لمحہ خوف اور امید کی کشمکش کا عذاب بن گیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ تم میرے اچانک غائب ہو جانے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہو گے۔ اگر تم نے اغوا کی کارروائی کرنے والوں کو نہیں دیکھا ہوگا تب بھی پانچ منٹ بعد تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شبنم تو پیٹرول پمپ پر کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد تم پیٹرول ڈالنے والے لڑکے سے کیشئر سے اور منیجر سے پوچھو گے تو وہ تمہیں بتا دیں گے کہ لال رنگ کی آلٹو والی بیگم صاحبہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ شبنم کو ایک ٹرک میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ٹرک کسی پولٹری فارم کا تھا اور اس کا رنگ نیلا تھا۔ ممکن ہے کوئی تمہیں اس پر لکھے ہوئے پولٹری فارم کے نام یا نمبر سے بھی آگاہ کر دے۔ اس کے بعد تم رئیس اور فرید کے ساتھ مل کے اور آزاد صاحب کی مدد سے پولیس کے ساتھ چھاپا مارو گے اور مجھے برآمد کر لو گے۔ قدرتی طور پر تمہارا شک بھی صرف ملک رب نواز کی طرف جائے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے میرا زیور' جو سونے کے ٹاپس میں نے پہن رکھے تھے اور لاکٹ' نہیں اتارا تھا۔ کلائی کی گھڑی بھی موجود تھی۔ میں اس میں وقت دیکھتی رہی۔ دوپہر سے شام ہوگئی۔ امید پر خوف غالب آنے لگا۔ میں

نے بھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہر قسم کی تفتیش کے تشدد کے لیے تیار کر لیا۔ اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ اس طرح مجھے اٹھانے والے صرف ملک رب نواز کے کارندے ہو سکتے تھے۔ رب نواز کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے ہی اسے فون کر کے بتایا تھا کہ میں نے گاڑی سروس کے لیے دی تھی اور اسس کا کوئی آدمی فلاں جگہ سے گاڑی لے سکتا ہے۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ تفتیش میں مجھ سے کیا پوچھا جائے گا لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ رب نواز کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وقت آنے پر میں کس حد تک اپنے ارادے پر قائم رہتی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ ملک رب نواز کو انتہائی قدم اٹھانے سے روکنے کے لیے میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں اس پر واضح کر دوں گی کہ میری گمشدگی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آزاد صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ شبنم سے ملک رب نواز کو کیا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اسے کس قسم کی دھمکیاں ملتی تھیں اور کس طرح ایک گاڑی میں سگنل دینے والا آلہ نصب کر کے شبنم کا پیچھا کیا گیا اور کچھ لوگوں نے ایک دکان کے شٹر توڑ کے اندر گھسنے اور شبنم کو نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

مگر رب نواز نے میرے اغوا کا پلان بناتے وقت ان تمام باتوں کو مدنظر رکھا تھا۔ شاید اس کے آدمی آزاد صاحب کے آس پاس منڈلاتے رہے ہوں کہ وہ شبنم کے اغوا کی خبر ملنے کے بعد کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ اگر وہ پولیس سے مدد لیتے ہیں اور پولیس ان کے دباؤ میں رب نواز ہاؤس پر چھاپا مارنے پر مجبور ہوتی ہے تو اس کا پتا چل جائے گا۔ اس کے نمک خوار فوراً رب نواز کو مطلع کر دیں گے کہ سرجی' آپ کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ مجسٹریٹ نے خانہ تلاشی کا وارنٹ جاری کر دیا ہے اور اگر اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا ہوگا تو وہ فوراً مجھے یہاں سے ہٹا دے گا۔

لیکن رات ہونے تک کچھ نہیں ہوا تو میری امید ختم ہوگئی اور ملک کا حوصلہ بڑھ گیا۔ پھر اچانک میں نے باہر سے کچھ آوازیں بھی سنیں۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔

ملکانی نے پوچھا "اسٹور میں کیا ہے' کھولو اسے۔"

کسی نے کہا "اسٹور میں کیا ہوگا جی' وہی پرانا سامان۔"

"بکواس مت کر پھر تو یہاں کیوں پہرے داری کر رہا ہے؟ یہ تالا کھول' میرا منہ مت دیکھ۔"

"ملکانی جی۔ آرڈر نہیں ہے مجھے۔"

"آرڈر کا بچہ۔ میرے سامنے زبان چلاتا ہے' چل ہٹ۔"

..... وہ بگڑ گئی۔

اب میں نے اندر سے دروازہ بجایا "اندر میں ہوں ملکانی۔ شبنم! مجھے ملک صاحب نے اٹھوا کے بند کر رکھا ہے یہاں' دروازہ کھولیں پلیز!"

ملکانی نے کہا "لائی۔ توڑ دے تالا۔"

مگر تالا توڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً گارڈ ملکانی کے غصے سے ڈر گیا تھا۔ اس نے چابی لگا کے تالا کھول دیا۔ ملکانی اندر آگئی۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا "تم۔ اخبار میں کام کرتی ہو نا؟"

"جی بیگم صاحبہ' میں پہلے مل چکی ہوں آپ سے۔"

"یہاں کب سے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "آج دوپہر بارہ بجے سے' چھ گھنٹے ہو گئے۔"

"تمہاری کسی بہن نے فون کیا تھا مجھے۔ اسے کیسے پتا چلا کہ تم یہاں ہو؟" ملکانی کمر پر ہاتھ رکھے مجھے گھورتی رہی۔

میں نے کہا "میری بہن۔۔۔ اچھا۔۔۔ نسیمہ کا فون آیا تھا؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا۔۔۔"

اس وقت تک میں سمجھ گئی تھی کہ فون سونی نے کیا ہوگا یا رخشی نے اور یہ جھوٹ میرا سراغ لگانے کے لیے تمہاری یا فرید کی ہدایت پر بولا ہوگا میں نے کہا "وہ۔۔۔ دراصل میں اس سے کچھ چھپاتی نہیں۔ بہت سے لوگ اور بھی ہیں جو یہ جانتے ہیں۔"

"کیا جانتے ہیں؟"

"یہی کہ ملک رب نواز صاحب مجھ سے ناراض ہیں۔ میری بہن کا جو شوہر ہے' وہ بھی بہت مشہور جرنلسٹ ہے۔ بی بی سی اور وائس آف امریکا۔ ورلڈ نیوز اور رائٹر کے لیے فری لانسنگ کرتا ہے۔"

"ملک صاحب کیوں ناراض ہیں تجھ سے؟"

میں نے کہا "ان کے کچھ ایسے معاملات میرے علم میں ہیں جو خطرناک حد تک غیر قانونی ہیں۔ غیر اخلاقی تو خیر ہیں۔۔۔"

"کھل کے بات کر مجھ سے۔ ایسی کیا بات معلوم ہوگئی تھی تجھے؟"

میں نے کہا "وہ ملک سے نوادرات اور آثار قدیمہ اسمگل کرتے ہیں۔ کچھ اصلی اور کچھ جعلی۔"

اس نے سر ہلایا "پھر تجھے کیا تکلیف ہے؟"

میں نے کہا "تکلیف تو ہر پاکستانی کو ہوگی۔ یہ ہمارا قومی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اثاثہ ہے اور ہمیں تو اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ہم خود اپنے گھر میں ڈاکا ڈالیں تو۔۔۔"

"بے وقوف لڑکی۔ یہ نہیں سوچتی کہ تیری حفاظت کون کرے گا؟" اس نے میری بات کاٹ دی "ذرا خود کو دیکھ۔ پنگا لیتی ہے ماں جیسے مردوں کے ساتھ۔ عزت آبرو کے ساتھ جان بھی جائے گی۔"

میں نے کہا "جب کوئی ایسا کرتا ہے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کے ہی کرتا ہے' آپ مجھے کیا سمجھانے آئی ہیں ہ؟"

"یہی کہ اپنی جوانی پر رحم کر۔ خدا نے اتنی اچھی صورت دی ہے۔ کیوں اس پر کالک ملواتی ہے۔ شادی کر اور گھر بیٹھ' تیرے چاہنے والے تو بہت ہوں گے۔"

میں نے کہا "شادی بھی ایک کام ہے جو وقت آنے پر سب کرتے ہیں مگر یہ میرا مقصد حیات نہیں ہے اور میرا مشن نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے تیرا مقصد۔ صرف ملک کو جیل بھجوانا۔ اس کے کاروبار کو بند کرانا اور اس کے سیاسی مستقبل کو تباہ کرنا؟"

میں نے کہا "یہ کام تو وہ خود کر رہے ہیں۔"

"چپ کر بے وقوف لڑکی۔ تو سمجھتی ہے ایسا ہو سکتا ہے' اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ کیا تجھے اندازہ نہیں ہے ملک کی طاقت کا؟"

"فرعون کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے اس کے لیے ایک موسیٰ پیدا کر دیا ہے۔"

"ڈائیلاگ مت مار۔ نیچے سے اوپر تک سب ملک کے ساتھ ہیں۔ اس کا سارا کاروبار انہی کی مدد سے چلتا ہے۔ پولیس' بیوروکریسی اور سیاست داں۔ سب کی طاقت ہے اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ اس کے باوجود میں اپنا کام کرتی رہوں گی۔ مجھے ڈرائیں مت' میں ڈرنے والی ہوتی تو یہاں نظر نہ آتی۔"

"کل تو کہیں بھی نظر نہ آتی۔ پڑی ہوتی زمین کی گہرائی میں کہیں۔"

میں نے کہا "اگر زندگی باقی ہے تو کوئی ملک رب نواز مجھے نہیں مار سکتا اور میرے نصیب میں ایسے ہی مرنا لکھا ہے تو مجھے راضی برضا ہونا پڑے گا لیکن ملکانی جی' ملک صاحب کی خوش فہمی بھی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ ان کے خلاف ثبوت محفوظ ہیں۔ آزاد صاحب کے علاوہ ایف یو جے کو معلوم ہے۔"

"ایف یو جے۔؟"

"فیڈرل یونین آف جرنلسٹ۔!" میں نے کہا "میں فیکے کی بیوی نہیں ہوں اور نہ کسی غریب' لاوارث مزارعے کی بہو بیٹی۔ میں ایک عورت نہیں' ایک نام نہیں' ایک طاقت ہوں کیونکہ میرے پیچھے قلم کی طاقت ہے۔ ضمیر کی طاقت ہے۔"

"تقریر مت کر" ملکانی سوچ میں پڑ گئی۔

میں نے کہا "آپ نے دیکھ لیا کہ میری بہن کو میرے یہاں ہونے کا علم ہے۔ یہ بات اب تک بہت لوگ جان گئے ہوں گے۔ خود سوچئے کہ کیا ملک رب نواز نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماری ہے۔ پریس کی آواز کے آگے حکومت کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے کسی بھی وقت۔ ملک گرفتار ہو کے ضمانت پر ضرور رہائی حاصل کرے گا مگر اسے بالآخر جیل جانا پڑے گا۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔"

میری بات ادھوری ہی تھی کہ ملک نے دھاڑ کے کہا "کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

وہاں ڈیوٹی پر مامور شخص ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا "جناب عالی! مجھے ملکانی نے مجبور کیا۔ زبردستی تالا کھلوایا۔"

ملک آتش فشاں بنا ہوا اندر آ گیا "ملکانی!"

ملکانی نے کہا "ہاں۔ یہ میرا گھر ہے۔ کوئی مجھے کہیں آنے جانے سے نہیں روک سکتا۔"

"تم چلو اوپر" ملک نے سخت لہجے میں کہا۔

"پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ کیا ہو رہا ہے' میرے گھر میں؟"

ملک نے غصے سے کہا "یہ کیا میرا گھر میرا گھر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تم جاتی ہو اوپر یا میں زبردستی لے جاؤں؟"

"ملک صاحب۔ اپنے سارے گندے دھندے اس گھر سے باہر کرو۔ میں دخل نہیں دوں گی۔ یہ میں نے پہلے بھی کہہ دیا تھا۔ اس گھر کے اندر جہاں میں رہتی ہوں اور میرے بچے رہتے ہیں' کوئی غلط کام نہیں ہو گا۔"

"خوا مخواہ بات کا بتنگڑ مت بناؤ۔ تمہارے بچوں پر اور تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"کب تک؟ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے ملک صاحب۔ بچے بھی اب بچے نہیں رہے' وہ سب سمجھتے ہیں۔ انہیں صرف پیسا ہی نہیں' عزت بھی چاہیے۔"

"تو کیا میری کم عزت ہے؟ کسی نیچ خاندان سے تعلق ہے میرا یا ان کا باپ کوئی کلرک ہے؟" وہ مجروح لہجے میں بولا "یا ٹیکسی ڈرائیور؟"

"دیکھو ملک صاحب! یہ جو باہر کی عزت کا سلسلہ ہے۔۔۔

یہ سب مصنوعی ہے' دکھاوا ہے۔ خوف کا نتیجہ ہے یا دولت کا کرشمہ ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری نظر میں تو عزت دار صرف پروفیسر ہو سکتا ہے۔ شاعر یا سائنس داں ہو سکتا ہے" وہ طنزیہ بولا۔

"نہیں۔ کلرک بھی عزت دار ہو سکتا ہے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی۔ ملک صاحب' میں عزت نفس کی بات کر رہی تھی۔ آپ کے بچوں کے لیے نہ آپ ایم پی اے ہیں۔ نہ صنعت کار اور نہ زمیندار۔ آپ صرف باپ ہیں ان کے لیے۔ وہ ایک باپ کی عزت صرف اس لیے نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اس کے محتاج ہیں۔ اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ جو علی الاعلان کرتے آئے ہیں' اپنے باپ دادا کی طرح' وہ سب کریں گے تو کوئی عزت نہیں ہو گی آپ کی کیونکہ یہ گاؤں نہیں' شہر ہے۔ آپ کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔"

ملک نے پریشان ہو کے کہا "دیکھو' لیکچر مت دو۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"ملک صاحب۔ ابھی اس عورت کی بہن نے فون کیا تھا۔"

ملک چونکا "کس کا؟"

"ہاں۔ تم جانتے ہو یہ خود ایک مشہور صحافی ہے اور اس کا بہنوئی۔!"

ملک نے اس کی بات کاٹ دی "بہنوئی کہاں سے آ گیا جب بہن ہی کوئی نہیں ہے اس کی۔"

"بہن نہیں ہے؟"

"ہاں۔ ماں باپ' بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔"

ملکانی سوچ میں پڑ گئی "پھر وہ کون تھی' اس نے تو کہا تھا:"

"وہ کوئی جھوٹی دھوکے باز عورت تھی۔ اس کی پرورش تو کی ہے آزاد صاحب نے" ملک بولا۔

"ہاں۔ یہ بھی کہا تھا اس نے کہ آزاد صاحب کو سب معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"تمہاری اور اس عورت کی دشمنی کی وجہ اور فون کرنے والی عورت کوئی بھی ہو' کیا یہ خطرے کی بات نہیں ہے کہ اسے سب معلوم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شبنم کو اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے' ملک ہاؤس میں ہ؟"

ملک نے کہا "اور تم نے اس کا اعتراف کر لیا؟"

"نہیں۔ میں نے کہا کہ میں دیکھ کے بتاتی ہوں۔ ملک صاحب خدانخواستہ چھاپا پڑ گیا یہاں تو۔؟"

"اوئے کیسے چھاپا پڑ سکتا ہے یہاں۔ اتنا آسان ہے ملک ہاؤس کے اندر پولیس کا داخل ہونا۔ قسم خدا کی اس دن پیشاب سے اپنی مونچھیں منڈواؤں گا جس دن ہماری یہ اوقات ہو گئی۔"

ملکانی نے نفی میں سر ہلایا "اگر تم نے ہوش سے کام نہ لیا تو غرور کا یہ آئینہ کسی دن ایسا ٹوٹے گا کہ پھر جڑ نہ پائے گا۔ اسے سنبھال کے رکھو ملک صاحب۔ وقت اب وہ پہلے والا نہیں رہا۔ دشمن بڑھا کے خوا مخواہ اپنے لیے پریشانی اور خطرات مول مت لو۔"

"اوفو۔ جب تم بولنے پر آتی ہو تو تمہاری زبان رکنے کا نام نہیں لیتی اور کیا کہا تھا اس عورت نے؟" وہ دھاڑ کے بولا۔

"کچھ نہیں۔ وہ پھر فون کرے گی۔" ملکانی کچھ دب گئی۔

"ٹھیک ہے۔ اس کا پھر فون آئے تو اسے کہہ دینا کہ یہاں کوئی بہن نہیں ہے تمہاری۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر اس عورت کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" ملک نے کہا "میں نے اسے کچھ پوچھنے کے لیے بلایا ہے۔"

وہ بولی "جو پوچھنا ہے ضرور پوچھو مگر پوچھنے کے سوا تم کچھ نہیں کرو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہو گا تو اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"تم کون ہوتی ہو یہ ضمانت دینے والی؟"

"اس گھر کی مالکن' تمہاری بیوی' تمہارے بچوں کی ماں۔ کیا میری اتنی حیثیت بھی نہیں ہے ملک صاحب؟"

"دیکھو۔ جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر میرے مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ عورت صحافی نہیں ایک بلیک میلر ہے۔ مجھے تباہ کرنے پر تل گئی ہے۔ اس سے شرافت کی زبان میں بات کر کے دیکھ چکا ہوں میں۔ الٹا نقصان ہوا مجھے۔ یہ میرے دشمنوں کے ساتھ مل گئی ہے۔"

"اگر اسے کچھ ہوا تو تم زیادہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ یہ سوچو کہ اس کے ساتھی ہیں صحافی۔ پریس تمہارا دشمن ہو گیا تو معاملات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا تمہارے لیے۔ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ عورت ہے اس لیے تم حمایت پر اتر آئی ہو' تم ڈرتی ہو۔"

"نہیں ملک صاحب۔ میں کسی عورت سے اس لیے نہیں ڈرتی کہ وہ مجھ سے زیادہ جوان اور خوبصورت ہے۔ ایسی عورتیں بہت آئیں اور گئیں۔ میں صرف آپ کو اور اپنے گھر کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ملک نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "کچھ نہیں ہوگا مجھے اور تمہارے گھر کو۔"

"آپ پوچھ گچھ میں کوئی زیادتی نہیں کریں گے اس کے ساتھ" وہ خوشامد پر اتر آئی۔

"بابا ایسے کون زبان کھولتا ہے' جب تک سختی نہ کی جائے؟"

"ملک صاحب' پلیز' میری خاطر۔ صرف اس لیے کہ میں نے اسے زبان دے دی ہے۔ آپ جیسے چاہیں پوچھ گچھ کریں لیکن اس کی جان اور عزت محفوظ رہنی چاہیے۔"

ملک نے سر ہلایا "ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔"

"یہاں اس کے پاس لالی رہے گی" ملکانی نے کہا "تفتیش کے دوران میں بھی۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔۔۔" وہ پھر بگڑ گیا۔

"اگر آپ نے نیک نیتی سے وعدہ کیا ہے تو لالی کی موجودگی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ پوچھ گچھ میں آپ کی ہر طرح سے مدد کر سکتی ہے۔"

اوپر سے کسی بچے نے کہا "امی' فون ہے آپ کا۔"

"کون ہے؟" ملک نے وہیں سے پوچھا۔

"کوئی عورت ہے' کہتی ہے امی سے بات کرے گی۔"

"چلو۔ اس سے کہو کہ یہاں کوئی شجنم نہیں ہے۔ کسی کو اٹھا کے نہیں لایا گیا اور ملک صاحب ایسے کام نہیں کرتے۔"

وہ ملک کے ساتھ جاتے جاتے بولی "لالی۔ تم دروازے کو لاک کر دو۔ چابی اپنے پاس رکھو اور یہاں باہر بیٹھو۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب!" محافظ نے پوچھا۔

"تم۔۔۔ جاؤ اپنا کام کرو" ملک نے بادل ناخواستہ کہا۔

ان کی گفتگو کے دوران میں' میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ اگر میں ملک کے خلاف بولنے لگتی تو وہ مشتعل ہو کے بیوی کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیتا۔ ملکانی نے مجھے جو ضمانت دی تھی وہ پکی ہو گئی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ملک سے اپنی بات منوالی تھی۔ وہ بہت سمجھ دار عورت تھی اور یہ جانتی تھی کہ ملک جیسے مرد کو نکیل کیسے ڈالی جاتی ہے۔

دروازہ پھر باہر سے بند ہو گیا اور میں اس کمرے کی ویرانی میں اپنے اندیشوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کرتی رہی۔ وقتی طور پر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ تم نے میرا سراغ لگانے کے لیے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا' وہ نشانے پر نہیں لگا تھا۔ حالانکہ نشانہ ٹھیک تھا۔ یہ بڑی مایوسی کی بات تھی کہ ملکانی جھوٹ بول کے تمہیں گمراہ کر دے گی۔

رات کے وقت ایک ملازم کھانا لے کر آیا تو لالی نے دروازہ کھول کے اندر رکھ دیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ کسی روبوٹ کی طرح وہ جذبات سے عاری ہے اور صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتی ہے۔ عورت ہونے کے باوجود وہ عورت نہیں ہے۔ اس کے قدوقامت اور جسمانی ساخت میں نسوانیت کی نزاکت کا کوئی وجود نہیں۔ طاقت اور سخت جانی میں بہت سے مرد اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور وہ ٹبّا ایذا پسند یعنی SADIST اور سفاک ہے۔ میرا خیال ہے کہ لالی جنس کی تبدیلی کا کیس ہے اور اگر اس کا آپریشن ہو تو وہ مکمل مرد بن سکتی ہے۔

رات بارہ بجے ملک رب نواز پھر نمودار ہوا۔ اس پر کچھ نشہ غالب تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے چھیڑ چھاڑ اور دست درازی کی کوشش کی مگر وہ ایک حد میں رہا۔ میری منت سماجت اور دھمکیوں کا اس پر کیا اثر ہوتا۔ وہ مسلسل فحش کلامی کرتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اس دوران میں لالی خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی نظروں کے پُرشوق تجسس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باز کے شکاری پنجوں میں ایک کنزور چڑیا کے پھڑپھڑانے کا تماشا دیکھ کے بہت لطف لے رہی ہے اور شاید یہ چاہتی ہے کہ ملک اس کھیل کو وحشیانہ بربریت کی انتہا تک لے جائے۔

معلوم نہیں کیوں' رب نواز نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک کرسی منگوائی اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"دیکھو رپورٹر صاحبہ' اللہ نے تمہیں صورت اور یہ خوبصورت جسم ہی نہیں دیا' عقل بھی دی ہے۔ اب تک تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہاں تم کتنی بے بس اور مجبور ہو۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم محتاط ہو۔ اس کی وجہ یہی

ہے کہ تم بھی ڈرتے ہو؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا" وہ بگڑ کے بولا۔

"تم آنے والے وقت سے ڈرتے ہو۔ تم ایک طاقتور مرد ہو۔ اس سے پہلے بھی بہت عورتوں کی آبرو کا غرور خاک میں ملا چکے ہو۔"

اس نے کہا "آبرو کی بات تو کرتی ہے؟ جو اس بے غیرت شخص شاہ عالم کی داشتہ تھی۔ کتیا کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتی پھرتی تھی اور دھتکارے جانے کے باوجود اسی سے۔۔۔"

میں نے کہا "شاہ عالم سے میری محبت کو تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"مجھے اس کا پتا چاہیے۔"

میں نے کہا "اس کا پتا میرے پاس نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہے تو۔ سارا زمانہ شاہ عالم کو چھوڑ سکتا ہے مگر تو اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اس کے لیے تو سارے زمانے کو چھوڑ سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ لندن میں ہے اور میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔ اس نے کسی ماڈل سے شادی کر لی ہے وہاں۔ اب مجھے نفرت ہے اس کے نام سے۔"

وہ بولا "وہ خبر ایک جھوٹ تھی۔ شاید خود شاہ عالم نے شائع کرائی ہوگی تیری مدد سے۔ میں سب معلوم کر چکا ہوں۔ اس نام کی وہاں کوئی ماڈل گرل نہیں ہے۔ وہ سارے زمانے کو دھوکا دے سکتا ہے' مجھے نہیں" وہ چلانے لگا۔

میں نے کہا "تمہارے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ برطانیہ میں تو پرائیویٹ سراغ رساں گڑے مردے اکھاڑ کے ان کی سات پشتوں کا شجرہ نسب اور نامہ اعمال بتا دیتے ہیں۔ تم اخبارات سے اور خبر رساں ایجنسیوں سے خبر کا ذریعہ معلوم کر سکتے ہو۔"

وہ کچھ سوچتا رہا۔ "سب معلوم ہو جائے گا مجھے۔ وہ دنیا میں جہاں بھی ہوگا ایک دن ضرور پکڑا جائے گا۔"

میں نے کہا "وہ ماضی کے سب رشتوں سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ اس نے سیاست کے ساتھ ہی سب کچھ چھوڑ دیا تھا' اپنی بیوی کو' اس ملک کو' اپنی دولت جائداد کو' وہ ایک بے ضمیر بزدل اور بے غیرت آدمی تھا۔ وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتا تھا اور یہاں اس کی جان کے دشمن بہت تھے۔"

"اس نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ میرے کاروبار کو چوپٹ کر دیا۔ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا ہوں۔ کم سے کم تین کروڑ کھا گیا وہ میرے۔ میں سب اس کی بیوی سے وصول کر لوں گا۔"

میں نے کہا "بیوی کو اس نے بہت پہلے طلاق دے دی تھی۔ اب اسے شاہ عالم کے معاملات سے کیا؟"

وہ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر بولا "ایک مورتی کا سر ہے تیرے پاس۔ اس نمک حرام جنسی نیکے نے دیا تھا تجھے۔"

میں نے کہا "ہاں' مگر اب نہیں ہے۔"

"تو مجھ سے سودا کرنا چاہتی تھی اس کا اور میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار تھا۔"

میں نے کہا "اسی سے مجھے شک ہوا کہ آخر اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ وہ تو بہت معمولی چیز تھی۔ تم نے جھوٹ بھی بولا تھا مجھ سے کہ وہ ایک مشہور مجسمہ ساز نے بنایا تھا۔ ایک نہیں' کئی جھوٹ بولے تھے تم نے۔"

"جھوٹ سچ کو دفع کر۔ مجھے وہ سر چاہیے۔ ورنہ میں تیرا سر اتار کے بھیج دوں گا تیرے اس ناجائز باپ کو۔۔۔ اسی اخبار کے ایڈیٹر کو۔"

میں نے کہا "وہ سراب تمہیں نہیں مل سکتا رب نواز۔ میں نے اسے آزاد صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ انہوں نے آثار قدیمہ کے ماہرین کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ مورتی کے اس سر کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ وہ فن مجسمہ سازی کا ایک بھدا اور بے ہودہ نمونہ تھا پھر بھی ایس ٹی آر لیبارٹری والوں نے بتایا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کی دو تہوں کے درمیان کم سے کم ایک کلو ہیروئن کی تہ موجود ہے۔ ایک انچ موٹی۔ اندر باہر پلاسٹر آف پیرس کی تہ بھی اتنی ہی موٹی تھی۔"

اس نے اپنا سر تھام لیا "اب کہاں ہے وہ سر؟"

"غالباً انسداد منشیات والوں کے پاس۔ اینٹی نارکوٹکس فورس کی تحویل میں اور وہ ایف آئی اے کے ساتھ مل کے پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نوادرات اور آثار قدیمہ کی اسمگلنگ کب سے جاری ہے۔ اس میں کون کون نامی گرامی لوگ شامل ہیں اور ان کے تعلقات منشیات فروشوں کے کس گروہ سے ہیں۔"

"تیرا کیا خیال ہے صحافی کی اولاد۔۔۔ وہ معلوم کر لیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بہت مشکل ہے۔ اس میں ایک نہیں دو طرح کی مافیا ملوث ہے اور ظاہر ہے' وہ ہر سطح پر تفتیش رکوا سکتے ہیں۔ بیوروکریسی اور قانون نافذ کرنے والے سب ادارے ان کے نمک خوار ہیں۔ اوپر والے سب نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی' بیشتر تو بدعنوان رشوت خور ہی ہیں' پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟"

"ڈر کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہاری ذاتی دخل اندازی سے میرا کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ باقی سب سے میں نمٹ لوں گا۔ تم میرے ساتھ پکا مت لو۔ میری دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ تم ایک عورت ہو۔"

میں نے کہا "میری دشمنی کی وجہ ذاتی نہیں ہے۔"

"مگر دشمنی ذاتی ہوئی۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم ایک ذہین عورت ہو اور خوبصورت بھی' خود بھی عیش سے جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو۔ تمہاری شہ نہ ملتی تو اس حرام زادے فیکے کی کیا مجال تھی کہ وہ مورتی کا سرچوری کر کے تمہارے پاس جاتا" ملک نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"اسے بیوی کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ وہ بہت محبت کرتا تھا اس سے۔"

وہ ایک دم پلٹا۔ "مگر اسے میں نے نہیں مروایا تھا۔ میری بیوی کے حکم پر ٹھکانے لگایا گیا تھا۔ اسی ملکانی نے قتل کرایا تھا اسے جو تمہارے سامنے مجھے اخلاقیات پر لیکچر دے رہی تھی۔"

"لیکن اس کی آبرو کو نیلام کرنے والے آپ ہی تھے۔"

"پتا نہیں ان دو ٹکے کی عورتوں میں یہ عزت اور عصمت کا تصور کہاں سے آجاتا ہے۔ اپنی خوبصورتی کی اچھی قیمت لے چکی تھی وہ مجھ سے اور وہ فیکا یہ بات جانتا تھا۔ بے غیرت نہ ہوتا تو خاموش کیوں رہتا۔ قتل کروتا مجھے یا اسے۔ اپنی بیوی کو لے کر کہیں چلا جاتا۔ اس کی بیوی کی ایک بہن بھی تھی۔ سونی نام تھا اس کا۔ پتا نہیں کہاں کہاں خوار پھری' ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ یہاں آ کے اس نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ اسے بے وقوف بنا کے کوئی تو وہ خود بے وقوف۔ ہم جیسے شوقین مزاج رئیس اب حرم آباد نہیں کرتے مگر شوق تو ایسے ہی پورے کرتے ہیں۔ ملکانی بھی سمجھتی ہے کہ یہ سب ایسے ہی ہے جیسے آدمی باہر ہوٹل میں کھانا کھا لیتا ہے حالانکہ گھر میں اسے سب ملتا ہی ہے مگر ان بیتوں کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ بڑی کی شادی فیکے سے ہو گئی تھی۔ چھوٹی کو اس نے پٹی پڑھائی کہ بڑے ملک کو چھوڑ' دانواز پر ڈورے ڈال اور اس سے شادی کر لے۔ یہ ناقابل برداشت تھا' میرے لیے بھی اور ملکانی کے لیے بھی۔"

میں نے کہا "یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

وہ بولا "اس لیے کہ تم فیکے اور اس کی بیوی کو مظلوم سمجھتا چھوڑ دو۔ یہ انتقام کا ڈراما اس نے تمہیں متاثر کرنے کے لیے کیا تھا۔ اصل وجہ کچھ اور تھی۔ وہ لالچ میں پڑ گیا تھا۔ میں جانتا ہوں' اس مورتی کے سر کو لے کر وہ تمہارے پاس کیوں گیا تھا۔ اس کو امید تھی کہ تم اسے اچھی قیمت دلوا دو گی۔ وہ خود اسے بیچنے جاتا کہیں تو پکڑا جاتا۔ ممکن ہے اس نے تم سے فضٹی فضٹی کی بات کی ہو۔"

"آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں مگر یہ سچ نہیں ہے۔"

"پھر سچ کیا ہے؟ کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہاری سنائی ہوئی ہر کہانی پر آنکھ بند کر کے یقین کر لوں گا؟" وہ گرم ہو گیا۔ "فیکے نے ہی تمہیں پروفیسر ہاشم رضا سے ملوایا تھا۔ اس نے کیا آفر دی تھی تمہیں؟"

"اس سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور اس میں سودے کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا "وہ کوئی طے شدہ ملاقات نہیں تھی۔"

وہ چلانے لگا' گالیاں بکنے لگا "مورتی کا وہ سر ابھی تک کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ نہ آثار قدیمہ والوں نے' نہ انٹی نارکوٹکس والوں نے۔ ایسا ہوتا تو مجھے فوراً معلوم ہو جاتا۔ وہ ابھی تک تمہارے پاس ہے' میں جانتا ہوں۔"

"آپ غلط جانتے ہیں۔"

اس نے پلٹ کے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا "تو کا پتا نہیں ہوں میں۔ مجھے معلوم ہے کہ فیکا اس بس میں کس کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ سونی کے ساتھ کوئٹہ کیوں جا رہا تھا۔ اس مورتی کے سر کا سودا کرنے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے' اس کے ساتھ میں تھی؟"

"ہاں۔ مجھے پتا چلا ہے۔ ایک لڑکی تھی تیرے جیسی اور وہ جو تیرا ڈرائیور بنا ہوا ہے داڑھی والا' وہ بھی تھا۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ آپ تشدد سے سچ نہیں کر سکتے۔"

"بہت لوگوں نے دیکھا تھا تجھے برقع کے باوجود اور شاہ جی کے ہوٹل کے ایک ویٹر نے بھی پہچان لیا تھا۔ تو بس سے نہیں اتری تھی۔ تیرا وہ یار بھی وہیں بیٹھا رہا تھا۔ تم نے بس میں ہی کھانا کھایا تھا مگر جو ویٹر کھانا لایا تھا اس نے بعد میں بتایا کہ وہ لڑکی کسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ ہم سب کے فوٹو اتار کے لے گئی تھی مگر اس نے چھاپے نہیں۔"

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا "میں اپنی زندگی میں کبھی کوئٹہ نہیں گئی اور نہ کسی شاہ جی کے ہوٹل پر۔"

"اچھا چل چھوڑ۔ وہ مورتی کا سر اب کہاں ہے؟"

"میں بتا چکی ہوں۔"

اس نے چیخ کر لالی سے کہا "اس صحافت کی ناجائز اولاد

کو کپڑے اتار کے اتنا لٹکاؤ۔ آج میں اس سے پوچھ کے رہوں گا۔"

لالی نے رب نواز کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ رب نواز کے کہنے پر برف جیسا ٹھنڈا پانی بھی لے آئی۔ ملک وہ پانی مجھ پر ڈالتا رہا۔ اس کے ساتھ وہ دوسری ناقابل بیان حرکتیں بھی کرتا رہا۔ لالی نے اس کی پوری مدد کی۔ ملکانی نے مجھ سے صرف اتنا وعدہ کیا تھا کہ میری جان اور آبرو محفوظ رہے گی۔

میں بتا چکی ہوں کہ لالی ایک اذیت پسندانہ مسخ شدہ شخصیت رکھتی ہے۔ اگر وہ زنانہ پولیس میں ہوتی تو ایک کامیاب ایس ایچ او بنتی۔ ملک نے اسے حکم دیا "لالی! اس سے تین باتیں پوچھنی ہیں۔ ایک یہ کہ شاہ عالم کا پتا کیا ہے۔ دوسری یہ کہ مورتی کا سر کہاں ہے۔ تیسری یہ کہ اس کا ساتھ دینے والے میرے دشمن کون ہیں۔ تو اسے لے جا اپنے کوارٹر میں۔"

لالی نے پُرہوس نظروں سے میری طرف دیکھا اور مردانہ آواز میں بولی "آپ جاؤ جناب عالی! یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

میں نے چلا کے کہا "ملک صاحب۔ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مت مارو۔ مجھ پر تشدد کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی تمہیں۔"

ملک نے میرے منہ پر تھوک دیا "بھونکنا بند کر کتیا۔ کس پر ناز کرتی ہے تو؟ اپنے رپورٹر ہونے پر؟ جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں میں پریس کو۔ بہت سے صحافی کتے کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں میرے پیچھے۔"

میں نے کہا "پریس کے ساتھ کسی نے ٹکر نہیں لی آج تک۔ بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کا تختہ الٹ گیا۔"

"تو نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی ہے" وہ میرے قریب آ کے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا "اب کہاں رہتی ہے تو' بول کس کے ساتھ سوتی ہے ہر روز؟"

میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اس کا منہ نوچ لیتی۔ میرے جسم کا سارا خون نیچے آ گیا تھا۔ میرا سر پھٹنے کو تھا اور یوں لگتا تھا جیسے خون میری آنکھوں سے' کانوں سے اور ناک سے پھوٹ کر بہنے لگے گا۔ بالآخر لالی نے مجھے اتارا اور عقبی حصے کے ایک سرونٹ کوارٹر میں لے گئی۔ یہاں لالی نے میرے ساتھ کیا' کیا؟ یہ بڑی لمبی اور شرم ناک تفصیل ہے۔ وہ رات بھر میرے جسم کو ایسے بے آبرو کرتی رہی کہ تشدد ثابت نہ ہو۔ کئی بار میں بے ہوش ہو گئی تو اس نے مجھے ہوش میں آنے کی مہلت دی۔ اس دیوزاد سے جسمانی مقابلہ میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ مجھے اس وقت سونی کی بہت یاد آئی۔ میری جگہ وہ ہوتی تو اس کے جسم کی دو سو پالیس ہڈیوں کو توڑ کے چار سو چوراسی کر دیتی اور اس وقت میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب میں سونی سے مارشل آرٹ کی ٹریننگ ضرور لوں گی۔

صبح تک لالی نے مجھ پر تشدد کے ایسے حربے آزمائے جن کا مظاہرہ میں نے صرف ایک بار تھانے میں دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں سنا بہت تھا۔ لالی کے لیے یہ بڑا پُرلطف کھیل تھا۔ میں صبح تک مرنے کے قریب ہو گئی مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میری ساری ہڈیاں سلامت تھیں اور میرے جسم پر کوئی زخم کا نشان نہیں تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میری مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو شاید میں سب بتا دیتی۔

میں اب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تھی۔ ملکانی کے جھوٹ نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ملک ہاؤس پر چھاپے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اذیت اور ذلت کی انتہا کے بعد میں سوچنے لگی تھی کہ مجھے مرجانا چاہیے لیکن مانگے سے موت بھی کہاں ملتی ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ موقع ملنے پر میں اپنی جان خود لے کر اس عذاب سے چھٹکارا پا لوں۔ کوئی خنجر یا بلیڈ مل جائے تو میں اپنی کلائی کاٹ لوں۔ ڈی ڈی ٹی پی لوں جس کا اسپرے لالی نے کچن میں کیا تھا۔ وہاں سے بڑے بڑے کاکروچ نکل کے بھاگے تو لالی نے انہیں بڑی مہارت سے ایک تھیلی میں جمع کر لیا پھر اس نے مجھے ایک بوری میں ڈال کے وہ تھیلی اندر الٹ دی اور بوری کا منہ بند کر دیا۔ کاکروچ میرے سارے بدن پر چڑھ گئے۔ مجھے اس مخلوق سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اتنا میں پاگل کتے سے اور سانپ بچھو سے نہیں ڈرتی۔ یہ بھی ایک نفسیاتی مسئلہ ہی ہے۔ گٹر اور فلش لائن میں رہنے والے اس مکروہ جانور نے جب میرے جسم پر رینگنا شروع کیا تو دہشت اور کراہیت سے میرا جسم سرد پڑ گیا اور مجھے الٹیاں آئیں۔ میرا جسم اپنی ہی غلاظت میں بھر گیا۔ میں بوری سمیت ادھر سے ادھر لڑھکتی پھری اور اندر ہی اندر چیخ چیخ کے بالآخر بے ہوش ہو گئی۔ لالی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لال بیگ کے بعد وہ مجھ پر چھپکلی اور چوہے چھوڑے گی۔

اس کے بعد جب میں ہوش میں آئی تو صورت حال بدل چکی تھی۔ میں پورے کپڑے پہنے آرام سے بستر میں لیٹی ہوئی تھی اور میرے قریب ملکانی بیٹھی تھی۔ کمرا وہی تھا مگر لالی وہاں نہیں تھی۔ شاید کپڑے پہنانے سے پہلے میرے جسم کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھی طرح صاف کیا گیا تھا اور گرم پانی سے دھویا گیا تھا۔ مجھ پر تکان غالب تھی لیکن جسم میں بالکل درد نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی ایک ڈاکٹر مجھے سکون بخش اور درد کا احساس مٹانے والا انجکشن لگا کے گیا تھا۔

ملکانی رو رہی تھی۔ میں یہ سمجھی کہ شاید اسے میری حالت دیکھ کے رونا آرہا ہے۔ میں نے اسے روتے روتے بتایا کہ لالی نے میرے ساتھ کیا وحشیانہ برتاؤ کیا تھا۔

میں نے کہا "اس سے تو بہتر ہے آپ مجھے کتوں کے سامنے ڈال دیں۔ وہ ایک بار ہی مجھے چیر پھاڑ کے کھا جائیں گے۔ اس آدم خور عورت سے بچالیں مجھے۔"

اس نے مجھے تسلی دی "فکر مت کرو۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ بہت جلد تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا ملک رب نواز کا ارادہ بدل گیا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا۔"

ملکانی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "وہ میرے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

میں نے کہا "کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟ کون لے گیا ہے آپ کے بیٹے کو؟"

"وہ ــــ وہ حرام زادی ــــ کنجری ــــ سونی لے گئی ہے اسے۔"

میں چہرے سے خوشی کے تاثرات کو چھپا نہ سکی "وہ آئی تھی؟"

"ہاں' آئی تھی اپنے اس یار کے ساتھ۔ جسے وہ شوفر اور باڈی گارڈ کہتی ہے۔ گن پوائنٹ پر وہ دلنواز کو لے گئے۔ ہماری ہی گاڑی میں۔"

مسرت سے میرے جسم کا رواں رواں سرشار ہوگیا۔

"اچھا ــــ؟ کب؟"

"آج صبح' فجر کے وقت۔ ملک ان کے پیچھے گیا تھا مگر صرف گاڑی ملی ایک جگہ۔ انہوں نے دلنواز کو مجبور کیا تھا کہ گاڑی چلائے۔ صرف ایک ریوالور تھا سونی کے اس یار کے پاس۔ دروازے پر کلاشنکوف لے کر کھڑا ہوا گارڈ بھی کچھ نہیں کرسکا۔ یہاں سے دو کلومیٹر دور لینڈ کروزر خالی کھڑی چھوڑ گئے۔"

"یعنی یہاں سے وہ تمہاری لینڈ کروزر لے گئے' آگے وہ چھوڑ دی اور اپنی گاڑی میں غائب ہوگئے؟ یہ تو کمال کردیا انہوں نے؟"

"کہاں لے گئے ہوں گے وہ دلنواز کو؟"

مجھے اس سوال پر ہنسی آئی "میں بتادوں تمہیں تو کیا ہوگا۔ کیا تم جا کے اسے واپس لے آؤ گی؟ یہ اتنا آسان کام ہوتا تو ملک رب نواز کرلیتا۔"

"وہ کوئی زیادتی تو نہیں کریں گے اس کے ساتھ؟"

"یہ ملک سے پوچھو۔ اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ میرے ساتھ اس نے جو بھی کیا پھر اس کے حکم پر لالی نے جو کچھ کیا" میرا غصے سے بُرا حال ہوگیا۔

ملکانی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں معافی مانگتی ہوں تم سے۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی تمہیں بچانے کی۔"

"یہ ٹھیک ہے ملکانی کہ تمہاری وجہ سے میری عزت بچ گئی جو ایک عورت کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے اور میں لولولان نظر نہیں آرہی ہوں لیکن یہ جو وحشی درندہ پال رکھا ہے تم نے لالی کے روپ میں' اسے میں معاف نہیں کرسکتی۔"

وہ بولی "اس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ انتہائی وفادار ہے۔ تمہارے ساتھ ہوگی تو وہی کرے گی جو تم کہو گی۔"

"اس کا جرم ایسا نہیں کہ اسے رعایت دی جائے۔"

"مگر اس کے نزدیک یہ جرم نہیں۔"

میں نے ناراضی سے کہا "ملکانی۔ تم پڑھی لکھی عورت ہو۔ بلاوجہ اس کی وکالت مت کرو۔ تمہارے یا میرے حکم پر کوئی قتل کردے تو کیا اسے پھانسی نہیں ہوگی۔ اس کے جرم کو وفاداری سمجھا جائے گا۔ اس کا وجود ہی عام آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ اسے جیل یا پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔"

"تم نے پہلے بھی دیکھا ہے اسے۔ وہ انتہائی بے ضرر اور معصوم ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "معصوم؟ کتا بھی بڑا وفادار سمجھا جاتا ہے مگر جو شکاری کتا اپنے مالک کے ایک اشارے پر خونی درندہ بن جائے اور شکار کو چیر پھاڑ کے رکھ دے' اسے پنجرے میں ڈال کے رکھا جاتا ہے اور وہ کسی کو کاٹ لے تو ذمے دار مالک ہوتا ہے۔ باہر بورڈ لگانا پڑتا ہے کہ "کتے سے ہوشیار رہیے۔"

"وہ میرے ساتھ جیز میں آئی تھی۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا اور میرے باپ کا وفادار تھا۔ لالی چھ سال کی تھی جب اس کی ماں نے باپ کو چھری سے ذبح کردیا تھا۔ بعد میں اسے پھانسی ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بھی ہوگا خونخوار ریچھ کی طرح بے ضرر۔ کوئی عورت کب برداشت کرتی اسے۔ کیا تم پروفیسر ہاشم رضا کو جانتی ہو؟"

"ہاں مگر وہ تو ــــ"

"قتل ہوگیا تھا اس کا۔ یہ بھی ملک رب نواز کا وہ جھوٹ ہے جس کا راز ابھی تک فاش نہیں ہوا۔ میں مل چکی ہوں اس سے۔ اس کے پاس لالی جیسا ہی ایک جانور ہے۔ اس کا نام جمبو ہے۔ بڑا اچھا جوڑ ہوگا لالی اور جمبو کا۔"

ملکانی کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی "تم کیسے جانتی ہو؟"

"میرا ایک بدقسمت جاننے والا شامت اعمال سے وہاں پھنس گیا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا۔"

اتفاق دیکھو کہ اسی دن مجھے رب نواز نے دوسری جگہ شفٹ کردیا۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے اور سارا راستہ کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خود میرے منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے جاسوسی کہانیوں کے کردار کی طرح آوازوں سے اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کی کہ گاڑی کہاں سے گزر رہی ہے۔ میں نے کچھ دیر ہر موڑ کو بھی اپنے ذہن میں رکھا۔ دائیں' پھر بائیں۔ ایک بار بائیں پھر دو بار دائیں مگر اس کے بعد سب خلط ملط ہوگیا۔ میرا خیال ہے گاڑی گھنٹا بھر چلتی رہی۔

بالآخر میں نے خود کو وہیں پایا جہاں رئیس کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا کا ٹھکانا تھا۔ شہر سے بہت دور ایک ویرانے میں۔ میں ایک کمرے میں گھومنے پھرنے کے لیے آزاد تھی۔ کمرے میں ریڈیو' ٹی وی اور فریج سب کچھ تھا مگر میرا باہر نکلنا ناممکن تھا۔ کھڑکیوں میں باہر کی طرف مضبوط فولادی گرل تھی۔ دروازہ مقفل رہتا تھا اور پہرے داری میں جمبو مامور تھا۔

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو میں واقعی دہل گئی۔ وہ ایک خوں آشام وحشی جانور تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہ تھا اور اس کا وزن بھی تین چار سو پاؤنڈ سے زیادہ ہی ہوگا۔ اس کے بازو ریچھ جیسے تھے اور سارے جسم پر ریچھ کی طرح بال ہی بال تھے۔ اس کے سر' داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی قدرتی حالت میں بڑھے ہوئے تھے۔ اگر اس کی شیو اور حجامت کرائی جاتی اور اسے مناسب کپڑے پہننے کو دیے جاتے تو وہ شاید انسان لگتا مگر جانتے بوجھتے اسے صرف ایک ٹیگر میں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ زیادہ خوفناک لگتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر آیا اور کھانے کی ٹرے رکھ کے چلا گیا۔ میں سمٹ کر ایک کونے میں کھڑی ہوگئی تھی مگر اس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ رات کے وقت وہ پھر آیا تو اس کے ساتھ شفاف سروالا پروفیسر ہاشم رضا بھی آگیا۔ اس نے انتہائی مہذب اور شائستہ انداز میں بات کی۔

"آئی ایم سوری مس شبنم! کہ ہماری ملاقات انتہائی ناخوش گوار حالات میں ہورہی ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟"

میں نے تلخی سے کہا "جی نہیں۔ مجھے تو اتنا آرام ہے کہ جی چاہتا ہے باقی زندگی اسی قید خانے میں گزار دوں۔"

"مجھے امید ہے بہت جلد آپ واپس جاسکیں گی۔" وہ ہاتھ مل کے بولا۔

میں نے کہا "کیا رب نواز کے معاملات طے ہوگئے ہیں؟"

"ہوجائیں گے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ انہوں نے دلنواز کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ رب نواز پوری کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ جب تک فرشتے اس کی مدد کے لیے ــــ نہ آئیں۔ رب نواز سے کہو' اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "مس شبنم۔ آپ کے ساتھی خاصے پروفیشنل لوگ ہیں' ہماری طرح۔"

میں نے کہا "تم وہی ہو نا' پروفیسر ہاشم رضا۔"

"ہاں۔ یہی نام تھا میرا۔" وہ بہت آہستہ آہستہ بات کرتا تھا۔

"جب تم زندہ تھے" میں نے پُرتحسر لہجے میں کہا "تم تو مقتول ہو' یہاں کے پولیس ریکارڈ میں۔"

"جی!" اس نے کہا "شاہ عالم کی طرح۔"

"مگر وہ تو زندہ ہے اور لندن میں ہے" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے اسے بھی تو مقتول بنا دیا گیا تھا اب میں بھی لندن میں ہوں۔ وہاں انشاء اللہ کسی نہ کسی دن شاہ عالم سے ملاقات ہوگی۔ میرے دوست بہت ہیں وہاں۔ انہوں نے کوشش کی تھی اس ماڈل کا پتا چلانے کی جس کے ساتھ شاہ عالم کی شادی کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن وہاں اس نام کی ایک ہی ماڈل ہے اور وہ سخت برہم تھی اس خبر کی اشاعت پر۔ اس نے لندن کے ایک اخبار کو لیگل نوٹس بھی بھیجا تھا مگر اخبار نے معافی مانگ کے جان چھڑائی۔ پاکستان کے اخباروں کا اسے پتا ہی نہیں۔ ویسے بھی اس خبر کی اشاعت کے دو ماہ بعد اس کا قتل ہوگیا تھا۔"

"یہ میرے لیے خبر ہے۔ کیا اس کے قتل سے شاہ عالم کا کوئی تعلق تھا؟"

اس نے کندھے ہلا کے لاعلمی کا اظہار کیا "ہوتا تو پولیس ضرور پتا چلا لیتی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ہر امکان کو پیش نظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھتے ہیں۔"

"کیا انہوں نے شاہ عالم کا سراغ نہیں لگایا ہوگا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے شاہ عالم کی اس ماڈل سے شادی کی خبر کے غلط ثابت ہونے کے بعد اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔"

"لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے پاس شاہ عالم کا پتا ضرور ہوگا' وہ اس سے ملے ضرور ہوں گے۔"

"میں نے کہا نا' اس کیس میں میری معلومات اتنی ہی ہیں جتنی آپ کی" وہ ٹالنے کے انداز میں بولا "مجھے شاہ عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"رب نواز کو ہے" میں نے کہا۔

"ہوگی لیکن مس شبنم! کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں ہے کہ آپ شاہ عالم کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟"

"اس میں کیا عجیب ہے؟"

"شاہ عالم کے جتنے قریب آپ تھیں' کوئی اور نہیں تھا۔ اس کی بیوی بھی نہیں۔" وہ بولا "اور اب آپ اتنی بے خبر ہیں۔"

"میں اسے بھلا چکی ہوں۔"

"کیا واقعی؟" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"آپ یقین نہ کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔"

"آپ کی بڑی شہرت ہے کہ آپ بال کی کھال نکالتی ہیں اور گڑے مردے اکھاڑ کے انہیں پریس کانفرنس میں پیش کرسکتی ہیں پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے شاہ عالم کے اچانک غائب ہوجانے کے معاملے میں خاموشی اختیار کی؟"

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"آئی سی۔ شاہ عالم چاہتا تھا کہ اسے عزلت و گمنامی کی زندگی گزارنے دی جائے۔ آپ نے روپوشی میں اس کی مدد کی؟"

"آپ تو پولیس کی طرح تفتیش کررہے ہیں" میں نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم صرف باتیں کررہے ہیں۔" وہ بولا "ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کے لیے۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانیں اور سمجھیں؟"

"ایک صحافی میں تجسس اور تفتیش کے جراثیم کبھی نہیں مرتے۔ آپ نے واقعی اس بے وفا سے اپنا جذباتی رشتہ توڑ لیا ہوگا۔ جس نے کبھی آپ کی قدر نہیں کی تھی اور دیکھیے' لندن جاکے اس نے کیسی لڑکی سے شادی کی۔ یہاں بیوی کو طلاق دے گیا تھا۔ اس کی جگہ آپ کو ساتھ لے جاسکتا تھا۔"

میں نے کہا "مسٹر ہاشم رضا! کوئی اور بات کیجیے۔"

وہ بولا "اچھا۔ میرے کیس میں بھی آپ نے کوئی کام نہیں کیا۔"

"کیسا کام؟"

"آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں مقتول ہونے کے باوجود زندہ ہوں اور لندن میں ہوں لیکن آپ نے اس کیس کی تفصیلات جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

"بس مجھے فرصت نہیں ملی۔"

"کسی اخبار میں بھی آپ کی عملی صحافت نظر نہیں آئی۔ حالانکہ صحافت آپ کا پیشہ ہی نہیں' شوق بھی تھا۔ اب ایسی کیا مصروفیت اختیار کرلی ہے آپ نے؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاسکتی" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ آپ نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کے کوئی گروہ یا گروپ بنالیا ہے۔ اس میں پیشہ ور تخریب کار اور دہشت گرد بھی ہیں۔ جو پروفیشنل ٹریننگ لے چکے ہیں۔ بے حد ذہین اور ایکٹو۔"

"میں نے کون سی تخریبی کارروائی یا دہشت گردی کی ہے پروفیسر صاحب؟"

"یہ جو آپ کے ساتھی رب نواز کے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ یہ خالص دہشت گردوں والا اسٹائل ہے۔ جدید ترین اسلحہ بھی ہے آپ لوگوں کے پاس اور مارشل آرٹ بھی جانتے ہیں سب لوگ۔ اغراض و مقاصد کیا ہیں آخر آپ کے۔ شہرت' دولت یا صرف طاقت۔ ویسے ایک کا سلسلہ دوسرے سے ملتا ہے۔"

میں نے کہا "فرض کریں کہ ایسا ہے تو میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں آپ کو بتا کے غداری کی مرتکب کیسے ہوسکتی ہوں۔ رہے اغراض و مقاصد' تو وہ وقت آنے پر سب کے سامنے آجائیں گے۔"

"یہ کوئی وطن کے جاں نثاروں' قانون پرست اور ترقی پسند پاکستانی جیالوں کی گوریلا تنظیم ہے" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا "جو وطن دشمنوں' لاقانونیت کے علمبرداروں اور سماجی فرعونوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کرے گی۔"

میں نے کہا "اچھا سنشور دیا ہے آپ نے سوچنے کے لیے۔ اگر ایسی کوئی تنظیم بنی تو کیا آپ ہم سے تعاون کریں گے پروفیسر صاحب؟"

وہ ہنسنے لگا "ہم اور آپ مخالف کیمپ کے لوگ ہیں۔ ایک پلیٹ فارم پر کیسے اکٹھے ہوسکتے ہیں۔ اچھا' اب آپ آرام کریں۔"

میں نے کہا "پروفیسر۔ آخر تم جیسے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ آدمی کو ایسے متقول ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ جاتے جاتے رک گیا "ضرورت پڑجاتی ہے مس شبنم۔ آخر شاہ عالم کو بھی تو ضرورت پڑی تھی مگر وہ مقتول بھی نہ رہ سکا۔ اسے لوٹ کے زندہ انسانوں کی دنیا میں آنا پڑا۔ ممکن ہے وہ پھر مرجائے۔"

"رب نواز یہی چاہتا ہے اور تم اس کے ساتھ ہو پھر شاہ عالم کیسے بچ سکتا ہے" میں نے کہا۔

"حیرت ہے کہ اس پر آپ کو تشویش بھی نہیں" اس نے جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں سونے کی کوشش میں رات بھر جاگتی رہی۔ میرے اعصاب میرے قابو میں نہیں تھے۔ میں آنکھ بند کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے لالی کے سفاک ہاتھ میرے جسم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس ویرانے میں آس پاس رات کے وقت گیدڑ چلا رہے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ دروازے پر ایک خطرناک وحشی جانور جبو بیٹھا ہے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کی کنڈیاں نکال دی گئی تھیں۔ میں خوف زدہ تھی کہ کہیں جبو اندر نہ آجائے۔

صبح میں نے ناشتا کیا پھر دوپہر تک کمرے میں ٹہلتی رہی۔ سوچتی رہی کہ معاملات کہاں تک پہنچے ہوں گے۔ کب مجھے رہائی کی نوید ملے گی۔ جب مجھے خیال آتا تھا کہ تم اور سونی کس طرح ملک ہاؤس میں گھس کے دلنواز کو لے گئے تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک پروفیشنل ایڈونچر تھا۔ سونی کی اور تمہاری بہادری سے زیادہ ذہانت قابل تعریف تھی کہ تم نے بہترین پلاننگ کی اور رب نواز کے غرور کا آئینہ چکنا چور کردیا۔ میں اب خود کو بالکل محفوظ تصور کرتی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ مجھ پر کسی قسم کا تشدد نہیں ہورہا تھا۔ الٹا مجھے مہمانوں کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ یہ سب ایک توازن کا نتیجہ تھا جو تمہاری چھاپا مار کارروائی نے پیدا کردیا تھا۔ اب رب نواز کا لخت جگر تمہارے پاس تھا اور تمہاری تو رنظر اس کے قبضے میں تھی۔ شاید تمہیں شبنم اتنی عزیز نہ ہوگی جتنا رب نواز کو اپنا بیٹا عزیز تھا۔ برا ماننے کی بات نہیں' جذبات کو کسی پیمانے سے نہیں دیکھا جاسکتا مگر نوعیت کے اعتبار سے جوان اولاد کے لیے ماں باپ کی محبت کا مقابلہ اور کسی محبت سے نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ کسی حد تک تمہارا پلڑا بھاری تھا۔

شام کو پروفیسر پھر آکے بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بالکل میرے سائز کے نئے کپڑوں کا ایک جوڑا' ٹوتھ میک اپ کا سامان اور ایک پرفیوم پیش کیا اور کہا کہ باتھ روم میں غسل کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ میں نے نہادھو کے کپڑے بدلے اور واپس آئی تو ٹیبل پر چائے رکھی تھی۔

میں نے کہا "کیا میرے ساتھ یہ وی آئی پی ٹریٹ منٹ کسی دو طرفہ معاہدے کا نتیجہ ہے؟"

وہ ہنسا "آف کورس۔ تم کو سمجھ لینا چاہیے۔ دشمنوں کے درمیان جنگی قیدیوں کے مسئلے پر مذاکرات جاری ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی معاہدہ ہونے کی امید کب تک ہے؟"

اس نے مایوسی کا اظہار کیا "دراصل دونوں طرف بداعتمادی ہے اور کوئی دوسرے فریق کو بالادستی حاصل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا پھر بھی کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک ہورہا ہے؟"

"کیونکہ بدلے میں دلنواز کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا۔"

اس نے کہا "رب نواز کی بات ہوگئی ہے اپنے بیٹے سے لیکن کال کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔ بیچ میں ہے ایک اخبار کا ایڈیٹر۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب پر تمہیں اعتبار ہونا چاہیے۔"

"میں کسی معاملے میں نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ یہاں موجود ہوں لیکن مجھے ہر خبر مل جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے آج ہی قیدیوں کا تبادلہ ہوجائے۔ آزاد صاحب کو ثالث تسلیم کرلیا گیا ہے مگر رب نواز ڈرتا ہے۔"

"وہ بااصول آدمی ہیں۔ ایک بار وعدہ کرلیں تو پھر دوست یا دشمن نہیں دیکھتے۔ میرا خیال ہے ان کے سوا کوئی بھی یہ کام نہیں کراسکتا۔"

"دیکھو۔ کیا کارمولا ملے پاتا ہے۔ ابھی تک بات ایک جگہ جاکے اٹک گئی ہے۔ آزاد صاحب کا کہنا ہے کہ شبنم کو بھی یہاں لے آؤ۔ دلنواز بھی وہیں لایا جائے پھر دونوں اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ گھر جائیں مگر رب نواز کو اس میں رسک نظر آتا ہے۔ کہیں آزاد صاحب نے چالاکی سے آس پاس پولیس کا جال پھیلایا ہو تو کیا ہوگا؟ باہر نکلتے ہی پولیس نے تعاقب کیا تو مشکل پڑجائے گی۔ آزاد صاحب کا بہت اثر رسوخ ہے۔ رب نواز اپنی بدمعاشی کی طاقت پر بہت بھروسا کرتا ہے مگر وہاں وہ بے بس ہوگا۔ خیر تم چائے پیو۔"

میں نے کہا "یہ جبو کیا چیز ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اللہ کی مخلوق ہے" وہ بولا۔
"کچھ اسی نوع کی مخلوق لالی بھی ہے" میں نے کہا۔
وہ بولا "GENETAC سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔"
میں چونکے بنا نہ رہ سکی "آپ کا مطلب ہے؟"
"یس۔ جمبو اور لالی ایسے ہی تجربات کی پیداوار ہیں۔" وہ بولا۔
میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی "یہ BREED CROSS ہیں۔"
وہ بولا "اس سینس میں نہیں۔ جیسے خچر یا کتوں کی نسل کے فاکس ٹیریر اور وولف ٹیریر۔ یہ GENES کی لیبارٹری میں پیدا ہونے والے CELL کی انسانی جسم میں نشوونما کا نتیجہ تھا۔ جیسے ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہوتے ہیں۔"
"ریئلی۔ کون تھے ان کے ماں باپ؟"
"ماں تو ایک عورت ہی ہو سکتی تھی لیکن اس کے لیے والنٹیر نہیں ملتے تھے۔ کوئی عورت رضاکارانہ طور پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک خطرناک بلکہ جان لیوا تجربہ بھی ہو سکتا تھا اور بعد میں ہوا۔"
"وہ عورتیں۔۔۔ مر گئیں؟" مجھے شاک لگا۔
اس نے سہلایا "ان کا بچنا محال تھا۔"
"یہ بات شروع سے جانتے تھے تجربہ کرنے والے؟"
"آف کورس، اسی لیے پیسے کا لالچ بھی کسی عورت کو راضی نہیں کرتا تھا۔"
مجھے سخت غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا "پھر کیسے راضی کیا گیا انہیں؟"
"کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں مس شبنم! جن کو کیش کرایا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی زندگی بیچنے پر راضی ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک ان کے نہ ہونے سے دنیا کو تو یقیناً کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کے لواحقین کو بہت فرق پڑتا ہے۔ بالآخر ایک عورت مل گئی۔ دس لاکھ میں اس کے بچوں کا مستقبل ویسا ہو سکتا تھا جیسا وہ خواب میں دیکھتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے بدلے تعبیر خرید لی۔ اس کے سب بچے اب بہت آرام سے ہیں۔ تعلیم حاصل کر کے واقعی بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ اس کے شوہر نے البتہ دوسری شادی کر لی تھی۔ اس عورت نے خود کہا تھا۔"
"اور وہ ذلیل آدمی مان گیا؟ کیا اسے بھی معلوم تھا؟"
"تھوڑا بہت۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی جان سے جائے گی۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ ففٹی ففٹی چانس ہے۔"
"کیا یہ ذلالت نہیں ہے اس کی۔ بیوی کی جان کو داؤ پر لگا دیا اس نے؟"
وہ بولا "بیوی نے اسے بتائے بغیر خود کو پیش کر دیا تھا اور خود ہی کہا تھا کہ اس کے شوہر کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اس کا شوہر پہلے ناراض ہوا تھا مگر جب اسے نقد ملے تو اس نے آہ بھر کے کہا کہ اچھا نیک بخت۔ تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں جب بیوی نے اس سے کہا کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو تم میری بہن سے شادی کر لینا۔ دراصل اس کے پہلے سے اپنی سالی کے ساتھ مراسم تھے۔ بیوی نہ کہتی تب بھی شاید وہ شادی کر لیتا۔"
"وہ واقعی ذلیل آدمی تھا" میں نے کہا۔
"تم کہہ سکتی ہو مس شبنم لیکن دنیا میں یہ سب ہوتا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوا بیوی کی بات پر مگر بعد میں اس نے آہ بھر کے کہا کہ اچھا نیک بخت، تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ بہن کے بچوں کا خیال وہی رکھ سکتی ہے۔ پانچ مہینے بعد وہ مر گئی۔"
"کیا اسے بچایا نہیں جا سکتا تھا؟"
"اگر ایسا ممکن ہوتا تو ڈاکٹر ضرور کوشش کرتے۔ یوں اس طرح تجربہ مکمل کامیاب سمجھا جاتا۔ بچہ پیدا ہوا مگر ماں مر گئی تو کامیابی ادھوری رہ گئی۔"
"یہ کس سائنس داں کا پروجیکٹ تھا؟"
"سوری۔ میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ وہ جنوبی افریقہ میں تھا اس وقت۔ گزشتہ سال اس کا انتقال ہو گیا۔"
میں نے کہا "آپ تو تاریخ کے پروفیسر تھے؟"
"ہاں لیکن اس منصوبے سے مجھے بڑی دلچسپی تھی۔ میں نے اسے سرمایہ فراہم کیا تھا اور جمبو کی ماں میرے پاس کام کرتی تھی۔ میں نے اسے قائل کیا اور وہ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے خود کو قربان کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے اس کا پکا بندوبست کیا تھا کہ اس کا شوہر دس لاکھ کی رقم کو عیاشی میں نہ اڑا سکے۔ رقم ان کے جوان ہونے تک محفوظ رہی اور اس کا سود انہیں ملتا رہا۔"
"یہ کتنی پرانی بات ہے؟"
"چودہ سال پہلے کی۔"
"چودہ سال۔۔۔ یعنی جمبو کی عمر چودہ سال ہے؟"
"یس۔ انسانی معیار سے وہ ابھی نابالغ ہے۔" پروفیسر خباثت سے مسکرانے لگا "وہ ابھی بڑھ رہا ہے۔"
"او مائی گاڈ۔ تین ساڑھے تین سو پاؤنڈ وزن تو ہے اس کا؟"
"چار سو پاؤنڈ تھا کل۔ میں ہر اتوار کو کچھ میڈیکل ہسٹری مرتب کرتا ہوں اور اس کی پروگریس کا ریکارڈ رکھتا ہوں۔

پیدائش کے وقت اس کا وزن تیس پاؤنڈ تھا۔"
میرا دماغ چکرا گیا "تیس پاؤنڈ! پھر کیسے زندہ رہ سکتی تھی وہ عورت؟"
"دنیا میں میڈیکل سائنس کی ریسرچ کے لیے ہر سال بہت سے رضاکاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو مختلف دوائیں استعمال کر کے نتائج مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ بے شک ان کو پہلے چوہوں اور بندروں پر آزمایا جاتا ہے لیکن انسانوں پر استعمال کر کے دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ریسرچ بہت اہم ہے انسانی فلاح کے لیے۔ ایک آدمی کے مرنے سے سیکڑوں ہزاروں کی جان بچ جاتی ہے۔"
میں نے برہمی سے کہا "مگر یہ تجربہ جو آپ نے کیا۔۔۔؟"
"میں نے نہیں مس شبنم! میرے ایک سائنس داں دوست نے۔"
"اس سے کون سی انسانی خدمت ممکن تھی۔ فلاح کا کون سا پہلو تھا اس میں؟"
"دیکھیے۔ خود امریکن سائنس داں یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ایٹم بم کی تابکاری کے مضر اور مہلک اثرات کا تجربہ پہلے امریکی فوجیوں پر کیا گیا تھا۔ انہیں بتائے بغیر اور ان کی موت کو بھی سرکاری راز کے طور پر چھپا لیا گیا تھا۔"
مجھے سخت افسوس ہوا "دنیا کے سائنس داں ہلاکت خیز اشیا کی ایجاد کے لیے بھی کوئی اخلاقی جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انسانوں کو اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ اس ایجاد کے بغیر بھی دنیا والے خوش اور خوش حال تھے۔"
"جذبات سے حقائق نہیں بدلتے مس شبنم! اب دیکھیے جمبو ایک اشاروں پر چلنے والا غلام ہے مگر وہ روبوٹ نہیں ہے۔ وہ عام انسانوں کے مقابلے میں دس گنا طاقت رکھتا ہے۔ دس گنا وزن اٹھا سکتا ہے۔ دس گنا سخت مشقت کے کام کر سکتا ہے۔ دس گنا زیادہ سردی گرمی برداشت کر سکتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو درختوں کے تنے اور گھاس پھوس کھا کے ہی گزارا کر لیتا ہے۔ تنخواہ نہیں مانگتا۔ چوری نہیں کرتا۔ کتنے فائدے ہیں۔"
اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "ماں تو ایک عورت تھی اس کی لیکن باپ کون تھا؟"
وہ مسکرایا "مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ تم نے یہ سوال نہیں کیا۔ اس کا باپ ایک بن مانس تھا۔"
میں اچھل پڑی "بن مانس۔ افریقہ کا؟"
"یس۔ اس لیے کبھی کبھی جمبو کا رویہ آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگتا ہے۔ میں اسے ہر ہفتے ایک انجکشن ۔۔۔ تو یہ

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے کمینہ صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۴۰۔ عزیز مارکیٹ
اردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب تہس نہس کردے۔ وہ ایک اسٹرانگ ریکولائزر ہے۔"
میں نے کہا "جمبو بات کرسکتا ہے؟"
"آف کورس۔ اس کی دماغی صلاحیت انسانی ہے۔ یوسی' بندر بن مانس اور گوریلے انسانی فیملی ہیں۔ ہم سائنس دانوں کے نزدیک پہلے بندر تھے۔"
میں نے کہا "ڈارون کا نظریہ ارتقا پڑھا ہے میں نے۔"
"یس۔ EVOLUTION کے عمل میں بندر ہی انسان بن گیا اور جو پیچھے رہ گئے وہ ابھی تک بندر' لنگور یا بن مانس اور گوریلے ہیں۔"
میں نے کہا "لالی کی ماں کون تھی؟"
وہ بولا "نام میں کسی کا نہیں بتا سکتا۔ یہ مرنے والوں کے ساتھ کیے گئے عہد کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کی ماں کو میں نے تلاش نہیں کیا تھا۔ وہ میرے سائنس داں دوست کو وہیں ملی تھی۔ افریقہ میں۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا تھا۔ چار بچے تھے اس کے۔ ان کی ذمے داری ڈاکٹر نے لے لی تھی۔ وہ سب وہیں ہیں ابھی تک اور اپنی ماں کی قربانی کے طفیل خوش حال ہیں۔"
میں نے کہا "لالی کے وجود کا کیا جواز ہے۔"
وہ ہنسا "ویری INTELLIGENT۔ اچھا سوال کیا تم نے۔ یوسی' جیسے آدم کے لیے حوا کو پیدا کیا گیا تھا' ایسے ہی جمبو کے لیے لالی کا ہونا ضروری تھا۔ وہ جمبو سے ایک سال چھوٹی ہے۔"
میں دم بخود بیٹھی رہی "یعنی ان کی شادی ہونی طے ہے۔"
"یس۔ کسی حد تک؟" وہ ہنس پڑا۔
"اور اس شادی کے نتیجے میں۔۔۔"
"نہیں مس جنم! وہ جو آپ سوچ رہی ہیں وہ نہیں ہوگا۔ جمبو اور لالی قدرتی طور پر تولیدی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم انسانی غلاموں کی ایک نسل پیدا کرسکتے تھے جو ہمارے سب کام۔ میرا مطلب ہے جسمانی مشقت کے کام' بہتر طور پر اور بلا معاوضہ کرتی۔"
"یہ CHEAP LABOUR بوتل کا جن بھی تو ثابت ہوسکتی تھی۔ آپ کی بلا آپ ہی کو چمٹ جاتی' عذاب بن کے۔ ایٹمی قوت کی ایک مثال ہے۔"
"ہاں مگر سائنس بالآخر ہر پروڈکٹ کے نقصان دہ اثرات پر قابو پانے کے مثبت نتائج حاصل کرلیتی ہے۔ مجموعی طور پر سائنس انسان کی زندگی کو بہتر اور طویل بنا رہی ہے۔"
پھر اچانک اس کے لیے کسی کا فون آگیا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں لالی کے بارے میں سوچ سوچ کے لرزتی رہی۔ وہ واقعی مجھ سے ایسے کھیلتی رہی تھی جیسے بھوکی بلی کسی چوہے سے کھیلتی ہے۔ بس اسے چوہے کو کھانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کے انداز میں ایک وحشی پن تھا۔ اگر وہ بے قابو ہوجاتی تو شاید اپنے ہاتھوں سے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی۔
پروفیسر کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ میرا خوف اور بڑھ گیا۔ اب اس ویران گھر میں میرے ساتھ ایک حیوانی مخلوق تھی۔ کہنے کو چودہ سال کا بچہ مگر آدمی سے دس گنا زیادہ طاقتور۔ اس کا ذہن انسانی تھا اس لیے وہ بات کرسکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ اس کی پسند ناپسند' خوشی اور ناراضی کے جذبات تھے۔ وہ مجھے دیکھ کے رومانٹک موڈ میں بھی آسکتا تھا۔ کسی عورت کا حسن اسے پُرکشش محسوس ہوتا تو۔۔۔ میں تو اس خیال سے ہی بے ہوش ہونے لگی۔ لالی عورت تھی' جمبو مرد تھا۔ انہیں اسی طرح بنایا گیا تھا۔
رات کو جمبو میرے لیے کھانا لے کر آیا تو میری روح فنا ہوگئی مگر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر لوٹ گیا۔ اس گھر میں مجھے دوسرا کوئی ملازم نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھانے پکانے کا اور صفائی کا سارا کام بھی جمبو ہی کرتا ہوگا۔ وہ مشینی نہ سہی' انسانی روبوٹ بہرحال تھا۔ شاید پروفیسر نے اسے تربیت دی ہوگی اور اسے امور خانہ داری سکھائے ہوں گے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایک سائنسی تجربے کی پیداوار ہے پھر یہ بات پروفیسر نے مجھے کیوں بتائی؟ کیا اسے ڈر نہیں تھا کہ میں اخبار میں یہ سب کچھ چھاپ سکتی ہوں؟
نہیں۔ اسے یہ ڈر نہیں ہوگا۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ مجھے جھٹلا سکتا ہے۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ میری اسٹوری میرے ذہن کی تخلیق ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ جمبو انسان کا بچہ ہے۔ کچھ لوگ غیر معمولی جسامت رکھتے ہیں۔ ان کے THYROID یا PITUITORY گلینڈز اگر ضرورت سے زیادہ OVERACTIVE ہوں تو ایسا ہوسکتا ہے۔ لالی بھی ایسی ہی مثال ہے۔ پروفیسر صاف انکار کردے گا کہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو کہہ سکتا ہے کہ میری اور اس کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی پھر بھی میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ یہ لیچر ضرور چھاپوں گی اور ریسرچ سائنٹسٹ ڈاکٹرز اور ANTHROPOLOGISTS کو دعوت دوں گی کہ وہ لالی اور جمبو پر تحقیق کریں۔
پروفیسر رات کو آیا تو کچھ اپ سیٹ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "چلو' میرے ساتھ۔ ہمیں ابھی جانا ہے۔"

میں نے کہا "اب کہاں لے جارہے ہو مجھے؟"
"جہنم میں" وہ غصے سے بولا۔
میں نے کہا "اب تک میں اور کہاں تھی؟"
ایک بار پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ یہ کام خود پروفیسر نے کیا۔ اگر میں انکار کرتی تو مجھے معلوم تھا' وہ جمبو کو یہ حکم دیتا۔ میرے ہاتھ پیچھے باندھ کے اور منہ پر ٹیپ لگا کے پروفیسر نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا نیکی آئی کہ اس نے خود ہی ٹیپ اتار دیا۔
گاڑی چلی تو اس نے کہا "ہم تمہارے مجازی باپ کے پاس جارہے ہیں۔ جیسے خدا ایک ہی ہے اسی طرح حقیقی باپ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ مجازی خدا کی طرح مجازی باپ زیادہ ہوسکتے ہیں۔"
"VERY FUNNY" میں نے کہا "آزاد صاحب کہنا کافی تھا۔"
"قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ ہوگیا ہے۔" وہ بولا۔
میں نے کہا "تمہاری کس سے بات ہوئی ہے۔ آزاد صاحب سے یا رب نواز سے؟"
"رب نواز کے ساتھ۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس کی بیوی نے سارا کام خراب کردیا ورنہ وہ تمہارے ٹینگ کو ناکوں چنے چبوا دیتا۔"
"تم انہیں گینگ کیسے کہہ سکتے ہو؟"
"آف کورس۔ وہ GANGSTERS ہیں۔ ایسی حرکت کیا شریف لوگ کرسکتے ہیں۔"
"وہ GANGSTERS ہیں تو پھر رب نواز کیا ہے۔"
اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا "ملک رب نواز نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ دلنواز واپس آجائے اور تمہارے وہ دہشت گرد ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں۔"
"کیا بندوبست کیا تھا؟"
"تمہیں معلوم ہوجائے گا واپس جانے کے بعد۔ افسوس کہ ملکانی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ جا کے بیٹھ گئی ہے آزاد صاحب کے آفس میں۔"
میں نے بے اختیار کہا "ویری گڈ!"
"کیا ویری گڈ!" وہ برہمی سے بولا "عورتیں جذبات سے مردوں کی عقل کو شکست دے دیتی ہیں۔ وہ واپس آنے کو تیار نہیں۔ کہتی ہے دلنواز کے بغیر وہ ملک ہاؤس واپس نہیں جائے گی۔"
"ملک کو چاہیے کہ ایسی نافرمان عورت کو فوراً طلاق دے کر ایک اور شادی کرلے۔"
"معاملہ ہے بیٹے کا اور اس نے دھمکی دی ہے کہ اس کی بات نہ مانی گئی تو پھر انجام کچھ بھی ہو۔ وہ سیدھی پریس کلب جا کے ایک پریس کانفرنس میں وہ سب بتادے گی جو اسے معلوم ہے۔"
میں نے کہا "یہ تو بڑی خطرناک دھمکی ہے ملک رب نواز کے لیے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اخبار والے تو ایسی سنسنی خیز ہیڈ لائنوں والے اسکینڈل ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ رب نواز تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"
"منہ کی بات مت کرو۔ سیاست میں سب روسیاہ ہوتے ہیں مگر کچھ دن بعد پھر آجاتے ہیں وہی منہ لے کر۔ دھلا دھلایا اور نئے میک اپ کے ساتھ اور اپنے منہ کی کالک دوسرے کے چہرے پر ملنے لگتے ہیں۔"
"اسے کہتے ہیں شامت اعمال۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ رب نواز کی بازی اس کے اپنے مہروں کی وجہ سے مات ہوگئی۔"
"مجھے امید ہے تم اپنی زبان بند رکھو گی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارو گی۔ میری ایک نصیحت ہے۔ زندگی اور جوانی صرف ایک بار ملتی ہے۔ خدا نے تمہیں جو حسن دیا ہے اسے ایک نعمت سمجھو۔ جو ہر ایک کو نہیں ملتی۔ اسے ضائع کرنا کفران نعمت ہوگا۔"
"کیا کروں میں اس حسن کا۔ مس ورلڈ کے مقابلہ حسن میں تو میں شرکت کرنہیں سکتی" میں نے غیر سنجیدہ ہوکے کہا۔
"انجوائے لائف۔ اس کے ایک ایک لمحے سے خوشی کشید کرو۔ ایک شعر سناتا ہوں۔

ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہ عدم
اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم

تو لعنت بھیجو سارے غموں پر۔ تم ایک رب نواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ایسے ہزاروں رب نواز ہیں پاکستان میں' لاکھوں ہیں دنیا میں۔"
میں نے کہا "میں اس مشورے کو یہیں مسترد کرتی ہوں۔"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تمہارا دماغ خراب ہے۔"
"ہاں۔ میرے جیسے بہت سے ہیں جن کے دماغ خراب ہیں۔ وہ بیشمار اس دنیا میں ہیں جو انسانوں کے لیے پُرامن زندگی کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ حق اور انصاف تو لالی اور جمبو کو بھی ملنا چاہیے۔ کالے گورے امیر غریب سب کی ہے یہ دنیا۔ تم بستری کے پروفیسر ہو' تم تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانتے ہو گے۔"

وہ خاموش رہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ میرے اور اس کے اصول اور نظریات میں مشرق و مغرب کی دوری ہے اور ہماری سوچ کی لہریں مخالف سمتوں میں سفر کرتی ہیں۔ باقی راستے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب میری حیثیت اس جنگ میں فاتح فریق جیسی ہو گئی تھی۔

لاہور شہر کے قریب اس نے پھر میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ میرے ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے اور اسی حالت میں پون گھنٹے تک گاڑی کی سیٹ پر بیٹھے رہنے سے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں دیکھ بھی نہیں سکتی تھی کہ گاڑی کہاں سے گزر رہی ہے۔ بالآخر پروفیسر نے ہارن دیا اور ایک شخص نے گیٹ کھولتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں مجھے پھر ملک ہاؤس تو نہیں پہنچا دیا گیا ہے۔

لیکن وہ نئی جگہ تھی۔ جب میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی گئی تو میں نے خود کو ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں پایا۔ میرے منہ پر سے ٹیپ ہٹا دیا گیا اور ہاتھ بھی کھول دیے گئے تو میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ پروفیسر مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کے ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے لگا۔ اس نے وائرلیس کے طور پر اپنا ریوالور سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے رب نواز سے بات کی۔

"سب ٹھیک ہے" وہ بولا "ہاں' نہیں فکر کی بالکل کوئی بات نہیں۔ چلو' ایسا بھی ہوتا ہے ملک صاحب۔ کبھی کے دن بڑے' کبھی کی راتیں۔ ہاں' میں خود بات کروں اس سے؟ اوکے۔ تمہارے دوسرے پلان کا کیا ہوا۔ اوہ فائن' تم واقعی ایک MASTERMIND ہو۔"

ہم جس گھر میں تھے اس کی دوسری منزل پر ٹی وی چل رہا تھا۔ نیچے شور مچا رہے تھے اور ایک عورت چلا رہی تھی "اوئے چپ کرو۔ نہیں تو بند کر دوں ٹی وی کو۔ ایسے شور میں کیا سنائی دیتا ہے۔"

پروفیسر نے فون میری طرف بڑھایا "تم آزاد صاحب سے بات کر سکتی ہو۔"

مجھے یقین نہیں آیا "میں۔۔۔ خود بات کروں؟" میں ایک دم اٹھی۔

پروفیسر نے ریوالور اٹھایا اور میری جگہ جا بیٹھا "اس وقت غیر ضروری گفتگو سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بس اتنا بتا دو کہ تم خیر و عافیت کے ساتھ یہاں ہو۔"

"یہاں کہاں؟"

"یہاں۔۔۔ لاہور میں۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے نمبر ملایا تو ریسیور خود آزاد صاحب نے اٹھایا "ہاں بھئی' بولو؟"

میں نے کہا "جی۔۔۔ میں شبنم ہوں۔"

انہوں نے عادتاً کہا "بہت خوب گویا" اور پھر چلائے "اچھا تو تم شبنم ہو۔ جو برضائے الٰہی یا شامت اعمال کچھ گمشدہ لاپتا وغیرہ تھی گویا۔"

میں نے کہا "جی میں لاہور میں ہوں لیکن کچھ پتا نہیں کہاں ہوں۔"

"بھئی یہ خود سے بے خبری چہ معنی دارد گویا! تمہارے حواس خمسہ وغیرہ کی کارکردگی خدانخواستہ متاثر ہو چکی ہے یا تمہاری ذہنی و جسمانی صحت کی حالت ناگفتہ بہ ہے گویا؟"

میں نے انہیں تسلی دی "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بالکل!"

"اچھا؟ اوپر بیان گویا تم بلاجبر و کراہ۔ برضا و رغبت اور بقائمی ہوش و حواس جاری کر رہی ہو؟ بخدا ہم ایک غیر جانبدار ثالث نہیں رہ سکتے تمہارے معاملے میں گویا۔ ہم پر سخت عالم رقت ہے۔"

میں نے کہا "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

"چہ خوش۔۔۔ ہم پریشان نہ ہوں گے عزیزہ تو کیا اہالیانِ کانا کاچھا ہوں گے گویا اور جب تک تم کرۂ ارض پر ہو اسباب پریشانی پیدا کرنے پر۔۔۔ خیر' اس موضوع پر ہم بہت سخت الفاظ میں ڈانٹیں گے تمہیں بھی۔ فی الحال جہاں ہو جیسے ہو کی بنیاد پر ایک بارٹر ڈیل ہو گئی گویا کہ تمہارے عوض میں ہم دیں گے ایک ماں کو اس کے جگر کا ٹکڑا وغیرہ۔"

اس کے بعد ٹیلی فون پر مذاکرات کا ایک سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے تک چلتا رہا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ اب معاملہ صرف جگہ کے تعین کا رہ گیا ہے کہ مجھے کہاں چھوڑا جائے اور دلنواز کو کہاں لایا جائے۔

آدھے گھنٹے بعد پروفیسر نے فون رکھ دیا "چلو شکر ہے بات بن گئی۔"

میں نے کہا "اگر بات نہ بنتی تو کیا ہوتا؟"

وہ مسکرایا "بات بگڑ جاتی۔"

"اور تم مجھے واپس لے جاتے؟"

وہ بولا "ظاہر ہے مگر اب کچھ دیر میں تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔ میرا مطلب ہے جہاں بھی تم جانا چاہو۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔"

"لڑکی کے دو گھر ہوتے ہیں۔ پہلے ماں باپ کا پھر شوہر کا۔ اس کے علاوہ بھی وہ جہاں چاہے رہ سکتی ہے مگر وہ اس کا گھر نہیں ہوتا۔"

مجھے اس کی بات تلخ لگی لیکن یہی سچ تھا۔ "رب نواز کے غرور کو شکست ہوئی۔ اس کے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہے۔"

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے رب نواز کی طاقت کا۔"

میں نے کہا "میں صرف خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔ وہ جسے چاہے وسیلہ بنائے۔"

"میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ ان معاملات کو ایک صحافی کی نظر سے مت دیکھنا اور EXPLOIT کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم نے کوئی اسٹوری بنائی تو اس کا خمیازہ بھی تمہی کو بھگتنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "رب نواز نے بھی محتاط رویہ اختیار نہ کیا تو بہت گھاٹے میں رہے گا۔"

"موٹری خود کو جتنا چالاک چاہے سمجھے' جنگل کے بادشاہ کے ساتھ پنگا لینا اس کے لیے خودکشی کے مترادف ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میرے پاس گنوانے کے لیے اپنی جان کے سوا کچھ نہیں ہے رب نواز بہت سی مجبوریوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ مثلاً خون کے رشتے۔ دیکھ لو بیٹے کی وجہ سے اس کو جھکنا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی رب نواز کی بہت سی کمزوریاں ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً اس کی سیاسی ساکھ اور مستقبل کے عزائم اسے بہت عزیز ہیں۔ اس کی خاندانی عزت کا شیش محل ہے اور اس کا ہر سمت میں پھیلا ہوا کاروبار ہے۔"

"جسے تم مجبوری یا کمزوری کا نام دے کر خوش ہو رہی ہو۔ غور کرو تو یہ اس کی طاقت کے ذرائع ہیں۔ اگر تمہارے ایسے اثاثے نہیں ہیں تو شاید یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔ دنیا میں کامیابی کے پیمانے یہی تسلیم کیے جاتے ہیں۔"

اس سے بحث میرا مقصد بھی نہیں تھا۔ مجھے اب بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب میں پھر تم سب سے ملوں گی۔ ملک رب نواز کے مقابلے میں پروفیسر ہاشم رضا تعلیم یافتہ تھا اور اس کی زندگی میرے جیسوں کو سبق پڑھاتے گزری تھی۔ اس نے مجھے یہ سبق پڑھانے کی کوشش کی کہ میں نے پیغمبر اور مصلح بن کے اس معاشرے کو اخلاقی خرابیوں اور غیر قانونی سرگرمیوں سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس سے پہلے کہ میری کوششوں پر لوگ ہنسنا شروع کریں'

میرے لواحقین میری وفات حسرت آیات پر آنسو بہاتے نظر آئیں گے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ صرف جذبہ جہاد ہو تو شہادت کا درجہ ضرور حاصل کیا جا سکتا ہے مگر کشمیر حاصل نہیں کیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔

بالآخر پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت ایک بچہ چائے کی ٹرے لے کر اندر آ چکا تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کے وہ وہیں کھڑا ہو گیا اور مجھے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پروفیسر نے "رانگ نمبر" کہہ کے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا آپ ہی چاؤلہ ہو؟" لڑکے نے پوچھا۔

پروفیسر نے چائے کا کپ اٹھا کے کہا "چوہی چاؤلہ کون ہے؟"

لڑکا ہنسنے لگا "چوہی نہیں انکل! جوہی چاؤلہ۔ آپ نہیں جانتے؟" اس نے گھٹا کٹ تین چار فلموں کے نام گنوا دیے۔

پروفیسر خفا ہونے لگا "چلو جاؤ اندر۔ ابھی پوچھوں گا کہ اورنگ زیب کون تھا تو پتا نہیں ہو گا۔ جہانگیر کا پتا نہیں ہو گا۔"

"پتا ہے انکل! اورنگ زیب لغاری اس ڈرامے میں بھی تھا۔ وارث میں' اور ایک ڈراما ابھی چل رہا ہے۔۔۔ اور جہانگیر تو اسکواش چیمپئن ہے۔"

پروفیسر نے سخت افسوس سے سر ہلایا "یہ حال ہے ہمارے مستقبل کے معماروں کا۔ انہیں صرف فلم اور ٹی وی کے ایکٹروں کے نام آتے ہیں یا پھر عمران خان' جہانگیر خان کا نام جانتے ہیں۔"

میں نے بچے سے پوچھا "تم بڑے ہو کے کیا بنو گے؟"

اس نے بلا تکلف کہا "میں وزیر اعظم بنوں گا۔"

"وزیر اعظم بن کے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔

"خوب عیش کروں گا۔ اپنے سارے خاندان کو اور دوستوں کو بیچ کاف کا مالک بنا دوں گا۔" اس نے ہاتھ پھیلا کے بتایا۔

"بیچ کاف!" میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا ہوتا ہے؟"

پروفیسر نے کہا "سکھوں کے ہوتے ہیں پانچ کاف۔ کنگھی' کیس' کڑا' کرپان اور کچھا۔"

بچہ ہنسنے لگا "آپ کو بیچ کاف نہیں معلوم؟ کارخانے' کوٹھی' کار' کیش اور کاروبار۔"

وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور وزیر اعظم کے نام کا مطلب اس کے نزدیک ملک اور قوم کی خدمت' عوام کے مسائل حل کرنا یا پاکستان کی ترقی وغیرہ نہیں تھا۔ وہ جو دیکھ اور سن رہا تھا یا اخباروں میں پڑھ رہا تھا' وہی کہہ رہا تھا۔ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی کیونکہ مجھے تمہاری یاد آگئی تھی۔ تم بھی بچپن میں وزیراعظم بننے کی بات کرتے تھے اور لوگ تم پر ہنستے تھے۔ جب وقت آیا اور تمہیں قدرت نے ایک موقع فراہم کیا کہ تم ہمت اور کوشش کرکے وزیراعظم کے عہدے کی دوڑ میں شامل ہو سکو تو تم خود جان چھڑا کے بھاگ گئے۔ اب کوئی سنجیدہ اور مخلص پاکستانی سیاست کے کوئے ملامت کا رخ بھی نہیں کرتا اور اقتدار کی لعنت کا طوق گلے میں ڈالنے کو دنیا اور عاقبت خراب کرنے کے مترادف سمجھتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں بچے سے مزید سوالات کرتی۔ پروفیسر نے اسے وہاں سے بھگا دیا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر پروفیسر کا اندیشہ جائز تھا کہ کہیں میں اس سے باپ کا نام اور پتا نہ پوچھ بیٹھوں اور کچھ نہ سہی میں بچے سے یہ بہرحال معلوم کرسکتی تھی کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے بعد میرے لیے دوبارہ اس گھر کا سراغ لگانا اور یہاں رہنے والوں سے پروفیسر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن ہو جاتا۔

دس منٹ بعد پھر فون کی گھنٹی بجی اور پروفیسر نے چائے پینے اور فون پر باتیں کرنے کے ساتھ میری نگرانی بھی جاری رکھی۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہی ہوگی مگر وہ جسمانی طور پر خاصا فٹ تھا۔ اس نے ریوالور کو اپنی دسترس میں رکھا تھا۔ ضرورت پڑنے پر کسی دشواری کے بغیر وہ مجھے شوٹ بھی کرسکتا تھا لیکن کیا وہ ایسا کرے گا؟ اپنے مہذب انداز گفتگو سے بے ضرر نظر آنے والا اور تاریخ پر سند رکھنے والا یہ پروفیسر ایک ایسے شخص کا معاون یا رفیق کار تھا جو خود مجرم تھا۔ مجرموں کا سرپرست تھا اور شاید جرائم پیشہ افراد کی ایک مافیا میں شامل تھا۔ اس سے کسی رعایت کی توقع رکھنا بے وقوفی کی بات تھی۔ اس وقت نہ وہ تاریخ کا استاد تھا اور نہ میں صحافی۔ نہ وہ ایڈیٹس کا خیال رکھنے والا تھا اور نہ میں کوئی محترم خاتون۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور یہی رشتہ سب سے اہم تھا۔

پروفیسر نے زیادہ تر گفتگو یک طرفہ کی۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہا یا سر ہلا کے "میں سمجھ گیا" اور "ٹھیک ہے" کہتا رہا۔ میں نے اتنی دیر میں غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار پر مشہور مصور ایف ایم حسین کی گھوڑوں والی پینٹنگ تھی اور بخیل ہونے کی وجہ سے وہ یقیناً قیمتی تھی اور صاحب خانہ کے اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کرتی تھی۔ تین دوسری تصاویر میں سے ایک تجریدی تھی اور میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ باقی دو میں خوبصورت مناظر تھے۔ ایک بہت پرانے فریم میں کوئی لڑکی دلہن بنی لاج کا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے کھڑی تھی اور پگڑی والا دولہا سہرا بنا کے بڑی فاتحانہ شان سے مسکرا رہا تھا۔ شاید صاحب خانہ کی پچیس تیس سال پرانی یادوں کا نقش تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم کی آرائش میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی جس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوتی۔

فون رکھنے کے بعد پروفیسر نے کہا "سب انتظام ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے، چلیں؟"

وہ مسکرایا "ابھی ایک گاڑی تمہیں لینے آئے گی۔ تم بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہی ہو۔"

میں نے کہا "ہاں مگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ویسے بھی اندر سے دیکھ کے کچھ پتا نہیں چلتا کہ میں کہاں ہوں اور کس کے گھر میں ہوں۔"

وہ بولا "اگر خود مجھے اطمینان نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں یہاں نہ لاتا۔"

میں نے کہا "آوازوں سے یہ ایک عام گھر لگتا ہے۔ یہ بچہ بھی عام سا بچہ تھا۔ اس کی قوت مشاہدہ افسوس ناک تھی۔ مجھے اپنی صورت میں جوہی چاؤلہ کی کوئی مشابہت نظر نہیں آئی۔"

"اسے نظر آتی ہوگی۔ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اگر میں فرار ہونے کی یا تم پر حملہ کرنے کی کوشش کروں تو کیا واقعی تم گولی مارو گے مجھے۔ فائر کی آواز سے اور قتل سے گھر والے دہشت زدہ نہیں ہوں گے؟"

"یہ گھر چوہدری رب نواز کے ایک کزن کا ہے۔ وہ بعض معاملات میں اس کا دست راست ہے۔ یہاں ایسی ہی کوٹھیاں ہیں، دس دس، بیس بیس کنال کی چنانچہ ایک گھر سے فائر کی آواز دوسرے گھر تک نہیں جاتی۔ مجھے رب نواز نے بتایا کہ اس کوٹھی کے باغ میں وہ تین بندے دفنا چکا ہے۔ ان میں ایک تمہاری بھی تھی۔"

"پھر تم اسے گھر کیوں کہتے ہو، یہ تو قبرستان ہے۔"

باہر سے ایک گاڑی نے ہارن دیا پھر گاڑی کا انجن غرا کے بند ہوا اور کسی نے گاڑی کا دروازہ دھڑ سے مارا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک ایسا شخص نمودار ہوا جو اپنے لوفر اور بدمعاش ہونے کا اشتہار بنا ہوا تھا اور صاف نظر آتا تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کی جسم سے چپکی ہوئی بنیان ٹائپ شرٹ پہن رکھی تھی جس کے کالر اور جیب زرد رنگ کے

تھے۔ آدھی آستینوں سے اس کے بازو کے مسل بہت نمایاں تھے۔ نیلی جینز کی پتلون کے گھٹنوں پر چمڑے کے پیوند لگائے گئے تھے اور اس نے ٹخنوں سے اوپر تک کے جوگرز پہن رکھے تھے۔

وہ اپنے بازو سمیٹ کر دروازے کے فریم میں ترچھا کھڑا ہو گیا اور چیونگم چبانے لگا "خیر ہووے جناب دی۔"

پروفیسر نے کہا "تم ہی باز ہو۔"

"اوجی، اپنا نام تو ابے نے شہباز رکھا تھا لیکن سب باز کہتے ہیں اور میں ہوں بھی باز۔ شکرا، ایسے جھپٹنے والا۔" اس نے ہوا میں جھپٹا مار کے بتایا اور اپنے ایک بازو کو سامنے کیا جس پر بڑے اناڑی پن سے ایک باز گودا گیا تھا۔

پروفیسر نے ناگواری سے سر ہلایا "یعنی یہ تمہارا شناختی کارڈ ہے؟ خیر، کیا تم اکیلے ہی آئے ہو؟"

"نہیں جی، گاڑی بھی ساتھ ہے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ گاڑی میں انجن ہے۔ پہیے چار ایک ساتھ چلتے ہیں یا الگ الگ۔" وہ پُرمسخراندازمیں بولا۔

پروفیسر ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور میں نے بڑی حیرت سے اس کی صورت کو بدلتے دیکھا۔ باز کی بات میں بے عزتی محسوس کرنے والا پروفیسر ایک دم طیش میں آگیا تھا اور غصے کے تاثرات نے اس کے چہرے سے نرمی اور شائستگی کے آثار مٹا دیے تھے۔ اس کے چہرے پر سختی اور سفاکی آگئی تھی۔

اس نے کہا "باز۔ میرے قریب آؤ، یہاں۔"

باز نے بھی رویے کی اس تبدیلی کو نوٹ کیا تھا مگر وہ بے خوفی سے چیونگم چباتا ہوا آگے آگیا "جیسا حکم سرجی!"

بڑی پھرتی اور ناقابل یقین برق رفتاری سے پروفیسر نے اس کے منہ پر باکسنگ کا ایک پنچ مارا اور دوسرا اس کے پیٹ میں۔ دوسرے لمحے وہ کڑیل جوان جسے اپنی بدمعاشی کی طاقت پر ناز تھا، کراہ کے جھکا اور فرش پر لوٹنے لگا۔

"اب جواب دو میرے سوال کا؟" پروفیسر نے کہا "گاڑی میں انجن ہے یا نہیں؟ بولو۔۔۔" اس نے باز کو ایک ٹھوکر ماری۔

"اوئے بے۔۔۔ ہے پاگل خانے۔" وہ تڑپ کے بولا "مارتا کیوں ہے؟"

"گڈ۔۔۔ اور اس کے چاروں پہیے ایک ساتھ چلتے ہیں یا الگ الگ؟ جلدی بولو۔"

پروفیسر نے اس کی پسلیوں میں ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ وہ پھر تڑپ کے پلٹا "ہائے میں مرگیا۔۔۔ تیری تو میں۔۔۔ چھوڑوں گا نہیں میں تجھے گنجے۔۔۔ میرا نام۔۔۔ باز ہے۔۔۔ شکرا۔"

پروفیسر نے ریوالور اٹھا کے اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا "تم جیسے کتے کے پلے جو بھونکنا بھی نہیں جانتے، مجھے کاٹنے کی کوشش کریں تو میں ان کے پیدا کرنے والوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔"

میں نے چلا کے کہا "پروفیسر۔ ہوش میں آؤ، یہ بے وقوف ہے۔"

پروفیسر میری طرف دیکھ کے مسکرایا "ایسے ہی عقل آتی ہے بے وقوفوں کو۔"

باز اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریوالور کی نال میں جھانک رہا تھا۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے گھگیا کے کچھ کہا۔

"میں دس تک گنوں گا، اتنی دیر میں میرے سوال کا جواب دے کر زندہ رہ سکتے ہو تم۔ ورنہ یہاں ہم پہلے بھی تین بندے گاڑ چکے ہیں۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے مس شبنم کو یہی بتا رہا تھا۔ یہ بڑی نامور صحافی ہیں۔"

یہ بڑی عجیب مضحکہ خیز اور خطرناک صورت حال ہو گئی تھی۔ خود کو بدمعاش سمجھنے والا ایک جوان آدمی تاریخ کے ایک بوڑھے پروفیسر سے مار کھا گیا تھا اور جتنی بے وقوفی اس جاہل نوجوان نے کی تھی، اس سے زیادہ بے وقوفی کا مظاہرہ وہ پڑھا لکھا اور عمر رسیدہ شخص کر رہا تھا۔ دونوں کا غرور قابل صد ملامت تھا مگر میرے لیے ان کو سمجھانا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

جب پروفیسر نے گنتی شروع کی تو میں واقعی کانپنے لگی تھی۔ میرے لیے یہ فرض کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ اگر وہ خود سر نوجوان صورت حال کو نہ سمجھا تو پروفیسر سچ مچ اسے میرے سامنے گولی مار دے گا اور یہاں اس کا جسم اپنے ہی خون میں غلطاں نظر آئے گا۔ بے سبب ایک آدمی کی جان کا زیاں ہوگا۔ وہ دشمنی میں ہی پولیس مقابلے میں مارا جاتا تو یہ اس کی زندگی کا ایک ناگزیر اور سمجھ میں آنے والا انجام ہوتا۔

باز نے رک رک کے کہا "آہو جی۔ چاروں پہیے ہیں۔۔۔ اور ایک ساتھ چلتے ہیں۔"

میں نے سکون کا سانس لے کر آنکھیں کھولیں اور افسوس سے سر ہلایا "یہ کیا ہے پروفیسر؟"

"اسے ہم ڈسپلن کہتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے باز کو اٹھنے کا اشارہ کیا "اس کے بغیر کوئی آرگنائزیشن نہیں چلتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باز کراہتا ہوا اٹھا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کے اندر کی ساری سرکشی بظاہر ختم ہو گئی تھی مگر میں اندازہ کر سکتی تھی کہ اندر ہی اندر وہی زخمی سانپ کی طرح طیش سے بل کھا رہا ہوگا۔ اس کی حیثیت ایک ادنیٰ کارکن کی تھی جو باس کی خوشنودی کے بجائے ناراضی کو دعوت دیں تو اعتماد کے مراحل طے کرنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر نے میری آنکھوں پر ایک پٹی باندھی "خدا حافظ فی الحال لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔"

میں نے سہلایا "I HOPE NOT۔"

وہ بولا "تم باز آنے والی لڑکی نہیں ہو۔ ایک ناخوشگوار تجربہ تمہارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی دنیا سمٹ کر مزید چھوٹی ہو گئی ہے۔"

"ایک گلوبل ولیج!" میں نے کہا "کیا اس شاہین کے ساتھ صرف میں جاؤں گی۔"

وہ ہنسا "شاہین اپنی مرضی سے پرواز نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری سیف ڈیلیوری نہ کرے تو خود بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

مجھے گاڑی میں آگے بٹھایا گیا اور میری یہ امید بھی پوری نہ ہوئی کہ شاید چلتے وقت مجھے اس کوٹھی کا اور اس علاقے کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ گاڑی دس پندرہ منٹ چلتی رہی۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو گاڑی کے اندر والے سب ہینڈل غائب تھے۔ اس کا شیشہ نیچے کیا جا سکتا تھا اور نہ دروازہ اندر سے کھولا جا سکتا تھا۔ بالکل بند ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازوں کا شور بھی بہت کم ہو گیا تھا لیکن ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ پروفیسر نے اس گھر کے محل وقوع کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی مجھے ٹریفک کا احساس ہو گیا تھا۔ نہ وہ بیس کنال کی کوٹھی تھی اور نہ وہ کوئی سنسان علاقہ تھا۔ وہ کوئی عام سا گھر تھا اور کسی رونق والی سڑک سے بہت نزدیک۔

دس منٹ بعد میں نے باز سے کہا "یہ پروفیسر تو واقعی پاگل ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اسے حکم تھا کہ راستے میں مجھ سے بات نہ کرے۔

میں نے کہا "تم بھی پرلے درجے کے احمق ہو۔ خوا مخواہ اپنی جان سے جاتے۔ زندگی کی قدر کرنا سیکھو۔ مارے تو جاؤ گے تم کسی دن مگر خودکشی کیوں کرتے ہو وقت سے پہلے۔"

وہ بولا "آپ نصیحت مت کرو مجھے۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے لیکن افسوس تو ہوتا ہے جب تم جیسے گبھرو جوان ایسے دھندے میں پڑ کے جوانی میں ہی قبر آباد کرتے ہیں۔ کوئی ارمان نکلنے سے پہلے ہی پولیس کی یا اپنوں کی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ میں نے تو فاتحہ پڑھ لی تھی تم پر۔"

"وہ پاگل کا پتر مجھے ڈرا رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ گولی مار دے مجھے" وہ شیخی بگھارنے لگا "ایسا نہیں ہے کہ اپنا والی وارث کوئی نہیں۔"

"وہ تمہیں صورت سے نہیں پہچانتا تھا' تم نئے ہو؟"

اس نے کہا "آپ بے شک پٹی اتار دو۔"

میں نے پٹی اتار کے ادھر ادھر دیکھا۔ گاڑی اب داتا صاحبؒ کے سامنے سے انارکلی کی طرف جانے والی سڑک پر تھی "تم نے بہت پیسے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا ہوگا۔ نوکری ملتی نہیں اور چھوٹی موٹی نوکری میں کچھ ہوتا نہیں۔ ذمے داریوں کا بوجھ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلط کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار مگر مجھے اس کی صورت کے تاثرات سے اپنے سوالوں کا جواب مل رہا تھا۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا مگر بولتے ہوئے ڈرتا تھا۔ بالآخر اس نے اردو بازار کے سامنے گاڑی روک دی "اب آپ جا سکتی ہو۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ میرا نام یاد رکھنا۔ شبنم' کسی بھی اخبار کے دفتر سے تم مجھے فون کر سکتے ہو۔ کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بے خوف آ جانا۔"

اس نے باہر سے میرے لیے دروازہ کھولا اور کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے اردو بازار کو پیدل کراس کیا اور انارکلی میں آ گئی۔ اپنی آزادی کا احساس میرے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور گزرے ہوئے واقعات کسی ایک بھیانک خواب کی طرح ہو گئے تھے جن کی یاد آنکھ کھل جانے کے بعد بھی ڈراتی رہے۔ یہاں سے آزاد صاحب کے آفس کا فاصلہ دو کلومیٹر سے بھی کم تھا۔ میرا دل پیدل چل کے زندگی کے اس حسن کے نظارے سے پھر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو صرف زندہ رہنے والوں کے لیے تھا اور میں زندگی کی آخری سرحد پر موت کو گلے لگا کے لوٹی تھی تو میرے لیے اس کی قدر بڑھ گئی تھی مگر مجھے تم سے اور ان سب سے ملنے کی جلدی تھی جو میرے لیے بے تابی سے چشم براہ تھے چنانچہ میں نے ایک رکشا پکڑ لیا۔

پانچ منٹ بعد میں آزاد صاحب کے آفس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ میرے آفس میں قدم رکھتے ہی شور مچ گیا

"آپ آ گئیں مس شبنم!" کاتب جواہر رقم لال دین نے چلا کے کہا۔

آزاد صاحب ہڑبڑا کے اٹھے اور جلدی میں میز پر چڑھ کے کودتے ہوئے میری طرف لپکے۔ فرط جذبات سے میں روپڑی۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا کے مجھے بار بار چوما اور مسلسل پوچھتے رہے "بھئی' یہ تم ہی ہو نا بقلم خود گویا اور ظاہر و باطن سے بقید حیات اور صحیح سالم بھی دکھائی دیتی ہو۔ بخدا' ہم تمہیں مرحوم و مغفور فرض کرتے تھے تو وفات پا جاتے تھے گویا۔"

میں نے انہیں تسلی دی "میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ کی دعا سے۔"

"کس قدر مسرت کا شکر گزاری کا وہ ہے۔ مقام گویا۔ بخدا یہ انکشاف ہم پر ہوا پہلی بار گویا کہ یہ جو صحافت وغیرہ ہے' یہ تو بزبان شاعر' دل کے بہلانے کو غالب یہی کام اچھا ہے' ورنہ مقصد حیات تو کچھ نہیں تمہارے سوا۔"

اور اس وقت جب میں آزاد صاحب کی محبت کے اس جذباتی مظاہرے پر شرمندہ بھی تھی کیونکہ میں نے اس محبت کی قدر کبھی نہیں کی تھی۔ میں نے ملکانی کو دیکھا۔ وہ دکھ اور پریشانی کی تصویر بنی بیٹھی تھی اور اس کی ماتا آنکھوں سے آنسو بن کے بہہ رہی تھی۔ وہاں وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ لالی آئی تھی۔ اس کی محافظ بن کے یا اس کے حکم کی غلامی کے لیے۔ اب میں جان گئی تھی کہ اس انسان نما حیوانی مخلوق کے وجود کا مطلب اور مقصد کیا ہے۔ اس کے باوجود اپنے ساتھ اس کے وحشیانہ سلوک کو یاد کر کے میرا دل نفرت کی آگ میں جلنے لگا۔

میں نے کہا "ملکانی۔ مجھے تمہارا شکریہ ادا ضرور کرنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے میری جان اور آبرو محفوظ رہی۔"

"چھوڑو شکریے کو۔ مجھے میرا دلنواز دے دو" وہ بولی اور پھر آزاد صاحب سے مخاطب ہو گئی "اب کس بات کی دیر ہے جی!"

آزاد صاحب نے فوراً فون اٹھایا "محترم خاتون۔ قول مرداں جان دارد۔ مطلب یہ کہ ہمیں بقول فلمی شاعر۔ جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا۔ ہاں بھئی ہیلو اور وعلیکم ہیلو۔ ایک مژدۂ جاں فزا گویا پہلے تو تھا جس کا انتظار وہ شکار آ گیا۔ ہاں میاں' آنا کہاں تھا۔ جتنے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔ تو کھوتے کو بھی اب پروانہ راہداری دو گویا۔ وہ بھی اپنے اصطبل پہنچ کے اس..... آلۂ گفت و شنید پر اطلاع دے۔"

قصہ مختصر پندرہ منٹ بعد دلنواز کا فون آ گیا اور اس نے ماں کو بتایا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ پندرہ منٹ اس نے سخت کشیدگی اور اضطراب کی کیفیت میں گزارے تھے۔ فون ریسیو کرتے ہی وہ بدحواسی میں بھاگی۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے اخبار کے دفتر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور کچھ بھی کھانے پینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھوک ہڑتال پر تھی۔ اسے شوہر کے وعدے اور آزاد صاحب کی کسی یقین دہانی پر اعتبار نہیں تھا۔

اس وقت میری طرح اسے بھی علم نہیں تھا کہ مجبور ہو کے رب نواز نے ایک چال واپس لے لی ہے مگر دوسری چال سے ہاری ہوئی بازی کو پھر جیت لیا ہے۔ مجھے گھر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہیں دھوکے سے اسپتال بلایا گیا تھا اور تم بے وقوفی میں تصدیق کیے بنا دوڑے چلے گئے اور سونی کے ساتھ پکڑے گئے۔"

○☆○

شبنم کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ میری بانہوں کے حلقے میں پرسکون ہو گئی تھی۔ اس خاموشی میں ہمارے جذبات کی ترجمانی ہمارے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی۔

میں نے کہا "جان۔ میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ تم سے بھی اور سونی سے بھی۔"

"تم کیوں قصوروار سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟"

"یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میری غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے وہ تمہیں میری نظروں کے سامنے سے اٹھا لے گئے اور مجھے کچھ پتا نہ چلا۔ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا پھر سونی نے وہ کام کر دکھایا جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رب نواز کے بیٹے کو اس کے گھر سے نکال لانے کا سارا کارنامہ اس کی پلاننگ اور اس کی ہمت کا نتیجہ تھا مگر اس کے بدلے میں سونی کو کیا ملا؟ میں اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ وہ بھی میری کوتاہی کی سزا بھگت رہی ہے۔"

شبنم نے میرے سینے پر سر رکھ کے کہا "اسے غلطی نہیں کہا جا سکتا۔"

"وہ میری غلطی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فرید نے تو کہا تھا کہ اسپتال سے تصدیق کر لینی چاہیے۔ میں نے اس کے مشورے کو اہمیت نہیں دی۔ وہاں مجھے اکیلے جانا چاہیے تھا۔ سونی نے میرا ساتھ دیا' آج رب نواز کی نظر میں وہی اصل مجرم ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ بھی سونی کے خلاف لکھوائی ہے۔ بس کو آگ لگانے کی ایف آئی آر بھی سونی کے خلاف درج کرائی گئی ہے۔"

"دیکھا جائے تو میری رہائی اسی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملکانی کو بیٹے کی محبت نے مجبور کردیا تھا کہ وہ شوہر کے خلاف کھڑی ہوگئی۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتی تو پتا نہیں وہ انسان نما جانور میرا کیا حال کرتے" اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔

میں نے اسے اپنے قریب کرلیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ ورنہ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔"

شبنم نے گھڑی کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے کہ تم کو آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے اسے نہیں چھوڑا "مجھے بہت آرام مل رہا ہے ایسے۔"

وہ مسکرائی "کھانا کھالو' پھر دوا کھا کے سوجاؤ۔"

میں نے کہا "اوہ۔ تین بج گئے۔ ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔"

وہ بولی "رخشی تو شاید وہیں رہے گی' سونی کے پاس۔"

"فرید عباسی بھی غائب ہے" میں نے کہا "ہائی کورٹ کا وقت تو ختم ہوگیا۔ اسے آجانا چاہیے۔"

فرید نے کمرے میں جھانک کر کہا "میں آگیا۔ اب اندر کیسے آؤں۔ تمہیں تو نہیں مگر مجھے شرم آتی ہے۔"

شبنم ہڑبڑا کے اٹھی اور بھاگ گئی "میں کھانے کا انتظام کروں۔"

فرید ہنسا اور میرے قریب بیٹھ گیا "تمہارا حال تو بہت اچھا ہے۔ میں نے دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "قانونی مسائل کا کیا حال ہے؟"

وہ کرسی پر نیم دراز ہوگیا "رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری ہوگئی۔"

میں نے کہا "وہ پیش ہوا تھا؟"

"پیش ہوئے بغیر ساعت کیسے ہوتی۔ دس لاکھ اس کے بیٹے نے عدالت میں جمع کرادیے۔ وہ ایک کروڑ لے کر آیا تھا۔ اس کی ماں ساتھ تھی۔ اس کا کیس آخری تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کا ایک ماتحت ملکانی کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس نے درخواست کی کہ میں مخالفت نہ کروں تو سرکاری وکیل بھی ضمانت کے خلاف نہیں جائے گا۔"

"کچھ مک مکا ہوگیا تھا؟"

"وہ تو ظاہر ہے۔ میں نے بھی پوچھا کہ مخالفت نہ کرنے کا کیا ملا ہے تمہیں؟ اس پر ملکانی بول پڑی کہ تمہیں کچھ چاہیے تو بتادو۔ جب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ جائے واردات پر ملک صاحب کی اور سونی کی یا تمہاری موجودگی ظاہر نہیں کی جائے گی تو پھر اب ملک صاحب کو کیا ان معاملات میں ملوث کیا جارہا ہے' جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

"یہ ملکانی کہتی ہے؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ خاتون تعلق سے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ وہ جگہ جہاں سے پولیس نے کانسٹیبل شیر خان اور ایک نامعلوم شخص کی لاشیں اٹھائی تھیں۔ ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔"

"وہ شخص نامعلوم کیسے ہوگیا جسے گولی ماردی گئی تھی۔ وہ رب نواز کا ملازم تھا" میں نے کہا۔

"میں نے بھی یہ نکتہ اٹھایا تھا مگر وکیل صفائی نے کہا کہ اس کی شناخت ابھی تک نہیں ہوئی۔ پولیس نے رب نواز کے سب ملازمین سے معلوم کرلیا ہے۔ کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ وکیل استغاثہ کچھ جانتے ہیں تو عدالت کو بتادیں۔ میں نے کہا کہ وہ اتنا ہی نامعلوم شخص تھا تو وہاں کیا کررہا تھا۔ سرکاری وکیل نے کہا کہ شاید قضا اسے وہاں لے گئی تھی۔ وہ کانسٹیبل شیر خان کے ساتھ گیا ہوگا۔ اب یہ تو شیر خان ہی بتا سکتا تھا کہ وہ خود وہاں کیا لینے گیا تھا اور اس کے ساتھ وہ اجنبی کون تھا۔ پولیس تفتیش کررہی ہے اور زیر حراست مرغی خانے کے دو ملازمین نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ مجسٹریٹ نے ان کا چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ دیا ہے۔ اس عرصے میں سب معلوم ہوجائے گا لیکن ابھی عدالت کے سامنے کسی ملزم کی درخواست ضمانت نہیں ہے۔ ملک رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کا معاملہ ہے جو دہرے قتل کی اس واردات کے وقت جائے واردات سے پونے دو سو میل دور راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر میں موجود تھے۔"

"اس کی کوئی بہن بھی ہے؟"

"ہاں۔ وہ ایک اسکول کی مالک اور پرنسپل ہے۔ اس کا شوہر ایک ڈاکٹر ہے۔ انہوں نے بھی گواہی دی کہ رب نواز گزشتہ رات ان سے ملنے آگیا تھا اور وہیں مقیم تھا۔ وہ رات کو واپس لاہور گیا تھا۔"

"انہوں نے حلف بھی اٹھایا ہوگا دستور کے مطابق؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو سب ہی اٹھاتے ہیں۔ جھوٹے بھی اور سچے بھی۔ رب نواز کے وکیل نے کہا کہ پولیس اس کیس میں خواہ مخواہ رب نواز کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ میرا موکل اسمبلی کا ممبر رہا ہے اور آئندہ بھی اپنے حلقے سے انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ گرفتاری سے اس کی نیک نامی پر برا اثر پڑے گا اور اس کا سیاسی مستقبل بری طرح متاثر ہوگا۔

جائے واردات سے رب نواز کے ریوالور کا ملنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ قتل اس نے کیا یا اس کے کہنے پر ہوا۔ خیر' عدالت نے ضمانت عبوری طور پر دو دن کے لیے منظور کی ہے۔ اس کی توثیق جمعرات کو ہوگی۔"

میں نے کہا "گرفتار ہونے والے دونوں ملازموں نے اپنا جرم مان لیا ہے۔"

"یہ تو طے تھا۔"

"اسٹوری کیا ہے ان کی؟" میں نے پوچھا۔

شبنم نے دروازے سے اعلان کیا "کھانا لگادیا گیا ہے۔ آجاؤ۔"

فرید نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "یار' کھانا یہاں نہیں آسکتا؟"

وہ بولی "پہلے کہتے تو آجاتا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا' جلدی سے آجاؤ۔"

باقی بات کھانے کے دوران میں ہوئی "ایک ملازم نے بیان دیا ہے کہ اس نے شیر خان سے بہن کی شادی کے موقع پر دس ہزار روپے ادھار لیے تھے جو وہ کسی وجہ سے واپس کرنے میں ناکام رہا۔ شیر خان اسے کئی بار دھمکی دے چکا تھا کہ وہ اسے کسی مقدمے میں ملوث کرادے گا۔ تاہم رب نواز کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کرسکا۔ اس دن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ آیا اور پہلے اسے گالیاں دیتا رہا پھر اس کے ساتھ آنے والے نے بھی اشتعال انگیزی کی۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو ناقابل برداشت تھیں۔ غصے میں ملزم نے اسے ریوالور نکال کے گولی ماردی۔ یہ ملک رب نواز کا ریوالور تھا جو دو دن پہلے وہ مرغی خانے میں بھول گیا تھا۔ ملزم کا ارادہ تھا کہ ملک صاحب راولپنڈی سے واپس آئیں گے تو ریوالور ان کے حوالے کردے گا۔ کانسٹیبل شیر خان کے بارے میں دوسرے نے کہا کہ وہ ملزم پر حملہ آور ہوا تھا۔ ملزم نے اپنا دفاع کیا اور اسے دھکا دیا تو وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ تصادم سے اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ یہ ایک غیر ارادی قتل تھا اور اپنے دفاع میں کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بوگس اسٹوری تو بہت کمزور ہے۔"

"ہاں لیکن ان کے بیان نے فی الحال رب نواز کو بچالیا ہے" فرید بولا "دراصل پھانسا پڑا تو رب نواز کو سب سے پہلے اپنی فکر لاحق ہوئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کا نام جائے واردات سے گرفتار ہونے والوں میں آتا تو اس کا سیاسی مستقبل تباہ ہوجاتا۔"

"اس ملک میں آج تک کسی کا سیاسی مستقبل تباہ نہیں ہوا۔ کسی پر کوئی الزام ثابت بھی نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ معاملہ مختلف تھا۔ اس میں شبنم کے ملوث ہونے سے پولیس ملک رب نواز کا دشمن ہوجاتا۔ اسے جیل یقیناً ہوتی۔ شبنم خود وہاں موجود تھی اس لیے یہ بھی ناممکن ہوگیا تھا کہ ملک رب نواز کا نام گرفتار ہونے والوں میں شامل نہ ہو۔"

میں نے کہا "اصل کام تو سونی نے کیا۔"

"یہ تو ہے۔ رب نواز کا بیٹا ہمارے قبضے میں نہ ہوتا تو ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے" فرید بولا۔

"پھر ملک مجھے چھوڑنے کا رسک بھی نہ لیتا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے غائب کردیتا" شبنم نے کہا "یوم حشر سے پہلے کسی کو میرا سراغ نہ ملتا۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہو۔ بقول شاعر۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ لیتے کہیں نہ کہیں۔"

"چاہنے والے تو خود گرفتار ہوگئے تھے" وہ ہنسی "گئے تھے مجھے ڈھونڈنے' خود لاپتا ہوگئے۔"

فرید نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا اور اصولاً ہم خود بھی قانون شکنی کے مرتکب ہوئے لیکن اس معاشرے میں عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی مجبوری تھی کہ میں نے ایک سودا وہاں کیا۔ سونی کو بچانے کے لیے رب نواز کو جانے دیا اور دوسری بار دلنواز کے بدلے میں شبنم کی رہائی کا سودا کیا۔"

میں نے کہا "ایسا صرف قانون کی بے بسی اور کمزوری کی وجہ سے ہوا کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہوگئے۔ یہاں قانون طاقتور کا ساتھ دیتا ہے۔ شبنم کو اغوا کرنے والوں کو کم سے کم تین افراد نے دیکھا تھا مگر مجھے معلوم ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک بھی گواہ سامنے نہ آتا۔ وہ حلف اٹھا کے جھوٹ بول دیتے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ شبنم کا کہنا ٹھیک ہے۔ ضابطے کے مطابق کارروائی کرکے پولیس کبھی شبنم کو برآمد نہیں کرسکتی تھی۔"

"اب ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ سونی کو بچانے کا ہے۔ اس کے خلاف بڑے سنگین جرائم میں ملوث ہونے کے الزامات ہیں۔ بڑے سے بڑے وکیلوں کا پینل بھی عدالت میں اس کی بے گناہی ثابت نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "عدالتی معاملات تو بعد میں آئیں گے۔ گرفتاری کے بعد پولیس تفتیش کے لیے اس کا ریمانڈ لیتی رہے گی۔ چودہ چودہ دن کے لیے اس میں توسیع ہوتی جائے گی اور اس دوران میں جو کچھ ہوگا' وہ ہم سب سمجھتے ہیں۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ضمانت قبل از گرفتاری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہائی کورٹ بھی اسے ضمانت پر رہا نہیں کرے گی۔"

فرید نے کہا "ویٹ از رائٹ۔ اصل بات یہ بھی ہے کہ سونی پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں' وہ سب جرم اس نے واقعی کیے ہیں۔ بس کو اس نے واقعی آگ لگائی تھی۔ دلنواز کو اس نے واقعی اغوا کیا تھا۔ گھر میں گھس کے اور کانسٹیبل شیر خان کی گردن اس نے واقعی توڑی تھی۔"

"اور میری بدقسمتی کہ ہر بار میں ہی چشم دید گواہ تھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جن حالات میں سونی کو یہ سب کرنا پڑا۔۔۔" شبنم بولی۔

فرید نے اس کی بات کاٹ دی "دیکھو' حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں رعایت کرنا یا سزا نہ دینا عدالت کے اختیار میں ہے لیکن یہاں تو خود ہم نے آپس میں طے کرلیا کہ اچھا جاؤ' ہم نے تمہارا جرم معاف کیا۔ تم ہمارا جرم معاف کرو اور بھول جاؤ اس بات کو۔ یہ تو فوجداری مقدمات ہیں جن میں عدالت کے باہر ہمارا تصفیہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

میں نے چڑ کے کہا "پھر کیا کریں وکیل صاحب۔ اعتراف جرم کے لیے خود ہی عدالت میں پیش ہو جائیں؟"

فرید نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے دیکھا ہے اور بھگتا ہے یہاں کے نظام انصاف کو۔ میں خود پولیس میں تھا۔ مقدمات کیسے بنائے اور بگاڑے جاتے ہیں۔ کیسے دبائے جاتے ہیں اور کیسے کھڑے کیے جاتے ہیں' مجھے تو انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے جج کی بے بسی پر ترس آتا تھا جو جانتا ہے کہ سچ کیا ہے مگر جھوٹ کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیونکہ ثبوت شہادت اور گواہی سب جھوٹ ہی کو سچ بنا دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "انہی خرابیوں نے لاقانونیت کو ایک ضرورت بنا دیا ہے۔ لوگ جھوٹ کو جائز سمجھنے لگے ہیں اور بے حس' خود غرض اور بے رحم بن گئے ہیں۔ طاقت کے قانون نے معاشرے کو جنگل بنا دیا ہے۔"

تیسرے پہر اسپتال سے رئیس نے فون کیا۔ وہ شبنم سے میری خیریت پوچھنا چاہتا تھا "کیا حال ہے تمہارے بیمار کا؟"

شبنم نے کہا "رخشی تو خیر تیمارداری کر رہی ہے' تم کیا کر رہے ہو وہاں؟"

"بہت سے کام ایسے ہیں جو رخشی نہیں کرسکتی۔"

"مثلاً اس کی دلداری۔" شبنم نے کہا "بہت امپریس ہوگی وہ تمہاری خدمت گزاری سے۔"

وہ خفا ہونے لگا "قسم اللہ کی۔ تمہیں کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔ آ کے دیکھو خود' کیا حالت ہوگئی ہے اس کی۔"

فرید نے کہا "ہم ابھی آئے ہیں۔ میں کورٹ گیا ہوا تھا۔"

"بس ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہیں" شبنم نے کہا "تم نے کھانا کھایا؟"

"کھانے کے لیے یہاں کون ہے پوچھنے والا پھر مصروفیت میں۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ تیرا کوئی کام نہیں تھا وہاں۔ تمر اور کمال فاروقی کے ساتھ رخشی تھی۔ تو وہاں جا کے کیوں بیٹھ گیا ہے؟ تمر خوب خاطر مدارات کر رہی ہوگی۔"

رئیس ہنسنے لگا "واقعی یار۔ وہ بے چاری تو مستقل خدمت میں لگی ہے ہماری۔"

ہم ہینڈ فری فون پر ایک ساتھ سب گفتگو سن رہے تھے اور دوسری طرف رئیس کو بھی ہم سب کی آواز پہنچ رہی تھی لیکن رخشی کی فرید سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ فرید نے پوچھا تو رئیس نے ریسیور اسے تھما دیا۔

"کمال نے ڈاکٹر عائشہ کو بلایا ہے" رخشی نے بتایا "وہ آنے ہی والی ہے۔"

میں نے کہا "کیا سونی جاگ رہی ہے؟"

"نہیں مگر نیند میں وہ بہت بولتی ہے" رخشی نے کہا۔

"کیا بولتی ہے؟" فرید نے کہا۔

"میں کیا بتاؤں کیا بولتی ہے۔ گالیاں بکتی ہے' روتی ہے اور ایک پرابلم یہ ہے کہ اس کی دیکھ بھال چندا نے اپنے ذمے لے لی ہے۔"

فرید نے کہا "اس میں پرابلم کیا ہے؟"

"یہ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ وہ تو میرے لیے بھی ایک NUISENSE بن گئی ہے۔ عجیب باتیں کرتی ہے مجھ سے۔ خاص طور پر اس وقت جب رئیس نہیں ہوتا۔ کل بھی رات کے وقت آئی تھی۔ وہ پھر آ رہی ہے" رخشی نے فون بند کر دیا۔

فرید کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا "رخشی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

شبنم نے کہا "اس نے فارسی تو نہیں بولی تھی۔"

"آخر چندا اسے کیوں پریشان کر رہی ہے؟ اور وہ کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ میرا خیال ہے کہ اب جانا ہی پڑے گا"

فرید بولا۔

میں نے کہا "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

شبنم نے مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی "ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔ کیا ہے میری حالت' چل پھر رہا ہوں۔ اتنی دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

گھنٹے بعد ہم اسپتال کے اس کمرے کے سامنے کھڑے تھے جہاں سونی تھی۔ ڈاکٹر عائشہ کو وہاں آئے دس منٹ ہی ہوئے تھے اور وہ سونی کی کیس ہسٹری کے نوٹس لے رہی تھی۔ رئیس برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ رخشی کمرے کے بند دروازے کے سامنے برآمدے کی منڈیر پر جھکی باغ کو دیکھ رہی تھی لیکن ناراضی اور بیزاری کے جذبات اس کی صورت سے عیاں تھے۔

"بہتر ہے کہ آپ بھی اندر نہ جائیں" اس نے تلخی سے کہا۔

"کیوں؟ ڈاکٹر عائشہ سے میری بھی اچھی جان پہچان ہے" میں نے کہا۔

شبنم بولی "میں ان کی قابلیت کا چلتا پھرتا ثبوت ہوں۔"

رخشی نے کہا "آپ سے بہت زیادہ قابل خاتون اندر موجود ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اپنے مریض کی کیس ہسٹری ان سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا۔"

میں نے کہا "کیا تم چندا کی بات کر رہی ہو؟"

"اور کون نکال سکتا تھا مجھے کمرے سے باہر" رخشی پھٹ پڑی "اس نے کہا کہ نرس میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے مریضہ کو کیا ٹریٹ منٹ دیا جا چکا ہے اور اس کے نروس بریک ڈاؤن کے SYMPTOM کیا ہیں۔"

شبنم نے حیرانی سے کہا "اس نے تمہیں نکال دیا کمرے سے؟"

"ہاں۔ رئیس کو بھی اور مجھے بھی۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ اتنے لوگوں کا یہاں موجود رہنا قطعی غیر ضروری ہے۔ نرس جو مریض کو اٹینڈ کر رہی ہے' وہ سب بتا سکتی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ ڈاکٹر صاحبہ' بہت سی باتیں ان کو معلوم نہیں کیونکہ میں سونی کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ مگر اس نے پھر میری بات رد کر دی اور ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اچھا آپ کی بات بھی سن لوں گی میں بعد میں۔"

رئیس اب ہمارے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا "یار' پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟"

میں نے غصے سے کہا "مجھے تو اس وقت بھی اچھا نہیں لگا تھا جب وہ کمال فاروقی کے ساتھ آئی تھی۔ کس نے بلایا تھا اسے۔ ڈاکٹر تو آیا' وہ کوالی فائڈ نرس بھی نہیں ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "مجھے اس نے کہا کہ یہ ایک خاتون کا کیس ہے اور اول تو میں ہوں اٹینڈ کرنے کے لیے۔ ورنہ مس رخشندہ کافی ہیں۔ آپ گھر جائیں۔ قسم اللہ کی' غصہ تو بہت آیا تھا' لحاظ میں خاموش ہو گیا۔"

رخشی نے کہا "تمر بھی بہت عاجز ہے اس کے رویے سے مگر ڈاکٹر کمال فاروقی نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ ان کے بعد صرف چندا کی چلتی ہے بلکہ وہ تو بعض اوقات کمال فاروقی کی بھی نہیں سنتی۔ یہاں ایک عیسائی نرس ہے کوئی!"

"کوئن۔ وہ تو انسان کے روپ میں فرشتہ ہے فرشتہ" میں نے کہا۔

"واقعی' اس کا اخلاق اور کردار دیکھ کے تو آدمی کا دل چاہتا ہے اس کی عزت کرنے کو۔ اصل میں سارا انتظام تو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔ چندا زبردستی کی ایڈمنسٹریٹر بنی ہوئی ہے۔ پتا نہیں دوسری نرسیں اور ڈاکٹرز اسے کیسے برداشت کرتے ہیں" رخشی اس سے بہت خفا تھی۔

رئیس نے آہستہ سے کہا "پہلے تو ایسی نہیں تھی وہ۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ آخر اس کی شخصیت میں یہ ناپسندیدہ اطوار کیسے پیدا ہو گئے۔ وہ ایک نرم خو' خوش ذوق اور شوخ سی لڑکی تھی جسے ستار بجانے کا شوق تھا۔ وہ جو اؤ کرائے مجھ سے پہلے سیکھ چکی تھی اور میں نے خان جی کے بعد اس کے ساتھ پریکٹس سے مہارت حاصل کی تھی۔ وہ شاعری کی کتابیں پڑھتی تھی اور کسی حد تک خلوت پسند تھی۔ اس کا بیشتر وقت گھر کے اندر ہی گزرتا تھا۔

خان جی کی بیماری سے انتقال تک اس نے آزمائشوں کا ایک طویل زمانہ اکیلے رہ کے گزارا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب میں بھی اس کا ساتھ چھوڑ کے شاہ عالم بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی مصیبت اور سختی نہیں دیکھی تھی۔ ماں نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں خان اعظم نے دہری ذمے داریاں نبھاتے ہوئے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا حالانکہ رشتے میں وہ اس کے دادا تھے۔ کرنل خان جن کو ہم عزت سے خان اعظم اور پیار سے خان جی کہتے تھے' اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو بند رکھنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ چندا کا باپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون تھا اور کیا اس کا انتقال چندا کی ماں سے پہلے ہو چکا تھا یا کوئی اور بات تھی۔ خود چندا اس معاملے میں قطعی لاعلم بن جاتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ خان جی کی داستان ماضی کا کوئی تکلیف دہ واقعہ تھا۔ وہ اس کا ذکر کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ ان کا کوئی خاندان بھی نہیں تھا یا پھر وہ سب سے الگ ہو گئے تھے اور تمام رشتوں کو بھلا چکے تھے۔ میں نے ان کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی کے سب سے خطرناک دس برس بتائے تھے۔ اسے بلوغت کا دور یا ADOLESCENCE پیریڈ کہا جاتا ہے۔ عمر کے اس نازک دور میں صحیح راہنمائی نہ ملتی تو میرے جیسا لاوارث اور لاابالی شخص غلط صحبت اختیار کر لیتا اور کبھی وہ ناصر عظیم نہ بنتا جو میں آج ہوں لیکن ان دس برسوں میں سوائے ان لوگوں کے جو فوج میں کرنل خان کے ساتھی تھے اور بہت عرصہ ایک ساتھ گزار چکے تھے۔ کسی ایک اسٹیشن پر یا محاذ جنگ پر۔۔۔ کوئی اور ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ ان میں کرنل ہی نہیں ایسے بھی تھے جو جنرل بن گئے تھے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بہادری کے کارہائے نمایاں دکھانے پر ترقی اور تمغے پا چکے تھے۔ ان سے میں نے یہ ضرور سنا تھا کہ کرنل خان قبل از وقت ریٹائرمنٹ نہ لیتے تو ضرور جنرل کے عہدے تک پہنچتے۔ جنرل سے ان کی مراد میجر جنرل ہوتی تھی لیکن باہر کے لوگ کرنل خان کے گھریلو معاملات سے قطعی بے خبر تھے۔ میں صرف فرض کر سکتا تھا کہ کسی فیملی CRISIS نے انہیں اپنے شاندار کیریئر کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا ہوگا اور یہ بحران اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ ان پر چندا کی ذمے داری آ گئی تھی۔ اسے وہ کسی رشتے دار یا گورنس کے سپرد کر سکتے تو ترقی کی راہ کا روشن سفر ختم نہ کرتے۔ بہت سے ناپسندیدہ امکانات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے اکلوتے بیٹے نے ان کی مرضی کے خلاف یا انہیں رسوا کر کے کسی سے شادی کر لی تھی اور بعد میں ان دونوں کو کسی حادثاتی موت نے ہمیشہ کے لیے کرنل خان سے چھین لیا تھا۔ وہ ان کی چھوڑی ہوئی نشانی چندا کو اپنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ کہانی صرف میرے ذہن میں تھی۔ خان اعظم نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ چندا نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ میں اس موضوع پر ان سے بات کرنے کی غلطی نہ کروں۔ اس کے باوجود میں نے ایسا کیا تھا اور کرنل خان نے ایسے سخت لہجے میں مجھے آئندہ کوئی سوال کرنے سے منع کیا تھا کہ میری دوبارہ ہمت نہ پڑی۔

ان حالات میں چندا کے لیے زندگی کے دو ہی سہارے تھے جن پر اس کے اعتماد کی دیواریں کھڑی تھیں۔ ایک کرنل خان اور دوسرا ناصر عظیم۔ جب یکے بعد دیگرے دونوں سہارے اس سے چھن گئے تو اس کا ہر چیز پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ دونوں صدمات ناقابل برداشت تھے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ ناصر عظیم نے دولت اور شہرت کے لیے شاہ عالم بننا قبول کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اس نے کبھی میری مجبوری کے عذر کو قبول نہیں کیا اور یہی سمجھا کہ میں ایک خودغرض اور مطلب پرست شخص تھا۔ جب دنیا میں کہیں جائے پناہ نہ تھی تو اس نے دس سال کرنل خان کے گھر میں عیش و آرام سے گزارے اور وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو ایک کامیاب زندگی کی شاہراہ پر میرے لیے رخت سفر تھا۔ موقع ملتے ہی میں نے اس گھر کو اور چندا کی محبت کو ایسے ٹھکرا دیا جیسے چیز استعمال کرنے کے بعد آدمی خالی لفافے کو کہیں پھینک کے بھول جاتا ہے۔

مزید بدقسمتی یہ کہ اس بے اعتمادی کے دل آشوب دور میں کرنل خان کو بھی سفر آخرت کی سوجھی اور وہ چندا کو دنیا کے رحم و کرم پر لاوارث چھوڑ کے چل دیے۔ چندا کی شخصیت کی مضبوط نظر آنے والی چٹان ریت کی دیوار کی طرح بکھر گئی۔ رخشی کے ساتھ میرے "ازدواجی" مراسم اور شبنم کے ساتھ بدنام محبت کے سب افسانے اس نے سنے۔ وہ بے اعتمادی کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس نے میری صفائی کو میرا اعتراف جرم سمجھا۔ کسی وضاحت سے مطمئن نہ ہوئی اور ایک ردعمل کے طور پر مجھ سے نفرت کرنے لگی۔ اس نے صرف محبت دیکھی تھی، نفرت کے وائرس کے خلاف اس کے پاس کوئی دفاع نہ تھا۔ اس نفرت کا زہر اندر ہی اندر پھیلتا گیا۔ آج نفرت کا برص اس کی بدصورتی بن گیا تھا۔ اس داغ کے نمودار ہوتے ہی اس پر محبت کا مرہم رکھا جاتا تو یہ غائب ہو جاتا مگر اب اس نے چندا کے پورے وجود کو داغ دار کر دیا تھا۔

میں برآمدے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ رخشی بھی چندا کو پہلے سے جانتی تھی مگر اس نے چندا کا یہ زہریلا روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ شبنم اسے ایک فطری جذبۂ حسد و رقابت کا نتیجہ سمجھ رہی تھی اور بے چارہ رئیس نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ اسے چندا سے بھی ہمدردی تھی مگر سوئی کے لیے اس کے جذبات کچھ اور تھے۔ وہ رخشی یا شبنم کو بھی غلط نہیں کہہ سکتا تھا چنانچہ صرف پریشان ہو رہا تھا۔

بالآخر کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر عائشہ نے باہر آتے ہی پہلے شبنم کو اور پھر مجھے دیکھا "ہیلو۔ ہاؤ آر یو شبنم!"

شبنم نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ کی مہربانی سے میں

بالکل ٹھیک ہوں۔"

"واٹ اے سرپرائز!" عادت کے مطابق ڈاکٹر عائشہ نے اردو میں انگلش ملا کے بولنا شروع کیا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر میری طرف متوجہ ہو گئی "شبنم کے ساتھ تمہارا ہونا تو بالکل قدرتی بات ہے۔"

ڈاکٹر عائشہ کے پیچھے چندا کے چہرے پر ایک تاریک سایہ آ کے گزر گیا "یس ڈاکٹر۔ اب ایسا ہی ہے۔"

شبنم نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا مگر رخشی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور بولی "نرس نے آپ کو بتا دیا ہوگا ٹرینٹ منٹ کے بارے میں۔ اب آپ کی کیا رائے ہے' اسے یہاں رکھنا چاہیے؟"

"سب سے اچھا ہوگا اگر وہ میرے پاس ہو۔ چوبیس گھنٹے آبزرویشن میں رہے۔ ہیشنٹ تو بہت ہیلپ ملتی ہے۔"

چندا نے نرس کہنے کا برا منایا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا "ڈاکٹر عائشہ' غیر متعلقہ لوگوں سے بات کرنے سے بہتر ہوگا اگر آپ ڈاکٹر کمال فاروقی سے بات کریں۔"

"میں غیر متعلقہ شخص نہیں ہوں" رخشی نے ترشی سے کہا "سوئی میرے ساتھ رہتی ہے۔ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ میں ہی اس کے ساتھ آئی تھی۔"

چندا نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ یہ آج کل مسز فرید عباسی ہیں۔ مسٹر فرید عباسی کو پولیس سروس سے فارغ کر دیا گیا تھا۔"

فرید عباسی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم سے کس نے کہا ہے تعارف کرانے کے لیے؟"

"کیا میں نے کچھ غلط کہا؟" چندا نے ایک معصوم دفاعی انداز اختیار کیا "رخشندہ تمہاری بیوی بننے سے پہلے۔"

"اسٹاپ اٹ چندا!" میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کے پاس فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر عائشہ گھبرا گئی "دیکھیے' مجھے صرف مریض کے بارے میں بتائیے۔ اگر اور کچھ ہے بتانے کے لیے ورنہ میں چلتی ہوں۔"

میں نے اس کو نرمی سے اپنے ساتھ کھینچ لیا "چلیے' میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ دوں۔ یہ اسپتال میرے بچپن کے دوست کمال فاروقی کا ہے اس لیے میں سوئی کو یہاں لے آیا۔ یہ ایک بہت الجھا ہوا کیس ثابت ہوگا آپ کے لیے۔"

"IS THAT SO" وہ بولی "کسی وقت مجھے وہاں آ کے بتاؤ۔ میرے شوہر بھی تم سے مل کے ضرور خوش ہوں گے۔"

میں نے کہا "مجھے شرمندگی ہے کہ میں آپ سے دوبارہ ملنے نہیں آیا۔"

وہ بولی "شرمندگی کیسی۔ آج کل دنیا میں سب اتنے ہی مصروف ہیں۔ کام پڑتا ہے تو ملتے ہیں۔ ویسے تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے یونگ مین!"

میں نے کہا "حلیے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ ہم کیا ہیں اور کیا نظر آتے ہیں۔ دونوں باتیں ایک جیسی اہم ہوتی ہیں۔ ایک صاف ستھری سلجھی ہوئی شخصیت کا ظاہر بھی دلکش ہوتا ہے۔ میں تمہیں جانتی ہوں اس لیے سمجھتی ہوں کہ کوئی خاص وجہ ہوگی۔"

میں نے کہا "وجہ میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

اس نے کار کا دروازہ کھولا "تم نے میری CURIOUSITY کو بیدار کر دیا ہے۔ مجھے سوئی کے بارے میں بتانے کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "بہت جلد۔ آج شاید۔ ورنہ کل۔"

"میری مانو تو اسے بھی وہیں شفٹ کر دو۔ آخر پرابلم کیا ہے؟"

میں نے کہا "پرابلم ہے سیکیورٹی کی۔ اس کو کچھ ایسے لوگوں سے بھی بچا کے رکھنا ہے۔ جو اس کی موجودہ حالت کے ذمے دار ہیں اور پولیس سے بھی۔"

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہاں ہم کسی کو نہیں جانے دیتے۔ مکمل رازداری برت سکتے ہیں اور پرائیویسی فراہم کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ چلیں۔ میں اسے وہاں پہنچاتا ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شبنم کی طرف دیکھ کے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلایا "تم نے اس سویٹ ٹل گرل سے میرج کی یا نہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "میرج تو آخری چیز ہے۔"

"اوہ نو۔ میرج از دی فرسٹ تھنگ۔ باقی کام اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ محبت کا کھیل کب تک چل سکتا ہے؟" اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

جب میں واپس پہنچا تو صورت حالات مزید کشیدہ ہو چکی تھی۔ چندا وہاں نہیں تھی مگر رخشی غصے میں آتش فشاں بنی ہوئی تھی "ناصر' میں اس عورت کا دماغ درست کر دوں گی۔ بہت بے عزت کیا ہے اس نے مجھے۔"

فرید نے اسے کندھے پر تھپکی دی "رخشی۔ تم لڑنے آئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو یہاں؟"

"میں ایک اسپتال میں کسی نرس سے ذلیل ہونے بھی نہیں آئی۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم اب جاؤ۔ تم کل سے یہاں ہو۔"

فرید نے سر ہلایا "ڈاکٹر عائشہ کے لیے یہاں سونی کا علاج مسئلہ بن جائے گا۔"

"اس مسئلے کا حل خود اس نے بتادیا ہے۔ ہم سونی کو اس کے کلینک میں رکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"فرید۔ تم نے ہی کہا تھا کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی" رخشی بولی۔

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن ڈاکٹر عائشہ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہاں بھی کوئی سیکورٹی رسک نہیں ہوگا۔ ہمارے حسب منشا انتظامات ہوجائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ چندا نے اسے کیا بتایا ہے اور کیا نہیں؟"

"اسے معلوم کیا ہے جو وہ بتاتی" رخشی کی خفگی ابھی برقرار تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ سب جائیں۔ شبنم تم بھی۔ رئیس خان تم بھی۔ میں آتا ہوں کمال سے بات کرکے اور سونی کو شفٹ کراکے۔"

شبنم نے صاف انکار کردیا "میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہاری اپنی حالت ایسی نہیں ہے' تم کیسے شفٹ کروگے اسے۔"

میں نے سختی سے کہا "پلیز شبنم! میں سونی کو اپنے سر پر اٹھا کے نہیں لے جاؤں گا۔ وہ ایمبولینس میں جائے گی اور میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کمال فاروقی کے ساتھ ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

شبنم نے کہا "صاف کہو نا کہ میرے سامنے تم چندا سے بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"جب تم سمجھتی ہو تو پھر ضد کیوں کرتی ہو؟"

"اوکے۔ میں جارہی ہوں مگر ڈاکٹر عائشہ کے کلینک۔ وہاں میں تمہارا اور سونی کا انتظار کروں گی اور موقع ملا تو اتنی دیر میں سونی کی پاسٹ ہسٹری لے بتادوں گی۔ دیر مت کرنا" شبنم نے کہا۔

اب شام ہورہی تھی۔ اسپتال میں ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں سیدھا قمر کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے بچے کو نہلا دھلا کے اور کپڑے بدلا کے اس کے گالوں پر سرے سے کالا تل بنا رہی تھی۔

میں نے کہا "ایسے کالے کلوٹے اور بندر جیسے بچے کو کس کی نظر لگے گی؟"

اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا "ہائے ظالم ماموں۔ ایسے چاند کے ٹکڑے کو تو چاند کی نظر لگ سکتی ہے۔ تم نظر کے قائل نہیں ہو بھائی' تمہیں کیا پتا۔"

میں نے کہا "بہنا۔ ہر ماں صرف اپنے بچے کی نظر کیوں اتارتی ہے؟ کیا اس کے شوہر کو نظر نہیں لگ سکتی؟ بھائی کو یا باپ کو نظر نہیں لگ سکتی؟"

اس نے بچے کو میری گود میں لاد دیا۔ "کروے خراب ان کے کپڑے بیٹا" وہ ہنسی "چائے پیو گے بھائی یا کافی؟"

"کافی!" میں نے کہا "اور اس اُلو کے پٹھے نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی نا تو۔" مگر اسی وقت میں گرم پانی میں شرابور ہوگیا۔ ہنستے ہنستے قمر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ صبر سے برداشت کرنے کے علاوہ میں کیا کرسکتا تھا۔ بچے نے ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے ہنستا رہا اور پھر سوگیا۔

قمر کافی لے کر آئی اور بچے کو میری گود سے اٹھالیا "یہ سونی کا کیا چکر ہے بھائی! چندا' مجھے بتارہی تھی کہ کوئی خطرناک لڑکی ہے اور پاگل ہے۔"

میں نے کہا "قمر۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ چندا پاگل ہوگئی ہے۔ تیرا کیا خیال ہے' اس کا رویہ بالکل ناقابل فہم ہوتا جارہا ہے۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے۔" وہ بولی "دیکھا جائے تو ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا بھائی!" وہ بولی "تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں' بدل لو۔"

میں نے کہا "سوکھ جائیں گے ابھی۔ گھر جاکے ہی بدلوں گا۔ چندا نے رخشی کے ساتھ کچھ ایسی باتیں کی ہیں کہ وہ بہت ناراض ہے۔ ابھی میرے سامنے بھی وہ بہت تلخ ہوگئی تھی۔ میں نہ روکتا تو بات بڑھ جاتی۔"

"کمال کہہ رہے تھے کہ وہ رخشی سے ایسی باتیں پوچھتی رہی' جو بہت غلط تھیں۔" وہ بولی۔

"کیا باتیں پوچھی تھیں اس نے؟"

"اسی سے پوچھنا' پرخشی سے۔"

میں نے کہا "آخر تو کیوں نہیں بتاسکتی۔ میں چندا سے پوچھ لوں گا۔"

"نہیں بتائے گی وہ بھی۔ ایسی بے شرمی کی باتیں ہیں' توبہ توبہ!"

میں نے کہا "اوہ۔ اتنا گر گئی ہے وہ؟"

"کمال خود حیران تھے کہ میں نے ناصر سے ایسے

سوالات کبھی نہیں کیے' اتنی بے تکلفی کے باوجود۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت بدمزاج ہوگئی ہے۔ دوسرے ڈاکٹر اور نرسیں بھی عاجز ہیں اس کے رویے سے۔"

"وہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سختی کرنے لگی ہے بھائی لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کا لہجہ تلخ ہوتا ہے۔ میں تو نظرانداز کردیتی ہوں' کبھی لڑپڑتی ہوں۔ میری بات اور ہے' میں جانتی ہوں اس کی شخصیت میں یہ تلخی حالات نے پیدا کی ہے اور حالات کی خرابی کے ذمے دار تم۔"

"میں۔۔۔ تو بھی مجھے الزام دے رہی ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ارے بھائی! آدھی بات اچک لی اور مجھ سے لڑ رہے ہو۔ میں کہہ رہی تھی کہ ذمے دار تم نہیں ہو' وہ خود ہے۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم نے کتنی کوشش کی تھی اسے سمجھانے کی۔ اس نے ایک نہیں سنی تمہاری۔ بہت بے عزت کیا تمہیں۔ تم بھی کہاں تک برداشت کرتے۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا "قمر' سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے اس کے سہارے کی بہت ضرورت تھی' اس وقت چندا نے مجھے بڑی بے رحمی سے ٹھوکر ماردی۔ میری مجبوری کو جھوٹ کہا اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چندا کی شخصیت کا دوسرا روپ اتنا سنگدل ہے۔ اس نے مجھے دھوکے باز' دوغلا۔ احسان فراموش' ہوس پرست اور نہ جانے کیا کچھ کہا۔ سب کے سامنے ذلیل کیا۔ میں تو مسلسل معافی ہی مانگتا رہا۔"

"چھوڑو بھائی۔ ان باتوں کو یاد کرکے خود کو دکھی کیوں کرتے ہو۔ غلطی سب سے ہوجاتی ہے لیکن معاف اپنے ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں کیونکہ کمال ایسے نہیں ہیں لیکن کل کو خدانخواستہ' میرے منہ میں خاک ۔۔۔ وہ لٹو ہوجائیں کسی پر' تو کیا میں چھوڑ دوں گی انہیں؟"

میں ہنسنے لگا "ارے تو کیا۔ میں نہیں چھوڑوں گا اس اُلو کے پٹھے کو مگر نہیں' مرد ذات پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ ذرا نظر چوکی تیری اور وہ لڑھک جائے گا کسی کی طرف۔ چار کا شرعی عذر اس کے ہاتھ میں رہتا ہے ترپ کارڈ کی طرح۔ کیا تجھے یقین ہے کہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں؟ اسپتال میں ایک دو نرسیں بہت خوبصورت ہیں' بہتر ہے انہیں نکلوادے۔ ایک ڈاکٹر بھی خطرناک ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "آپ کے دوست کو نہ نکال دوں؟ نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری!"

میں نے کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔ وہ جو ڈاکٹر عائشہ آئی تھی' اسی کے کلینک میں۔ معاف کرنا' آج بغیر پروگرام کے آنا پڑا۔ تیرے لیے چاکلیٹ نہیں لایا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "چاکلیٹ! وہ کیا ہوتی ہے بھائی؟ ذائقہ کیا' میں تو نام بھول گئی ہوں اس کا۔ وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔"

میں نے اس کے گالوں پر پیار سے چانٹا مارا "ڈرامامت کر۔"

"کیسے اچھے تھے وہ دن۔ سب بھول سکتے تھے تم مگر باہر سے آتے تھے تو بہن کے لیے چاکلیٹ لانا نہیں بھولتے تھے۔ شادی کرلو گے تو کیا ہوگا۔ بہن کو بھی بھول جاؤ گے۔"

"اسی لیے تو شادی نہیں کررہا ہوں میں۔"

وہ ہنسنے لگی "تم نہیں کررہے ہو یا کوئی تیار ہی نہیں ہے بھائی!"

میں نے آہ بھری "یہ بھی سچ کہا تو نے۔ دیکھ لے' دنیا میں تیرے بھائی کی کیا اوقات ہے۔ پھرتے ہیں میرخوار کوئی پوچھتا نہیں۔ دو کوڑی کا نہیں ہے تیرا بھائی!"

وہ ہنسی "ایسا مت کہو۔ لاکھوں کیا' کروڑوں میں ایک ہے میرا بھائی۔ بس ذرا دماغ خراب ہے مگر تم ہاں کردو اور پھر دیکھو' میں کوہ قاف کی پری لاتی ہوں یا نہیں۔"

میں نے نکلتے ہوئے کہا "بہنا' اتنی دور جاؤ تو پھر ایک نہیں چار ہی لے آنا۔"

کمال مجھے اسپتال میں ملا۔ وہ کام ختم کرکے گھر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ مجھے دیکھ کے حیران ہوا "کیا ہوا' کھانا کھا کے نہیں جائے گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں سونی کو لے جارہا ہوں۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں۔ علاج وہیں بہتر ہوگا۔"

وہ بولا "صحیح فیصلہ کیا تو نے۔ میں خود تجھے یہی مشورہ دینے والا تھا۔"

"یہاں وہ محفوظ تھی لیکن دوسرے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہوسکتے ہیں یہاں۔ حفاظت کا بندوبست وہاں کیا جاسکتا ہے۔"

کمال نے سر ہلایا "چندا سے کوئی بات ہوئی؟"

"نہیں اور میں کرنا بھی نہیں چاہتا" میں نے کہا۔

لیکن اسی وقت چندا اندر آگئی "ناصر۔ کہاں تھے تم۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "اس وقت نہیں۔ دیکھو کوئی ایمبولینس ہو تو۔"

"ایمبولینس تو ہے۔ کیا کرنا ہے ایمبولینس کا؟"

میں نے کہا "سونی کو شفٹ کرنا ہے' ڈاکٹر عائشہ نے کہا ہے۔"

وہ تیز ہو کے بولی "ڈاکٹر عائشہ سے میری بھی بات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"وہ کیوں بات کرے گی تم سے۔ وہ بات کرے گی کسی ڈاکٹر سے یا مریض کے لواحقین سے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ابھی تک اس بیوی کے غلام بنے ہوئے ہو۔"

میں بھونچکا رہ گیا "چندا' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسی گھٹیا بات کر سکتی ہو۔"

"ہاں۔ ہر گھٹیا حرکت صرف تم کر سکتے ہو۔ اس گھٹیا عورت کی حمایت کر رہے ہو میرے سامنے۔ کیا لگتی ہے اب وہ تمہاری؟"

میں نے کہا "وہ پہلے بھی میری کچھ نہیں لگتی تھی' تم جانتی ہو۔"

"بس کرو ناصر! بے حیائی اور بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں کیا جانتی ہوں' سارا زمانہ جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے" میرا غصہ قابو سے باہر ہونے لگا "تمہیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ رخشی کو تو تم نے چھوڑ دیا تھا۔ کسی اور کے حوالے کر دیا تھا پھر اب وہ تمہارے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ کیوں تمہاری حمایت میں لڑنے کھڑی ہو جاتی ہے؟ اور وہ ریورنر۔ اسے تو نہ شرم ہے نہ لحاظ۔ کس رشتے سے رہتی ہے وہ تمہارے ساتھ؟"

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پا لیا "تم پاگل ہو گئی ہو چندا۔ بہت غلطی کی میں نے جو سونی کو یہاں لائے تھے ہم۔"

کمال نے چندا کا بازو تھام لیا "تم آؤ میرے ساتھ' چلو یہاں سے۔"

چندا نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا "آپ [redacted] میں گے حمایت اپنے دوست کی۔ صحیح دوست ہوتے تو سمجھاتے کہ دنیا میں دنیا کے طریقے سے رہو۔ مذہب نے اور معاشرے نے کچھ پابندیاں عائد کی ہیں مرد عورت پر۔ قانون بھی ایسے آزادانہ میل ملاپ کے خلاف ہے۔ تین مرد آخر تین غیر عورتوں کے ساتھ کیسے رہتے ہیں؟"

میں نے چیخ کے کہا "چندا۔ بند کرو یہ بکواس ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔ تھپڑ مارو گے مجھے۔ میرا منہ بند کر سکتے ہو تم مگر سچائی نہیں بدلے گی ناصر۔ پتا نہیں اس سابقہ زوجہ شاہ عالم کی بھی شادی ہوئی ہے اس پولیس والے سے یا نہیں لیکن یہ سونی اور شبنم کس کی بیویاں ہیں؟ تم اجتماعی شادی۔"

کمال بیچ میں نہ آتا تو میرا جھانپڑ چندا کا دماغ درست کر دیتا۔ اس پر کچھ ہسٹریا جیسی کیفیت غالب تھی۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور منہ سے کف سا جاری تھا۔ کمال اسے زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ چلاتی رہی۔ اس نے ہم سب کے خلاف فحاشی کی زندگی بسر کرنے کا الزام لگایا۔ وہ کہتی رہی کہ ہم سب اخلاقی مجرم ہیں اور آپس میں میاں بیوی جیسے آزادانہ جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ ہم سب کا نہ خاندان ہے نہ کسی کے نام نسب کا پتا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا بدن غصے سے پھٹنے کے قریب آتش فشاں کی طرح لرز رہا ہے۔ خون کا ابال میرے سر میں دھمک پیدا کر رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ کچھ فاصلے سے مریض اور ان کے ملاقاتی چندا کے چلانے پر متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک دو نرسوں نے بھی یہ منظر دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ انہیں اصل بات کا علم نہیں تھا مگر زیب داستان کے لیے یہ نظارہ بھی کافی مواد فراہم کرتا تھا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی اپنی دست راست مس چاندنی کو زبردستی کھینچ کر لے جا رہے ہیں اور وہ مزاحمت کرتے ہوئے شور مچا رہی ہے۔

پھر مجھے ہوش آیا۔ میں نے ایک واٹر کولر سے پانی پیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا اور میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں ایسے کیوں بی ہیو کر رہا ہوں۔ اگر چندا نفسیاتی ہسٹریا سے مغلوب ہے تو مجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔ میں اس پر کیوں چلا رہا تھا اور کیوں اسے مارنے دوڑا تھا۔ وہ تو رحم کے قابل ہے۔ وہ نارمل نہیں ہے تو مجھے نارمل رہنے کی ضرورت ہے۔ وقتی طور پر اس کے اعصاب کا دباؤ ناقابل برداشت ہو گیا تھا تو میں نے کیوں ضبط سے کام نہیں لیا۔

اب میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نے رخشی سے کس قسم کی باتیں کی ہوں گی۔ رخشی کا غصے میں آنا بے سبب نہیں تھا۔ یہ مجھ سے نفرت کا شدید ردعمل تھا جس نے چندا کے خیالات میں انتشار اور پراگندگی پیدا کی تھی۔ اسے ہمیشہ یہ

خیال بچھو کی طرح ڈنک مارتا رہا کہ شاہ عالم بن کے میں نے رخشی سے ازدواجی تعلقات رکھے تھے جبکہ اس معاملے میں میرے یا رخشی کے دامن پر کوئی داغ نہ تھا۔ رخشی نے میری حمایت کی تو اس نے الٹا مطلب نکال لیا۔ رہی سہی کسر شبنم کے میرے ساتھ آنے سے پوری ہو گئی۔

حیرانی مجھے اس بات پر تھی کہ چندا کو سونی کے بارے میں کس نے بتایا۔ ضرور اس نے رخشی کو باتوں میں لگا کے سب پوچھ لیا ہو گا اور اعتماد کے دھوکے میں رخشی نے بہت کچھ بتا دیا ہو گا جو بتانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ چندا اسے EXPLOIT کر رہی ہے۔ رخشی تو یہی سمجھی ہو گی کہ چندا اور کمال فاروقی پر اتنا ہی بھروسا کیا جا سکتا ہے جتنا ہم ایک دوسرے پر رکھتے ہیں مگر چندا نے قمر کو بتایا کہ سونی خطرناک ہے اور پاگل ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ رخشی نے چندا سے کچھ نہیں چھپایا اور سب معلوم کر لینے کے بعد چندا نے رخشی کی ایسی تیسی کر دی۔ جس کی جوتی اسی کے سر۔

چندا کا یہ ردعمل میرے لیے بالکل ناقابل فہم تھا۔ کہاں اس کا وہ انداز بے نیازی کہ وہ مجھ سے بات کرنے اور میری صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ اس کا رویہ مکمل لاتعلقی کا تھا کہ جیسے ہم کبھی آشنا ہی نہ تھے۔ وقت جو گزر گیا اس کی یاد بھی بھلا دینی چاہیے۔ وہ مجھے چھوڑ کے اور اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے لندن جا رہی تھی جہاں اس کا کوئی بھولا بسرا کزن دریافت ہو گیا تھا۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ وہ مجھے بھلا نہیں سکی تھی۔ وہ خود پر جبر کر کے مجھ سے بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کا ظاہر نفرت کی بے حس چٹان تھی مگر اس کے وجود میں محبت کے چشمے پھوٹنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اگر اسے واقعی میرا خیال نہ ہوتا تو اس کے لیے مجھے بھول جانا بہت آسان ہوتا۔ میں اس کے سامنے بھی آتا تو ایک اجنبی کی طرح وہ مجھے کوئی اہمیت نہ دیتی۔

میں سونی کے کمرے میں جا کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمال کچھ دیر بعد آیا تو اس کا چہرہ فکر اور تردد سے پر شکن ہو رہا تھا۔

میں نے کہا "یار کمال' آئی ایم رئیلی سوری!"

وہ پھٹ پڑا "سوری کے بچے۔ اتنا بڑا تماشا کرنے کے بعد سوری کہنے کا کیا فائدہ۔ کیا تجھے اتنا بھی قابو نہیں ہے اپنی زبان پر۔ تو چپ نہیں رہ سکتا تھا؟"

میں نے کہا "اب احساس ہو رہا ہے مجھے اپنی غلطی کا لیکن یار' اس کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا۔"

"وہ تو پاگل ہے تیری نظر میں۔ تو خود پاگل نہیں ہے کیا؟ اب بولنے دیتا اسے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی ہی ہو رہی ہے۔"

"مجھے تو یہ معلوم نہیں تھا۔ وہ آئی تھی تیرے ساتھ تو بالکل ٹھیک تھی۔ تو نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"دیکھ یار۔ یہ جذباتی آتش فشاں ایسے ہی پھٹتے ہیں۔ برسوں سوئے رہتے ہیں اور کوئی معمولی سی بات بہانہ بن جاتی ہے۔ یہ اندر ہی اندر پکنے والا ناسور ایک کانٹا چبھ جانے سے ابل پڑتا ہے۔ کیا یہ بات تو نہیں سمجھتا؟ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ رحم کے قابل ہے وہ لڑکی۔ نفرت کی مستحق نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں واقعی شرمندہ ہوں یار۔ تو بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"مجھے اب کبھی ادھر نہیں آنا چاہیے" کمال نے بے رخی سے کہا "تیری میری دوستی اپنی جگہ۔ قمر کے ساتھ تیرا رشتہ بھی اپنی جگہ لیکن میں چندا کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس نے بہت مدد کی میری۔ اس کے باپ نے اپنا سب کچھ لگا دیا تھا میرے اسپتال میں۔ اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ اب چندا میری ذمے داری ہے اور مجھے اس کی ضرورت بھی ہے۔ میرا کام ادھورا ہے ابھی۔"

میں نے کہا "تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میری صورت بھی نہیں دیکھے گا تو۔ قمر سے بھی کہہ دینا۔"

"یہ بات نہیں یار۔ ہم آئیں گے' آتے رہیں گے۔ اصل پرابلم ہے چندا کی۔ میں چاہتا ہوں' وہ کسی طرح تیرے SPELL سے نکل آئے۔ سچ سچ اپنے دل سے تیرے خیال کو نکال دے تاکہ اس کے لیے جینا آسان ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تو اس کے سامنے بھی نہ جا۔ یہاں تک کہ وہ ناامید ہو جائے۔ اس کی ہر آس ٹوٹ جائے۔ سب سے بہتر تو یہ تھا کہ تو شادی کر لیتا شبنم سے۔"

"ابھی تو یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں۔ کیا شبنم اس کے حق میں نہیں ہے؟"

[redacted] نے کہا "یہ بات نہیں۔ میں دوسرے معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔"

"وہ معاملات تو نے خود الجھائے ہیں۔ انہیں سلجھانا کیا مشکل ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "تیری طرح میرے لیے بھی زندگی کا ایک مشن ہے۔"

"شادی اس مشن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مجھے دیکھ لے، تم سے شادی کی تو کیا میرے اس اسپتال والے پروجیکٹ میں میری ازدواجی زندگی حائل ہوئی؟ اس کے برعکس تم میری بہترین معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ اب ہم دونوں کا ایک ہی مقصد اور مشن ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں سوچوں گا۔"

"کم سے کم چندا کو اس فیصلے کا علم ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ لاشعوری طور پر بھی کسی جھوٹی امید سے وابستہ نہ رہے۔ وہ واقعی مجھے بھول جائے بلکہ ایسا ہو کہ سچ مچ نفرت کرنے لگے مجھ سے۔"

میں نے کہا "ہو جائے گا یہ بھی۔ تو ایمبولینس کا انتظام کر۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "یار، مجھ سے ناراض مت ہونا۔ دنیا میں تو میرا ایک ہی دوست ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "پاگل ہو گیا ہے کیا تو بھی۔ تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں میں؟"

سونی کو ایمبولینس میں شفٹ کرنے کے بعد میں نے پوچھا "چندا کہاں ہے؟"

"اسے میں نے زبردستی انجکشن لگا کے سلا دیا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا خیال رکھنا یار۔ مجھے فکر رہے گی۔"

ایک بار پھر میں ڈاکٹر عائشہ کے کلینک پہنچا۔ یہاں ایک زمانے میں شبنم زیر علاج رہی تھی۔ کلینک کا ماحول وہی تھا۔ لان پر پہلے کی طرح دو بزرگ شطرنج کی بساط جمائے بیٹھے تھے۔ یہ تصویر پرانی تھی مگر کردار نئے تھے۔ شبنم بڑی دلچسپی سے ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ پھر رہی تھی اور مریضوں سے ملاقات کر رہی تھی۔ یہ لوگ پاگل نہیں تھے۔ ان کے رویے اصلاح طلب تھے۔ انہیں نفسی یا خطبی ہونے کی اس انتہا پر سمجھا جا سکتا تھا جس کے بعد یہ پاگل پن کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ان کے ری ایکشن نارمل نہیں رہتے تھے یا غیر یقینی ہو گئے تھے۔ وہ کسی فضول سی بات پر مشتعل ہو سکتے تھے یا بے سبب ہنسنا شروع کر سکتے تھے۔ کسی وہم کو یقین بنا لیتے تھے مثلاً یہ کہ شام سات بجے زمین کی گردش رک جائے گی۔ یہ بی بی [redacted] بتایا ہے اور تصدیق کے لیے ریڈیو پر وائس آف امریکا گا رہے تھے۔ وہ کسی خیالی اور غیر موجود مخلوق سے باتیں بھی کرتے تھے مگر ان کا رویہ کسی طرح بھی ضرر رساں یا VIOLANT نہیں تھا۔

سونی کے لیے اتفاق سے پھر وہی کمرا ملا جس میں شبنم نے کچھ دن گزارے تھے۔ وہ خود ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ بڑی بے تکلف تھی اور انہیں آنٹی کہہ رہی تھی۔

"میں نے آنٹی کو سب بتا دیا ہے۔" وہ بولی۔

آنٹی عائشہ نے کہا "یہ سب وقتی شاک کا نتیجہ ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دو چار ہفتوں میں سونی بالکل ویسی ہی ہو جائے گی جیسی تھی۔"

"دو چار ہفتے" میں نے کہا۔

"ڈیئر بوائے! اتنا وقت تو جسم کے زخم مندمل ہونے میں لگ جاتا ہے۔ روح کے زخم آسانی سے نہیں جاتے۔"

"میرا مطلب تھا۔ کیا یہ ایسے ہی پڑی رہے گی، زمانے سے بے خبر؟"

وہ ہنسنے لگی "یہ تو SEDATION کا اثر ہے۔ کل تک نہیں رہے گی پھر اسے ایک OF SECURITY SENSE کی ضرورت ہوگی۔ اس کا اعتماد بحال ہونا چاہیے اور اس کے لیے تم سب کا تعاون چاہیے۔ ابھی تم جاؤ، یہاں اس لڑکی کو چھوڑ دو، شبنم کو۔ یہ میری پرانی پیشنٹ ہے اور سمجھ دار بھی ہے۔"

میں نے کہا "پتا نہیں آپ ایسا کیوں سمجھتی ہیں؟ خیر، میں پھر کل آؤں گا۔"

رئیس خانے میں صورت حالات کچھ معمول پر دیکھ کے مجھے تسلی ہوئی۔ اندر کمرے میں رخشی کوئی جھگڑا طے کرا رہی تھی جس کے فریق حسب سابق تیمی یا رخان اور چھوٹی تھے۔ رئیس خان گھر پہنچتے ہی بڑی عجلت میں کہیں تشریف لے گئے تھے اور مجھے فرید نے بتایا کہ کسی نے ایک نایاب قسم کے مرغ کا سراغ لگایا تھا جو ہنوز زیر تربیت تھا مگر اس کے تیور بتاتے تھے کہ اس میں ورلڈ چیمپئن بننے کی صلاحیت ہے۔ عرصہ دراز سے رئیس کسی جوہر قابل کی تلاش میں تھا جو عمران خان ثابت ہو سکے چنانچہ وہ منہ مانگی قیمت پر سودا کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

فرید قانون کی موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھا اور پی ایل ڈی کے ذخیرے سے کوئی ایسی نظیر تلاش کرنے میں ناکام تھا جس سے رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق نہ ہو۔

"اس کی ضمانت کی توثیق ہو جائے گی" اس نے مجھے مایوسی سے مطلع کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ کیس تو رجسٹر ہو گیا ہے نا" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے اس کے لیے بھی ہائی کورٹ کو MOVE کرنا پڑے گا کہ ایف آئی آر اس کے خلاف درج کی جائے۔ اس نے اپنے دو غریب ملازموں کو قربانی کا بکرا بنایا ہے۔ وہ الزام اپنے سر لے رہے ہیں۔"

میری آواز پر رخشی اٹھ کے آگئی "تم کب آئے؟"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ تم ایک کیس کی سماعت کر رہی تھیں۔"

"ارے، وہ پاگل ہیں دونوں۔ تم سناؤ، سونی کا کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ہونا کیا ہے، اسے بھی ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں چھوڑ آیا ہوں شبنم کے ساتھ۔ دو تین ہفتے لگ جائیں گے اس کی صحت کی مکمل بحالی میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم سب مل کے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ وہاں بہت مشکل تھا دو دن گزارنا، ہم تو یہ سمجھ کے گئے تھے کہ وہاں بھی سب اپنے ہیں۔"

فرید نے کہا "اب چھوڑو، یہ ذکر۔"

رخشی نے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا "تمہاری کوئی بات ہوئی اس سے یا ڈاکٹر کمال فارو قی سے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اچھی خاصی بات ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم وہاں نہیں تھیں ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"چندا کی وجہ سے اچھا خاصا سین CREATE ہو گیا تھا" میں نے کہا اور پھر محتاط رہتے ہوئے مختصراً سب بتا دیا۔ میں نے چندا کی الزام تراشی کے سارے اشتعال انگیز جملے سنسر کر دیے اور صرف اتنا کہا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ ڈسٹرب ہے۔

رخشی نے مجھ سے اختلاف کیا۔ "تم اسے بہت LIGHTLY لے رہے ہو۔ چندا ایک مینٹل کیس ہے۔ اس قاتل ہے کہ اسے بھی ڈاکٹر عائشہ کے پاگل خانے میں۔"

میں نے کہا "آپ جینئس! وہ ہرگز پاگل خانہ نہیں ہے۔ تم جا کے دیکھ لینا۔ تم سے چندا نے ایسی کیا بات کہی تھی کہ تم ابھی تک غصے میں ہو؟"

رخشی نے کہا "ناصر، مجھے تو چندا کے بارے میں جو کچھ تم نے بتایا تھا، اس سے میں نے اپنے ذہن میں بہت اچھی تصویر بنا رکھی تھی کہ جسے تم اتنا چاہتے تھے وہ کوئی بہت اعلیٰ صفات کی حامل لڑکی ہوگی۔ شبنم سے زیادہ متاثر کرنے والی ہو گی اس کی شخصیت لیکن وہ تو بالکل اس کے برعکس ثابت ہوئی۔"

"تم نے اسے سونی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"سب بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر کمال کے سامنے جو کہا وہ چندا نے بھی سنا تھا۔"

میں نے کہا "اس کی گزشتہ زندگی کے بارے میں بھی؟"

"ہاں۔ کیا میں نے غلطی کی۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم سے ایسا کیا کہہ دیا اس نے؟"

رخشی نے اجازت طلب نظروں سے فرید کو دیکھا "بتا دوں سب؟"

وہ اپنی کتابیں اٹھا کے چل پڑا "ضرور بتاؤ۔ ورنہ تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہیں گے۔ مجھے تو کام کرنا ہے۔ میں اپنا دماغ خراب کرنا نہیں چاہتا۔"

بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ فرید وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ جو باتیں رخشی نے بتائیں وہ حد درجہ افسوس ناک بلکہ شرمناک تھیں۔ چندا نے پہلے تو میٹھی میٹھی باتوں سے رخشی کو شیشے میں اتارا۔ اس سے سونی کے بارے میں سب پوچھ لیا پھر وہ ذاتی باتوں پر اتر آئی۔ اس نے رخشی سے پوچھا کہ جب میں شاہ عالم کی حیثیت سے اس کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس میں رہتا تھا تو میرا رویہ اس کے ساتھ کیسا تھا۔ قدرتی طور پر یہ سوال رخشی کو برا لگا۔ اس نے کہا "رویے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

چندا نے کہا "دیکھو۔ تمہیں تو معلوم نہیں تھا کہ تمہارے شاہ عالم کی جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا" رخشی نے تنک کے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ ساری دنیا اس فرق کو محسوس نہ کر سکی۔ جو اس کے قریب تھے وہ بھی ناصر عظیم کو شاہ عالم ہی سمجھتے تھے۔"

"مگر بیوی سے زیادہ قریب کون ہوتا ہے؟" رخشی نے کہا۔

"تو تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"حد کرتی ہو تم بھی۔ ایک غیر آدمی اور شوہر کے رویے کا فرق مجھے فوراً پتا چل گیا تھا۔"

"کیسا رویہ۔ جب اس نے تمہارے قریب آنے کی کوشش کی؟"

"نہیں۔ میں نے اسے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

چندا نے کہا "یعنی اس نے کوشش کی تھی؟"

رخشی نے برہمی سے کہا "نہیں۔ اس نے کوشش بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کی تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' اسے پورے مواقع حاصل تھے۔ کیا تم ایک ہی بیڈ روم میں نہیں ہوتے تھے؟"

رخشی نے کہا "پلیز شٹ اپ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔"

چندا نے کہا "تم سچ بتاتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو' مجھے تو معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے تمہیں؟" رخشی بھڑک اٹھی۔

"یہی کہ تم میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے' سب کے سامنے۔"

رخشی نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہے چندا۔ دنیا کے سامنے ہم ڈراما کرتے تھے۔ خود کو میاں بیوی ظاہر کرنے پر مجبور تھے۔"

"اکیلے میں تو کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ڈر کس کا تھا؟"

رخشی نے نفرت سے کہا "دیکھو چندا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے گندے دماغ میں کیا ہے لیکن میں تمہیں وہ بات بتاتی ہوں جو کسی اور کو معلوم نہیں اور میں نے کسی سے نہیں کہی۔ پہلے میں بھی دھوکا کھا گئی تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا تھا۔"

چندا کے لبوں پر ایک پُر تحقیر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی "دیکھا۔ تم نے مان لیا بالآخر۔"

"میں نے کچھ نہیں مانا۔ ذلیل عورت!" رخشی نے چلا کے کہا۔

"چلانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ تم نے ابھی کہا کہ پہلے تمہیں بھی پتا نہیں تھا۔ اس ذلیل آدمی نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں اور فائدہ اٹھا لیا۔"

"اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا" رخشی رونے کے قریب ہو گئی۔

"جھوٹ مت بولو۔ تم اعتراف کر چکی ہو کہ تمہیں پہلی بار پتا نہیں چلا تھا۔"

"پہلی بار۔ یہ میں نے کب کہا؟" رخشی کا دماغ گھوم گیا "میں نے کہا تھا کہ پہلے مجھے واقعی دھوکا ہو گیا تھا۔"

"پہلے کب؟"

"یا میرے خدا! چندا' جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔"

"میں نے وہ ویڈیو فلم دیکھی ہے۔ وہ تمہارے بیڈ پر تمہارے ساتھ لیٹا ہوا تھا" چندا نے کہا "اس نے ایک جھوٹی کہانی مجھے بھی سنائی تھی۔"

"او مائی گاڈ! وہ جھوٹ نہیں تھا۔"

وہ ایک سازش تھی۔ شاہ عالم کو قتل کر کے اس کی جگہ ناصر عظیم کو لانے کی" رخشی رونے لگی۔

"اور یہ سازش کامیاب ہو گئی تھی۔"

"مگر مجھے ناصر عظیم نے بتایا تھا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔ تم مجھ پر شک کر سکتی ہو مگر ناصر' وہ تو فرشتہ ہے۔"

چندا ہنس پڑی "جیسی روح ویسے فرشتے۔"

"چندا۔ میں خدا رسول کی قسم کھا سکتی ہوں۔"

"جھوٹی قسمیں کھانے کا عذاب مت لو۔ تم ایک ہی بیڈ روم میں بلکہ ایک ہی بیڈ پر سوتے تھے' کیا یہ ممکن ہے۔"

"خدا کے لیے میری بات سنو چندا۔ بے شک وہ چاہتا تو فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں کیا بتاؤں تمہیں' میں اس جیسے مضبوط کردار کی عورت نہیں ہوں۔ میں اپنے شوہر سے کبھی خوش نہیں تھی۔ اکیلے میں ایسے مواقع آئے جب میں نے بڑی بے شرمی سے اسے ورغلانے کی کوشش کی مگر اس نے ہر ترغیب کو رد کر دیا۔ تمہارے نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہی ہے۔"

"مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ تم ایک آوارہ اور بدچلن عورت ہو اور ناصر کی شخصیت ایک دھوکا ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا میں اسے سمجھتی تھی۔ وہ ایکٹر ہے' ڈرامے باز ہے۔ ہوس پرست اور دولت کا بھوکا ہے اور تمہارا شوہر شاہ عالم' وہ تو ہے ہی بے غیرت۔ اس نے سب دیکھا اور برداشت کیا۔ وہ عیاش آدمی اب لندن میں عیش کر رہا ہے اور اس کی معشوقہ ناصر عظیم کے ساتھ سو رہی ہے۔ ناصر نے اس فاحشہ کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ اس عورت کے لیے جسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے ساتھ شاہ عالم ہے یا ناصر عظیم۔"

رخشی کا رو رو کے برا حال ہو گیا "خدا کے لیے بس کرو چندا!"

"کیوں بس کروں۔ میں نے سب دیکھا ہے اور برداشت کیا ہے۔ تم سب بدکردار اور بے غیرت ہو۔ رئیس کیا تھا اور ناصر عظیم کیا تھا۔ یتیم خانے میں پلنے والے بچے جن کے ماں باپ انہیں بار گناہ سمجھ کے وہاں پھینک گئے تھے۔ فقیروں کے ڈیرے پر خیرات کمانے والے۔ آج وہ معزز ہو گئے ہیں مگر ہیں تو وہی بے نسب نلی کے کیڑے اور وہ شبنم' یہ سونی' سب کی ایک ہی کہانی ہے۔ میرا تو دادا بھی کرتل تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی میں اس کی عزت تھی۔ اس احسان فراموش' ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ناصر عظیم نے اسے بھی قتل کر دیا۔ وہ ویسے ہی مرنے والا تھا مگر اس نے اپنے محسن کو سکون سے مرنے بھی نہ دیا۔ انہیں اذیت دے کر مارڈالا۔ میں اسے چھوڑوں

گی نہیں۔ سب کو بتا دوں گی اس کی دھوکے بازی کا حال۔"

روتے روتے رخشی کا پھر برا حال ہو گیا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے اس کے اعصاب پھر جواب دے گئے تھے۔ میں نے اسے پانی پلایا اور بڑی مشکل سے اس کی حالت سنبھلی۔

میں نے کہا "رخشی۔ پلیز' خود کو قابو میں رکھو۔"

رخشی سسکیاں لیتی رہی "وہ عورت بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے تمہارے لیے ناصر۔ وہ زخم خوردہ ناگن ہے۔"

"وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہمارا۔ کون یقین کرے گا اس کی بات پر اور پھر کمال اسے کچھ کرنے دے گا؟"

"تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ سب تم نے فرید کو بھی بتایا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں وہ بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے۔"

"فرید تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہیں اس پر اعتماد رکھنا چاہیے۔"

"وہ غصے میں پاگل ہو کے ... اور کچھ بھی کر سکتا تھا" وہ بولی۔

میں نے کہا "او کے۔ تم نے اچھا کیا لیکن اب ایسا نہ ہو کہ فرید آ جائے اور تمہاری یہ حالت دیکھ کے پریشان ہو۔ جاؤ' منہ دھو کے فریش ہو جاؤ۔"

"وہ اپنے کام میں مصروف ہیں" رخشی اٹھ کے واش روم میں چلی گئی۔

میں اپنا سر تھامے بیٹھا رہا۔ یہی سب کچھ چندا نے میرے سامنے کہا تھا مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ رخشی کے سامنے وہ اس حد تک جا چکی تھی۔ یہ بالکل ناقابل یقین تھا کہ چندا نے ایسی باتیں خود اپنی زبان سے کہی ہوں گی مگر رخشی کی روداد کا ہر لفظ خود اپنی صداقت کا گواہ تھا۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب سونی بے ہوش پڑی تھی اور اس کی تیمارداری پر مامور دو عورتیں اپنے اپنے جذباتی ہسٹریا کے دورے میں ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی کر رہی تھیں۔ ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا مگر جو کچھ انہوں نے کہا' وہ اتنا خطرناک تھا کہ دہرایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر حملہ کر سکتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ سکتی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کتنا بُرا ہوتا۔ قمر کیا سوچتی' کمال کیا کرتا۔ اسپتال کی کتنی بدنامی ہوتی۔

جو آج شام ہوا وہ بھی کم نہ تھا اور بلاشبہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی کے مترادف تھا۔ چندا کے لیے رخشی کے اندیشے بے بنیاد نہ تھے۔ وہ پاگل پن میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کسی بھی حد کو پار کر سکتی تھی۔ سوال اب یہ تھا کہ میں اس کو کیسے روک سکتا ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے فرض نہیں کر سکتا کہ خطرہ کوئی نہیں۔

رات کو کھانے پر رخشی مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی لیکن نارمل تھی۔ فرید نے یہ بات نوٹ کی لیکن اہمیت نہیں دی۔ اس نے سمجھا ہو گا کہ چندا کی بکواس نے اس کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمارا سونی کو کمال اسپتال لے جانا ایک بہت بڑی غلطی بن گیا تھا۔ مجھے اب آئندہ کی فکر تھی۔

کیا چندا سے دور رہ کے میں اس کے انتقام کی آگ کو سرد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جو اندر ہی اندر پھیلتی رہی تھی۔ جسے میں نے آج تک محسوس نہیں کیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا۔ کتنا فرق تھا چندا کے ظاہر اور باطن میں۔ وہ کیا تھی اور کیا نظر آتی تھی۔

اصل بات یہ تھی کہ دس سال تک میں نے اس کی شخصیت کا صرف ایک روپ دیکھا تھا۔ میں اس شخص کی طرح تھا جس نے اپنی تمام زندگی ایک پہاڑ کے دامن میں گزار دی تھی جہاں سرسبزی و شادابی تھی۔ پھولوں کے رنگ تھے اور پہاڑی ندی کا گیت گاتا بہاؤ تھا۔ میں نے کبھی پہاڑ کے دوسری طرف دنیا دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ دوسری طرف پتھر کی چٹانیں ہیں اور بے ثمر خاردار کیکٹس اگے ہیں اور ویرانی کا بسیرا ہے۔

میں چاندنی کے ساتھ تھا۔ چاندنی کا تھا اور اپنے خوابوں خیالوں میں اس کے سوا کسی کو دیکھتا ہی نہیں تھا پھر مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ حسد' رقابت اور نفرت کے جذبات میں چاندنی کی دلنواز ٹھنڈک کیسے بدل کے جلنے والی اور جلا دینے والی آگ بن جاتی ہے۔ یہ تجربہ مجھے اب ہوا تھا تو میں ڈر گیا تھا۔

میرے ڈرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ رخشی کی اور شبنم کی دشمن تھی جو اس کی نظر میں میری گمراہی اور بے وفائی کا سبب تھیں۔ مجھے پھر اپنانے کی ضد میں وہ ان دونوں کو نقصان پہنچانے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھا سکتی تھی اور یہ موقع اسے ہمارے اعتماد کی ایک غلطی نے فراہم کر دیا تھا۔ ابھی تک چندا تو کیا کمال فاروقی اور قمر نے بھی رئیس خانہ نہیں دیکھا تھا جہاں اکیلا میں نہیں رہتا تھا۔ چندا کے مطابق تو یہ بدکردار مجرموں کا اڈا تھا۔ وہ سونی کو دیکھنے کمال کے ساتھ یہاں آ چکی تھی۔

رخشی نے اسے سونی کے مجرمانہ ماضی کی کہانی سنا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے خدشات کو بڑھادیا تھا۔ چندا سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ خود پولیس کو وہاں لے آئے یا خود سامنے آئے بغیر ہمارے خفیہ ٹھکانے کا راز فاش کردے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے سوفی کی طرف سے حاصل ہونے والے اطمینان کا یہ احساس باقی نہ رہا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور محفوظ ہے۔ چندا جانتی تھی کہ وہ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں ہے۔ پولیس اسے وہاں سے گرفتار کرسکتی تھی۔ ہم سب کے مقابلے میں سوفی کے جرائم کی فہرست سب سے لمبی اور خطرناک تھی۔

کھانے کے بعد میں نے رئیس کو اپنے اندیشوں سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ فرید اور رخشی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں سکون اور تنہائی چاہتے تھے چنانچہ وہ اپنی خواب گاہ کی خلوت میں بند ہوگئے تھے۔ رئیس کو میں نے مرغی خانے میں جا پکڑا۔

وہ بہت خوش تھا "پیارے' یہ دیکھ۔ قسم اللہ کی کیا چیز لایا ہوں میں۔"

میں نے کہا "مرغا ہے۔ اس کا مطلب ہے کل چکن بریانی ہوگی' بھئی واہ!"

وہ بگڑ گیا "ابے عقل کے اندھے۔ یہ تیری پیٹ کا دوزخ بھرنے والا مرغا نہیں ہے۔ یہ تو مستقبل کا عمران خان ہے پیارے۔ قسم اللہ کی میں تو بڑا مایوس تھا کہ اس سال "پنجاب دا بادشاہ" ٹرافی کئی اپنے ہاتھ سے۔ تین سال سے میں ہی جیت رہا تھا۔"

میں نے کہا "یہ بات ہے۔ بہت قیمتی مرغا ہوگا پھر تو۔"

اس نے پیار سے بغل میں دبا کے مرغے کو کچھ کھلایا "تو اندازہ بھی نہیں کرسکتا اس کی قیمت کا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ڈیڑھ دو سو تو ہوگی۔"

وہ بہت جز بز ہوا۔ "یار' میرا نہیں تو عمران خان کے جذبات کا ہی خیال کر۔ دیکھ' اس کی نظر کیسے دیکھ رہی ہے تجھے۔ کہتا ہوگا کہ کیسا جاہل ہے یہ شخص جسے ہیرے اور پتھر کی پہچان نہیں۔ ابے پورے دس ہزار میں ہوا ہے سودا پھر بھی اچھا ہوا مجھے وقت پر پتا چل گیا ورنہ کوئی اور ہزار دو ہزار اوپر لگا کے لے جاتا۔ تو غور کر اس مرغے کی اٹھان پر۔"

میں نے کہا "ابے مرغے کی اولاد۔ میں کچھ اور بات کرنے آیا تھا۔"

"ہاں ہاں' بول میں ہمہ تن گوشت ہوں۔"

مجھے ہنسی آگئی "گوشت نہیں جاہل کی اولاد۔ ہمہ تن گوش۔"

اس نے مرغے کو چوم کے کہا "اب ہاں' وہی۔"

میں نے کہا "اس عمران خان کو چھوڑ دے پنجرے میں ورنہ میں۔۔۔ اس کو سوفی چھوڑوں گا۔۔۔ جہاں۔"

اس نے فوراً مرغے کو بند کردیا اور اٹھ کھڑا ہوا "ایسی کیا بات ہے یار کہ تو اس شخر پاکستان کا دشمن ہو رہا ہے؟"

میری بات سن کے اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔ "یار' کیا ایسا کرسکتی ہے وہ تیری چندا کی چاندنی؟"

میں نے کہا "اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے۔ مجھے تو بڑا دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ اس نے اپنے دل کی بھڑاس شبنم اور سوفی پر بھی نکالی۔"

"دل میں بھڑاس تھی اس کے تو نکالی مگر تیری بات بہت قابل غور ہے۔ اس سے پہلے کہ چندا کچھ کر گزرے' ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ کرلینا چاہیے۔"

میں نے کہا "تو ایک آسان طریقہ تو یہی ہے کہ ہم پھر زیر زمین چلے جائیں۔ اپنے بل میں گھس جائیں۔"

"اور سوفی کا کیا کریں؟"

میں نے کہا "ہاں' یہ سوچنے کی بات ہے۔ سوفی کو وہیں رہنا چاہیے۔ ہم اسے یہاں لے آئے تو علاج میں خلل پڑے گا اور ڈاکٹر عائشہ کے لیے یہاں آنا مشکل ہوگا۔"

وہ بولا "یار' لاہور شہر میں ایک ڈاکٹر عائشہ ہی تو نہیں ہے۔"

"مگر ہم اور کسی کو نہیں جانتے۔"

وہ بولا "ڈاکٹر عائشہ تو جانتی ہوگی۔ ہم اسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ جائیں تو جائیں کہاں۔ وہ پوچھے گی کہ آخر جانے کی ضرورت کیا ہے تو اسے بتادیں گے کہ خطرہ سوفی سے زیادہ اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچنے کا ہے اور یہ ہم نہیں چاہتے۔ دوسرے مریض بھی ڈسٹرب ہوں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر عائشہ کے مشورے پر ہم سوفی کو کسی دوسرے کلینک میں لے جائیں گے۔ وہاں اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا اور ہم آنے جانے میں بھی احتیاط کریں گے۔ رہی یہاں کی بات تو کچھ دن کے لیے ہم انڈر گراؤنڈ رہ کے دیکھ لیتے ہیں۔ چندا کا ری ایکشن سامنے آجائے گا۔ خود کمال فاروقی سے پوچھ سکتے ہیں ہم کہ اب اس کا کیا حال ہے۔"

صبح میرے جاگنے سے پہلے ہی فرید نکل گیا۔ رخشی نے بتایا کہ وہ کسی سینئر وکیل سے قانونی مشورہ لینے گیا ہے۔ اسے ایک ساتھ کئی کیس ڈیل کرنے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ سوفی کا معاملہ کسی اور کے سپرد کردے۔ اس کی پیروی کے لیے فوجداری مقدمات کے کسی نامور وکیل کا ہونا ضروری تھا۔

پولیس اور عدالتی معاملات میں جوڑ توڑ۔ ہیرا پھیری اور لین دین کی اہمیت' اصول انصاف کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ انصاف کرنا اور انصاف حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔

میں نے رخشی کو اپنے خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ وہ آج ہی ساری گرہستی کو نہ خانے میں منتقل کردے۔

"اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اس سے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ ہوسکتا ہے کہ میں امکانات کو بہت اغلارج کرکے دیکھنے لگا ہوں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"اتنی کمینی لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔ تم اس پر فریفتہ تھے؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ ایسے فیصلے مت دو۔ حالات کے پس منظر میں ہم سب اچھے یا برے نظر آتے ہیں۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ غلطی کس کی تھی۔ میری' تمہاری یا چندا کی۔ شاید اس کی جگہ تمہارا بھی ایسا ہی ردعمل ہوتا۔"

اس نے برا مان کے کہا "ایسا کہنا بڑی زیادتی ہے۔ خیر' تم اپنے جنرل منیجر تیس مار خان کو بتادو' کیا کرنا ہے؟"

تیس مار خان بے حد معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کی پیمائش کرتے ہوئے کہا "آپ فکر و غم مت فرمائیں۔ ام ایسا بندوبست کرتی کہ حضرت عزرائیل بھی تشریف لاتی تو آپ کی تلاش میں خود بخود شرمسار ہوتی۔"

میں نے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں فون کیا تو کسی آپریٹر نے مجھے براہ راست سوفی کے کمرے میں لائن ملادی۔ یہ کلینک میں ایک نئی سہولت تھی۔ پہلے ہر کمرے سے مریض کو یا اس کے اٹینڈنٹ کو بات کرنے کے لیے کاؤنٹر تک آنا پڑتا تھا۔

شبنم نے کہا "رات کیسی گزری؟"

میں نے کہا "بقول فلمی شاعر۔ روتے روتے گزر گئی رات رہے۔ یاد آئی تری ہر بات رہے۔ تم سناؤ' سوفی کی کیا رپورٹ ہے؟"

وہ ہنسی "آج سوفی نے مجھ سے بات کی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور میں نے اسے بتایا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کے گھر میں۔ وہ بہت نروس اور ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی کہ شبنم باجی' یہاں سے نکل چلو۔ وہ لوگ یہاں بھی آجائیں گے۔ جب اس نے آکے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے نرس کو بلالیا پھر ڈاکٹر آگئی۔ اسے پکڑ کے انجکشن لگانا پڑا' اب سو رہی ہے۔"

"ایسے کب تک چلے گا شبنم!"

"ڈاکٹر عائشہ کا کہنا ہے کہ اب اس کو سلائے رکھنا ضروری نہیں۔ اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوستوں کو دیکھے۔ وہ ہنسی مذاق سے اس کا دل بہلائیں اور خوف دور کریں۔"

میں نے کہا "REHABILITATION کا پروسیس ہے۔ اس میں ڈاکٹر عائشہ کی گائیڈنس اور ہمارا کوآپریشن یکساں اہم ہیں لیکن شبنم' ہمیں سوفی کو یہاں سے کہیں اور لے جانا ہوگا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کی وجہ ہے اور بہت اہم وجہ ہے۔ اس کی صحت کی بحالی سے زیادہ اس کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے۔ PRIORITY رکھتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں چندا اسے گرفتار نہ کرادے۔"

"چندا ایسا نہیں کرسکتی۔"

"یار سمجھا کرو۔ میں یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ کل میری چندا کے ساتھ بڑی سخت جھڑپ ہوگئی تھی۔ میں فون پر نہیں بتا سکتا۔۔۔ کہ اس نے کیا کہا تھا۔ رات کو مجھے رخشی نے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو چندا نے اس سے کہی تھیں کہ مجھے لگتا ہے وہ پاگل ہوگئی ہے۔"

"ایک ایک کرکے ہم سب پاگل ہوتے جارہے ہیں۔ میرے بعد سوفی' پھر چندا۔"

"ذرا سوچو' اگر اس حالت میں سوفی کو پولیس نے پکڑ لیا تو کیا حشر کرے گی اس کا۔ اس کے خلاف الزامات اتنے سنگین ہیں کہ ضمانت بھی مشکل ہوگی۔ رب نواز گن گن کے بدلے چکائے گا۔ فرید عباسی گیا ہے کسی بڑے وکیل سے بات کرنے لیکن فی الحال ہم خود بھی انڈر گراؤنڈ جارہے ہیں اور میں آرہا ہوں وہاں۔ ڈاکٹر عائشہ سے پوچھتے ہیں کہ اور کوئی جگہ ہے ایسی لاہور میں؟"

"جگہ تو ہوگی یقیناً۔۔۔ او مائی گاڈ!" وہ ایک دم چلائی۔

میں نے کہا "شبنم! کیا بات ہے؟"

شبنم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ناصر۔ تم نے ٹھیک سوچا تھا مگر دیر ہوگئی۔"

"کیا دیر ہوگئی۔۔۔ صاف بات کرو نا!"

"وہ۔۔۔ وہ یہاں آگئی ہے۔۔۔ چندا!" اس نے ایک دم فون لائن بند کردی۔

میں ہیلو ہیلو چلاتا رہ گیا۔ اس خبر نے خود میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کردی تھی۔ میں نے پھر نمبر ملایا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپریٹر نے کہا کہ مجھے فوراً ڈاکٹر عائشہ سے بات کرنی ہے۔
آپریٹر نے کہا "پلیز ہولڈ کیجئے' میں دیکھتی ہوں۔"
انتظار کا ایک ایک سیکنڈ ایک گھنٹے کی طرح ہو گیا۔ میں بار بار گھڑی کو دیکھتا رہا۔ ایک منٹ بعد آپریٹر نے کہا "سوری سر۔ آپ کچھ دیر بعد فون کرلیں' یا نام بتادیں اپنا۔"
"آپریٹر۔ ان سے کہو ایمرجنسی ہے۔" میں نے چلا کے کہا۔
"میں آپ کا پیغام پہنچادیتی ہوں لیکن وہ پولیس سے بات کررہی ہیں۔"
میں نے چیخ کے کہا "پولیس' پولیس کیوں آئی ہے؟"
"سوری سر! مجھے معلوم نہیں اور ہوتا تب بھی میں فون پر نہ بتاتی۔" اس نے کہا۔
میں گھبرا کے باہر دوڑا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ہم نے بالکل ٹھیک سوچا تھا اور فیصلہ بھی ٹھیک کیا تھا مگر اس فیصلے پر عمل درآمد میں دیر ہو گئی تھی۔ میں نے رات کو رئیس سے بات کی تھی۔ صبح میں نے رخشی سے بات کرنے میں وقت ضائع کیا پھر شبنم سے بات کی حالانکہ میں کلینک جا کے بھی اسے یہ سب بتا سکتا تھا لیکن میں یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ صبح ہوتے ہی چندا پولیس کے ساتھ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک پہنچ جائے گی۔
رخشی نے میری صورت پر وحشت کے آثار دیکھے تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ "کیا ہو گیا نا صر! سونی تو ٹھیک ہے نا؟"
میں نے کہا "تمیں مار خان۔ گاڑی کی چابی کدھر ہے؟"
وہ اندر چھوٹی کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اندر جا کر ڈانٹ کھولو۔ مجھے جانا ہے اور گاڑی کی چابی دو مجھے۔"
چھوٹی گاڑی نرید لے گیا تھا۔ وہاں صرف پے جیرو کھڑی تھی۔ ہنگامہ سن کے رئیس بھی آنکھیں ملتا نمودار ہوا "کیا شور مچا رکھا ہے یار؟"
میں نے کہا "وہ اُلو کی پٹھی' چندا اسپتال پہنچ گئی ہے پولیس کے ساتھ۔"
وہ منہ پھاڑ کے جماہی لے رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا "کیا؟"
میں نے کہا "مجھے شبنم نے ابھی بتایا' حالانکہ میں اسے یہی سمجھا رہا تھا۔"
"پھر اب کیا ہو گا؟"
"پتا نہیں' شبنم اکیلی کیا کرے گی؟" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
ابھی میں نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ اندھیرے سے تمیں مار خان نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح پکارنا شروع کیا۔
"ناصر صاحب' آپ کا فون تشریف لاتی۔"
میں یہ سمجھا کہ شاید شبنم نے پریشانی میں فون کیا ہو گا۔ یہ پوچھنے کے لیے اب میں کیا کروں' یا یہ بتانے کے لیے کہ کیا ہو رہا ہے؟ میں اترکے اندر گیا اور ایک طرف پڑا ہوا ریسیور اٹھالیا۔
"ہاں۔۔۔ ہیلو!" میں نے کہا۔
دوسری طرف سے کسی نے کہا "کیا میں مسٹر فرید عباسی ایڈووکیٹ سے بات کرسکتا ہوں؟"
لہجہ بڑا چونکانے والا تھا۔ میں نے پوچھا "کون صاحب بات کریں گے؟"
قدرے توقف کے بعد جواب آیا "رب نواز!"
میرے کانوں پر جیسے کسی نے ریوالور رکھ کے فائر کردیا۔
میں نے سنبھل کے محتاط انداز میں' آواز اور لہجہ بدل کے پوچھا "کون رب نواز؟"
غلط نمبر کسی سے بھی ڈائل ہو جاتا ہے اور پہلی بار کوئی اجنبی نا آشنائی کا احساس دلائے تو شریف آدمی فوراً سوری کہہ دیتا ہے یا اپنی غلطی کا اندازہ ہوتے ہی فون بند کردیتا ہے مگر نہ وہ شریف آدمی تھا اور نہ عام آدمی۔ ایک نفسیاتی احساس برتری کے غرور میں وہ خود کو غلطی کرنے والے انسانوں سے بالاتر مخلوق سمجھتا تھا۔
رب نواز نے ناگواری کا اظہار کیا۔ "اوئے ملک رب نواز ہمارے سوا اور کتنے ہیں؟"
ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے گھر کا کوئی ملازم سمجھ رہا ہے۔ فوری طور پر مجھے اس کے سوا کچھ نہ سوجھی کہ میں بھی ناگواری سے رانگ نمبر کہہ کے ریسیور رکھ دوں مگر میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ وہ رب نواز ہی تھا اور اگر کسی طرح وہ رئیس خانے کا فون نمبر معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا تو یہ بات بھی یقینی تھی کہ چند سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی پھر بجے گی۔
رئیس کی شکل پر بارہ بج گئے تھے۔ "کیا یہ واقعی رب نواز ہی تھا؟"
میں نے سر ہلایا "ہاں' وہی تھا۔"
"مگر یار! اسے کیسے معلوم ہو گیا یہاں کا نمبر؟"
میں نے کہا "ابھی پھر فون آئے گا۔ تو خود پوچھ لینا' میں جا رہا ہوں۔"
اسی وقت گھنٹی پھر بجی اور جاتے جاتے میں نے ریسیور

اٹھالیا "ہیلو!" میں نے زیادہ اعتماد کے ساتھ کہا۔
رب نواز نے پھر فرید عباسی کو پوچھا۔
اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا "HELL ARE YOU WHO THE۔ کیوں مجھے پریشان کررہے ہو صبح صبح؟ کوئی فرید عباسی نہیں رہتا یہاں۔"
"یہ کس کے گھر کا نمبر ہے؟" وہ شک میں پڑ گیا۔
"یہ ڈاکٹر محمد علی کا گھر ہے" میں نے کہا اور ریسیور رکھ کے دوبارہ اٹھایا اور ایک طرف ڈال دیا۔
رئیس زیادہ پریشان ہو گیا "ابے یار' تو نے آواز سنی؟ یہ وہی تھا؟"
میں نے کہا "آواز بنا کے میں بول رہا تھا' وہ نہیں۔ کیا اس کی آواز کو بھی میں نہیں پہچانوں گا؟"
"ہمارے ساتھ ایسا مذاق کرنے والا بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔"
میں نے کہا "ابھی تو میں نے اسے جھوٹ بول کے ٹال دیا ہے مگر اس کا نام ہے ملک رب نواز۔ اتنی آسانی سے وہ کیسے قائل ہو گا کہ جو نمبر اس کے حکم کے غلام معلوم کرکے لائے تھے' وہ غلط تھا۔ اس نے تیسری چوتھی بار بھی یہی نمبر ملایا ہو گا اور۔۔۔ ایچ کی ٹون سن کے اس کا شک یقین میں بدل گیا ہو گا کہ یہ نمبر ٹھیک ہی تھا۔"
"آخر کسی نے تو اسے دیا ہی ہو گا یہ نمبر؟"
میں نے کہا "ہاں۔ تصدیق کے لیے بھی رب نواز اسی کو بلائے گا اور دو جوتے رسید کرکے کہے گا کہ میں نے تجھے ایڈووکیٹ فرید عباسی کا فون نمبر پتا کرنے کا کہا تھا' تو نے پکڑا دیا مجھے کسی ڈاکٹر محمد علی کا نمبر۔ اور ظاہر ہے محنت کرکے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنے والا نمک خوار بے قصور جوتے کھا کے بھی شکایت نہیں کرے گا۔ وہ پھر تصدیق کرے گا۔ اس نے ٹیلی فون ایکس چینج میں کسی سے مدد لی ہو گی۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا "وہاں سے کچھ پتا نہیں چل سکتا۔ فون نمبر پہلے تو بدلتا ہی رہتا تھا۔ یہ نمبر ملک خدا بخش مندرال کے نام پر ہے۔"
میں زیادہ متفکر ہو گیا "اسے تو مرحوم ہوئے ایک سال ہو گیا۔"
"ہاں اور اس کے نام پر تو کوئی ایک درجن فون تھے۔ اس کے بیٹوں کے نام پر۔ بیویوں کے نام پر۔ یہاں تک کہ ملازموں کے نام پر فون لگتے تھے اور ختم ہو جاتے تھے۔"
"ختم کیسے ہو جاتے تھے؟"
"ابے یار' یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یہ سب سالے بڑے بڑے سرکاری افسر۔ سیاست داں' وڈیرے اور اسمگلرز ٹائپ لوگ فون لگوا لیتے ہیں مگر بل دینا ان کی شان کے خلاف ہے۔ لاکھوں کے واجبات چلتے رہتے ہیں۔ کسی کی مجال کہ فون ایک دن کے لیے بند کردے۔ کبھی اخبار میں چھ آجائے تو وہ فون بند کروا دیتے ہیں۔ دوسرا لے لیتے ہیں۔"
میں نے کہا "تو بھی خدا بخش مندرال کا چھپ تھا؟"
"ہاں' لیکن چھپے تو بہت ہوتے ہیں۔ پورا کنٹری سیٹ ہوتا ہے اور وہ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ خدا بخش مندرال کے نام سے کسی کا دھیان میری طرف کیسے جاسکتا ہے۔ یہ تو پیارے کسی نے اپنے فرید عباسی سے پوچھا ہو گا۔"
میں نے کہا "دماغ خراب ہے تیرا۔ وہ کسی کو رئیس خانے کا فون نمبر کیوں بتائے گا؟"
"اس کے کسی جاننے والے سے پوچھا ہو گا" وہ بولا مگر

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنفہ نے اس ناول میں معاشرے کی
دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت =/۱۰۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر خود ہی اپنی بات پر شرمندہ ہوا "جاننے والا بھی ایسا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "رئیس خان' ابھی وقت ہے' غائب ہو جاؤ یہاں سے ورنہ کوئی آ کے گھنٹی بجا دے گا۔ یقیناً کسی نے فرید عباسی کا پیچھا کیا ہوگا اور اسے یہاں آتے دیکھا ہوگا۔ ایڈریس معلوم ہو تو ایکس چینج والے فون نمبر بتا سکتے ہیں۔ اور فون نمبر ہو تو پتا معلوم ہو جاتا ہے۔"

رئیس پریشان ہو گیا "وقت ہوتا تو باہر ڈاکٹر محمد علی کی تختی لگا دیتے اور تمیں مار خان کو باہر کھڑا کر دیتے۔"

میں نے کہا "ٹائم واقعی نہیں ہے۔ میں نے رخشی کو بھی سمجھا دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے ہمارا روپوش ہو جانا ہی بہتر ہے۔"

"کیوں؟ تجھے کیا پہلے سے معلوم تھا کہ رب نواز فون کرے گا؟"

میں نے کہا "اب نہیں یار۔ مجھے خطرہ تھا چندا کا۔ وہ کمال کے ساتھ آ چکی ہے یہاں۔"

رئیس کا منہ غصے سے لال ہو گیا "اس حد تک جا سکتی ہے وہ؟"

میں نے کہا "اب بھی شک ہے تجھے۔ سونی کو پکڑوا دیا تھا اس نے حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ سونی کی حالت ٹھیک نہیں۔ اور پولیس جب تفتیش کرے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ غصہ چھوڑ' میں جا رہا ہوں اسپتال۔ تو سب کے ساتھ چلا جا تہ خانے میں۔ سامنے والا راستہ بند۔ کچھ عرصہ ہم وہی پرانا راستہ استعمال کریں گے پہلے کی طرح۔ دروازہ توڑ کے زبردستی کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن اب نگرانی ضرور کرنی ہوگی اندر آنے جانے والوں کی۔"

رئیس نے سر ہلایا "وہ خبیث مجھے بھی پہچانتا ہے۔ ورنہ میں بن جاتا ڈاکٹر محمد علی۔"

میں نے جاتے جاتے کہا "اپنی شکل دیکھی ہے اپنی' کمپاؤنڈر بھی نہیں لگتا۔"

وہ جھینپ گیا "صورت کی بات رہنے دے۔ ہم نے بڑے بڑے چڑی مار جیسی صورت کے ڈاکٹر دیکھے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ دروازے تک آیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا "اب جو تیرا جی چاہے کر' میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ اسپتال جانا بھی بے کار لگتا ہے مجھے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب تک پولیس اپنی کارروائی کر کے جا چکی ہوگی۔"

رئیس بھی افسردہ ہو گیا "مایوس مت ہو یار۔ ہم نمٹ لیں گے پولیس سے بھی۔ سونی کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور ہوا تو قسم اللہ کی۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک گہری سانس لی۔

میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی "میں بھی چندا کو کبھی معاف نہیں کروں گا اس حرکت پر۔"

اس نے اچانک کہا "یار' ایک کام ہو سکتا ہے۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی "کیا؟"

"دیکھ پیارے' اب اللہ میاں سے یہ شکایت کرنے کا تو کوئی فائدہ نہیں کہ اس نے مجھے ڈاکٹر محمد علی جیسی صورت کیوں نہیں دی تھی۔ اپنا ایک یار ہے جیرا بلیڈ' ڈرائے باز۔"

میں نے کہا "تو تھانے سے سونی کو چھڑانے کے لیے انسپکٹر نذیر بیگ کو بھیجنا چاہتا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ ذرا مشکل کام ہے اور خطرناک بھی۔ سوچ سمجھ کے قدم نہ اٹھایا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"ہاں' پتا چلے کہ سونی کے چکر میں وہ بھی پکڑا گیا۔"

رئیس بولا "میرے دماغ میں کچھ اور تھا۔ جیرا بلیڈ اگر پولیس انسپکٹر بن سکتا ہے وردی پہن کے تو ڈاکٹر کا رول بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے تو وردی بھی ضروری نہیں۔ میں اسے بلا لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ وہ یہاں رہے کچھ دن۔ پھر دیکھیں گے۔"

اس نے کہا "یار' مجھے فون کر کے بتا دینا۔"

ڈاکٹر عائشہ کے کلینک جاتے ہوئے میرے دماغ میں پریشان کرنے والے خیالوں کی آندھی سی چل رہی تھی۔ یہ نفرت کے رد عمل کی بادِ سموم تھی جو میری عمر گزشتہ کی کتاب کے ان اوراق کو اڑا کے جھلسا رہی تھی جن پر چندا کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے ان گنت خوبصورت لمحوں کی تحریر تھی۔ ہر لمحہ اپنی شناخت کی الگ کہانی رکھتا تھا اور ایک نقش لازوال تھا جس میں محبت اور معصومیت کے سارے رنگ محفوظ تھے مگر دیکھتے دیکھتے سب رنگ بے معنی اور بھدے ہو کے اپنا حسن کھو بیٹھے تھے۔ یوں جیسے خوش خطی کے نظر نواز نمونے پر اناڑی بچے سے ایک بدوضع' ادھورے بگڑے ہوئے لفظوں کی سیاہی رہ جائے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ تجربے کی کسوٹی پر کسنے سے پہلے جذبوں کا کھوٹ بھی نظر نہیں آتا۔ میں نے چندا کو کیا سمجھا تھا۔ وہ کیا تھی۔ وقت نے رفتہ رفتہ مجھے سب سمجھا دیا تھا۔ یہ کچھ میرے جذبات کا اندھا پن تھا تو کچھ

حالات کی ستم ظریفی کہ میرے سامنے اس کی تصویر کا ایک ہی رخ رہا۔ میں نے اس کی صرف محبت دیکھی تھی' نفرت نہیں۔ اور آج اگر میں چندا سے نفرت کرنے لگا تھا تو یہ اس کی نفرت کا رد عمل تھا۔ جب تک وہ مظلوم تھی اور میری بے وفائی کے عذاب کو برداشت کر رہی تھی' میں خود اپنی نظر میں گنہگار اور شرمسار تھا مگر اب چندا کے رویے نے میرے جذبات کے دھارے کو پلٹ دیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ سامنے آئے گی تو میں اس کے ساتھ کیسے پیش آؤں گا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے اپنے نفسیاتی اسپتال کا نام بدل دیا تھا۔ اب یہ صرف عائشہ کلینک تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے بعد میں یہ بتائی کہ نام میں نفسیاتی امراض کا حوالہ بھی آنے جانے والوں پر ایک منفی اور ناخوشگوار اثر ڈالتا تھا۔ خود مریض بھی یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی دماغی عارضہ لاحق ہے اور ان کی مزاج پرسی کرنے والے سب اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے تھے کہ نفسیاتی مسئلے اور پاگل پن کے فرق کو سمجھ سکتے۔ مریض تو مریض ہی ہوتا ہے مگر اس کے تیماردار اور خاندان کے قریبی لوگ بھی ایک کمپلیکس کا شکار ہو جاتے تھے۔ اور یہ سب جہالت کا کرشمہ تھا۔ نفسیاتی الجھن کے شکار شخص کو تماشا بنا لیا جاتا تھا اور اس کے مسئلے کو سمجھنے کے بجائے ایسے چھپایا جاتا تھا جیسے پرانے وقتوں میں جزام کو۔ مائیں پریشان ہو جاتی تھیں کہ بات مشہور ہو گئی تو بیٹیوں کے رشتے نہیں آئیں گے۔ لوگ مریض کا غلط نام لکھا دیتے تھے' ان سے چھپ کر ملنے آتے تھے اور ڈاکٹر عائشہ سے درخواست کرتے تھے کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو کچھ معلوم نہ ہو۔ ڈاکٹر عائشہ نے نام بدل کے سب کی مشکل آسان کر دی تھی۔

مجسم سے بات ہوئے آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر میرا دل اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ ایک بار میں گیٹ کے سامنے سے گاڑی گزار کے سیدھا چلا گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اندر کے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے کوئی بات خلاف معمول نظر نہ آئی۔ پولیس اندر باہر کہیں بھی نہ تھی۔ یہ بڑی مایوسی کی اور اس سے زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ شاید اب یہاں میرے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

گاڑی کھڑی کرتے ہوئے مجھے اپنے فیصلے پر پشیمانی اور تاسف کے احساس نے گھیر لیا۔ سونی کو ہم نے اس لیے کمال اسپتال میں رکھنے کی اجازت دی تھی کہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ ترین جگہ تھی۔ وہاں سونی غیروں کے نہیں اپنوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس وقت میں کیسے سمجھ سکتا تھا کہ چندا کی خاموش ہمدردی کے پیچھے عناد کا آزار دینے والا جذبہ کارفرما ہے۔ چندا نہ جانے کب سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ کمزوری کے ایک بے نام سے لمحے میں اس کے وجود کا جوالا مکھی ایسے پھٹ گیا جیسے برسوں میں چند انچ سرکنے والے برفانی تودے ایک آہٹ پر پھسل کے تباہ کن طوفان بن جاتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت سونی کو ڈاکٹر عائشہ کے کلینک لے جانا ہی ہمارے' ڈاکٹر کمال اور قمر کے حق میں سب سے بہتر تھا لیکن یہ فیصلہ بھی بالآخر ایک پچھتاوے کا سبب تھا۔ صرف اس لیے کہ چندا کے انتقامی جذبات کا آتش فشاں آسانی سے سرد ہونے والا نہیں تھا۔ وہ تو شاید پولیس کو رئیس خانے بھی لے آتی۔ اس کا دماغ اس حد تک خراب ہو سکتا ہے' یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

پولیس حراست میں سونی کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا ہر جواب میرے دل کے گرد پھیلے ہوئے مایوسی کے گھپ اندھیرے کو مزید گہرا کر دیتا تھا اور اس میں امید کی ایک کرن تلاش کرنے کی کوشش بھی لاحاصل محسوس ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس حالت میں سونی تفتیش کے غیر انسانی پُرتشدد اور وحشیانہ طریقوں کی تاب نہ لا سکے گی۔ وہ مر جائے گی اور یہ ماورائے عدالت قتل ملک رب نواز کے ایما پر ہوگا۔ اس کی مرضی اور منشا کے مطابق کیا جائے گا۔ وہ سونی کو سخت ترین اذیت کے ساتھ ہلاک کرنے کا آرزومند تھا اور پولیس اس کی یہ آرزو پوری کر دے گی۔ اسے رب نواز سے اچھی کارکردگی دکھانے پر داد ہی نہیں' انعام بھی عطا ہوگا۔ ایسے قتل آئے دن ہوتے ہیں۔ کسی کے وارث بہت رونا پیٹنا کریں اور خبروں کے وسیلے سے اپنی فریاد و فغاں ایوانِ اقتدار کی بے حس پتھر کی دیواروں سے بھی آگے پہنچا دیں تو انصاف میں مساوات کی اسلامی روایات پر عمل پیرا ہونے کے دعوے دار کسی حاکم کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ جام صحت تجویز کرنے والے کسی قاضی یا کوتوال شہر پر برس پڑتا ہے۔ "واٹ از دِس۔ یہ اخبار میں کیا چھپا ہے۔ مجھے تو کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ ایک ایڈیٹ جرنلسٹ نے سوال کر دیا۔"

اور کوتوال شہر دست بستہ گزارش کرتا ہے "وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں سر۔ یہ حشرات الارض عوام تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ قضا آ جائے جس کی۔"

"قضا' مائی فٹ۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم ان حشرات الارض کی آواز بھی نہیں دبا سکتے۔ اتنے اختیارات رکھنے کے باوجود۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور کوتوال شہر یا قاضی کے حکم پر انصاف کا ڈراما پھر پیش کیا جاتا ہے جس کا اسکرپٹ نصف صدی کی آزادی اور ترقی کے دور میں بھی بدلا نہیں ہے۔ خانہ پری کے لیے افسر متعلقہ کو معطل کرنے کی خبر کسی اپنے کرائم رپورٹر کے ذریعے شائع کرادی جاتی ہے۔ کسی اپنے ایس ڈی ایم کو انکوائری افسر مقرر کرنے کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ پھر کسی اپنے پولیس سرجن سے اپنی مرضی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل جاتی ہے کہ مرنے والا سوفیصد طبعی موت مرا۔ گرفتاری تو بس بہانہ بن گئی۔ شریف خوا مخواہ انصاف کے رکھوالوں اور قانون کے محافظوں کو بدنام کرنے پر آمادہ ہیں اور غیر ملکی ایجنٹوں کے اشارے پر امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ فائل داخل دفتر کردی جاتی ہے۔ عزیز و اقارب بعد فاتحہ سوئم کے قورمہ بریانی سے منکتی ڈکار لے کر مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور یسمانہ گان صبر جمیل اختیار کرلیتے ہیں۔ ایک زندگی کے ساتھ ایک ڈراما ختم ہوجاتا ہے۔ دنیا ویسے ہی چلتی رہتی ہے۔ سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات' ہر چیز فانی ہے' باقی ہے اللہ کا نام۔

گیٹ تک میں انتہائی دل گرفتہ اور اپنی بے بسی کے احساس اور بانیانہ پر دہشت خیالوں کی آگ میں جھلستا ہوا گیا۔ میری جذباتی کیفیت اس وارث جیسی تھی جو کسی زندہ اں سے کسی بے گناہ پھانسی پانے والے عزیز کی لاش لینے پہنچا ہو۔ قانون کے سارے نظام انصاف کے جھوٹ سے۔ دنیا کے یہاں تک کہ خدا سے بھی شاکی و باغی ہو۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے پٹھان چوکیدار نے کلاشنکوف اپنے کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ ایک داڑھی میں نسوار کی چٹکی دباتے ہوئے اس نے مجھے ملاحظہ کیا اور شاید اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے روک کے تشریف آوری کا مقصد دریافت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں صورت سے ہی اتنا دکھی نظر آتا ہوں کہ مشکوک نہیں ہوسکتا۔

میں خود ہی اس کے پاس رک گیا "خان۔ ابھی یہاں پولیس آئی تھی؟"

اس نے غور سے میرا جائزہ لیا "ام نئیں جانتا۔ تم کیوں پوچھتا اے؟"

میں نے جواب میں ایک اور سوال کیا "کیا پولیس کسی مریض کو گرفتار کرکے لے گئی ہے؟"

"ام بولا نئیں مالوم۔ خواندرجا کے پوچھو۔ یار۔۔۔" اس نے بیزاری سے کہا پھر شاید اسے میری مظلومیت پر ترس آگیا اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "وہ کون تھا۔ تمہارا عزیز تھا قاتل ہے؟"

میں بوجھل قدموں سے آگے گیا حالانکہ اب معلوم کرنے کے لیے کچھ نہ تھا مگر میں کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سامنے ٹھہر گیا جو بیک وقت ٹیلی فون آپریٹر اور ریسپشنسٹ تھی۔ اس نے اپنی جذبات سے عاری مسکراہٹ چہرے پر سجا کے مجھ سے سوال کیا "یس سر!"

میں نے اپنا سوال دہرادیا "ابھی کچھ دیر پہلے پولیس یہاں سے کسی کو گرفتار کرکے لے گئی تھی؟"

اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "یس سر۔ لیکن میں اس معاملے میں آپ کو کچھ نہیں بتاسکتی۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کل میں ہی اسے ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ یہاں لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی دیکھ بھال کے لیے۔ وہ کہاں ہے۔ کیا میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہے اس نے' شبنم نام تھا اس کا۔"

وہ چونکی "وہ خاتون صحافی!"

میں نے سرہلایا "یس۔ کیا وہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں پولیس اسٹیشن؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ پولیس ایک داڑھی والے نوجوان کو لے گئی ہے" وہ بولی۔

"ARE YOU SURE" مجھے ایک شاک سا لگا۔

"او یس! وہ تین چار دن سے یہاں داخل تھا' پاگل بنا ہوا تھا۔"

میں نے سکون دینے والی خوشی کو اپنے وجود میں یوں پھیلتا ہوا محسوس کیا جیسے تپتی دھوپ میں دوپہر کے وقت پیدل چل کے خشک کانٹوں بھرے حلق کے ساتھ گھر پہنچنے والے کو ٹھنڈے میٹھے پانی کا پہلا گلاس پینے سے ٹھنڈک اپنے رگ وپے میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ "وہ۔۔۔ کوئی مرد تھا؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

وہ مسکرانے لگی "ظاہر ہے۔ داڑھی والی لڑکی تو ہو نہیں سکتی۔" اس نے کسی دوسرے داڑھی والے کو قتل کردیا تھا۔ بحث کے دوران میں مشتعل ہوکے۔ پولیس نے بھی کوشش کی تھی کہ ڈاکٹر عائشہ اس کے حق میں رپورٹ دے دیں کہ وہ نارمل نہیں ہے' ذہنی مریض ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔" اور لفٹ کے زینے کی طرف چل پڑا۔ شبنم نے جو دیکھا تھا' وہ مجھے بغیر مجھے بتادیا تھا۔ چندا کے ساتھ پولیس کا آنا محض ایک

اتفاق تھا جسے شبنم کے خوف نے اپنا مفہوم دے دیا۔ میری اپنی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ میں نے آسانی سے اس پر یقین کرلیا۔ اب میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ اندیشوں کا کوہ گراں کسی بادل کی طرح غائب ہوگیا تھا۔

سوئی کو خاموشی سے بستر پر سوتا دیکھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شبنم اس کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرائی اور اس نے رسالہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ٹیبل پر ڈال دیا۔

میں اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا "کیا صورت حال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے ابھی تک" وہ بولی۔

میری آواز پر سوئی نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا "ہیلو۔ ہاؤ ڈو یو ڈو!"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے انہیں صاف کردیا۔

"اب کیا بات ہے رونے کی۔ بہادر لڑکی! چلو بس اب ٹھیک ہوجاؤ فٹافٹ تو گھر چلیں" میں نے کہا۔

سوئی نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "میں مرجاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ ایک دن میں بھی مرجاؤں گا۔ شبنم بھی' ہم سب بھی مرجائیں گے بالآخر۔"

شبنم نے اسے ڈانٹا "ایسی باتیں کرنے سے بہتر ہے' تم چپ لیٹی رہو۔ ہوش آیا نہیں اور مرنے مارنے کی سوجھ گئی۔"

"نہیں باجی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

میں نے کہا "باجی کی بہن' آپ کو اس فرمارہی ہیں۔"

شبنم نے کہا "تمہیں منع کیا ہے ڈاکٹر نے بولنے سے۔"

سوئی نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی حالت میں بہتری یقیناً آئی تھی مگر جسم سے زیادہ ذہنی اذیت کے اثرات باقی تھے اور اسے کم سے کم دو ہفتے تک آرام کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔

میں نے شبنم سے پوچھا "چندا کہاں ہے؟"

"وہ چلی گئی۔ دراصل پولیس بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آئی تھی تو مجھے غلط فہمی ہوگئی۔" شبنم نے شرمندگی سے کہا۔

میں نے کہا "وہ مجھے معلوم ہوگیا ہے۔"

"چندا تو صرف معافی مانگنے آئی تھی۔ بہت ندامت تھی اسے اپنے رویے پر۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اب کیا فائدہ۔ پہلے تو مجھے سب کے سامنے ذلیل کردیا۔ مجھے کیا' کسی کو بھی نہیں بخشا اور اب اکیلے میں آکے تم سے معافی مانگ لی۔"

شبنم بولی "اور کیا کرتی۔ پہلے ان سب کو جمع کرتی جو اس وقت وہاں موجود تھے اور پھر فرداً فرداً سب سے معافی مانگتی۔ میں معافی کا اعلان پڑھتی۔"

میں نے کہا "تم خود سوچو شبنم! اس نے جو کچھ کہا تھا' تمہارے اور رخشی کے بارے میں۔۔۔ ہم سب کے لیے' وہ معاف کیا جاسکتا ہے؟ الفاظ کے زخم ایسے مندمل نہیں ہوسکتے۔"

شبنم نے کہا "چلو جانے دو۔ اس وقت وہ ہوش میں کہاں تھی۔"

میں نے کہا "بے اختیار سچ آدمی کب بولتا ہے؟ یا نشے کی حالت میں یا پھر پاگل پن کے دورے میں۔ بقائمی ہوش وحواس ہم سب بڑی منافقت سے کام لیتے ہیں۔ وہ چندا کے دل کی بات تھی جو خود ہی زبان پر آگئی۔ اب اس پر ندامت کی جھوٹ کی چادر ڈال کے سچائی کو بدلا نہیں جاسکتا۔"

شبنم بولی "اس وقت بھی مجھے ایسا لگا تھا۔۔۔ جیسے چندا جو کچھ کہہ رہی ہے' مجبوری میں کہہ رہی ہے' کسی کے کہنے سے سوری کہنے کے لیے آنا پڑا اسے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔ سب سے پہلے تو کمال نے احساس دلایا ہوگا اسے اپنی غلطی کا۔ ممکن ہے قمر نے جھگڑا کیا ہو۔"

شبنم ہنسی "ہاں۔ اس کے بھائی کو کچھ کہہ دے کوئی' یہ اس سے کہاں برداشت ہوگا۔"

"تم نے اسے روکا نہیں؟"

"روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بتایا تھا کہ ناصر بھی آنے والا ہے مگر اس پر وہ کچھ زیادہ ہی نروس ہوگئی۔ کہنے لگی کہ میں نے عوجا تھا یہاں سب مل جائیں گے۔ مجھے سوئی کی خیریت بھی پوچھنی تھی۔ مگر میں اسپتال سے زیادہ دیر غیر حاضر نہیں رہ سکتی۔ تم بتادینا رخشی کو بھی کہ مجھے واقعی بہت افسوس ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا جو میں نے ایسی غلط سلط باتیں کہہ دیں۔"

میں نے کہا "یعنی وہ خود کہنا نہیں چاہتی تھی۔"

شبنم بولی "ہاں' یہ بات مجھے کچھ عجیب لگی۔ بھئی میں کیوں معافی مانگوں تمہاری طرف سے اور تمہارا معافی نامہ اپنے الفاظ میں دوسروں تک کیوں پہنچاؤں۔ جو کہنا ہے خود کہو۔ فرصت نہیں ہے تو فون پر کہہ دو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"فرصت نہ ہونے کا محض بہانہ ہوتا ہے ورنہ آدمی ہر کام کے لیے وقت نکال سکتا ہے اور نکالتا ہے۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی اسپتال کے اوقات میں آنے کی؟ وہ شام کے بعد آسکتی تھی۔ اور ایک بار وہ ڈاکٹر کمال کے ساتھ رئیس خانے آچکی ہے تو کپا دوبارہ نہیں آسکتی۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ ایک فار میلٹی پوری کرنے آئی اور تمہارے آنے کا سن کے بھاگ گئی۔"

میں نے کہا "اور کون تھا اس کے ساتھ؟"

"کوئی بھی نہیں۔ وہ کمال اسپتال کی ایمبولینس کو خود ڈرائیو کرکے لائی تھی۔ کسی گاڑی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے مگر ایمبولینس دیکھ کر چوکیدار نے جانے دیا ہوگا۔ ادھر نیچے ہی پورچ میں کھڑی کی تھی۔ میں نے اسے اوپر کی کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"بھائی مجھے نہیں چاہیے اس کا معافی نامہ۔ میں اس سے کسی قسم کا تعلق بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں کیوں اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے اس سے۔ کل کی باتوں سے اس کے عزائم کا اور اس کی نیت کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ احتیاط بہتر ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ سونی کو کہیں اور لے جانا چاہیے۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "کہیں اور کہاں؟"

میں نے کہا "یار لاہور میں نفسیاتی کلینک بہت ہیں۔"

"میں ہرگز اس بات سے اتفاق نہیں کروں گی۔ کسی بھی کلینک میں آپ کو یہ ذاتی توجہ نہیں مل سکتی جو ڈاکٹر عائشہ دیتی ہے۔ میں نے مریض کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا اور تیمارداروں کے بھی دیکھ رہی ہوں' چندا کچھ نہیں کرے گی۔"

میں نے کہا "میں صرف چندا کے ڈر سے ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ اور بھی وجوہات ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے رئیس سے کہا تھا کہ ہمیں کچھ دن کے لیے پھر روپوش ہوجانا چاہیے۔ میرے یہاں آنے سے چند منٹ پہلے رب نواز نے فون کیا تھا۔"

"رب نواز نے فون کیا تھا؟ کیسے؟"

"اس نے رئیس خانے کے نمبر پر فرید عباسی کو پوچھا تھا۔"

شبنم بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی "رئیس خانے کا نمبر اس کو کس نے دیا؟"

میں نے جھنجھلا کے کہا "میں نے۔ یا شاید خود فرید عباسی نے۔ کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو تم بعض اوقات۔ کسی کا فون نمبر معلوم کرنا کیا صرف تمہارے لیے آسان ہے؟ تم کرسکتی ہو یہ کام تو ملک رب نواز بھی کرسکتا ہے۔"

"تم لڑنے کے موڈ میں ہو۔ غصہ ہے چندا کی باتوں کا اور اتار رہے ہو مجھ پر۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "آف کورس' میں ٹینشن میں ہوں۔"

وہ بولی "میں چائے منگواتی ہوں تمہاری پسند کی۔ بلکہ خود بنا کے لاتی ہوں۔"

شبنم کیتلین گئی ہوئی تھی کہ سونی نے پھر آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "ناصر' مجھے یہاں سے لے چلو۔ پلیز!"

میں نے آہستہ سے اس کے بالوں کو سہلایا "بس تم جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ۔"

اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی "نہیں۔۔۔ مجھے گھر لے چلو۔ میں ٹھیک ہوجاؤں گی' یہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا پگلی!" میں نے پیار سے اس کو پھر لٹادیا۔

وہ رونے لگی "ڈر لگتا ہے بس مجھے۔ میں مرجاؤں گی یہاں' میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں تسلی اور دلاسا دینے والے الفاظ کی مدد سے اسے قائل کرتا' ڈاکٹر عائشہ کا متبسم چہرہ دروازے میں نمودار ہوا "ہیلو۔"

میں نے کہا "آیئے۔ سونی ابھی آپ ہی کو یاد کررہی تھی۔"

"ڈاکٹر کی یاد تو تکلیف میں ہی آتی ہے۔" اس نے جھک کر سونی کا ہاتھ تھام لیا "واٹ از دی پرابلم۔ ٹائی گرل' میں تمہیں جلد از جلد چلتا پھرتا بلکہ دوڑتا بھاگتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سونی نے پلک جھپکائے بغیر کہا "کیا میں۔۔۔ یہ سب کرکے دکھاؤں آپ کو؟"

ڈاکٹر مسکرائی "تو۔۔۔ ناٹ ناؤ' ٹھیک ہونے کے بعد۔"

سونی اچانک اٹھ بیٹھی "دیکھو ڈاکٹر۔۔۔ میں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ کو شاید اس کی قوت ارادی نے حیران کیا "ہاں۔۔۔ ویسے تو ٹھیک ہو۔"

"پھر ناصر سے کہیں مجھے گھر لے جائے۔"

خلاف توقع ڈاکٹر عائشہ نے انکار میں سر نہیں ہلایا "اوکے۔ میں ابھی لکھ دیتی ہوں۔ ناصر' تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

باہر آتے ہی میں نے کہا "واٹ از دس ڈاکٹر عائشہ! اس

نے کہا اور آپ نے مان لیا؟ آپ خود جانتی ہیں کہ ابھی وہ کسی طرح بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جائے۔ مینٹل شاک سے نکلنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن جسمانی طور پر بھی وہ فٹ کہاں ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی اور چلتی گئی۔

میں نے کہا "ایک بات البتہ مجھے آپ سے کہنی تھی۔ پلیز' برا مت مانیے گا۔ جتنا اعتماد مجھے آپ کی ذات پر اور آپ کی صلاحیت پر ہے' اتنا کسی اور پر ہونے کا سوال ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شبنم کے کیس میں یہ صرف آپ کا اعجاز مسیحائی تھا کہ وہ آج مجھ سے زیادہ نارمل ہے۔ اور دیکھ لیں کیسے تیمارداری کررہی ہے۔ مگر میں چاہتا تھا کہ سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔ کسی دوسرے کلینک میں۔ آپ RECOMMEND کریں گی؟"

وہ اپنے آفس کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کے اس نے مجھے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چشمہ اتار کے آنکھیں ملتے ہوئے بولی "میں خاصا RELEIVED محسوس کررہی ہوں اب۔ حالانکہ ایک گھنٹے سے میں بہت اپ سیٹ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے کیا کہوں' اور کیسے کہوں؟"

میں نے کہا "ایسی کیا بات تھی؟"

اس نے میرے سامنے اخباروں کا ایک بنڈل رکھ دیا "یہ آج کے اخبار ہیں جو میں نے بہت دیر سے دیکھے' تم نے شاید دیکھے نہیں۔"

میں نے ایک اخبار کھولا "نہیں۔ مجھے وقت نہیں ملا۔"

"انگریزی کے ایک اور اردو کے دو اخبارات میں سونی کی تصویر شائع ہوئی ہے" وہ بولی۔

"اوہ۔ یہ خطرہ تو تھا" میں نے انگلش اخبار کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔

"اس کی کافی SENSATIONAL ہسٹری ہے' تمہاری طرح۔ جیسا کہ مجھے اس WANTED کے اشتہار سے پتا چلا۔ میری اپنی تو کوئی ناچ نہیں تھی۔ جو تم نے بتایا وہی معلوم تھا۔"

میں نے تین کالم پندرہ سینٹی میٹر کے اشتہار کو غور سے پڑھا۔ اس میں سونی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر پاسپورٹ سائز میں بہت واضح تھی۔ اس کی تمام قابل تعزیر اور ناکردہ جرائم کی تفصیل موٹے حروف میں شائع ہوئی تھی اور یہ اشتہار ملک رب نواز کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں بالواسطہ طور پر میرا حوالہ یوں تھا کہ مجھے پر سونی کا ساتھی ہونے کا شک ظاہر کیا گیا تھا۔ میرا حلیہ بیان کیا گیا تھا کہ قد چھ فٹ' وزن ایک سو ستر پاؤنڈ کے لگ بھگ' جسم درمیانہ۔ رنگ صاف' گھنی سیاہ داڑھی اور مونچھیں۔ سر کے بال لمبے وغیرہ وغیرہ۔ ضرور سونی اور اس کے ساتھی کی نشاندہی کرنے والے کے لیے دس لاکھ روپے انعام کی پیشکش تھی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اخبار میز پر رکھ دیا "اب یہ میری اخلاقی ذمے داری بن گئی ہے کہ میں آپ کے اعتماد کا ناجائز فائدہ نہ لوں اور فوراً سونی کو یہاں سے لے جاؤں۔"

"پلیز!" ڈاکٹر عائشہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "میں نہیں جانتی کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔ میں صرف اپنے کلینک کی گڈول اور مریضوں کی WELFARE سے CONCERNED ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے پولیس ایک اور پیشنٹ کو پکڑنے آئی تھی۔ اس وقت تک میں نے بھی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ یوسی' اخبار تو آجاتے ہیں صبح سویرے دس بجے تک میں رپورٹیں دیکھتی ہوں اور راؤنڈ پر رہتی ہوں۔ اخبار میرے آفس میں پڑے رہتے ہیں۔ راؤنڈ سے فارغ ہوکے میں چائے پیتے ہوئے ہیڈ لائنز پر نظر ڈال لیتی ہوں۔ اس کے بعد اخبار ہال میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ مریض بھی پڑھتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ سونی کو کسی نے دیکھا نہیں ورنہ پولیس والے اسے بھی لے جاتے۔ اور خوا مخواہ مجھے بھی ملوث کرتے کہ میں نے اسے چھپا رکھا تھا۔ وہ بہت برہم تھے کہ میں نے ان کے مریض کو نارمل قرار دے دیا۔ ان کے ساتھ ایک ڈی ایس پی تھا جو کسی وی وی آئی پی کے پرسنل اسٹاف میں شامل ہے۔ خورشید کیانی' اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے خاص بندے کی رپورٹ میں یہ لکھ دوں کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ یہ تین دن پہلے کی بات ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں مریض کو دیکھے بغیر ہی یہ لکھ دوں تو اسے کون چیلنج کرے گا۔ میں نے انکار کردیا اور کہا کہ مریض کو آبزرویشن میں رکھنے کے بعد اس کا فی صد خیر دیکھ کے ہی میں کوئی فیصلہ کرسکتی ہوں۔ تھانے والے اسے لے کر آگئے۔ ایک انسپکٹر جو تھانہ انچارج تھا' دو سپاہی اور ملزم۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی میں نے جج کرلیا تھا کہ وہ FANATIC ہے۔ اس پر قتل کا الزام تھا مگر ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔ وجہ یہ کہ وہ ایک وی وی آئی پی کے پرسنل سیکیورٹی اسٹاف آفیسر کا خاص بندہ تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کے مجھے ایسے گھورتا رہا کہ میں پہلے تو نروس ہوگئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر بھی بڑے رعب میں تھا' کہنے لگا کہ لو جی' آپ نے ضد کی تو ہم بندہ لے آئے ہیں۔ اب آپ دیکھ لو اور بناؤ رپورٹ فٹافٹ۔ میں نے کہا کہ تم کیا سمجھتے ہو' میں کوئی سرکاری اسپتال کی ڈاکٹر ہوں یا پولیس سرجن ہوں جس سے تم اپنی مرضی کی کچھ بھی رپورٹ لے سکتے ہو۔ کس نے کہا تھا تم سے اپنا بندہ یہاں لانے کو۔ بہتر ہے کہ اسے واپس لے جاؤ اور ڈی ایس پی صاحب کو بتادو کہ میں یہ کام نہیں کرتی۔ انسپکٹر نے پہلے تو واضح کیا کہ یہ ہائی کورٹ کا حکم ہے اور میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ ہائی کورٹ سے میں نمٹ لوں گی۔ میری مرضی معلوم کیے بغیر عدالت نے یہ حکم کیسے جاری کردیا۔ عدالت کو کیا معلوم کہ میں یہاں ہوں یا نہیں؟ میرے پاس وقت ہے یا نہیں؟ میں بیمار تو نہیں ہوں۔ پھر انسپکٹر مجھے سمجھانے لگا کہ اس کیس میں ایک رپورٹ دے کے میں کتنا فائدہ حاصل کرسکتی ہوں۔ وزارتِ صحت سے مجھے کتنی مراعات حاصل ہوسکتی ہیں اور میں چاہوں تو اس اسپتال کو ایک بہت شاندار اور وسیع جگہ پر منتقل کرنا بھی ممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرادیا اور کہا کہ مجھے کوئی لالچ نہیں اور اس سے بڑے کسی اسپتال کو صحیح طرح سے چلانا میرے بس کی بات نہیں تو میں اس کی خواہش بھی کیوں کروں۔ انسپکٹر بہت بیزار ہوا۔ آخر میں وہ اس پر آگیا کہ کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا بھی کارِ ثواب ہے۔ وہ مولوی بھی سہلانے لگا کہ زندگی اور موت کا سوال ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ اب تم خود اندازہ کرو کہ وہ شرع کے احکامات کی کتنی غلط اور ناجائز تاویل پیش کررہا تھا۔ خود اس نے اختلاف رائے پر ایک مسلمان کو قتل کردیا تھا اور اب پھانسی کا پھندا نظر آرہا تھا تو شرع کی آڑ میں مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے تو صاف کہہ دیا کہ تم ملزم ہو' تم اس معاملے میں مت بولو ورنہ میں یہ بھی لکھ دوں گی رپورٹ میں کہ تم تو اتنے صحیح الدماغ ہو کہ ابھی سے فتوے دینے لگے ہو۔ حالانکہ تم مجھے نہ عالم دین لگتے ہو اور نہ مفتی۔ وہ تو چپ ہوگیا۔ انسپکٹر نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کردیا تھا۔ میں نے اسے ایک وارڈ میں منتقل کردیا اور اس پر ایک جونیئر ڈاکٹر کو مامور کردیا۔ اس نے تو ڈاکٹر کی جان عذاب میں ڈال دی۔ پہلے اسے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا رہا۔ یہ بتاتا رہا کہ جسے اس نے قتل کیا تھا' وہ اس کا بڑا عزیز دوست تھا مگر گمراہ ہوگیا تھا۔ اور واجب القتل تھا۔ زہرہ ایک نئی لیڈی ڈاکٹر تھی جو یہاں ابھی چھ مہینے پہلے ہی ہاؤس جاب کرکے آئی تھی۔ اسے ڈراتا رہا کہ اس کا تعلق کس تنظیم سے ہے اور اس کے حامی کیا کرسکتے ہیں اور کیا کرچکے ہیں۔ اس لڑکی نے ڈر کے مجھے بتایا تو میں نے کہا کہ تم اس کی سنتی رہو۔ پھر اپنی رائے لکھ دو بے خوف ہوکے۔ تاہم اتنی احتیاط میں نے ضروری سمجھی کہ زہرہ کے ساتھ کوئی میل نرسنگ آرڈرلی رہے۔ تیسرے دن ہی اس نے لیڈی ڈاکٹر کو نکاح کا پیغام دے دیا اور کہا کہ گزشتہ دو دن میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ ایک اچھی شریک حیات بن سکتی ہے اور یہاں نامحرموں کے درمیان رہ کے اپنی عاقبت خراب کرنے سے بہتر ہوگا کہ وہ اپنی زندگی احکام شریعت کے مطابق اس کی زوجیت میں رہ کے گزارے۔ اگرچہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے مگر اسے کوئی شبہ نہیں کہ وہ دو بیویوں کے درمیان عدل کرسکتا ہے اور ان کا کفیل بن سکتا ہے۔ اب یہ ساری باتیں میرے نزدیک ایب نارمیلٹی کی علامت ہیں مگر دوسرے SENSE میں۔ اگر میں ایسا لکھ دیتی اپنی رپورٹ میں تو اس کے دل کی مراد بر آتی۔ اور لگتا ہے اس نے جانتے بوجھتے اپنا رویہ ایسا رکھا ہو۔ خیر میں نے جو ٹیسٹ لیے تھے اور جو آبزرویشن تھی اس پر BASE کرکے اپنی رپورٹ میں اسے خطرناک حد تک چالاک اور عیار لکھ دیا اور یہ کہ وہ بہت ذہین ہے مگر اسے مفلی ذہانت کہا جاسکتا ہے۔ ڈی ایس پی نے دوبارہ فون کیا مگر میں نے ریسیو ہی نہیں کیا۔ انسپکٹر نے بھی ایک چکر پھر لگایا تھا۔ آج میں نے اسے رپورٹ دی اور کہہ دیا کہ اپنا بندہ لے جاؤ تو ڈی ایس پی بہت چراغ پا ہوا۔ بہت دھمکیاں دیں اس نے مجھے مگر میں نے بھی پیش بندی کرلی تھی۔ اس کے ری ایکشن کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے ایک تو اپنے معاون ڈاکٹر رشید کو بطور گواہ ساتھ رکھا تھا جو درمیان میں ڈی ایس پی کو سمجھاتا بھی رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ساری گفتگو پوری طرح ریکارڈ کرلی تھی بلکہ حوالے کے لیے اس میں پرانی باتیں بھی ڈال دی تھیں کہ فلاں دن تم نے ایسا کہا تھا اور تمہارے انسپکٹر نے یہ فرمایا تھا۔ اس میں رشوت کی پیشکش کا حوالہ تھا اور دھمکیاں تھیں۔ ڈی ایس پی نے کہا کہ انسپکٹر نے کیا غلط کہا تھا۔ وہ دنیادار آدمی ہے' آپ کو ٹھیک سمجھا رہا تھا مگر اب آپ نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ یہ ایمانداری' فرض شناسی کا ذرا مہنگا پڑے گا آپ کو۔ خیر وہ سب ریکارڈ کرلیا ہے میں نے اور پولیس کے جاتے ہی میں نے ایک ملازم کو بھیج دیا تھا کہ اس کی کاپیاں بنوالائے۔ مجھے بھی تو اپنے دفاع میں کچھ کرنا ہے۔ میں ایک نقل چیف جسٹس آف پاکستان کو بھی بھیج سکتی ہوں اور پریس کو بھی دے سکتی ہوں۔"

میں دم بخود اس فرشتہ سیرت اور ضمیر پرست لیڈی ڈاکٹر کی باتیں سنتا رہا جو دنیاداری کے معیار سے ایک جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہ تھیں۔ اس نے واقعی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ قانون شاید اسے کوئی تحفظ کی ضمانت دینے سے قاصر تھا۔ لاقانونیت کی بے مہار قوتیں اس کے خلاف صف بندی کررہی تھیں۔ ان سب کا مقابلہ ایک عورت کیسے کرسکتی تھی۔ شاید کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے ڈی وی آئی پی کو ناراض کیا تھا جو خود حکومت تھا۔ اس کی سیکیورٹی کے انچارج کو ناراض کیا تھا اور خود کو بالکل غیر محفوظ..... کرلیا تھا۔ اس نے ایک جنونی کی زوجیت میں آنے سے انکار کیا تھا اور اس کا یہ جرم بھی ناقابل معافی تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے خاموش ہوجانے کے بعد کہا "آئی ایم سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا سنگین ہوگیا ہے آپ کے لیے۔"

"مجھے کوئی زیادہ سے زیادہ مار سکتا ہے لیکن جو رپورٹ میں نے لکھ دی ہے' وہ بدل نہیں سکتی" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ بھی خوش فہمی ہے آپ کی۔ اپیل میں کوئی میڈیکل بورڈ آپ کی رائے کو غلط کردے گا۔ OVERRULE ہوجائے گا آپ کا فیصلہ۔ خریدے ہوئے جھوٹ سے آپ کا سچ مسترد ہوجائے گا۔"

"ہونے دو۔ اس کی مجھے فکر نہیں ہے۔ آگے جو ہونا ہے وہ میری ذمے داری نہیں ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کردیا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "اب آپ دیر مت کریں۔ اس ٹیپ کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں۔ میں ایک وکیل کو پہنچادیتا ہوں۔"

"وکیل کی ضرورت تو شاید ہوگی مجھے" وہ سوچ کے بولی۔

میں نے کہا "بالکل ہوگی۔ بشرطِ زندگی۔ آج کل لوگ قانونی فیصلے بھی خود ہی کرلیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد بھی۔ خیر' میں نے آپ کی بات اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ میں سونی کو ابھی یہاں سے لے جاتا ہوں۔"

"میں تمہیں اس سے زیادہ رعایت نہیں دے سکتی" وہ بولی "اصولاً تو میرا فرض بنتا ہے کہ یہ اشتہار دیکھنے کے بعد پولیس کو بلا کے سونی کو ان کے حوالے کردوں۔"

"دس لاکھ بھی مل جائیں گے آپ کو۔ جو سو فیصد جائز ہوں گے۔" میں نے نفی سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے پورا یقین نہیں ہے اس اشتہار کے CONTENTS پر۔ یہ ذاتی عداوت کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے نہیں' ڈاکٹر عائشہ' ہے۔"

"میں تمہیں بھی سو فیصد سچا نہیں مانتی۔ بس شک کا فائدہ دیتے ہوئے تمہیں یہ موقع فراہم کررہی ہوں کہ اسے نکال کرلے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہاں کسی اور کو پتا چلے پھر میں مجبور ہوجاؤں گی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ اتفاق ایسا ہے کہ خود سونی بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھر جانے کی ضد کررہی تھی اور میں نے بھی اسے صرف آپ کی پوزیشن خراب ہونے سے بچانے کے لیے دوسری جگہ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

"ابھی تک اس کی انٹری بھی نہیں ہے میرے ریکارڈ میں۔ تم جاؤ' اور یہ اخباروں کا بنڈل بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کم سے کم آج میں اپنے اسٹاف کو بے خبر رکھ سکتی ہوں۔ اور پرسکون رہ سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "ہمارے جانے کے بعد آپ سارے اخبارات کی چوری کا الزام ہم پر عائد کرنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں" میں نے مسکرا کے کہا۔

"تم میری پوزیشن کو سمجھتے ہو نا؟"

"یس' بہت اچھی طرح اور میں کسی طرح بھی احسان فراموش کہلانا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔

"تم پر کیا احسان ہے میرا؟"

"آپ کے احسان کا چلتا پھرتا ثبوت ہے شبنم!" میں نے کہا۔

وہ کچھ متفکر ہوگئی "اوہ نو۔ وہ ٹھیک ہوئی تھی اپنی قوت ارادی سے۔ وہ ٹھیک ہونا چاہتی تھی' اس لیے ہوگئی۔ ڈاکٹر کی CONTRIBUTION بہت کم ہوتی ہے ایسے کیس میں لیکن مجھے اب دوسری فکر ہے۔"

"وہ کیا؟"

"شبنم اسے اٹینڈ کررہی تھی اور اسٹاف شبنم کو جانتا ہے۔ خیر' انہیں میں سمجھالوں گی کہ ہمیں بلاوجہ قانونی الجھنوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک کیس پہلے ہی ہوگیا ہے جس سے سب ڈر گئے ہیں۔ وہ خاموش رہنا ہی پسند کریں گے۔ یہاں سونی زیرِ علاج تھیں رہی' رائٹ؟!"

"رائٹ" میں نے کہا "وہ تو یہاں کبھی آئی ہی نہیں' نہ میرے ساتھ اور نہ شبنم کے ساتھ۔"

"لیکن ــ فرض کرو' کسی نے پولیس کو انفارم کردیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یو سی' دس لاکھ کی رقم کا لالچ کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتا ہے۔ اور میرے پاس کچھ غریب لوگ بھی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سب ہی غریب ہیں اپنے اپنے پیمانے سے۔"

میں نے کہا "دس لاکھ کی ترغیب بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس سے کوئی بھی اپنے خوابوں کی تعبیر خریدنے کے لیے ملک رب نواز کے پاس پہنچ جائے تو اسے قصوروار نہیں کہا جاسکتا۔"

"اور پھر ایسا کرنا غلط بھی نہیں سمجھا جائے گا۔ تمہیں تو کوئی نہیں جانتا مگر کسی نے بتادیا کہ اس لڑکی کے ساتھ مس شبنم رات بھر رہی تھیں۔ وہ جو کسی اخبار میں رپورٹر ہیں۔ تو شبنم کیا کہے گی؟"

میں نے کہا "وہ کچھ بھی کہے مگر آپ کا نام نہیں لے گی۔ آپ کے ریکارڈ پر کچھ نہیں تو قانونی طور پر آپ کی پوزیشن محفوظ ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ کسی نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ سونی یہاں ایک رات ہی تو رہی ہے۔ کس کس نے دیکھا ہوگا اسے؟"

ڈاکٹر نے سوچ کے جواب دیا "ایک تو وہی ڈاکٹر زہرہ ہے جس نے ایک قاتل کی زوجیت میں آنے سے انکار کردیا تھا۔ اور اب بڑی مشکل میں پڑ گئی ہے کیونکہ رپورٹ بھی اسی نے بنائی تھی۔ اس کے علاوہ رات کی ڈیوٹی والی نرس تھی۔ دوسری نرس جو صبح آٹھ بجے آئی تھی۔ کمرے کی صفائی کرنے والا اسٹاف ہے۔ شبنم سب کو جھٹلا سکتی ہے مگر ڈاکٹر یا نرس کو کیسے جھٹلائے گی؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ شبنم ایسے مسائل سے نمٹنا جانتی ہے۔ وہ کوئی ایسی اسٹوری بنالے گی جس سے آپ کی پوزیشن بالکل محفوظ رہے۔"

واپس کمرے میں جانے کے بعد میں نے شبنم سے صرف اتنا کہا کہ ڈاکٹر نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی ہے۔ سونی ہوش میں تھی۔ یہ بات سن کے وہ اٹھ بیٹھی "کیا ہم گھر جارہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں' مگر تم لیٹی رہو۔ میں اسٹریچر منگواتا ہوں۔"

"نہیں' میں چل سکتی ہوں۔" وہ میرے روکنے کے باوجود بیڈ سے اتر کے کھڑی ہوگئی مگر نیچے قدم رکھتے ہی اسے چکر آگیا اور میں نے اسے فوراً ہاتھ بڑھا کے نہ سنبھالا ہوتا تو وہ فرش پر گر جاتی۔

"بس۔ اب اندازہ ہوگیا ہے نا کہ تم کتنی اسٹرانگ ہو؟" میں نے کہا اور اسے پھر لٹادیا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے عائشہ کلینک کی ایمبولینس دستیاب ہونے کے باوجود استعمال نہیں کی۔ میں نے فون کرکے ایک ویلفیئر ٹرسٹ کی ایمبولینس منگوائی اور اس کے دو رضاکار اسٹریچر کے ساتھ اوپر آگئے۔ جب سونی اس پر لیٹ گئی تو میں نے انہیں اندر بلانے سے پہلے سونی کے چہرے پر بھی چادر ڈال دی۔ وہ بھی سمجھے ہوں گے کہ خاتون پردہ دار ہیں۔ میرا اصل مقصد سونی کی صورت کو چھپائے رکھنا تھا۔ اسپتال میں صرف مریض ہی نہیں ان کے تیماردار بھی تھے۔ ہال میں اوپی ڈی کا وقت ہوگیا تھا اور کچھ لوگ مشورے کے لیے باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اخبار کو چاٹ کے آیا ہو اور پہلی نظر میں سونی کو شناخت کرلے۔ کچھ لوگ اخبار صرف دیکھتے ہیں کہ سرخیوں پر نظر ڈالی اور رکھ دیا۔ کچھ لوگ پڑھتے ہیں۔ چاٹنے والے وہ ہوتے ہیں جو ہر خبر کی ہر سطر کا ہر لفظ' ہر اشتہار' کالم' مراسلے اور ٹینڈر نوٹس پورا پڑھتے ہیں اور ہر تصویر کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور پھر ہر جگہ خود کو سب سے زیادہ باخبر ثابت کرتے ہیں۔

جب ایمبولینس روانہ ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈاکٹر عائشہ کی مہربانی سے سونی بال بال بچ گئی تھی اور اس نے بھی مہربانی بے سبب نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر عائشہ اپنے غیر لچک دار رویے اور کمپرومائز نہ کرنے کی عادت کی وجہ سے مشکل میں پڑ گئی تھی اور مزید مشکل میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ہمارے اسپتال سے رخصت ہوجانے کے باوجود وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کے مسائل ختم ہوگئے ہیں۔ ریکارڈ پر سونی کے نام کا اندراج نہ ہونے اور اس کے انکار سے بات ختم ہوجاتی اگر پہلے سے پولیس کی مشینری کا ایک بہت اہم پرزہ اس کے خلاف متحرک نہ ہوتا۔ ایس پی خورشید کیانی کو زعم تھا کہ بیوروکریسی کے اہم ترین نمائندے کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہے اور انصاف کے پورے عمل کو اپنی خواہش کے مطابق سبوتاژ کرسکتا ہے۔ اور یہی ہمارا المیہ ہے کہ ہم نے ایسے ہی رویے اپنا کے تمام اداروں کو تباہ کردیا ہے۔ مجموعی معاشرتی انحطاط اور سیاسی عدم استحکام نے بالآخر ہمیں اس مقام پر پہنچادیا ہے جہاں ہر شخص مایوس ہے کہ اسے انصاف نہیں مل سکتا۔ نہ عدالت سے' نہ ملازمت میں میرٹ پر۔ نہ کالج یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔ ردعمل سے پیدا ہونے والی مایوسی کا ازالہ کرنے کے لیے وہ اپنی بساط اور طاقت کے مطابق انصاف خریدتا ہے۔ پیسے کی' سفارش کی یا بدمعاشی کی طاقت کے بل بوتے پر۔ وہ قواعد وضوابط اور قانون کو اپنی ضرورت اور مرضی کے

مطابق استعمال کرلیتا ہے۔ اور قانون جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے' بے بسی سے منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر عائشہ بھی خورشید کیانی کا مقابلہ اسی طرح کرسکتی تھی کہ اپنے دفاع میں اس وی وی آئی پی تک ایک ڈی ایس پی سے بڑی سفارش کے ساتھ پہنچ جائے۔ کسی طرح اس ڈی ایس پی کی پوسٹنگ کہیں اور کرادے جہاں وہ ایک عام پولیس افسر رہ جائے اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے ڈاکٹر عائشہ کو ہراساں نہ کرسکے۔ صرف قانون پر انحصار کرکے وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتی تھی۔ جب تک وہ خود بھی خورشید کیانی کو ہراساں کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو' اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔

اتنا ہی افسوس مجھے لیڈی ڈاکٹر زہرہ کے لیے تھا جس کی خوش قسمتی ہی اس کی بدبختی بن گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر نہ ہوتی' کوئی عام سی گھریلو لڑکی ہوتی اور اسے خدا نے اچھی صورت نہ دی ہوتی تو وہ جنونی اسے دوسری بیوی کی حیثیت سے اپنی زوجیت میں لینے کے جنون میں مبتلا نہ ہوتا۔ زہرہ کو عاقبت سنوارنے کا موقع فراہم کرنے کی بات میرے نزدیک ایک گناہ سے کم نہ تھی۔ اس نے اپنی ہوس پرستی کے جذبات کی تسکین کے لیے شرع کو ایک خوف زدہ کرنے والے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب ان دونوں عورتوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔

نہ جانے کیوں رئیس خانے کی طرف جاتے ہوئے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں جو کچھ کررہا ہوں' وہ غلط ہے۔ سونی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے گھر میں رکھا جائے۔ اسے واقعی کسی اسپتال میں مسلسل دیکھ بھال کی ضرورت تھی مگر تمام اسپتال ایک جیسے غیر محفوظ ہوگئے تھے۔ اس کا ذمے دار میں صرف سونی کو قرار نہیں دے سکتا تھا' بلاشبہ وہ ایک مجرمانہ ماضی رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کی کہانی میں گناہ اور جرم کا رنگ بھرنے والے حالات خود سونی کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ آسانی کے لیے اسے تقدیر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی بہن کے ساتھ ایک غیر اخلاقی اور گناہ کی زندگی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہی۔ وہ خود ملک رب نواز اور اس کے بیٹے کے استعمال میں رہی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک خوبصورت گاڑی یا کار۔ پھر ایک بہن اپنی بساط سے بڑھ کر خوابوں کی تعبیر مانگنے کے جرم میں سزائے موت کی سزاوار ہوئی اور دوسری نے انتقام کے جذبات میں مصلحت کے تقاضوں کو نظرانداز کردیا اور یہ نہیں دیکھا کہ رب نواز کے مقابلے میں اس کی طاقت کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اب نواز کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے فیکے کے ساتھ مل کر وہ رب نواز کو تباہ کردے۔ اس کی ایک بس کو آگ لگا کے سونی نے رب نواز کو اتنا نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا جتنا کچے مکان کو ڈھانے والا زلزلہ کسی ہمالہ جیسے پہاڑ کو پہنچا سکتا ہے۔ اگر وہ چاہتی تو رب نواز کو گولی مار کے پھانسی چڑھ سکتی تھی مگر اس کو تباہ کرنے کا سوچنا بھی سونی کا پاگل پن تھا۔

بس کو آگ لگانے کے بعد بھی وہ روپوش ہوجاتی تو ملک اس حادثے کو بھول جاتا۔ اس کا مالی نقصان انشورنس کمپنی پورا کردیتی اور سب کچھ پہلے کی طرح ہوجاتا لیکن تقدیر کی خرابی اسے میرے پاس لے آئی اور اسے پھر رب نواز کے مقابل کردیا۔ اگرچہ دلنواز کے انوا میں میری مدد کرتے ہوئے سونی کے ذہن میں ذاتی انتقام کی خواہش کا خیال بھی تھا مگر میں اس حقیقت سے انحراف نہیں کرسکتا تھا کہ وہاں وہ میری وجہ سے گئی تھی۔ وہ شبنم کی رہائی میں میری مددگار نہ بنتی تو رب نواز اس کے خلاف دس لاکھ کے انعام کا اشتہار دینے کی ضرورت محسوس نہ کرتا اور سونی کی وہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت تھی چنانچہ میرا خود کو ذمے دار سمجھتے ہوئے احساس جرم وندامت کا شکار ہونا ایک فطری بات تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ کسی دوسرے نفسیاتی معالج یا علاج گاہ کے بارے میں ڈاکٹر عائشہ کی رائے پر انحصار کرنا ہی سب سے مناسب ہوگا مگر جب بات کا رخ قانونی پیچیدگی اور سونی کی وجہ سے پیدا ہونے والے غیر قانونی مسائل پر پلٹ گیا تو میرا ذہن پریشانی اور پریشانی کے خیالوں میں الجھ کے رہ گیا اور میں اس کے سوا سب کچھ بھول گیا کہ مجھے سونی کو جلد از جلد اپنے ساتھ لے کر نکل جانا چاہیے۔ نکل کے کہاں جانا چاہیے؟ یہ سوال اب اہمیت اختیار کررہا تھا۔

رئیس خانے کے قریب یہ احساس اچانک شدت اختیار کرگیا کہ سونی کو گھر لے جاکے میں اس کی زندگی کے لیے ایک خطرہ مول لینے کی حماقت کررہا ہوں۔ اگر شام تک یا کل تک اس کی ذہنی کیفیت بگڑ گئی یا اس کی جسمانی حالت خراب ہوگئی تو کیا ہوگا؟ ہم کس ڈاکٹر سے رجوع کریں گے اور اسے کیا بتائیں گے؟ اور کون ہے جس پر اتنا ہی اعتماد کیا جاسکے جتنا ہم ڈاکٹر کمال فاروقی پر رکھتے تھے یا ڈاکٹر عائشہ پر۔

میں نے ایمبولینس ڈرائیور سے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ پھر میں اتر کے پیچھے گیا جہاں ایک بنچ جیسی سیٹ پر دراز سونی کے ساتھ شبنم اپنی باتوں میں مصروف تھی۔

میں نے شبنم کو باہر بلالیا "کیا سونی کو رئیس خانے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے جا کے رکھنا ٹھیک ہوگا؟"

"ٹھیک تو نہیں ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر عائشہ سے پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ کیا تم جانتی ہو کسی ایسے ڈاکٹر کو؟"

شبنم نے سر ہلایا "ڈاکٹر تو ہیں جاننے والے لیکن ایک تو یہ مسئلہ ہے نفسیاتی علاج کا اور پھر قانونی پیچیدگی ہے۔"

"رئیس خانہ میرے نقطۂ نظر سے کوئی محفوظ جگہ نہیں رہی۔"

شبنم مسکرائی "محفوظ کون سی جگہ ہے شہر میں؟"

"شبنم، ہم میں اور سوئی میں فرق ہے۔ ہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔ فرار ہو سکتے ہیں، بے فکری سے روپوش رہ سکتے ہیں۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟"

"تم نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری پی آر بہت زیادہ ہے۔ تم معلوم بھی کر سکتی ہو۔"

وہ بولی "معلوم تم بھی کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر کمال کو فون کر کے پوچھ سکتے ہو یا ڈاکٹر عائشہ سے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ یوں جیسے تاریکی میں بجلی کے دو تار ملنے سے اسپارک ہو۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر جس کی یادداشت میں گزرے ہوئے وقت کا ہر لمحہ محفوظ تھا ACTIVATE ہو گیا اور اس نے ایک نام کے ساتھ کسی کے عکس کو میرے ذہن کے اسکرین پر روشن کر کے پیش کر دیا۔ یہ نام تھا نیلم کا۔ جو برسوں پہلے اتنا ہی اہم تھا جتنا آج شبنم کا یا قمر کا نام مگر پھر گزرتے وقت کے ماہ و سال کی گرد میں دھندلاتے دھندلاتے میں اس نام اور اس سے وابستہ ہر یاد کو بھول گیا۔ اس کا تصور اور خیال بھی لاشعور کی گہرائی سے تحت الشعور کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

اب اس کا نام یاد آیا تو مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ یکلخت زندگی کی کتاب کا ایک پچھلا باب ایسے کھل گیا کہ میرے لیے دس سال پہلے کا وقت آج کا لمحہ گزراں بن گیا۔ مجھے اس کا چہرہ، اس کا انداز تبسم و تکلم۔ اس کے پیکر کے خطوط، اس کا رنگ، پیراہن اور خوشبوئے زلف۔ اس کی ساری مہربانیاں، اس کا گھر، اس گھر کے در و دیوار سے آشنائی کا ہر انداز۔ اور اس کی زندگی کے روز و شب کے سب حوالوں سے اپنی وابستگی کا ہر سلسلہ۔ یہ سب اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ یاد آیا۔ شناسائی کے پہلے دن سے آج کی لاتعلقی کے دن تک جو بھی تھا، سب ایک لمحے میں پوری فلم کی طرح گزر گیا۔ اس فلم کا ہر سین ہر فریم یاد کر کے ہر عکس کو اس کی پوری تابانی تازگی اور خوبصورتی کے اجلے رنگوں کے ساتھ ایسے پیش کرتا تھا جیسے یہ کوئی دس سال پہلے کی فلم نہیں، وہ منظر ہے جو اس وقت بھی میرے گرد و پیش پر محیط اور میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔

شبنم نے میرے پاؤں کو ٹھوکر ماری "اے، کہاں چلے گئے؟"

میں نے چونک کے کہا "میں نیلم کے گھر چلا گیا تھا۔"

"نیلم۔ کون نیلم؟" اس کی آنکھیں شوخی سے طنز کرنے لگیں۔

میں نے کہا "چلو۔ وہیں چلتے ہیں ہم۔ بس خدا کرے وہ گھر پر مل جائے۔"

میں شبنم کو وہاں کیا بتا سکتا تھا اور کتنا بتا سکتا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے پانچ منٹ گزر گئے تھے اور ایمبولینس کے صابر و شاکر قسم کے ڈرائیور کے لیے یہ آدھے راستے کی مشاورت جتنی پراسرار و معنی خیز تھی اتنی ہی ایمبولینس میں لیٹی ہوئی سوئی کے لیے باعث تشویش۔ چنانچہ میں اپنے فیصلے کی وضاحت کیے بغیر پلٹ کر پھر آگے ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا۔

اپنے اس فیصلے سے جو میں نے چند سیکنڈ میں سوچ سمجھ بغیر کر لیا تھا، میں اتنا مطمئن اور پرسکون تھا کہ خود مجھے حیرانی تھی اور اس سے زیادہ خوشی تھی کہ میری عقل نے یا کسی الہامی قوت نے بالکل صحیح وقت پر مجھ سے صحیح فیصلہ کرا دیا۔

میں نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو دوستانہ اعتماد کے ساتھ یہ بتا دیا کہ کسی وجہ سے اب ہم نے کہیں اور جانے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے جو زحمت ہوئی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ میرے اخلاق سے متاثر ہوا اور جواب میں اس نے بھی بڑے اخلاق سے کہا کہ جناب، ہم تو خادم ہیں۔ آپ جہاں کہو گے، لے جائیں گے۔ کچھ دیر بعد میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا جو میرے لاشعور میں موجود خطرے کے احساس کی پیداوار تھا کہ جیسے میں نے ڈاکٹر عائشہ کی زندگی سے اپنی پریشانیوں کے متعدی مرض کو دور کر لیا تھا ورنہ چھوت کے مرض کی طرح یہ پریشانیاں اسے بھی لاحق ہو سکتی تھیں۔ ایسے ہی مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں خطرے کے مسلک مرض کے جراثیم لے کر نیلم جیسی مخلص اور مہربان دوست کے گھر پہنچ جاؤں اور اس کی پرسکون، محفوظ اور آسان زندگی کو پُرخطر اور مشکل بنا دوں۔

میں نے ایک چھوٹی سی احتیاط کی۔ نیلم کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی میں نے ایمبولینس کو ایک پرائیویٹ اسپتال کے گیٹ پر رکوا لیا۔ شبنم کو کچھ بتائے بغیر میں اندر گیا اور ایک ملازم کے ساتھ وہیل چیئر لے کر لوٹا۔ میں نے سوئی کو وہیل

چیئر میں بٹھا کے ملازم سے کہا کہ اسے وہ ویٹنگ روم میں لے جائے۔

"یہ نیلم۔ کوئی ڈاکٹر ہے؟" شبنم نے کہا۔

"جو کسی کے دکھ درد یا فکر و غم کا مداوا کرے کیا وہ مسیحا نہیں ہوتا؟" میں نے ایک فلسفیانہ متانت کے ساتھ کہا۔

"تم نے گھر کہا تھا، کیا نیلم اسپتال میں ہی رہتی ہے؟" شبنم نے میرے گول مول جواب کو پسند نہیں کیا۔

استقبالیہ پر جانے سے پہلے میں نے ایک دیوار پر لگے ہوئے تقریباً دس فٹ چوڑے اور آٹھ فٹ اونچے پلائی وڈ کے پالش کیے ہوئے بورڈ کا مطالعہ کیا جس پر اوپر سے نیچے تک چار قطاروں میں مختلف امراض کا علاج کرنے والے ماہر ڈاکٹروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ہر نام کے ساتھ مہارت کا شعبہ اور ڈاکٹر کی ڈگریوں کے ALPHABETS کا سلسلہ تھا جو سب باہر سے حاصل کی جانے والی ڈگریوں کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے نیچے یہ بھی درج تھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کن مخصوص ایام میں کس وقت دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر میں معصوم صورت بنا کے استقبالیہ تک گیا اور ایک مجبوری میں مسکرانے والی قدرے فربہ بدن حسینہ سے پوچھا کہ میں ڈاکٹر فلاں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کی جبری مسکراہٹ کافور ہو گئی اور اس نے خاصی بیزاری سے مجھے مختصر جواب دے کر فارغ کرنے کی کوشش کی کہ وہ شام کو چھ بجے ملتے ہیں مگر پہلے سے اپائنٹ منٹ لینا ضروری ہے چنانچہ آج تو ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شبنم کچھ فاصلے پر سوئی کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے چند منٹ بعد وہیل چیئر اندر لانے والے کو پھر زحمت دی کہ وہ مریض کو اسپتال سے باہر پہنچا دے۔ میں خود آگے نکل گیا۔ شبنم میرے رویے سے خاصی کنفیوز ہو رہی تھی مگر خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ باہر آ کے میں نے سڑک پر سے گزرنے والی ایک ٹیکسی روک لی اور جب ملازم سوئی کو وہیل چیئر پر لے کر آیا تو میں نے سوئی کو پچھلے والی سیٹ پر منتقل کر کے ایک آہ بھری "کیا کریں یار۔ جب ضرورت ہے تو ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں۔ اب ہم شام تک تو بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ بڑی مہربانی" میں نے اسے پانچ روپے پیش کیے اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی والے نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا "ہاں جی!"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "کیا ہاں جی؟"

"کہاں جانا ہے؟ کچھ بتاؤ گے یا ایسے ہی بیٹھے رہو گے"

وہ بولا۔

میں نے خوش دلی سے کہا "تم چلو پہلے تو سہی آباد۔ آگے میں راستہ بتاؤں گا۔ یا تم کو معلوم ہے نیلم کہاں رہتی ہے؟"

اس نے گاڑی آگے بڑھا دی "پتا نہیں، ایسی کون سی نیلم ہے۔"

میں نے کہا "یار، بڑی مشہور ہیروئن ہے۔ پہلے تو بہت فلموں میں آتی تھی۔ اب فلمیں ہی کہاں بن رہی ہیں ایسی۔ اور نئی نئی آ گئی ہیں جن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ایک فلم کامیاب ہونے سے۔ خود ہی اپنے آپ کو نمبر ون کہنے لگتی ہیں اور دوسروں پر کیچڑ اچھالنے لگتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ خود بھی کیچڑ سے ہی اٹھ کے آئی تھیں۔ اب دودھ کی دھلی بن گئی ہیں۔"

ظاہر ہے یہ سب ٹیکسی ڈرائیور سے دوستی بڑھانے یا اسے امپریس کرنے کے لیے نہیں تھا۔ میں شبنم کو بتانا چاہتا تھا کہ نیلم کون ہے؟ نیلم کو آج بھی سب فلم بین صف اول کی آخری اداکارہ قرار دیتے تھے کیونکہ اس کے بعد دو نمبر اور تین فلموں کے ساتھ ہی سب دو نمبر اور تین نمبر ہو گئے تھے۔ کیا اداکار، ہدایت کار یا موسیقار۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ سب ہی فلموں کے سین، کہانیاں اور دھنیں چرا رہے تھے اور معیار کی پروا کیے بغیر چالو کام کر رہے تھے۔ شبنم اپنے صحافتی پس منظر کے باعث ایسے سب لوگوں کے بارے میں جانتی تھی جن کی نجی زندگی بھی پبلک پراپرٹی بن جاتی ہے خواہ ان کا تعلق شوبز، اس سے ہو، کرکٹ سے یا سیاست سے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نیلم کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہو گی لیکن وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ میں نیلم کو گھر کے ایک فرد کی طرح جانتا ہوں اور اس کے گھر میں رہ چکا ہوں۔ یہ اتفاق تھا کہ میں نے جب شبنم کو اپنے پرانے ماضی کی کہانی سنائی تو اس میں یتیم خانے کی زندگی کا حال آیا۔ اس دور کا حوالہ آیا جب میں شاہ جی کے ڈیرے پر شادو سے ملا تھا اور اس کے عشق کی دلدل میں ایسا غرق ہوا تھا کہ اگر موت اسے مجھ سے جدا نہ کرتی تو شاید آج بھی میں اس کے ساتھ ہوتا۔ اور اس کے چار چھ بچوں کا باپ بن گیا ہوتا۔ میں نے شبنم سے چندا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی نہیں چھپایا تھا اور پھر کہانی کو ایک ڈرامائی موڑ دے کر اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں ہی ناصر عظیم سے شاہ عالم بن گیا تھا۔ چنانچہ چندا کی مجھ سے بدگمانی ایک فطری بات تھی۔ میں کئی سال دولت اور اقتدار کے چکر میں شاہ عالم بنا رہا۔ میں نے رخشی سے شادی کی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم سے بھی مراسم رکھے۔ نتیجہ یہ کہ آج چندا مجھ سے نفرت کرتی ہے اور جب میں ڈھٹائی سے اس کے سامنے جا کے پھر ناصر عظیم بنتا ہوں تو اس کے حسد اور عناد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

شبنم نے میری بات پر یقین کیا تھا اور مان لیا تھا کہ شاہ عالم مرا نہیں زندہ ہے۔ اس جھوٹ کو تسلیم کرنا اس کی اپنی مجبوری بن گیا تھا۔ اس کے بغیر وہ خود بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور میرا یہ جھوٹ خود چندا کی' قمر کی اور ڈاکٹر کمال کی گواہی کی مضبوط بنیادوں پر کامیابی سے استوار تھا۔ میرے ماضی کا ہر حوالہ مستند تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب میں نے شبنم پر ناصر عظیم کے ماضی کے بند دروازے کھولے تو کچھ دریچے کھلے سے رہ گئے۔ کچھ حوالے میں نے غیر اہم سمجھتے ہوئے نظرانداز کیے تو کچھ غیر ضروری جان کے چھپا لیے۔ ایسا ہی ایک حوالہ ڈاکٹر مشہود کا تھا اور ان کی بیگم سے میرے تعلق کا تھا جنہوں نے پہلی بار مجھے حسن و رعنائی کی اس بیکراں دنیا کے مدہوش کن نظاروں سے اور تجربات سے روشناس کرایا تھا جو مرد کے لیے دست قدرت کی صناعی نے عورت میں مجسم کر دیے ہیں۔ آج مجھے اس آغاز بلوغت کے سنسنی خیز دور کے تذکرے پر بھی خجالت محسوس ہوتی تھی۔ بس اسی طرح نیلم کے ساتھ میرے تعلق کا ذکر بھی نہیں آیا تھا ورنہ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس پر میں شبنم کے سامنے شرمندہ ہوتا۔

ٹیکسی جب ایک قصر عالی شان کے مقابل ٹھہر گئی تو میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا "کیا ہوا؟"

اس کے نزدیک یہ سوال احمقانہ ہی ہو سکتا تھا "ہونا کیا ہے۔ تم نے نیلم کے گھر جانے کے لیے کہا تھا نا' آگیا اس کا گھر۔"

میں نے اس دیہاتی کی طرح محسوس کیا جسے کوئی چڑیا گھر دکھانے لے جائے تو وہ حیران ہو کہ یہاں تو شیر چیتے اور ہاتھی ہیں۔ کیا یہی ہے چڑیا گھر؟ میں نے اپنی حیرت کے تاثرات کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ "اچھا۔۔۔ اب یہاں رہتی ہے وہ۔ خیر' یہ لو تم اپنے پیسے۔ مگر ایک منٹ ٹھہر جاؤ' میں ذرا معلوم کر لوں۔"

"کیا معلوم کر لوں؟" ڈرائیور نے بدمزگی سے کہا۔

مگر اسے جواب دینے کے بجائے میں نے گیٹ کیپر سے رجوع کیا جو خطرناک قسم کا اسلحہ اٹھائے مجھے زیادہ خطرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

"نیلم ہے گھر پر؟" میں نے پراعتماد متانت اور بے تکلفی کے ساتھ سوال کیا۔

گیٹ کیپر کو میرے لہجے نے اور حلیے نے جتنا حیران کیا اس سے زیادہ ناراض کیا "اگر میڈم ہیں تو کیا؟"

میں نے کہا "اپنی میڈم کو بولو کہ ناصر عظیم آیا ہے۔"

"کون ناصر عظیم!" بڑے فلم اسٹارز کے سیکیورٹی گارڈز کی طرح وہ کسی نام سے متاثر ہونا نہیں جانتا تھا اور اگر میں اسے کہتا کہ میں وزیراعظم ہوں تب بھی وہ اتنے ہی جارحانہ لہجے میں پوچھتا کہ کون وزیراعظم۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اوقات یاد دلانے والے سرد لہجے میں کہا۔ "روز کتنے ناصر عظیم اندر جاتے ہیں نیلم سے ملنے؟ اور یہ تو خود نیلم تم سے بعد میں پوچھے گی کہ اگر یہاں پہلے بھی کوئی ناصر عظیم آیا تھا تو کب؟"

اب وہ واقعی ڈر گیا اور اس نے ایک دیوار پر نصب انٹرکام کا بٹن دبا کے کسی سے بات کی "کوئی بندہ آیا ہے میڈم سے ملنے۔ ٹیکسی میں۔ دو عورتیں بھی ساتھ ہیں۔ داڑھی مونچھیں اور بڑے بڑے بال ہیں۔ ناصر عظیم نام بتا رہا ہے۔ نہیں جی' وہ تو کھڑا ہے گیٹ پر۔ ہاں آپ پوچھ لو۔"

چوکیدار نے ریسیور رکھ کے مجھے حکم دیا "ادھر سے ہٹ جاؤ۔"

میں نے غرا کے کہا "ادھر سے ہٹ کے کہاں جاؤں۔ کیا تمہیں کھڑا ہونا ہے اس جگہ جہاں میں کھڑا ہوں؟"

"او یار! میڈم کے سیکریٹری ابھی بات کر کے بتائیں گے۔ تم کھڑے ہو بالکل گیٹ کے سامنے۔"

میں نے کہا "گیٹ کے سامنے تو تم بھی کھڑے ہو۔ کیا میرے کھڑے ہونے سے ہوا کا راستہ رک رہا ہے یا ٹریفک میں خلل پڑ رہا ہے۔"

چوکیدار کی آنکھوں میں خون اتر آیا "کیسا عجیب آدمی ہے۔"

"کیا چیز عجیب ہے؟" میں نے کہا "گدھے کی طرح میرے سر پر سینگ نکلے ہوئے ہیں یا میری دم ویسی نہیں ہے جیسی تمہاری ہے۔ یا میں تمہیں سر کے بل کھڑا ہوا نظر آ رہا ہوں؟"

وہ پریشان ہو گیا "خدا کے لیے مجھے معاف کرو بابا!"

میں نے کہا "بابا! میں بڈھا بابا لگتا ہوں تمہیں اور اس فضول بات کا مطلب کیا ہے آخر؟ ایسا تو بھیک مانگنے والے فقیر سے کہا جاتا ہے۔"

انٹرکام پر نیلم کی آواز ابھری تو اس کی جان چھوٹی "کون ہے؟"

چوکیدار سے پہلے میں نے کہا "ناصر عظیم اور کون۔۔۔ تمہاری یادداشت اتنی خراب تو نہیں ہو سکتی۔"

حسب توقع اس نے ایک پرمسرت حیرانی سے بھرپور ہسٹریائی چیخ مار کے میرا نام دہرایا اور پھر اندر فون رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ گیٹ پر خود مجھے لینے آئے گی۔ چوکیدار نے مجھے افسوس ناک سوالیہ نظروں سے دیکھنا جاری رکھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے سہلایا "نیلم کا یہ حال کب سے ہے۔ یہ دورے اکثر پڑتے ہیں پاگل پن کے؟"

"ہیں جی۔۔۔" چوکیدار کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئیں۔

"ایسے چیخ پکار ہی کرتی ہے یا کچھ توڑ پھوڑ بھی؟" میں نے کہا۔

اسی وقت چھوٹا گیٹ کھٹ سے کھلا اور نیلم حواس باختہ نمودار ہوئی۔ اندر کہیں اس کا میک اپ ہو رہا تھا جب سیکریٹری نے اسے میرا نام بتایا۔ وہ اسی طرح اٹھ کے باہر چلی آئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پھر چلا کے کہا۔ "ناصر!" اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے معلوم نہیں بے تکلفی کے اس مظاہرے سے بے چارے چوکیدار کے دل پر کیا گزری اور وہ پٹ سے گر کے بے ہوش کیوں نہیں ہوا۔ میں اس کی صورت کے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ تاہم مجھے اندازہ تھا کہ پیچھے ایک ٹیکسی ڈرائیور شبنم اور سونی کے علاوہ سامنے والی کوٹھیوں کے چوکیدار اور چند غیر متعلقہ لوگ بھی نیلم کو حقیقی زندگی کے ایک ایسے منظر میں دیکھ رہے تھے جو بعض اوقات فلم سنسر بورڈ کے شرمیلے اور نابالغ اراکین پر بھی گراں گزرتا ہے۔

نیلم کے منہ پر نہ جانے کس چیز کا ماسک لگا ہوا تھا اور اس کے بالوں میں کلپ اور پنوں کے کیل کانٹے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اسے فوراً الگ کر دیا کیونکہ وہ مسلسل پوچھ رہی تھی۔ "تم ناصر ہی ہو نا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"معاف کرنا جی! میں تو ناصر عظیم ہوں لیکن مجھے نیلم سے ملنا تھا۔" میں نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ ہنسنے لگی "بدمعاش۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟"

میں نے کہا "اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تم نے پہچان لیا ہے مجھے اور تم نیلم ہی ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ غلط جگہ آ گیا۔ خیر' میں اکیلا نہیں ہوں۔"

نیلم مجھے ہاتھ پکڑ کے اندر لے جاتے ہوئے رک گئی "اور کون ہے۔ اچھا ہاں' ٹیکسی میں آئے ہو نا تم۔ یہ خواتین کون ہیں؟ تمہاری بیوی ہو گی ایک تو۔"

میں نے کہا "کیا دوسری بھی بیوی نہیں ہو سکتی؟ خیر میں انہیں لاتا ہوں۔ تم ان کی مستقل رہائش کا بندوبست کرو کیونکہ یہ بلائے جان قسم کے مہمان ہیں۔ جگہ کی کمی ہو تو خود کہیں اپنے رہنے کا انتظام کر لو۔"

شبنم نے پہلے اتر کے نیلم سے ہاتھ ملایا "میرا نام شبنم ہے۔"

"ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ وہی روبن گھوش والی شبنم ہیں۔ ایک نئے جادو اثر طریقہ علاج نے ان کی عمر کا سفر پیچھے کی طرف شروع ہو گیا ہے۔ تمہارا فلمی مستقبل خطرے میں ہے" میں نے سہارا دے کر سونی کو اتارا۔

شبنم نے کہا "میں ایک جرنلسٹ ہوں۔"

نیلم نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ بات ہے نا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ تمہارا چہرہ دیکھا ہوا کیوں لگتا ہے۔"

"میں نے کہا "یہ ہے میری چھوٹی بہن' سونی آف جاپان!"

نیلم کا چہرہ پل بھر کے لیے سوالیہ نشان بنا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بہن بھائی ہی کیا' مجھے تو ماں باپ کا رشتہ بھی میسر نہ تھا۔ چوکیدار نے اتنی دیر میں گیٹ پورا کھول دیا تھا' اب وہ بالکل این شن کھڑا تھا اور مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے انوکھا اور ناقابل فراموش تجربہ تھا کہ کسی ایرے غیرے سے لے کر وی آئی پی تک سب کو انکار کر دینے والی نیلم مجھ سے ملنے کے لیے فرط اشتیاق میں دروازے تک دوڑی چلی آئی تھی اور دیکھنے والوں کی نظریں دیکھے بغیر میرے گلے لگ گئی تھی۔ یہ صرف محبت کے جذبات کا اظہار تھا جس کی نوعیت رشتے کے ساتھ کہیں نہیں بدلتی۔ ماں اپنے بیٹے سے' بیوی اپنے شوہر سے یا بہن اپنے بھائی سے برسوں بعد ملے تو یہ محبت کا جذبہ ایسے ہی سیلابی ریلے کی طرح احتیاط اور تکلف کے سارے بند توڑ دیتا ہے اور ہر بار اتنا ہی سچا' خالص اور شفاف ہوتا ہے جتنا قطرۂ شبنم یا پہاڑوں کی برف کے پگھلنے سے وجود میں آنے والے پانی کا چشمہ جو کانغان میں ہو یا سوئزرلینڈ میں۔ اس کے پانی میں ایک سی پاکیزگی اور طہارت ہوتی ہے۔

شبنم نے سہارا دے کر سونی کو ٹیکسی سے اتارا اور گیٹ تک لائی تو نیلم نے آگے بڑھ کے اسے دوسری طرف سے پکڑ لیا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں' کیا تم بیمار ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اسے میں تمہارے پاس علاج کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے لایا ہوں۔"

نیلم نے اسے شفقت سے دیکھا "اسے اپنا ہی گھر سمجھو سونی۔ یہ تمہارا نامعقول بھائی تمہیں آج تک یہاں نہیں لایا کیا ہوا؟"

سونی مسکرانے لگی "شکایت تو مجھے کرنی چاہیے۔"

میں نے شبنم کی طرف اشارہ کیا "خاتون پوچھ رہی تھیں کہ کیا نیلم کوئی ڈاکٹر ہے؟"

شبنم نے کہا "اور میں کیا سمجھتی' میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ آپ کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے انہوں نے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

نیلم ہنسی "ایسے ہی ہوتے ہیں یہ پالتو جانور جسے شوہر کہتے ہیں۔ میں نے اسی لیے یہ روگ نہیں پالا۔"

شبنم کا چہرہ لال ہوگیا۔ دراصل یہ میرا اور اس کا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا انداز تھا جس نے نیلم کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ میں نے شبنم کو بڑی بے تکلفی سے خاتون کہا تھا لیکن جواب دیتے ہوئے شبنم نے خالص مشرقی بیویوں کے اسٹائل میں میرے نام کی جگہ "یہ" اور اس کے بعد "انہوں نے" جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ وضاحت یا تردید کا موقع ملنے سے پہلے ہم وسیع لان اور باغ کے عین درمیان سے گزر کے نیم دائرے میں پورچ تک جانے والے سرخ بجری سے بچھے راستے کو عبور کر چکے تھے اور اس خوبصورت محل میں داخل ہوگئے تھے جس کے باہر صرف چوکیدار ہی نہیں ایک ملازمہ اور ایک باوردی شوفر بھی بکا کا کھڑے ہوئے تھے۔ شوفر پورچ میں کھڑی شاہانہ اطوار رکھنے والی ایک لینڈ کروزر کو محض ناز پروری کے لیے مزید چمکانے کا شوق بھی پورا کر رہا تھا۔

جب نیلم نے سونی کو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر لٹایا تو مجھے ٹیکسی ڈرائیور کا خیال آیا کہ شاید وہ ابھی تک کرائے کے انتظار میں ستم کش انتظار ہوگا۔ "اسے تو میں بھول ہی گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو۔"

نیلم نے کہا "بیٹھو آرام سے۔ وہ چلا گیا ہوگا۔"

"کرایہ لیے بغیر؟" میں نے کہا "کیا ضروری ہے کہ ہر ٹیکسی ڈرائیور تمہارا ایسا پرستار ہو کہ تمہارے دیدار حسن کو ہی بکافی سمجھے۔"

"اوہ۔ چوکیدار نے دے دیا ہوگا کرایہ بھی۔ تم بیٹھو' چند منٹ میں ذرا تیار ہو کے ۔۔۔ میرا مطلب ہے چہرہ صاف کر کے اور کپڑے بدل کے پھر آتی ہوں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ دس سال بعد نظر آئے ہو' میں تو سمجھی تھی۔"

میں نے کہا "کہ کہیں مر کھپ گئے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ تم جیسے ڈھیٹ اتنی آسانی سے مرتے بھی کہاں ہیں۔ تم لوگ چائے پیو پہلے۔"

وہ اندر غائب ہوگئی اور میں نے اسے کسی سے کہتے سنا "دیکھو' اندر چائے کافی سب بھیجو اور فون کردو میں آج نہیں آسکتی۔"

معلوم نہیں کس نے کہا "لیکن میڈم۔۔۔؟"

"لیکن ویکن چھوڑو۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ ڈیٹس کا سارا شیڈول گڑبڑ ہو جائے گا' ہونے دو۔ بتا دو کہ میڈم کو ایک سو چار یا چار سو ایک بخار ہے" وہ خوشی میں ہنسی۔

میں اٹھ کے اندر چلا گیا "یہ مت کرو۔ ہماری وجہ سے دوسروں کا نقصان کیوں ہو؟"

اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا "ناصر' میرا کوئی موڈ نہیں۔"

میں نے کہا "نیلم کام تو کام ہے اور ہم کہیں جا تو نہیں رہے ہیں۔ باتیں کرنے کے لیے بہت وقت ہوگا بعد میں۔"

اس کے سامنے کچھ متفکر اور موڈب کھڑے ہوئے پچاس سال کے معزز اور باوقار شخص نے ممنونیت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ نیلم نے کہا "پکا وعدہ' تم جاؤ گے نہیں۔ ویسے تو میں کہہ جاؤں گی چوکیدار سے کہ کسی کو باہر نہ جانے دے پھر تم جا کے دکھانا۔"

میں نے کہا "نیلم۔ سونی یہاں رہے گی۔ مجھے اور شبنم کو بھی اپنے کام ہیں لیکن ہم آتے جاتے رہیں گے۔"

"اگر میں شوٹنگ ڈیٹ پر چلی گئی تو پھر رات تک چھٹکارا نہیں ہوگا۔ سیکریٹری صاحب' مجھے پتا ہے۔"

سیکریٹری نے کہا "آپ ایک دو گھنٹے بعد جا سکتی ہیں۔"

نیلم نے چٹکی بجائی "ویٹ از بیٹر۔ ناصر' تم بیٹھو یا فریش ہونا چاہو تو تمہاری مرضی۔ گھر دیکھو میرا' اور اپنی بیوی کو بھی دکھاؤ' جو چاہو کرو۔"

میں نے کہا "مس نیلم! یہ غلطی دوسری بار کر رہی ہیں آپ' وہ میری بیوی ہرگز نہیں ہے۔"

"اچھا!" وہ حیران ہوئی اور ہنس پڑی "پھر لگتی کیوں ہے تمہاری بیوی۔ خیر' میں ابھی آئی دس منٹ میں۔ اس حلیے میں بیٹھ تو نہیں سکتی سب کے سامنے۔"

وہ ایک دروازے کے پیچھے غائب ہوگئی تو سیکریٹری نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میرا نام عبدالرحمان ہے سر۔ میں سیکریٹری ہوں میڈم کا چھ سال سے۔"

"اور میرا نام ناصر عظیم ہے۔ نیلم اور میں بہت پرانے دوست ہیں۔ صرف دوست" میں نے کہا اور لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

وہاں شبنم کچھ ناخوش سی بیٹھی تھی "تم بہت پُراسرار آدمی ہو۔"

میں نے کہا "یہ تمہیں آج پتا چلا۔"

"ناصر' ہم یہاں نہیں رہیں گے" شبنم فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"کیا تم جیلس FEEL کر رہی ہو" میں نے کہا۔

"ہاں کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ تم نے آج تک اپنے اور نیلم کے تعلق کو مجھ سے جانتے بوجھتے چھپائے رکھا۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "اس کیوں کا میرے پاس واقعی کوئی جواب نہیں۔ رہی جیلس ہونے کی بات تو کل پوچھوں گا تم سے کہ اب تمہارا کیا خیال ہے۔ ابھی تم نیلم سے ملی کہاں ہو۔ صرف دیکھا ہے تم نے اسے۔"

سونی بہت خوش اور کچھ EXCITED تھی "مجھے تو ابھی تک بالکل یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ وہی نیلم ہے جسے میں نے آج تک صرف سینما کے اسکرین پر دیکھا تھا۔ اتنی سیدھی سادی اور اتنی عام سی لڑکی۔ کتنی اپنائیت کے ساتھ ملی ہے۔"

میں نے کہا "شاید تمہارا خیال بھی کل تک بدل جائے۔ شبنم ضرور جانتی ہوگی کہ وہ کتنی بددماغ' آدم بیزار اور مغرور سمجھی جاتی ہے۔"

"ہاں۔ میں خود حیران ہوں اسی لیے۔ وہ تو کسی سے بھی نہیں ملتی کام کے بغیر۔ کسی کو انٹرویو نہیں دیتی۔ فلمی صحافی اس کے رویے سے سخت نالاں اور مایوس ہیں کہ نہ کوئی اسکینڈل بنتا ہے اس کا نہ وہ کسی افواہ کی تردید کرتی ہے۔ جس کا جو جی چاہے لکھے۔ اب لکھتا بھی کوئی نہیں۔"

"ہاں' فائدہ کیا لکھنے کا جب نہ کوئی بلیک میل ہو نہ چٹخارے۔ تم سے کب ملاقات ہوئی تھی کہ اسے تمہاری صورت یاد رہی" میں نے کہا۔

شبنم بولی "دیکھا ہوگا ایوارڈ کی کسی تقریب میں یا کسی فلمساز کی تقریب میں۔ دو چار مرتبہ گئی ہوں میں مہورت پر۔ شوبزنس میرا فیلڈ نہیں تھا۔"

سونی نے حیرانی کا اظہار کیا "پھر بھی پہچان گئی وہ تمہیں؟"

شبنم نے کہا "ایکٹریس ہے نا۔ موڈ نہ ہوتا تو ناصر کے لیے بھی اجنبیت کے جذبات طاری کر لیتی اپنے چہرے پر۔"

میں نے اسے غصے سے دیکھا "اگر ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تمہیں تو بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔ کیا فائدہ اپنے ساتھ دوسروں کا موڈ خراب کرنے سے۔ شام کو یا کل ملاقات ہوگی۔ آج تو ناممکن ہے کہ نیلم آنے دے۔"

سونی نے کہا "میں تو اب یہیں رہوں گی کچھ دن۔ بڑا مزہ آئے گا۔ نیلم کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے جاؤں گی۔ بہت شوق تھا مجھے مگر یہ معلوم تھا کہ اسٹوڈیو کے اندر کوئی گھسنے بھی نہیں دیتا۔"

شبنم نے کچھ سبکی محسوس کی تھی۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کا رنگ فق ہوگیا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا "تمہیں میں ایسے چھوڑنے والی نہیں۔"

"تو پھر یہ سمجھ لو کہ نیلم کے ساتھ صرف میرے ہی نہیں' رئیس کے بھی اتنے ہی پرانے مراسم ہیں اور مجھ پر بڑے احسانات ہیں نیلم کے۔ جب شادو بیمار تھی اور اس کے مرنے کے بعد۔ اگر نیلم مجھے نہ سنبھالتی تو شاید میں زندہ ہی نہ رہتا۔ میں خودکشی کر لیتا یا ڈیپریشن کا شکار ہو کے نشہ کرنے لگتا۔ پاگل خانے پہنچ جاتا۔ تم اسے صرف ایکٹریس مت سمجھو یا دیبی ایکٹریس مت سمجھو جیسی تمہارے تصور میں ہے۔"

"اوکے! آئی ایم سوری۔" شبنم نے آہستہ سے کہا۔

سونی نے فوراً موضوع بدل دیا "ناصر۔ کتنا خوبصورت ہے یہ گھر۔"

میں نے کہا "گھر نہیں' بالکل پریوں کا محل ہے۔"

"ہاں۔ ایک پری جو رہتی ہے یہاں" شبنم نے کہا۔

اچھا ہوا کہ اس وقت ایک ملازمہ چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آگئی۔ اس نے باری باری ہم سب سے پوچھا کہ ہم چائے لیں گے یا کافی اور ہر ایک کی پسند کے مطابق چینی ڈال کے سنہرے نقوش والے آسمانی رنگ کے نازک مگ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ یہ انتہائی نفیس اور بیش قیمت سیٹ بھی نیلم کے حسنِ ذوق کا مظہر تھا پھر نیلم بالکل بدلے ہوئے انداز میں ایک خاتون کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس چہرے پر اب کوئی ماسک نہیں تھا اور اس کے کپڑے بھی بدل گئے تھے۔ اس کے بال اب کھلے ہوئے تھے اور شانوں کے اوپر سے کمر تک پھیل گئے تھے۔

ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے پلٹ کر سائے کی طرح ساتھ آنے والی عورت کو ڈانٹ دیا۔ "خدا کے واسطے چائے تو پینے دو مجھے سکون سے۔ چلو جاؤ' آدھے گھنٹے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آجانا۔"

اس عورت نے ہڑبڑا سا منہ بنایا اور زیرلب کچھ کہتی ہوئی واپس نکل گئی۔ نیلم ہمارے درمیان والے صوفے پر ایسے بیٹھ گئی کہ بیک وقت سب کے ساتھ آسانی سے بات کرسکے۔ اب وہ میرے بائیں جانب تھی۔ سامنے شبنم تھی اور سیدھے ہاتھ پر سونی پہلے لیٹی ہوئی تھی مگر چائے آتے ہی اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"ہاں جی۔ اب بولو' یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ یہ فالتو بالوں کا بوجھ کیوں اٹھائے پھر رہے ہو؟" نیلم اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

میں نے کہا "دنیا کو دھوکا دینے کے لیے۔"

وہ ہنسی "یعنی پرانے کام چھوڑے نہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ پتا نہیں بندہ مجذوب ہوگیا ہے یا سکھ بن گیا ہے۔ چلو' سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ آخر تم تھے کہاں اتنے دن سے اور آج کیسے یاد آگئی نیلم کی؟"

میں نے کہا "یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ابھی میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تھا اسی شہر میں اور جواب دوسرے سوال کا غالب کی زبان میں یہ ہے کہ۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا"

"اپنی سمجھ میں بس دوسرا حصہ آیا۔ خیر' یہ معاملہ تو پھر بہت سنگین ہوگیا کہ تم اس شہر میں رہ کے بھی نہیں ملے۔ فون تک نہیں کیا۔ اتنے خودغرض اور مطلب پرست تو نہیں تھے تم۔"

میں نے خفت سے کہا "بس' اس کے سوا کیا کہوں اپنی صفائی میں کہ نہیں تھا تو دنیا نے بنا دیا۔ اب جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں' تم سناؤ؟"

"میں کیا سناؤں' میری زندگی تو کنوئیں کے مینڈک کی طرح اسی ایک جیسی مصروفیت کے دائرے میں گزر رہی ہے اور گزرتی رہے گی" وہ بولی۔

"ہمت ہے تمہاری کہ تم ابھی تک بور نہیں ہوئیں۔"

وہ ہنسی "یہ تمہیں کیا معلوم لیکن بور ہو کے آدمی کہاں جائے' کیا کرے۔ یہ دولت مندی' شہرت اور گلیمر کی دنیا بھی ایک قید خانے سے کم تو نہیں۔ خود اپنے بنائے ہوئے زنداں سے نکل سکتا ہے کوئی؟"

میں نے کہا "شادی کرسکتی تھیں تم۔"

وہ ہنس پڑی "یعنی جیل کی اے کلاس سے خودسی کلاس قبول کرلیتی' ساری عمر کے لیے اور یہ مشورہ مجھے دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو' میں نے شادی کی تھی۔"

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ ہمارے درمیان گزرے ہوئے وقت کا ایک درد مشترک جاگ اٹھا۔ اچانک وہاں سے شادو کے احساس نے ہمارے خیالوں پر ایسے تسلط حاصل کرلیا جیسے وہ ایک نظر نہ آنے والے وجود کے ساتھ وہیں موجود ہے۔ اپنی تمام دلنوازی اور شان محبوبی کے ساتھ۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ کی روشنی' اس کی آنکھوں کا اداس اجالا۔ اس کے قرب کی نرمی سے معمور خوشبو۔

یہ چند لمحے گزر گئے پھر نیلم نے کہا "شادو کی قبر پر جاتے ہو؟"

یہ سوال کسی بہت بڑی چٹان کی طرح لڑھک کر میرے اوپر آگرا۔ یوں کہ میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہوگیا۔ میں نے اس کرب آفریں بوجھ سے نجات پانے کے لیے سخت جدوجہد کی مگر میں انکار یا اقرار میں سر بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ ایک اور مجرم۔ خاموشی کے دوران میں نیلم چائے پیتی رہی کیونکہ وہ مجھ سے نظر نہیں ملانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے سوال پر شرمندگی تھی مگر وہ بات ایسی تھی کہ دل سے بے اختیار نکل کے زبان تک آگئی تھی۔ اسے روکنا شاید نیلم کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے شبنم کی اور سونی کی مطعون کرنے والی نظریں جواب کے انتظار میں مجھ پر مرکوز ہو کے رہ گئی ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

بالآخر سونی کو مجھ پر ترس آگیا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں یہاں آپ کے گھر میں ہوں اور آپ میرے سامنے ہیں۔ بالکل کسی خواب کی طرح لگ رہا ہے مجھے یہ سب کچھ۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے تک میں سوچتی کہ یہاں آکے رہوں گی تو یہ بالکل بھی ایسا ہی ہوتا جیسے میں امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس میں قیام کا سوچوں۔ خود کو پاگل سمجھتی میں۔"

نیلم مسکرائی "کیا یہی ہے تمہاری بیماری؟ ایسی باتیں کرنے کی۔ ورنہ دیکھنے میں بھی تم اچھی لگتی ہو بلکہ بہت اچھی لگتی ہو۔"

میں نے کہا "سونی کے یہاں رہنے سے تمہیں پرابلم تو نہیں ہوگی؟"

نیلم نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا "ان کے سامنے ایسی غیریت کی باتوں سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "نیلم۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے فون پر بات تک نہیں کی تھی تم سے۔ اور وہ تو خود بھلا کرے اس ٹیکسی ڈرائیور کا جو تمہارا پرستار تھا اور جانتا تھا کہ تم یہاں

رہتی ہو اب۔ میں تو اسے لے جاتا پرانے سمن آباد والے پتے پر۔ دس سال بعد بھی پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آگیا۔"

"بڑی مہربانی آپ کی" وہ بولی "مطلبی آدمی! پہلے کام بتاؤ؟"

میں نے کہا "تمہارے ایک فیملی ڈاکٹر تھے۔ میاں بیوی دونوں' جن کے پاس شادو رہی تھی۔"

"ہاں۔ وہ چلے گئے کینیڈا۔ چھ سات سال ہوگئے۔ فون کرتے رہتے ہیں بے چارے وضع داری میں۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے کیونکہ میں بالکل بھول جاتی ہوں' ان سے کیا کام پڑ گیا ایسا؟"

میں نے کہا "جب وہ موجود ہی نہیں ہیں یہاں تو پھر بات کرنے سے کیا فائدہ۔ میرا خیال تھا کہ سونی کے علاج میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔ بات کچھ ذاتی توجہ کی تھی اور کچھ رازداری کا بھی مسئلہ تھا۔"

نیلم نے مگ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے ایسے غور سے دیکھا جیسے اس کے کام کی خوبصورتی پہلی بار اس کے سامنے آئی ہو۔ "شادمان میں ایک پرائیویٹ کلینک ہے۔ مجھے دوبار وہاں رہنا پڑا۔ میں بہت زیادہ کام نہیں کرتی لیکن اس کام کے علاوہ بھی زندگی میں بہت سے دباؤ ہیں یا شاید میرے اعصاب پہلے جیسے نہیں رہے۔ یوں' مصروفیت میں ایک بڑی یکسانیت ہے اور یکسانیت کا تسلسل بعض اوقات ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔"

شبنم نے کہا "یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے آپ جیسی فنکارہ کے منہ سے۔ جن کے لیے زندگی میں صرف حسن ہے' کامیابی ہے' تعریف و توصیف ہے۔"

"ہاں" نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے۔ کاش ..... ناکامی کے چیلنج کا کوئی زمانہ آتا۔ یا مجھے ہائی ووڈ' بالی ووڈ سے آفر آجاتی مگر نہ نیچے نہ اوپر' میں درمیان کے سیدھے خط پر چلتی جارہی ہوں۔ اس کی ایک وجہ میری تنہائی پسندی کی عادت بھی ہے۔ ورنہ میں نکل جاتی کسی کے بھی ساتھ یورپ امریکا کی طرف' رومانٹک ایڈونچر میں کرہی نہیں سکتی۔ کسی کے عشق میں مبتلا نہیں ہوسکی آج تک حالانکہ چاہنے والے تو ہر قدم پر جان و دل ہتھیلی پر لیے نظر آتے ہیں۔"

شبنم نے اس کے خاموش ہوجانے کا انتظار کیا "تمہیں کوئی مرد پسند نہیں آیا آج تک؟ ایک بھی اس قابل نہ تھا۔"

"ہاں۔ بس اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اسے۔ یا پھر قسمت" اس نے خوش دلی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"کیا تم کو مردوں سے نفرت ہے؟" شبنم نے خالص صحافیوں والا سوال کیا۔

"نفرت!" نیلم ہنس پڑی "ان مردوں کی دنیا میں رہ کے کیا یہ ممکن ہے۔ نہیں' مجھے ایسا کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ بہت معقول اور متاثر کرنے والے مرد ملے مجھے لیکن یا تو وہ پہلے ہی کسی کے شریک سفر بن چکے تھے یا پھر انہوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔ مجھ میں ایسا کون سا گن تھا یا غیر معمولی صلاحیت تھی جو کسی کو متاثر کرے؟"

سونی نے کہا "کیوں' اتنی خوبصورت ہیں آپ اور اتنی اچھی ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہو شاید لیکن دنیا میں مجھ سے ہزار درجہ حسین لڑکیاں ہیں۔ تم اور یہ صحافی خاتون۔ تم کیا کم ہو کسی سے۔ شبنم واقعی فلموں میں آجاتی تو شبنم ثانی بن کے چھا جاتی لیکن یہ صحافت میں چلی گئی اور یہ ظاہر کا حسن پسند کرنے والے ہزاروں لاکھوں' ان پر کوئی ساری عمر کے لیے کیسے اعتبار کرے آخر؟ کل جب حسن نہیں ہوگا تو کیا یہ ایسے ہی رہیں گے۔ نہیں بی بی' اسی لاہور شہر میں مینا شوری تھی' لارا لپا گرل' ریحانہ تھی۔ خیر چھوڑو' ہم یہ کیا باتیں لے بیٹھے۔ ہم کسی اور مسئلے پر بات کررہے تھے۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں اس انٹرویو سے فرصت ملی۔ تم شادمان کے کسی پرائیویٹ کلینک کا ذکر کررہی تھیں۔ ہم شملہ پہاڑی کے پاس ایک ایسے ہی کلینک سے سیدھے یہاں آئے ہیں۔ عائشہ کلینک سے۔"

"اس کی تو بڑی شہرت ہے۔"

"ہاں مگر ہم سونی کو کسی بھی کلینک یا اسپتال میں رکھنا نہیں چاہتے۔ سب کچھ تمہیں ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ یہ بتاؤ' کیا تمہارے کہنے سے کوئی ڈاکٹر تمہارے گھر آکے سونی کو دیکھ سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

ہاں۔ ڈاکٹر عثمانی مجھے دیکھنے آتے رہتے ہیں۔ میں ان کی مستقل مریض ہوں۔ سارا سال انڈر آبزرویشن رہتی ہوں۔ مہینے میں ایک دوبار کسی بہانے سے چیک کرلیتے ہیں۔ کبھی اپنے گھر دعوت پر بلالیا' کبھی خود آگئے۔ دراصل وہ پوری فیملی ڈاکٹرز کی ہے۔ ان کی بیوی گائنی ہیں' ایک بیٹا ہے ای این ٹی اسپیشلسٹ' بہو چائلڈ اسپیشلسٹ ہے۔ بیٹی کی شادی کردی ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر ہے اور اس کا شوہر ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ سب اپنی فیملی کلینک کو مل کے چلاتے ہیں۔ باہر کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ رہتے بھی ایک ساتھ ہیں۔ دو کنال کی کوٹھی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی انکیسی میں بیٹی داماد ہیں اور باقاعدہ کرایہ ادا کر کے رہتے ہیں وہاں۔ اسپتال کے بعد کوئی ایک دوسرے کی پرائیویٹ لائف میں دخل نہیں دیتا۔ ویسے آپس میں رشتوں کا پورا احترام ہے اور لحاظ ہے۔ وہ واقعی نیوکلیئر فیملی کی مثال ہیں۔"

میں نے کہا "ہوں۔۔۔ اور یہ بزرگوار جو اس نیوکلیئر فیملی کے ہیڈ ہیں' ان کا شعبہ کیا ہے' کس فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے انہوں نے؟"

"نیورولوجی میں اور سائیکاٹری میں۔ بڑے زندہ دل بڑے میاں ہیں۔ ان کی بیگم اتنی ہی پرانے خیالات کی ہیں اور ان کے مقابلے میں پرانی لگتی ہیں۔ بہت ہنسی مذاق کی عادت ہے اور بیگم ایسی کہ مسکرانے سے بھی پرہیز ہے جیسے۔"

میں نے کہا "سب کچھ ٹھیک ہے۔ ان پر اعتماد کس حد تک کیا جاسکتا ہے' یہ زیادہ اہم ہے۔"

"تم کھل کے بات کیوں نہیں کرتے۔ ہر ڈاکٹر پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ویسے تو لیکن ڈاکٹر عثمانی کی فیملی سے میرے خصوصی مراسم ہیں۔ ان کے بچے تو ویسے ہی بڑے فین ہیں میرے اور بڑے خوش ہوتے ہیں جب میں ان کے گھر جاتی ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں ان کے ساتھ۔ کبھی باہر بھی چلے جاتے ہیں۔ ایک دوبار ایسے ہی رات کو رک گئی ان کے گھر۔ وہ ابھی مہینہ بھر پہلے سب آگئے اپنی اپنی گاڑی میں بھر کے اور یہاں رات بھر ہنگامہ کیا۔ اس سے پہلے بہت منائی انہوں نے میرے ساتھ۔ ان کے کہنے پر میں نے فلمی دنیا کے کچھ خاص لوگوں کو بلوالیا تھا۔"

میں نے کہا "تم نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟"

وہ حیران ہوئی "ہاں' کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

میں نے کہا "پھر دیکھو' اس میں سونی کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ دس لاکھ کا انعام رکھا گیا ہے اس کی گرفتاری کے لیے۔"

نیلم ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اس نے میری بات کو سمجھنے سے پہلے سونی کو' پھر شبنم کو اور بالآخر مجھے دیکھا "پولیس نے دیا ہے اشتہار؟"

"نہیں' ایک ملک رب نواز ہے' بااثر لوگ ہیں۔ سیاسی خاندان ہے اور روایتی قسم کے جاگیردارانہ ذہن کی سوچ رکھتے ہیں۔ انسان کو انسان اور قانون کو قانون نہ سمجھنا ان کی شان ہے۔ بین الاقوامی قسم کے اسمگلر بھی ہیں خیر سے۔ اشتہار ان کی طرف سے شائع کرایا گیا ہے۔"

نیلم سوچ میں پڑ گئی "آخر جرم کیا ہے اس کا۔ یہ تو اتنی بے ضرر سی لڑکی لگتی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ فرسٹ سیکنڈ ائیر میں پڑھتی ہوگی۔"

"اس کا جرم یہی ہے کہ کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔ ایک پرسنل معاملہ ہے بیک وقت ہم سب کے ساتھ ملک رب نواز کی دشمنی کا۔"

وہ بولی "کوئی اور کہتا تو میں نہ مانتی۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا؟" میں نے کہا۔

"مجھ سے نہیں بولو گے' یہ معلوم ہے مجھے۔"

میں نے کہا "یہ دس سال پہلے کا اعتماد ہی مجھے یہاں لے آیا تھا۔ ورنہ اتنے طویل عرصے میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ یہ توقع رکھنا کہ تم مجھ سے پہلے کی طرح ملوگی' یہ خوش فہمی نہیں تھی میری۔"

"ڈاکٹر عثمانی مجھے بیٹی کہتے ہیں۔ میں ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"دھوکا ایک ہی بار دیا جاسکتا ہے کسی کو مگر اس کے بعد آدمی ساری عمر کا اعتبار کھو دیتا ہے۔ ہمارے درمیان اور کیا رشتہ تھا۔ میرے اور رئیس کے درمیان' شادو کے اور میرے درمیان' تمہارے ساتھ۔ میں نے تو کبھی تمہاری کوئی فلم ہی نہیں دیکھی تھی۔ کتنا حیران ہوئی تھیں جب پہلی ملاقات میں تم نے بتایا تھا کہ میں نیلم ہوں تو میں نے کہا تھا کہ کون نیلم؟ اور تم نے کہا کہ فلمی ہیروئن تو میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں فلمیں نہیں دیکھتا۔"

وہ مسکرائی "اب بھی نہیں دیکھتے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں۔ انگلش فلمیں بہت دیکھی ہیں بعد میں۔ اب بتاؤ کیا خیال ہے؟"

"خیال' کس بارے میں؟" وہ بولی۔

"تم کچھ کرو گی یا میں "پھر لیں گے" کہہ کے جاؤں؟"

وہ ہنسنے لگی "تمہارے جانے کا تو خیر اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جانتے نہیں کہ صرف آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے' اب آگئے ہو تو رہو۔"

شبنم نے کہا "نیلم' مسئلہ صرف سونی کا ہے' ہمارا نہیں۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "شی از رائٹ۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گا اور نہ ہمارے تعلق کی نوعیت متاثر ہوگی اگر تم صاف کہہ دو کہ میں سونی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"

"اگر تم کو سو فیصد بھروسا نہیں تھا۔ تم سمجھتے تھے کہ انکار

کا رسک بھی ہے تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ مجروح لہجے میں بولی "سونی اب میری ذمے داری ہے۔ تم کو جانا ہے شبنم کے ساتھ تو جاؤ۔ آخر شادو کی ذمے داری بھی تو نبھائی تھی میں نے۔"

میں نے کہا "تھینکس۔ تم نے مجھے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ میرے یقین کو غلط نہیں ہونے دیا۔"

"میں آج ہی ڈاکٹر عثمانی کو بلالوں گی۔ کوئی ایمرجنسی تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں۔ سونی تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ ایمرجنسی کوئی نہیں ایسی۔ شام تک وہی دوائیں چل سکتی ہیں جو ڈاکٹر عائشہ نے لکھی تھیں۔"

شبنم نے گھڑی دیکھی "ہم اب چلتے ہیں۔"

"جانا تو مجھے بھی ہے۔ کھانا کھا کے چلے جانا تم بھی۔ کھانا لگ گیا ہوگا اب تو" وہ بولی اور عین اسی وقت ایک بٹلر نے اندر آکے اس کا اعلان بھی کردیا۔ نیلم کے حکم پر ایک ملازمہ اسے گیسٹ بیڈ میں لے گئی۔

شبنم نے میری طرف دیکھا "میں رئیس کو فون کردوں۔"

"ہاں۔ انہیں بتادو تاکہ ہم آتے ہیں ایک گھنٹے میں۔"

کھانے کی میز پر نیلم نے پوچھا "ناصر' تم کرتے کیا ہو آخر؟"

"میں بہت کچھ کرتا ہوں اور کچھ بھی نہیں کرتا۔ سونی یہاں ہے' وہ تمہیں سب بتادے گی۔ ابھی نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ تمہارے پاس۔ میں نے دنیا کا ہر کام کیا ہے' بھیک مانگنے سے سیاست تک۔"

"اور کامیاب نہیں ہوئے کہیں بھی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "شاید مجھے تیسی سے اترتے دیکھ کے اور میرے حلیے سے ایسا لگتا ہے۔ کسی حد تک ٹھیک ہی ہے تمہارا اندازہ۔ قسمت کو خراب بھی کہا جاسکتا ہے اور اچھا بھی۔ کچھ کیے بغیر بھی اچھی گزری ہمیشہ۔ تم جیسی حسین عورتوں کا سہارا ملتا رہا۔ دیکھ لو اس وقت بھی ایک نہیں دو ساتھ ہیں۔ ایک کو بہن بنایا ہے دوسری کو محبت کے جال میں پھنسالیا ہے۔"

اس نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا ناصر۔ تمہارے تو بڑے اونچے عزائم تھے۔"

میں نے آہ بھری "صرف عزائم سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اب بھی اونچے ہی ہیں۔ سوچتا ہوں بمبئی چلا جاؤں اور کوشش کروں' مادھوری ڈکشٹ سے شادی ہوجائے تو سب دلدر دور ہوجائیں۔ ورنہ یہاں کوئی مل اونر اپنا گھر داماد بنالے۔ کروڑوں کی لاٹری تو یہاں ہوتی نہیں۔ پرائز بانڈ کا انعام ہی مل جائے۔ یہاں ملتی ہیں تو ایسی ہی لڑکیاں جیسی شادو تھی یا یہ صحافی خاتون ہیں۔ بس نام ہی نام ہے یا صورت ہے۔"

نیلم کی صورت پر حیرانی اور مایوسی کے جذبات واضح ہوگئے مگر اس سے پہلے کہ وہ میری بڈ حرامی اور نااہلی پر مجھے شرمندہ اور مطعون کرتی' شبنم اٹھ گئی "فون کوئی نہیں اٹھا رہا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے مسلسل۔"

"فون نہیں اٹھا رہا ہے؟" مجھے پریشانی لاحق ہوگئی۔

"ہاں' کہاں چلے گئے آخر سب" وہ بولی "میں ابھی پھر نمبر ملا کے دیکھوں گی۔"

"نمبر مجھے بتاؤ" نیلم نے کہا "میں رحمان صاحب کی ڈیوٹی لگادیتی ہوں' نمبر مل جائے گا تو فون لادیں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ نمبر تمہیں تو بتایا جاسکتا ہے' رحمان صاحب کو نہیں۔"

"اوہ۔ خفیہ نمبر ہے" نیلم بولی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ میری باتیں نیلم کو پسند نہیں آئیں اور میرے زندگی گزارنے کے ڈھنگ پر اسے سخت اعتراض ہے لیکن شبنم کے سامنے اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں مظلوم اور مسکین صورت بنائے اس کی صورت کے تاثرات سے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اگر اسے یہ خیال آیا ہو کہ دس سال بعد میں اس سے پرانے مراسم کا فائدہ اٹھانے آگیا ہوں اور اپنے ساتھ ایک ذمے داری کا بار بھی نیلم کے کندھوں پر شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دن دوستی کو کیش کرا کے عیش کروں گا اور پھر ڈھیٹ بن کے کسی اور کے در پر چلا جاؤں گا۔ تو یہ کوئی اچھا خیال نہیں ہوسکتا تھا اور نیلم کی جگہ کوئی بھی ہوتا' مجھے شرمندہ کرنے میں حق بجانب ہوتا مگر جیسا کہ شبنم نے سوچا تھا' نیلم ایک ایکٹریس تھی۔ اس نے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور میں دل ہی دل میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اس کا ردعمل کیا ہوگا؟

شبنم نے کہا "جلدی سے کھانا کھالو' پھر چل کے دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "رئیس اور رخشی تھے گھر میں۔ فرید بھی آگیا ہوگا۔ اپنے تمیں مار خان اور اس کی جانِ جاں ہیں۔ کسی کو گھنٹی سنائی نہیں دے رہی؟"

شبنم نے کہا "فون خراب ہوسکتا ہے یا منقطع ہو تو ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگتا ہے کہ بیل جا رہی ہے۔"

میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ نیلم کی حیرانی بھی اب واضح پریشانی میں بدل گئی تھی کیونکہ ہم نے اسے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اچھے سے اچھا دوست بھی مشکل وقت میں دستگیری سے پہلے پریشانی کی نوعیت ضرور جاننا چاہے گا۔ پوچھے گا ضرور کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

"رئیس کو میں جانتی ہوں۔ یہ رخشی کون ہے اور تیس مار خان؟"

"میں نے کہا نا سونی سب بتا دے گی تمہیں، ہم چلتے ہیں۔"

"کیسے جاؤ گے؟" ہمارے ساتھ ہی نیلم بھی کھڑی ہو گئی۔

"مل جائے گی کوئی ٹیکسی" شبنم نے کہا۔

نیلم نے کہا "یہاں ٹیکسی میں کوئی نہیں آتا۔ بہت دور جانا پڑے گا اور انتظار میں بہت دیر ہو جائے گی۔ میں شوفر سے کہہ دیتی ہوں کہ تمہیں چھوڑ آئے۔"

میں نے رسمی انداز میں انکار کیا "نہیں، ہم چلے جائیں گے۔ تم تکلیف مت کرو۔"

نیلم کا بڑا مانا جائز تھا "ناصر۔ مجھے کیا تکلیف ہو گی؟ گھر میں ایک نہیں دو گاڑیاں ہیں اور دو ڈرائیور ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنے ٹھکانے کا پتا نہیں دینا چاہتے مجھے بھی سیا شرم آتی ہے بتاتے ہوئے، ایسی جگہ رہتے ہو؟"

شبنم نے کہا "میں ایک بار پھر فون ملا کے دیکھ لوں۔"

شبنم اندر چلی گئی تو نیلم نے افسوس سے سر ہلایا "مجھے بہت مایوس کیا ہے تم نے ناصر، تمہیں تو خود چابی اٹھا کے کہنا چاہیے تھا کہ میں تمہاری گاڑی لے جا رہا ہوں۔ خیر، جاتے جاتے سونی سے ضرور کہہ جاؤ کہ اس گھر کو واقعی اپنا ہی گھر سمجھے۔ اگر اس نے بھی یہی غیریت والا اجنبیت کا انداز اختیار کیا تو۔۔۔ تو مجھے دکھ ہو گا۔"

سونی گیسٹ بیڈ روم میں بڑے سکون کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی سی جسمانی EXERTION اور بہت زیادہ EXCITEMENT نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا سوچ کے مسکرا رہی تھی۔

میں نے کہا "سونی۔ مجھے اور شبنم کو جانا ہے۔ ہم شام تک ورنہ رات تک پھر آئیں گے۔ تکلف سے بالکل کام مت لینا۔ یہ سمجھ لو کہ تم اپنی بڑی بہن کے گھر میں ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہاں مجھے ایسا وی آئی پی ٹریٹ منٹ کہاں مل سکتا تھا۔ ایک ملازمہ وقف کر دی گئی ہے میری خدمت کے لیے اور وہ اتنی دیر میں دس بار تو پوچھ چکی ہے مجھ سے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

نیلم نے کہا "میں بھی چلی جاؤں گی کچھ دیر میں۔ ڈاکٹر رانی بھی شاید اب رات کو ہی آئیں گے۔ تم اپنی دوائیں لیتی رہو اور کسی بات کی بالکل فکر مت کرو۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ میں نے سب کو سمجھا دیا ہے کہ کسی سے کوئی بات نہ کریں بلکہ آپس میں بھی بات کرتے ہوئے محتاط رہیں۔ سمجھ لو کہ تم یہاں آئی ہی نہیں تھیں۔"

میں نے کہا "کیا اس سے وہ شک میں نہیں پڑیں گے؟"

"وہ میرے ملازم ہیں اور ان میں نیا کوئی نہیں ہے۔ جتنی تنخواہ میں دیتی ہوں، اتنی کیا اس سے آدھی بھی نہیں ملے گی کہیں۔ خیال بھی بہت رکھتی ہوں ان کا اور نوکر سمجھ کے بے عزت بھی نہیں کرتی مگر شک ہو جائے تو دو منٹ میں باہر نکال کے بقایا جات ہاتھ پر رکھ دیتی ہوں" نیلم بولی۔

میں نے کہا "یہ بڑے اطمینان کی بات ہے میرے لیے۔"

شبنم نے اندر آ کے کہا "ناصر چلو جلدی۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے، پتا نہیں کیا بات ہے؟"

میں نے سونی سے کہا "سونی۔ ہم فون پر رابطہ رکھیں گے لیکن فون نہ آئے تو فکرمند مت ہونا۔ نیلم کو سب بتا دینا بالکل سچ۔ کچھ بھی چھپانا نہیں ورنہ یہ پہلے ہی ناراض ہے مجھ سے۔ کوئی غلط بیانی ہو گئی تو بہت مارے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔"

شبنم کو یہ بات بھی اچھی نہیں لگی۔ نیلم نے باہر آ کے لینڈ کروزر کو پیار سے چمکارنے والے شوفر کو ہدایت کی "مہمانوں کو لے جاؤ، جہاں بھی یہ جائیں اور گیٹ کیپر کو سمجھا دینا کہ انہیں ہر وقت بلا روک ٹوک اندر آنے کی اجازت ہے۔ شکایت پر میں کوئی عذر نہیں سنوں گی۔"

شوفر نے بڑے مؤدبانہ طریقے پر "یس میڈم!" کہنا جاری رکھا مگر اس کی آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی کے جذبات بہت عیاں تھے۔ شبنم کو اس نے حسن صورت کی بنا پر قبول کر لیا تھا۔ شاید اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں اس لڑکی کو میڈم کے پاس سفارش کے لیے لایا تھا کہ اسے کسی فلم میں چانس دلوا دیں اور میڈم نے اتنی اہمیت دی تھی تو گویا لڑکی کا فلمی مستقبل روشن ہونے کے واضح امکانات نظر آتے تھے مگر میں اس کے ساتھ بالکل مس فٹ تھا۔ جیسے کسی خوبصورت نئے ماڈل کی کار میں پرانے گھسے ہوئے ٹائر اور پرانی ٹیوب والا پنکچر شدہ اسپیئر وہیل۔

ہم پیچھے بیٹھ گئے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب بدتمیزی کی

حد تک اکھڑ رویہ رکھنے والے خوں خوار چوکیدار نے مجھے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔

شبنم نے آہستہ سے کہا "اس شاہی سواری کو لے جائیں گے ہم گھر کے دروازے تک تو سب دیکھیں گے۔"

"اور جلیں گے۔۔۔ کیونکہ یہ نیلم کی گاڑی ہے۔ لوگ اسے ضرور پہچانتے ہوں گے۔ اس کا نمبر ہی الگ ہے۔"

"پتا نہیں کون لوگ ایسے دیوانے ہوتے ہیں۔ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تمہاری مس نیلم کے پاس کس رنگ کی کون سی گاڑی ہے اور اس کا کیا نمبر ہے۔"

میں نے قہقہہ مارا "یہ بھی تم نے خوب کہا۔ میری نیلم، افسوس تو یہی ہے کہ وہ میری نہ ہو سکی۔"

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اب مجھے اندازہ ہونے لگا ہے کہ چند ماہ تم سے کیوں نفرت کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے تمہاری فطرت کو۔ اس سے پہلے صرف شادو ہی نہیں تھی، نیلم تھی، پھر رخشی ہو گئی۔ اب میرا زمانہ ہے۔ وہ کیوں شک نہ کرے کہ سونی کو بھی تم نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بہن بنا رکھا ہے۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ یہ ایک ایسی عورت بول رہی تھی جو پیار میں دیوانگی کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کسی رشتے اور حوالے سے اپنے محبوب پر کسی عورت کا کوئی حق تسلیم کرنے پر راضی نہ تھی۔ اسے حسد اور رقابت کے جذبات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کر دیا تھا۔

میں نے کہا "شبنم۔ تم بہت بدل گئی ہو۔ تم وہ پہلے والی شبنم نہیں ہو جو شاہ عالم سے بے غرض، غیر مشروط اور یک طرفہ محبت کی دعوے دار تھی۔"

"تم بھی تو بدل گئے ہو۔"

"نہیں۔ میں کہاں بدلا ہوں۔ تمہیں تو اب اندازہ ہونے لگا ہے کہ میں وہی پرانا ہوس پرست ناصر عظیم ہوں جس کی مردانہ انا کو اس بات سے بہت تسکین ملتی تھی کہ وہ ایک کے بعد دوسری لڑکی کو اپنے پیار کے جال میں پھانس کے دیوانہ کرے اور پھر اسے ٹھکرا کے آگے بڑھ جائے۔ میرا یہی چلن تھا اور آج بھی ہے۔ ایسا ہی سمجھتی ہو نا تم!"

شبنم کچھ نادم نظر آنے لگی "جو کچھ تم خود بتا چکے ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ابھی تو میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ مرتے وقت شادو نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟ جو میں نے پورا نہیں کیا۔ اس وقت میں انکار کیسے کر سکتا جب اس کا دم لبوں پر تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر ساکت تھیں اور اس کے سرد ہاتھوں نے عہد لینے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے اپنی قسم دی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد میں نیلم سے شادی ضرور کروں۔ معلوم ہے وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟"

"اسے پتا ہو گا کہ تم نیلم کو پسند کرتے ہو؟"

"نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ نیلم مجھے پسند کرتی ہے۔ میں ایک پھکڑ، لاوارث اور بے حیثیت شخص تھا۔ شادو ایک فقیر زادی تھی اور عمر میں بھی مجھ سے زیادہ تھی مگر اس خواب عشق کی تعبیر میری دسترس میں تھی۔ سوچو آج سے دس سال پہلے نیلم کیا قیامت ہو گی۔ اس کے باوجود شادو نے کیا دیکھا اور کیا سمجھ کے مجھ سے یہ وعدہ لیا۔ دراصل وہ میری طرف سے بہت شکر گزار تھی۔ مرتے وقت بھی اسے یہی خیال تھا کہ بعد میں میرا کیا ہو گا اور اس کے نزدیک صرف نیلم ہی تھی جو مجھے سنبھال سکتی تھی۔ مجھے اتنی توجہ اور پیار دے سکتی تھی جو خود شادو نے دیا تھا۔ آج جب نیلم نے پوچھا کہ شادو کی قبر پر جاتے ہو تو مجھے کتنی ندامت ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے سرعام میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس سوال سے مجھے کتنی اذیت ہوئی ہے۔ میں نے کتنی ذلت محسوس کی ہے اور نیلم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ میں نے شادو کو بہت جلد بھلا دیا۔ اس سے کیے ہوئے آخری وقت کے وعدے کا بھی پاس نہ کیا۔"

"آخر کیوں؟ جب تم شادی کر سکتے تھے نیلم سے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں یا سماجی حیثیت میں اور دولت مندی میں مجھ سے زیادہ تھی۔"

"پھر کیا بات تھی؟ تمہیں ڈر تھا کہ وہ انکار کر دے گی۔"

میں نے کہا "ڈر تو تب ہوتا جب میں ایسا سوچتا۔ شادو کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس سے جھوٹا وعدہ کر لیا تھا مگر دوبارہ میں نے اس کے بارے میں سوچا تک نہیں حالانکہ اس کے مرنے کے بعد نہ جانے کتنا عرصہ میں نے نیلم کے ساتھ اس کے گھر میں گزارا۔ میں پاگل ہو گیا تھا اور میرا پاگل ہونا غلط بھی نہ تھا۔ نیلم نے مجھے بچا لیا۔ وہ مجھے پھر زندگی کی طرف لے آئی۔ اس وقت بھی وہ ایک مصروف ترین اداکارہ تھی۔ آج سے زیادہ کام تھا اس کے پاس۔ فلمیں زیادہ بنتی تھیں اور ہر فلمساز اسے کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ دراصل نیلم مجھے پسند کرتی تھی یا میں اسے پسند کرتا تھا تو یہ پسند ایسی ہی تھی جیسے میں سونی کو پسند کرتا ہوں یا رئیس کو پسند کرتا ہوں۔ یہ دوستی خلوص اور اعتماد کا رشتہ تھا جو عام طور پر ایک جوان عورت اور مرد کے درمیان جنس کے بغیر چلتا نہیں۔ وہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک فطری بات ہے۔ جسے آپ پسند کرتے ہوں' وہ عورت ہو تو قریب رہنے سے آپ کا آئیڈیل بن جاتی ہے۔ آپ اسے اپنانے کا سوچنے لگتے ہیں۔ ساری زندگی کے لیے اس کا ساتھ چاہتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اور میرے درمیان وہ پرانا اعتماد کا رشتہ آج بھی ویسا ہی ہے۔ اگر میں اس پر فریفتہ ہو جاتا تو مجھ میں اور ایک عام فلم بین میں کیا فرق رہ جاتا۔ بس میری یہی بات اسے اچھی لگی اور مجھے وہ یوں اچھی لگی کہ اس میں اپنائیت تھی' عاجزی تھی۔"

"یہ تو بالکل الٹی بات کہہ رہے ہو تم۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی کسی سے۔"

"وہ لوگ بھی دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔ اس بات کو تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ فلمی دنیا میں کامیابی کے افق تک پہنچ کے ایک روشن ستارہ بننے کے لیے کسی عورت کو جس سیڑھی کا سہارا لینا پڑتا ہے' اس کے ہر اسٹیپ پر کوئی مرد اس سے نذرانہ وصول کرتا ہے اور وہ اپنی خواہش پر اپنی عزت نفس کی قربانی دیتی جاتی ہے۔ معمولی لائٹ مین سے ڈائریکٹر تک جو آج اس کی ایک نگاہ کرم کے محتاج ہیں اور ایک آؤٹ ڈور منٹ پر سائن کرانے کے لیے اس کے در سے دس بار دھتکارے جانے کے باوجود وہیں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس وقت نیلم کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے جب وہ ایک گمنام اداکارہ تھی۔ آج تو بس حساب برابر ہو رہا ہے۔ میری بات اس وقت بھی اور تھی۔ میں اسے فلمی ہیروئن کی حیثیت سے جانتا تک نہیں تھا اور ہمارے تعلق کو فلموں کی دنیا سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ہم اپنی ذاتی حیثیت میں ایک دوسرے کو جانتے اور پسند کرتے تھے۔ ہمارا رشتہ بے غرض اور بے وسیلہ تھا۔ کیونکہ اسے لاکھوں لوگ جانتے تھے مگر وہ پھر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی تھی اور میں اس زمانے میں اتنا اکیلا ہو گیا تھا کہ ایک بار بے دھیانی میں سڑک پار کرتے ہوئے اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تو وہ سمجھی کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی اس وقت نشے میں گاڑی چلا رہی تھی۔ وہ خود ہی مجھے اپنی کار میں ڈال کے ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسپتال میں لے گئی جہاں میرا علاج کسی ڈی آئی پی کی طرح ہوا۔ یہ بھی اس تعلق کی بنیاد۔"

"ایک بات کہوں ناصر' برا مت ماننا' تمہاری سرشت میں وفا واقعی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو تم نے کیسے بھلائے رکھا نیلم کو دس سال اور آج کس منہ سے اس کے گھر پہنچ گئے؟"

"مجھے آپ پر کوئی ندامت نہیں۔ ہاں تمہاری پہلی بات تمہارے نقطہ نظر سے وزن رکھتی ہے مگر فلمی اور افسانوی زندگی خوابوں کی طرح ہے۔ عملی زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے سب کے ساتھ۔ زندگی کی معصوفیت کے دائرے اتنے پھیل جاتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں کہ اپنے سوا کوئی کسی کو یاد نہیں رکھ پاتا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہے۔"

"کل کو میں مر جاؤں تو مجھے بھی ایسے ہی بھول جاؤ گے تم؟"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بڑی قرات کے ساتھ کہا "انشاء اللہ۔ تم مرے تو دیکھو' کم سے کم ایک بار۔ ان اللہ مع الصابرین۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔"

"ہو گی لیکن میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

میں نے کہا "جذباتی ڈائیلاگ مت مارو۔ اگر میں نہ رہوں تو تم کتنے دن رو سکتی ہو' مہینہ دو مہینہ۔ سال دو سال۔ کسی کی یاد میں قبر پر دیا جلا کے کون ساری عمر بیٹھا رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شادو کے معاملے کا موازنہ نیلم سے نہیں ہو سکتا اور نیلم کا کیس بالکل مختلف ہے چند ایک مثالیں سے۔ دلائل میں سارا دن دے سکتا ہوں مگر کیا فائدہ۔ تم ایک متعصب جج ہو۔"

وہ مسکرائی "توہین عدالت؟ اس کی سزا معلوم ہے' ڈرائیور صاحب! گاڑی یہاں روک لو۔"

ڈرائیور پہلے ہی اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو ایک کنارے پر روک لیا تو جنم نے ہاتھ ہلا کے کہا "تھینکس' اب تم جاؤ۔" اور میرے ساتھ پیدل چلنے لگی۔ ڈرائیور حیران ضرور ہوا ہو گا کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔ ہم گاڑی کو عین گھر کے دروازے پر بھی روک سکتے تھے۔

میں نے کہا "کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ جب میں عائشہ کلینک آیا تھا تو رئیس خاں کی پے جیرو تھی میرے پاس۔"

"اچھا؟ پھر کہاں گئی وہ؟"

"جائے گی کہاں۔ وہیں کھڑی ہو گی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔"

"پھر ایمبولینس منگوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "خاتون۔ آپ نے اس لینڈ کروزر کو کیوں واپس کروایا؟ اس لیے کہ ایسی گاڑی کو سب مرعوب ہو کے اور کچھ دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہم تو اب جائیں گے چور دروازے سے۔ ہم پے جیرو جیسی گاڑی سے اترتے اور پھر چوروں کی طرح جاتے تشہر اٹھا کے۔ پے جیرو کو وہیں کھڑا رکھنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑتا۔"

دو رویہ مین روڈ کی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہم نے الٹے ہاتھ کی ایک بائی لین کو کراس کیا۔ اس سے اگلی لین میں رئیس خانہ تھا۔ یہ سب مکان تیرہ تیرہ مرلے پر یوں بنے ہوئے تھے کہ ایک کی بیک دوسرے سے ملتی تھی۔ ایک کا رخ مشرق کی طرف تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف اور ہر گھر کے سامنے چالیس فٹ کی اسٹریٹ تھی۔ دوسری جانب ایسی ہی تین سڑکوں کو کاٹتی ہوئی یہ اسٹریٹ سوفٹ کی دوسری ڈبل روڈ سے مل جاتی تھی۔

رئیس خانہ تقریباً وسط میں تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے بائیں طرف دیکھا تو مجھے گیٹ کے سامنے پولیس نظر آئی۔ کچھ فاصلے پر تجسس پسند تماشائی جمع تھے اور بظاہر کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ایک ساتھ میری اور شبنم کی سوالیہ نظریں ملیں۔

شبنم نے میرا بازو تھام لیا۔ "ناصر۔ یہ پولیس کیوں آئی ہے اور لوگ کیوں جمع ہیں؟"

میں نے کہا "ہاتھ چھوڑو میرا۔ ہم سڑک پر ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات تو ہوئی ہے' جلدی چلو۔"

ہم نے تیزی سے قدم بڑھائے اور آگے نکل گئے۔ اس سے اگلی اسٹریٹ میں رئیس خانے کا دوسرا عقبی دروازہ تھا۔ آگے پیچھے کے دونوں مکان اب اندر سے ایک تھے اور ان کا مجموعی رقبہ ڈیڑھ کنال تھا مگر یہ ایک پٹی کی صورت میں تھا جو تقریباً سوا سو فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی ہو گئی تھی۔ رئیس خانے کا اصل دروازہ ایک گلی میں مغرب کی طرف تھا تو پیچھے والا راستہ اگلی گلی میں سڑک کی طرف۔ یہ ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہوئے یکلخت مجھے شدید پریشانی کے احساس نے گھیر لیا۔

"شاید اسی لیے کوئی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔" شبنم نے ڈرتے ڈرتے کہا "فون کی لائن کاٹ دی ہو گی کسی نے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لائن تو سامنے سے پیچھے والے گھر میں اور تہ خانے میں گئی تھی۔"

ہم ساتھ ساتھ اگلی گلی میں بائیں طرف مڑ گئے۔ دور ہی سے میں نے فرید عباسی کی سلور گرے شیراڈ کو دیکھ لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہائی کورٹ سے واپس آیا تب بھی پولیس باہر موجود تھی اور جائے واردات پر ہر جگہ بے سبب کھڑے رہنے والے بھی گیٹ پر جمع تھے۔ فرید نے گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں دیکھ لیا ہو گا اور عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے گاڑی کو واپس موڑ لیا ہو گا۔

شبنم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے مسکرا کے کہا "یہ قبل از مرگ واویلا بند کرو۔ میں نے رب نواز کا فون موصول ہوتے ہی سب کو سمجھا دیا تھا کہ غائب ہو جائیں۔ رئیس بہت سمجھ دار ہے۔"

"ناصر۔ کچھ تو ہوا ہے نا!" اس کا زور کم نہیں ہوا۔

گیراج یعنی دکان کا شٹر نیچے گرا ہوا تھا لیکن باہر سے مقفل نہیں تھا۔ میں نے جھک کر اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے ناکامی ہوئی۔ دکان جس گھر کے سامنے والے حصے میں نکالی گئی تھی اس کا مین گیٹ کبھی کھولا نہیں گیا تھا۔ زنگ خوردہ لوہے کا ہر پٹ نیچے جمع ہو جانے والی مٹی اور کوڑے کرکٹ سے جام ہو گیا تھا اور اس میں لگا ہوا قفل بھی برسوں بعد کسی چابی سے نہیں کھل سکتا تھا۔ گیٹ کے اندر مختصر سی گیلری میں بھی سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا اور زمانے بھر کا اڑ کے آجانے والا کچرا پڑا ہوا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے دونوں دروازوں کا اڑا ہوا رنگ اور ان کی زبوں حالی خود اس گھر کی ویرانی کا افسانہ سناتی تھی لیکن رئیس خان نے پرانے اسٹور کام کو ایسے کارآمد بنایا تھا کہ نیا نظر نہ آئے۔ یہ گھر جس خاتون کی ملکیت تھا اس نے کبھی اپنے نام کی تختی باہر نہیں لگائی تھی اور گزشتہ چند برسوں میں ایک بار بھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا پھر اس خانہ ویراں میں ہمارے سوا اپنی آمد کی خبر کون دیتا؟

میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تو چند سیکنڈ کے بعد رئیس چھت پر نمودار ہوا اور اس نے منڈیر پر سے جھانک کے کہا "اچھا' میں کھولتا ہوں" اس کی حالت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ رئیس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور اس کی صورت پر جنون کے آثار تھے۔

شبنم نے پھر میرا بازو تھام لیا "ناصر' کوئی بات ضرور ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا "حوصلہ رکھو یار۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ میرے جھوٹ سے شبنم بہل نہیں سکتی۔ میرے لہجے میں اعتماد کے فقدان کا کھوکھلا پن تھا اور خوف کی بازگشت صاف محسوس ہوتی تھی۔ رب نواز کے فون پر جس خطرے کی گھنٹی بجی تھی وہ کسی نہ کسی صورت میں نازل ہو چکا تھا۔ رئیس نے اندر سے شٹر کا تالا کھولا اور اسے اوپر اٹھایا۔ شبنم کے ساتھ ہی میں اندر گھس گیا۔ "رئیس' کیا ہوا؟" ہم نے ایک ساتھ کہا۔

رئیس شٹر گرا کے پلٹا "اس ۔۔۔ ملک رب نواز کی ماں کا

۔۔۔ ہوا اور کیا ہوا" سخت اشتعال میں اس نے شبنم کی موجودگی کا خیال کیے بغیر گالیاں دیں۔

شبنم سائڈ سے دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی تو میں نے کہا "آرام سے بتا یار' آرام سے" اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ ایک دم رونے لگا "آرام سے کیا بتاؤں یار! ان ۔۔۔ نے مجھ سے میرا دوست چھین لیا۔ میرا سب سے وفادار ساتھی چھین لیا۔"

میرا دل بیٹھ گیا "رئیس۔ کس کی بات کر رہا ہے تو۔ رو مت یار!"

لیکن رئیس میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگا "تیمی مارخان۔ وہ اپنے فرض پر قربان ہو گیا۔ ان ۔۔۔ نے اسے مار ڈالا۔ چھوٹی کو مار ڈالا۔"

"چھوٹی کو بھی" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہو گیا۔ "او مائی گاڈ! یہ کب ہوا؟ ہم تو بہت دیر سے فون کر رہے تھے۔ چل اوپر چل۔"

میرے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے اور مجھے احساس نہ تھا۔ رئیس بالکل بچوں کی طرح رو رہا تھا "ان حرام زادوں نے فون کا تار کاٹ دیا تھا۔ میں نے باہر جا کے تجھے بتانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ وہ تو چلے گئے۔ فرید کی مجھے زیادہ فکر تھی مگر اس سے میں ہائی کورٹ میں کہاں بات کرتا ۔۔۔ خیر' اللہ نے اسے بچا لیا۔"

اوپر شبنم بھی رخشی کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ تہ خانے کی فضا کسی مقبرے کی طرح سوگوار اور پُر آسیب ہو گئی تھی۔ مرنے والے دو ہی تھے۔ وہ کسی کے رشتے دار نہیں ملازم تھے۔ ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ سب کی خدمت کرتے تھے اور سب کی جھاڑ کھاتے تھے۔ سب کے مذاق کا نشانہ بنتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قد والے دو مضحکہ خیز انسان لیکن اچانک ان کے نہ ہونے سے ہم خود کو اکیلا اور بہت بے بس محسوس کر رہے تھے۔ یہ گھر خالی لگنے لگا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی ہم آواز دیں گے تو ان میں سے کوئی نمودار نہیں ہو گا۔ کچن میں ان کی بے مقصد لڑائی کا پیار بھرا ڈراما ختم ہو گیا ہے۔

کچھ دیر میں سب ایک دوسرے کو دلاسا دیتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے بس اتنے ہی آنسو تھے ہمارے پاس۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہم کوئی جذباتی وابستگی کا وہ رشتہ نہیں رکھتے تھے جو ماں باپ اپنی اولاد کے لیے یا بہن بھائی اور میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں رہنے والے دو اجنبی تھے۔ جنہوں نے اپنی فرض شناسی اور خدمت گزاری سے ہمارے دل میں جگہ بنا لی تھی چنانچہ ان کی موت کا صدمہ اور احساس زیاں کم نہ تھا۔ ہم خاموش بیٹھے اپنے خیالوں میں بہت کچھ دیکھتے رہے اور گزرے ہوئے وقت کی ان یادوں کو دہراتے رہے جس کا تعلق تیمی مارخان سے اور اس کی محبوبہ دلنواز چھوٹی سے تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور وقت نے مہلت نہ دی ورنہ وہ ایک دوسرے کے شریک حیات بھی بن جاتے۔ ان کی یہ محبت بھی ان کی طرح سارے زمانے سے نرالی تھی۔ چھوٹی کے آنے سے پہلے تیمی مارخان گیٹ پر مستعد کھڑا رہتا تھا۔ اسے اپنی مونچھیں بڑھانے کا بھی ایسا ہی جنون تھا جیسا اپنے قد کو بڑھانے کا۔ اس کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ مونچھوں پر طلسماتی اثر والے ہیئر ٹانک اور جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ تیل ملتا تھا اور آئینے میں ان کی نشوونما کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ڈاکٹر حکیم' وید اور فقیر سنیاسی سب کی دوائیں خاندانی نسخے اور ٹوٹکے اس کے قد میں ایک انچ کا اضافہ نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ آئے دن بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ کسی کے ہاتھوں بے وقوف بن کے کوئی چیز لے آتا تھا اور کچھ دن ضرور اپنے قد کی پیمائش کر کے اضافہ بھی دیکھ لیتا تھا خواہ وہ ایک سوت ہوا یا ایک ملی میٹر۔ بیشتر نیم حکیم اور فراڈ لوگ اسے تھکتے تھے اور بے وقوف بنانے والے اسے راکھ کی پڑیا اور ہلدی کی گولی بنا کے سو روپے میں کسی مجرب خاندانی نسخے کے نام پر بیچ دیتے تھے مگر اس سے تیمی مارخان کی سعی مسلسل کا جذبہ مایوسی کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ چھوٹی کے آجانے سے اس کی زندگی کے بیزار کن معمولات یکسر دل گئے تھے۔ اب اس کا بیشتر وقت کچن میں صرف ہوتا تھا۔ چھوٹی بہت چالاک اور تیمی مارخان جیسے سادہ لوح کے مقابلے میں انتہائی عیار تھی۔ وہ تیمی مارخان کو خوب لوٹتی تھی۔ اس کی زبان قینچی سے زیادہ تیز چلتی تھی اور اس کی کاٹ کا مقابلہ شاید دنیا کی کوئی قینچی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے قصور کی سزا تیمی مارخان کو دیتی تھی اور تیمی مارخان آداب عاشقی کی روایات نبھاتے ہوئے اس کے سارے ستم بھی ناز و انداز محبوبی کی طرح یوں اٹھاتا تھا کہ ۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایسی جفاخو اور ستم پیشہ نظر آنے والی وہ عورت اپنے محبوب کے لیے دل کی گہرائی میں اپنائیت کے کتنے انمول جذبات کا خزینہ رکھتی تھی۔ کوئی تیمی مارخان کو دکھ پہنچائے یا اس کے جذبات کو مجروح کرے تو وہ اس کی عزت نفس کے تحفظ کے لیے ایک چٹان کی طرح سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آجاتی تھی اور ایک جارحانہ محسوس ہونے والا دفاعی رویہ اختیار کرلیتی تھی۔ اس نے تیمی مارخان کی زندگی کے خلا کو ایسے پُر کیا تھا کہ وہ اپنی کوتاہ قامتی کے احساس کمتری کے کمپلیکس سے نکل آیا تھا۔ وہ خود کو ایک مکمل مرد سمجھنے لگا جسے کوئی عورت مکمل خود سپردگی کے جذبات رکھتے ہوئے پسند کرسکتی ہے۔ اس نے اپنے قد میں اضافے کی کوشش اور خواہش کو چھوڑ دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس حد تک اس نظریے کی توثیق کرتی کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔

ایک آہ بھر کے میں نے خاموشی کے اس بوجھل سکوت کو توڑا "یہ سب کیسے ہوگیا رئیس!"

"بس یار۔ تیرے جاتے ہی وہ آگئے تھے۔ ٹھیک کہا تھا تو نے کہ جب فون نمبر ہے ان کے پاس تو ایڈریس بھی ہوگا۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم سب تہ خانے میں روپوش ہو چکے تھے اور اپنے ساتھ ضرورت کا سب سامان بھی لے جا چکے تھے کہ ہفتہ دس دن کیا مہینہ بھر بھی موقع نہ ملے ادھر آنے کا تو گزارا ہوجائے۔ وہ دونوں گئے تھے بچن سے چولھا لانے کیونکہ نیچے والے بچن کا چولھا تھا سنگل برنر والا۔ اوپر تو اودن کے پانچ برنر تھے مگر اسے اکھاڑ کے لانا مشکل تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک ڈبل برنر والا چولھا نیچے رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی کے لیے اودن والے برنر پر توا رکھ کے روٹیاں ڈالنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ نیچے والے چولھے پر بیٹھ کے آسانی سے کام کرلیتی تھی۔ اس نے تیمی مارخان سے کہا کہ ایک برنر سے تو کام نہیں چلے گا۔ وہ چولھا کھول کے لے آتے ہیں۔ ربر کا پائپ کھول کے الگ کرنے میں کیا دیر لگتی ہے لیکن قضا کے لیے یہی بہانہ بنا۔ چار افراد ایک ساتھ گیٹ کے اوپر سے کود کے اندر آگئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ہاکیاں اٹھا رکھی تھیں اور کپڑے بھی ہاکی پلیئروں جیسے پہن رکھے تھے۔ شور سن کے تیمی مارخان باہر نکلا تو وہ اسے دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ اس کے پاس ریوالور بھی تھا لیکن اب تو وہ ایک گھریلو قسم کا ملازم بنا ہوا تھا۔ اس کا شور سن کے چھوٹی بھاگی۔ تیمی مارخان سے حملہ آوروں نے یہی پوچھا کہ فرید عباسی کہاں ہے؟ وہ چلاتا رہا کہ ادھر کوئی فرید عباسی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر محمد علی صاحب ہوتی لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے اندر آنے سے پہلے ہی آس پاس کے رہنے والوں سے معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اور انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اس گھر میں جو رئیس خانہ کہلاتا ہے' ایک تو خود رئیس خان صاحب رہتے ہیں جو مشہور سیاسی کارکن ہیں اور خدا بخش مندرال کے دست راست تھے لیکن آج کل ایک داڑھی والا نوجوان بھی آتا جاتا دکھائی دیتا ہے اور ایک دبلی پتلی بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی ہے جس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے ہیں۔"

"یہ معلومات دینے والا کون تھا؟"

"میرا خیال ہے نکی کے کونے پر جو بیکری اور جنرل اسٹور والا ہے' وہی صبح سے شام تک آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس نے میرا اور شبنم کا حلیہ بتادیا؟"

"ہاں۔ جب تیمی مارخان نے فرید عباسی کے نام سے ہی ناواقف ہونے کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ جھوٹ بولتا ہے تو۔ وہ داڑھی والا تیرا باپ اور کون ہے۔ حملہ آور شاید یہی سمجھے تھے کہ داڑھی والا فرید عباسی ہے۔ انہیں کسی نے فرید عباسی کا حلیہ نہیں بتایا تھا۔ باہر ہی سے وہ پوچھ کر آئے تھے کہ یہاں کوئی ڈاکٹر محمد علی بھی رہتا ہے اور ظاہر ہے اگر آس پاس کسی گھر میں بھی کوئی ڈاکٹر ہو تو لوگ جانتے ہیں۔ اس گلی میں میو اسپتال کا ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ حملہ آوروں نے تیمی مارخان کو مارنا شروع کیا کہ سچ بتادے وہ داڑھی والا فرید عباسی نہیں تو کون ہے؟ تیمی مارخان اپنی بات پر اڑا رہا کہ داڑھی والا تو کوئی نہیں جس کے لیے لمبے بال بھی ہوں۔ انہوں نے چھوٹی کو پکڑ لیا جو تیمی مارخان کی جان بچانے کے لیے اور اسے حملہ آوروں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے بیچ میں آکے کافی پٹ چکی تھی۔ حملہ آوروں نے شبنم کو رخشی سمجھا۔ ملک رب نواز نے انہیں بتایا ہوگا کہ فرید عباسی وکیل ہے اور اس کی بیوی اب رخشی ہے جو پہلے شاہ عالم کی بیوی تھی۔ دونوں کو اٹھالاؤ۔ ظاہر ہے رب نواز نے حلیہ بیان کرنے یا تصویر دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تجھے اور شبنم کو فرید عباسی اور رخشی سمجھ کے پوچھتے رہے۔"

"تو نے یہ سب دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ میں کیسے دیکھ سکتا تھا۔ ہم سب پچھلی طرف اور انڈر گراؤنڈ تھے پھر عین اس وقت میں تجھے فون کرنے چلا گیا۔ اوپر نیچے کے سب فون ایک دم ڈیڈ ہوگئے تھے۔ میں تجھے صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب پچھلی طرف سے آنا اور اس پیجرو کو کہیں دور چھوڑنا۔"

"اسے میں نے عائشہ کلینک کے سامنے لیکن دروازے سے کافی فاصلے پر پارک کیا تھا۔ ابھی تک وہیں کھڑی ہوگی۔"

"میں فرید کو بھی بتانا چاہتا تھا کہ پیچھے والے راستے سے

آئے مگر اس کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ ہائی کورٹ بار روم میں پیغام چھوڑ دیا میں نے اور واپس آگیا۔ بس اتنی دیر میں سب ہوگیا۔ اوپر سے شور سنائی دے رہا تھا لیکن رخشی اکیلی بدحواس ہونے کے سوا کیا کرتی۔ وہ تو اوپر آنے جانے کے راستوں سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھی۔ جب میں گلی کا چکر کاٹ کے اور یہ گاڑی لے کر گیا تو دروازے پر بہت لوگ جمع تھے۔ وہ چیخ پکارین کے آگئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی حملہ آور کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے پاس صرف ہاکیاں ہی نہیں' ریوالور بھی تھے اور جاتے جاتے انہوں نے ہوائی فائر کیے اور جو لوگ وہاں موجود تھے' انہیں دھمکی دی کہ کسی نے پولیس کو بلایا یا پولیس کے سامنے کوئی بیان دیا تو اس کی خیر نہیں۔ نتیجہ یہ کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ نہ ان کے حلیے کے بارے میں اور نہ شکلوں کے بارے میں۔ کسی نے ان کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی گاڑی کا رنگ تک بتانے کے لیے راضی نہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ کار تھی تو کون سی تھی' ماڈل اور رنگ تو دیکھا ہوگا۔ سب انکار میں سر ہلانے لگے تو میں نے غصے میں گالیاں دیں کہ سالے نامردوں کی اولاد ہو' ہیجڑے بن جاؤ۔ یہاں کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو۔ تماشا دکھاؤ ناچ گا کے بے غیرتو۔ پڑوس میں کچھ بھی ہوجائے تم انجان بنے رہو گے۔ سارے حق بھلادو گے ہمسائیگی کے۔ خیر ایک نے ہمت کرکے بتادیا کہ وہ ہاکی پلیئر لگتے تھے اور سفید رنگ کی سوزوکی پک اپ میں سوار ہوکے آئے تھے جو پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ آگے ڈرائیور دروازے کے سامنے ہی گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ سوزوکی بغیر نمبر پلیٹ والی تھی۔ میں اندر گیا تو تیمی مارخان لہولہان پڑا تھا برآمدے میں۔ اس کا سر باکی مار کے پھاڑ دیا گیا تھا۔ باقی جسم بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا بے چارے کا۔ وہ زندہ نہیں تھا۔ چھوٹی اندر بے ہوش پڑی تھی اور مرنے کے قریب نظر آتی تھی۔ میں اسے اپنی گاڑی میں ڈال کے لے جاتا تو وہ راستے میں مرجاتی۔ میں نے ایمبولینس کے لیے کہا اور پتا نہیں کون خود لینے چلا گیا۔ ادھر دو گلیاں چھوڑ کے ایک اسپتال ہے۔ اس کی ایمبولینس آگئی۔ اب یار' یہ تھا پولیس کیس۔ جو کچھ ہوا تھا میرے گھر میں ہوا تھا چنانچہ مدعی میں ہی ہوسکتا تھا۔ میں کیا بتاتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ میں نے تو یہ ظاہر کیا کہ گھر میں میرے پرانے ملازموں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا اور میں نہ حملہ آوروں کو جانتا ہوں اور نہ کسی پر شک کا اظہار کرسکتا ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ ظاہر ہے اتنی آسانی سے کیس ختم کیسے ہوسکتا تھا۔ میرے جاتے ہی علاقہ پولیس یہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے قانون کے مطابق ساری ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور تیمی مارخان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی۔ سرکاری اسپتال میں بھی چھوٹی کو کوئی نہ پوچھتا مگر میں نے دو کام کیے۔ ایک تو نوٹ چلائے اور چھوٹی کو ایمرجنسی میں فوراً طبی امداد مل گئی۔ پولیس سرجن آفس کے ایک ہیڈ کلرک کو میں جانتا ہوں۔ اس نے بھی پہچان لیا تھا مجھے مگر حرامی انجان بن گیا۔ جب میں سیاست میں تھا اور ہنگامہ آرائی میں اپنے بندے زخمی ہوتے تھے تو میں ہی ان کو قانونی چکروں سے بچاتا تھا۔ زخم ہوتے تھے چھری چاقو کے یا گولی کے مگر پولیس کی مدد سے "ضرب خفیف" قرار دینے سے معاملہ ختم ہوجاتا تھا۔ یہ موقف تسلیم کرلیا جاتا تھا کہ چوٹ سیڑھی سے پھسل کے یا موٹر سائیکل کے گرنے سے آئی ہے۔ اس ہیڈ کلرک سے میں نے صاف بات کی کہ ابھی تو میری جیب میں صرف تین ہزار ہیں۔ باقی سات میں شام تک پہنچادوں گا لیکن میرے لیے کوئی قانونی رکاوٹ پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد میں نے فون کیا خدا بخش مندرال کے بڑے بیٹے کو۔ تجھے یاد ہوگا کہ ایک بار میں نے اس کا ایک کام کیا تھا جس پر اس نے خوش ہوکے کہا تھا کہ کبھی کوئی کام ہو تو بتانا۔"

"مجھے یاد ہے۔ وہ شاید پہلی بیوی سے تھا جو خاندانی تھی۔"

"ہاں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد دوسری بیوی کو انہوں نے نکال باہر کیا اور صاف کہہ دیا کہ قانونی وارث بننے کے چکر میں مت پڑنا۔ جو ہم ازراہ مہربانی دیں' وہ لے لو ورنہ کورٹ کچہری میں جانے کا شوق ہے تو یہ بھی کرکے دیکھ لو۔ ہم سے دشمنی تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہ جان بھی گنوادو گی خوا مخواہ۔ وہ سمجھ دار عورت تھی۔ خدا بخش کی بیوی نے بھی اسے فراخ دلی سے بہت دے دیا اور وہ پتا نہیں کہاں گئی۔ اب اس خاندانی محل میں خدا بخش کا ولی عہد اپنی ماں اور ایک بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ سب زمین جائداد کی دیکھ بھال پہلے باپ کرتا تھا۔ یہ سرکاری افسر تھا۔ اب زمینداری اس نے سنبھال لی ہے اور سیاست میں باپ کی جگہ لینے کی تیاری کررہا ہے۔ سرکاری افسری اب اس سے چھوٹا بھائی کررہا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ وہ موجود تھا اور اسے اپنا وعدہ بھی یاد تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر مت کرو۔ رب نواز کو بھی ہم اچھی طرح سمجھادیں گے کہ تم سے پنگا نہ لے۔ اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون کرادیا اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی ہے۔ آدھے گھنٹے میں پولیس کا ایک ڈی ایس پی خورشید کیانی وہاں پہنچ گیا۔"

"خورشید کیانی!" میں چونکا۔

"ہاں۔ تو جانتا ہے اسے؟"

میں نے کہا "آج ہی نام سنا تھا مگر وہ تو کسی ڈی ڈی آئی پی کے پرسنل اسٹاف میں ہے۔ سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور ہے۔ کیا کہا تھا اس نے۔"

"بکواس کی ہوگی۔ اس کا علاقہ وہی ہے۔ اس کے ساتھ تھانہ انچارج بھی تھا اور ایک مجسٹریٹ۔ اس وقت تک چھوٹی کو ہوش آگیا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تو اس نے مجھے رک رک کے سب بتادیا۔ اس سے چھوٹی کی حالت پھر خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر اس نے رات گزار دی تو اس کے بچنے کے امکانات روشن ہوجائیں گے مگر مجھے یہ جھوٹی تسلی ہی لگتی تھی۔ وہ خود زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس سے جو پوچھا اس نے بتادیا پھر میں نے اسے کہا کہ تھوڑی دیر میں پولیس اس کا بیان لے گی اور یہ بیان تمہیں مارخان کے قاتلوں کو سزا دلوانے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے بتادیں کیا کہوں' میں نے اسے کچھ باتیں سمجھادیں۔ ایک یہ کہ وہ رب نواز کا نام ضرور لے۔ یہ کہے کہ حملہ آوروں کو ہدایت دینے والا ملک رب نواز تھا جو باہر گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس کو میں دوبارہ دیکھوں گی تو پہچان لوں گی۔"

"وہ کیسے پہچانتی؟"

"میں نے اسے رب نواز کی ایک تصویر دکھادی تھی مگر پہچاننے کی نوبت ہی کہاں آئی یار۔ وہ تو اپنا بیان ریکارڈ کرا کے تھوڑی دیر بعد ہی مرگئی تھی۔ مجسٹریٹ نے اس کا بیان لیا اور انگوٹھا لگوادیا۔ چھوٹی نے یہ بھی کہا کہ وہ گاڑی بہت بڑی تھی۔ ہمارے مالک رئیس خان کی گاڑی جیسی۔ شاید اس سے بھی بڑی۔ اس نے گاڑی کا نمبر آدھا بتایا مگر رنگ بتادیا۔ اس سے ملک رب نواز براہ راست شبہے کی زد میں آگیا۔ یہ اس کی لینڈ کروزر کا رنگ اور نمبر ہے۔ چھوٹی اگر ماڈل بتاتی تو معاملہ شاید گڑبڑ ہوجاتا۔ اس نے کہا کہ پجیرو جیسی ہے مگر پجیرو کا نام بھی نہیں لیا۔"

"یہ نہیں بتایا کہ حملہ آور کس کی تلاش میں آئے تھے؟"

"یہ تو پہلے بتایا کہ وہ فرید عباسی کو پوچھ رہے تھے جو کوئی وکیل ہے اور شبنم کو پوچھ رہے تھے جو کسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شبنم ایک دفعہ بچ گئی تھی مگر دوسری دفعہ ملک صاحب اس کی لاش کو اپنے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے مار کے تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کہاں گئی۔"

میں دم بخود رہ گیا "یہ سب جھوٹ بولا چھوٹی نے؟"

"ہاں۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ جو بھڑک رہی تھی۔ میں نے اسے یقین دلادیا تھا کہ اس کے بیان سے قاتلوں کو پھانسی ضرور ہوگی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے اسے مرتے وقت جھوٹ بلوایا مگر اس کا بیان قانون کی نظر میں سب سے بڑا سچ بن گیا۔ نزع کی کیفیت میں کوئی شخص بیان دے تو عدالت میں اسے ایک مستند شہادت مانا جاتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "یار' کوئی بھی ایسے وقت میں جھوٹ بولنے پر تیار نہیں ہوتا۔ آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن مرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اب مرتے مرتے تو میں ایک گناہ اور نہ کروں۔ جب چھوٹی نے یہ بیان دیا' اس وقت تو وہاں موجود تھا۔"

"نہیں۔"

"تو نے دیکھا ہے وہ بیان!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مجسٹریٹ کے محرر نے مجھے پڑھ کے سنایا تھا اور ایک گواہ کی حیثیت سے سائن کرنے کے لیے کہا تھا مگر میں نے انکار کردیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں تو ایک فریق تھا۔ حملہ میرے گھر پر ہوا تھا۔ وہ میری ملازمہ بھی بعد میں یہ کہا جاتا کہ بیان میں نے اسے رٹادیا تھا۔"

"یار' یہ الزام تو شاید اب بھی آئے۔ اگر تو نے دستخط کیے ہوتے تو وہ بیان بدلا نہیں جاسکتا تھا۔"

"تیرا مطلب ہے۔۔۔ رب نواز۔۔۔؟"

"ہاں۔ وہ بیان خریدلے گا۔ اسے جتنی بھی قیمت ادا کرنی پڑے' کرے گا کیونکہ اب یہ معاملہ اس کی زندگی اور موت کا بن گیا ہے۔ اس نے قتل خود نہیں کیا مگر وہ رہے قتل کی یہ واردات اس کے ایما پر اور حکم پر ہوئی اور اس کے مفاد میں تھی۔ اس نے پلاننگ کی اور اس پر عمل درآمد کے لیے لوگ HIRE کیے۔ تو دیکھ لے کہ نوعیت کے اعتبار سے یہ بالکل ویسا ہی الزام ہے جیسا ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار تک پہنچانے والوں نے عائد کیا تھا اور خود قتل میں شریک نہ ہونے کے باوجود عدالت نے ان کو سزائے موت دے دی۔ بے شک وہ ایک متنازع فیصلہ تھا اور ہمیشہ رہے گا مگر

رب نواز اس بیان کی وجہ سے سخت مشکل میں پڑسکتا ہے۔ اسے عمر قید ہوئی تو لازمی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تو نے۔"

میں نے کہا "جب تو نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو پھر کس کی گواہی لی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ڈاکٹر کی۔ بعد میں اس نے ڈ-تھ سرٹیفکیٹ دیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ موجود تھا جب چھوٹی بیان دے رہی تھی؟ یا اس نے بیان سنا تھا۔"

"نہیں مگر مجسٹریٹ نے کہا اور اس نے دستخط کردیے۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر یا تو بے وقوف ہے یا اس کا کوئی کردار نہیں۔ ورنہ وہ قانونی نوعیت کے ایک بیان پر سن کے بھی دستخط نہ کرتا۔ اسے کیا معلوم کہ ریڈر کیا پڑھ کے سنا رہا ہے' وہ خود پڑھتا۔"

"یار' اس میں کردار کی بات نہیں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی شک نہ ہوتا یا مجسٹریٹ اور اس کے ریڈر پر اعتبار کرتے ہوئے سائن کردیتا۔"

میں نے کہا "یار' اب فرض کر اس ریڈر نے دوسرا بیان لکھا اور مجسٹریٹ نے ڈاکٹر کو بلا کے کہا کہ یہ اسی بیان کی نقل ہے۔ اس پر دستخط کردو۔ تو کیا وہ کردے گا۔ مجسٹریٹ صاحب پر اعتبار کرتے ہوئے؟"

رئیس پریشان نظر آنے لگا "دوبارہ تو شاید نہ کرے۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو نے پولیس سرجن آفس میں ایک معمولی سے کام کے لیے دس ہزار پھینک دیے تھے۔ تو جانتا ہے کام ایسے ہی ہوتے ہیں پھر تو نے خدا بخش مندرال کے بیٹے کی سفارش لڑائی ورنہ مجسٹریٹ آتا اتنی جلدی وہاں؟ اس ڈی ایس پی کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے جو محنت کی تھی' وہ اکارت گئی۔ چھوٹی نے مرتے وقت جو جھوٹ بولا وہ گناہ بے لذت ہوگیا۔ نہیں ہوا تو ہوجائے گا۔ یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"ایک گھنٹا تو ہوگیا۔"

"اب تک جو ہونا ہوگا ہوگیا ہوگا۔ ریڈر خود یا مجسٹریٹ صاحب شاید ایسا نہ کرتے مگر ان کے ساتھ تھا ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ اس نے پہلے یہ کیا ہوگا کہ ملک رب نواز کو مطلع کیا ہوگا کہ جناب آپ کے خلاف ایک ایف آئی آر درج ہونے والی ہے ایک بیان کی بنیاد پر اور بیان بھی ایسا کہ بعد میں اسے جھٹلانا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوگا۔ ابھی وقت ہے۔ بیان حاصل کرلیں مجسٹریٹ سے۔ دوسرا بیان لکھوالیں۔ ہم تو خیر جناب کے خادم ہیں۔ دوسرے دستخط کردیں گے لیکن آپ کو پہلے مجسٹریٹ سے بات کرنی چاہیے اور ہوسکے تو اس ڈاکٹر سے بھی۔ یہ کم سے کم دس لاکھ کی ڈیل ہے ڈاکٹر کے لیے۔ کسی اسپتال میں سرکار کی نوکری کرنے والے ایک میڈیکل افسر کو صرف ایک دستخط کرنے کے دس لاکھ مل جائیں تو وہ آنکھ بند کرکے دستخط کرسکتا ہے کیونکہ کھلی آنکھوں سے وہ جو خواب دیکھتا ہے' وہ سب دس لاکھ میں پورے ہوجاتے ہیں۔ وہ اسپیشلائز کرنے جاسکتا ہے باہر یا یہاں ایک شاندار کلینک قائم کرسکتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ اسے رب نواز اور مجسٹریٹ جیسے مربی بھی مل جائیں۔ بے شک ہر ڈاکٹر ایسا نہیں ہوتا مگر بھائی' زمانہ اب وہ پہلے والا نہیں ہے جب آدمی اپنے ضمیر کی آواز پر کوئی سودا نہیں کرتا تھا اور بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکرادیتا تھا۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔"

میں نے کہا "جو شخص صرف سوتی کی گرفتاری کے لیے دس لاکھ کا انعام پیش کرسکتا ہے' وہ اپنی زندگی کی' سیاسی ساکھ اور خاندانی نیک نامی کی کیا قیمت دے سکتا ہے؟ وہ دس لاکھ تو ریڈر کو دے سکتا ہے۔ بیس لاکھ مجسٹریٹ کو۔ پچاس لاکھ یا ایک کروڑ خرچ کرکے وہ اس معاملے کو یہیں ختم کرسکتا ہے۔ تو یقیناً کرے گا بلکہ اب تک کرچکا ہوگا۔ رب نواز خوش ہوکے دس لاکھ انعام کے طور پر ڈی ایس پی کو بھی دے سکتا ہے اور اتنے ہی تھانے دار کو بھی۔ مجھے آج اتفاق سے معلوم ہوگیا تھا کہ کیانی کس کردار کا آدمی ہے۔"

"کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا؟"

میں نے کہا "فرید عباسی کہاں ہے؟"

"وہ گیا ہے پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے۔ وہ میرے جانے کے بعد آیا تو رحمتی نے اسے سب بتادیا تھا۔ وہ تدفین کے انتظامات بھی کرے گا۔"

مجھے بہت افسوس ہوا "کیسی بدقسمتی کی بات ہے کہ میرا کسی سے رابطہ نہیں ہوا ورنہ میں عائشہ کلینک سے سوتی کو نکال کرنہ لے جاتا تو ایک اور مشکل ہوتی۔"

رئیس نے سرہلایا "میں نے دیکھے ہیں آج کے اخبارات۔"

میں نے کہا "یہ خبیث ڈی ایس پی وہاں گیا تھا۔ عائشہ کلینک۔"

"سوتی کی گرفتاری کے لیے؟"

"نہیں۔ وہ ایک اور معاملے میں ڈاکٹر عائشہ کا دشمن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ سونی کو فوراً لے جاؤ یہاں سے ورنہ دس لاکھ کے لالچ میں کسی نے اسے پکڑوا دیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔ ڈی ایس پی ویسے ہی دھمکیاں دے کر گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔"

"پھر میں سے لے گیا سونی کو نیلم کے پاس؟"

رئیس بھونچکا رہ گیا "نیلم کے گھر میں۔ آج نیلم کا خیال کیسے آ گیا؟"

میں نے کہا "اور کوئی ٹھکانا جو نہیں رہا تھا۔ کمال کے اسپتال میں چندا نے مسئلہ پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں اسے رکھنا ممکن نہ رہا۔ میں اسے یہاں بھی نہیں لانا چاہتا تھا۔ رب نواز کا فون آنے کے بعد یہ جگہ بھی مجھے غیر محفوظ لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے اسے بھی آزماؤں اور خدا کا شکر ہے اس نے میرے اعتماد کو شکست نہیں ہونے دی مگر بُرا یہ ہوا کہ اتنی دیر تک میں بھی فون کرتا رہا اور تم بھی کرتے رہے۔"

"نیلم کے گھر کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا تھا تو وہاں نہیں تھا۔"

میں نے کہا "فون کی ایک لائن اس طرف سے بھی آنی چاہیے۔"

"دراصل جب وہ پیچھے والا مکان لیا تو وہاں کوئی فون نہیں تھا۔ ہوگا کبھی مگر کٹ چکا تھا۔ میں نے رئیس خانے کے دو ٹیلی فونوں میں سے ایک یہاں شفٹ کر دیا۔ حملہ آوروں نے رئیس خانے میں آنے والی دونوں لائنیں پہلے ہی باہر سے کاٹ دی تھیں۔"

بہت دیر تک خاموش رہنے والی شبنم نے بالآخر کہا "اب کیا کرنا ہے، پہلے یہ سوچو؟"

"مجھے اب تدفین میں شرکت کے لیے جانا ہے" رئیس بولا "یہاں میں صرف تم دونوں کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ تو اپنے دل سے تدفین میں شرکت کا خیال بھی نکال دے۔"

میں نے کہا "یار، خطرہ تو ہے فرید عباسی کو۔"

"نہیں۔ یہاں آنے والوں نے واپس جا کے رب نواز کو رپورٹ دی ہوگی کہ وہاں فرید عباسی کوئی نہیں۔ ایک تو کوئی لمبے لمبے بالوں اور داڑھی مونچھ والا ہے اور دوسری اس حلیے کی ایک لڑکی ہے تو رب نواز خود سمجھ جائے گا کہ وہ لڑکی شبنم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ مجھے وہ شبنم کے ساتھ اس کے ڈرائیور کے طور پر دیکھ چکا ہے مگر دو اور دو چار کرنے سے اسے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا ہر حلیہ شبنم کے ساتھ نظر آنا اور شبنم کا یہاں روپوش رہنا کیا ثابت کرتا ہے۔ یہی کہ ہم سب ایک ہیں۔ فرید عباسی، رخشی، شبنم اور تو پانچواں مجرم میں جس نے تم سب کو جگہ فراہم کر رکھی ہے۔ سونی کے ساتھ بھی اشتہار میں تیرا حوالہ ہے۔ اس کا مطلب ہوا سونی کو بھی ہم نے چھپا رکھا ہے۔"

"پھر تو خطرہ ہم سب کے لیے برابر ہی ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ تدفین کے وقت کچھ نئے چہرے ضرور نظر آئیں گے۔ سادہ کپڑوں میں پولیس والے اور کچھ رب نواز کے بندے یہ دیکھنے کے لیے موجود ہوں گے کہ مطلوب افراد میں سے کون کون نظر آ رہا ہے۔ وہ قبرستان میں تو کوئی کارروائی کرنے سے رہے۔"

رئیس نے انکار میں سر ہلایا "رسک لینے کا فائدہ کیا ہے۔ خود فرید عباسی نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تدفین کے تمام انتظامات کفن دفن کرنے والی ایک خیراتی اور فلاحی انجمن کے سپرد کر دیے ہیں۔ اس نے اپنی جان کو خطرہ ظاہر کرتے ہوئے ڈی آئی جی کو ایک درخواست دی تھی جو آج اس نے ہائی کورٹ میں بھی پیش کر دی۔ اس نے ہائی کورٹ کے حکم سے ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرتے ہوئے اس کا نام ایف آئی آر میں شامل کرنے کی جو درخواست کی تھی، اس پر نوٹس جاری ہو گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مرغی خانے میں ہونے والے دو قتل رب نواز کے ایما پر ہوئے اور اس وقت وہ خود بھی مرغی خانے میں موجود تھا لیکن پولیس کی کوتاہی نے اسے چھپنے اور جائے واردات سے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دہرے قتل کی اس واردات میں ایک کانسٹیبل بھی ہلاک ہوا تھا۔ اس کی موت گردن ٹوٹنے سے واقع ہوئی مگر لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایسا نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں موت کی وجہ وہی تھی جو کانسٹیبل شیر خان کے لیے لکھی گئی یعنی یہ کہ وہ گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ یہ رپورٹ بعد میں غائب کر دی گئی۔ جائے واردات سے ملنے والا ریوالور ملک رب نواز کی ملکیت تھا اور اس پر فنگر پرنٹ تھے جو بعد میں مٹا دیے گئے۔ مرغی خانہ رب نواز کی ملکیت ہے اور گواہوں نے واردات کے وقت رب نواز کی گاڑی کو شناخت کیا تھا جو باہر موجود تھی۔ چنانچہ اس کا نام ملزمان میں شامل کیا جائے۔ رب نواز کے دو ملازمین کا پولیس کی تحویل میں اعتراف جرم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست کی تو ثیق نہ کی جائے ورنہ وہ گواہوں پر اور مقدمے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گا۔ عدالت نے ضمانت قبل از گرفتاری کی تو ثیق نہیں کی اور فرید عباسی کو گارڈ فراہم کرنے کی ہدایت کی۔"

"ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست تو وکیل دے سکتا ہے مگر فیصلے کے وقت ملزم کا عدالت میں موجود ہونا ضروری ہے۔"

"ہاں۔ رب نواز پیش ہوا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا لیکن جیسے ہی عدالت نے درخواست مسترد کی، وہ غائب ہو گیا۔"

میں نے کہا "کہاں غائب ہو گیا؟"

"بس ہو گیا۔ ایسا تو عدالتوں میں کئی بار ہوا ہے۔ اس کا انتظام پہلے سے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے، پولیس کی مدد سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد خانہ پُری کے لیے باہر موجود پولیس اہلکاروں کو معطل کیا جاتا ہے۔ وہ بھی راضی خوشی گھر جاتے ہیں اور ملزم بھی گھر پہنچ کے طے شدہ انعام کی رقم انہیں بھجوا دیتا ہے۔ اسے رشوت کون کہہ سکتا ہے۔ رب نواز اپنے گھر میں چاہے نہ ہو مگر کسی نہ کسی ٹھکانے پر ضرور آرام سے بیٹھا وکیلوں سے قانونی مشورے کر رہا ہوگا۔"

میں نے کہا "وکیل کون ہیں اس کے؟"

"ایک تو وہی ہیں جو پچھلے سال بار کونسل کی صدارت کے امیدوار تھے، امین ڈوگر۔ وہ تھوڑے سے ووٹوں سے ہار گیا تھا کیونکہ مقابلے پر جیتنے والے کی بہت عزت تھی اور امین ڈوگر کے جوڑ توڑ کے باوجود وہی جیتا تھا جو مستحق تھا۔ بار کے انتخابات میں دھاندلی نہیں چلتی۔ وکیل بہت سیانے ہوتے ہیں۔ رب نواز کا دوسرا وکیل اکبر سبحانی ہے۔ فوجداری مقدمات کا سب سے نامور وکیل۔ وہ یقیناً سپریم کورٹ میں اپیل کریں گے۔"

"لیکن اس وقت تک تو رب نواز آزاد... نہیں پھر سکتا، جب تک ضمانت کی درخواست منظور نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن اس کی غیر موجودگی میں سامنے آ گیا ہے دلنواز۔ اس کا بیٹا۔ وہ آج عدالت میں بھی بہت اکیڈو تھا۔ ایک بار اس نے براہ راست دھمکی بھی دی کہ فرید صاحب، آپ کے ساتھ ہماری کوئی دشمنی نہیں لیکن ہمارے دشمنوں کا ساتھ دے کے آپ فائدے میں نہیں رہیں گے۔ فرید نے کہا کہ میں تو وکالت ہی چھوڑ دوں لیکن لاہور میں سیکڑوں وکیل ہیں۔ آپ کس کس کو یہ نفع نقصان کا سوال سمجھائیں گے۔ اس نے فرید کو بتا دیا کہ اگر ملک صاحب کے خلاف شبنم کے اغوا کا کیس چھیڑا گیا تو وہ اپنے اغوا کے معاملے میں شبنم کے ساتھیوں کو فریق بنا لے گا۔"

"کون سے فریق؟ آزاد صاحب یا سبحانی؟"

"فرید نے کہا کہ اس کیس میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے کا احترام کریں گے مگر رب نواز نے سونی کے خلاف ایف آئی آر درج کرا کے اور آج اخبار میں اپنی طرف سے اشتہار شائع کر کے بدعہدی کی ہے۔ رب نواز کو اسی لیے وہاں سے نکلنے کا موقع دیا گیا تھا کہ وہ سونی کے معاملے میں خاموش رہے گا۔ اب اس نے پہل کی ہے تو یہ جواب ہے ہمارا۔ ہم بھی اب ثابت کر دیں گے کہ اصل بات کیا تھی۔ فرید عباسی کے ساتھ یہ معمولی سی جھڑپ عدالت کے باہر ہوئی تھی۔ اس وقت تک فرید کو یہ علم نہیں تھا کہ کچھ حملہ آور اس کی تلاش کے نام پر رئیس خانے میں کیا خونریزی کر گئے ہیں۔"

میں نے کہا "چل تو جا۔ فرید اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا مگر تو جائے گا کہاں؟"

"وہیں جہاں ان دونوں کی لاشیں رکھی ہیں" رئیس کی آنکھوں سے پھر آنسو نکل آئے۔

میں نے چابی اسے دے دی "عائشہ کلینک کے سامنے سے اپنی پے جیرو اٹھا لینا۔ کہاں لے جائے گا تو اسے؟"

"جیرے بلیڈ کو دے دوں گا۔ وہ کسی شو روم میں کھڑی کر دے گا۔ کل وہ بھی آئے گا تدفین میں" رئیس بولا۔

اچانک شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"تم۔ کیوں بلاوجہ۔۔؟"

"نہیں رئیس۔ ایک بار ہو گیا جو ہونا تھا۔ رب نواز کو بھی سمجھ آ گئی ہوگی کہ میں اکیلی عورت نہیں ہوں اور صرف عورت نہیں، ایک صحافی بھی ہوں۔ میں ڈر کے گھر میں بیٹھ گئی تو کام نہیں چلے گا" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں زیادہ حقیقت پسندی سے کام لے رہی ہوں۔ اتنی بزدلی دکھاتی تو اتنا نام نہ ہوتا میرا۔ اب میں اپنی حفاظت کا زیادہ خیال رکھا کروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا پہلے، اب ہر جگہ ساتھ رکھوں گی۔"

میں نے کہا "ایک ریوالور سے کیا ہوگا؟"

"یہ ہوگا کہ میں دو چار کو ضرور مار دوں گی اگر موقع ملا۔ میں جہاں جاؤں گی سب کو بتا کے جاؤں گی۔ میرے ساتھ تمہارے علاوہ۔۔۔ کوئی اور بھی ہوگا۔ میرے پیشہ ور ساتھیوں میں سے کوئی۔ فرید نے اچھا کیا کہ اپنی حفاظت کے لیے گارڈ لے لیا۔ رب نواز کے کچھ کرنے سے پہلے ہی پولیس اور عدالت کو مطلع کر دیا۔ اب آج جو حملہ آور آئے تھے وہ فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ اس سے فرید کا کیس کتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مضبوط ہو گیا ہے' میں بھی ایسا ہی کروں گی۔"

میں نے کہا "تم رب نواز کے خلاف کھلی جنگ لڑو گی؟"

"ہاں۔ لڑنی ہی پڑے گی۔ میں چھپ کے نہیں بیٹھ سکتی۔ ثبوت شہادت بعد کی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ کیس خارج ہو جائے گا لیکن میں کھینچتی ہوں رب نواز کو ہر معاملے میں۔ میرا اغوا اور میری گاڑی کی چوری۔ میں اس کی بیوی کو ایک گواہ کے طور پر بلوا سکتی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے کیسے جھوٹ بولتی ہے؟"

"تو ادرات یا منشیات کی اسمگلنگ کے معاملے کو مت چھیڑنا۔" میں نے کہا۔

شبنم کی حکمت عملی نے مجھے قائل کر لیا تھا لیکن رخشی کی فرید کی طرف سے تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ شاہ عالم کے ساتھ سیاسی زندگی کے سارے مدوجزر جھیل چکی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ ایک عام عورت میں جو کسی بابو یا دکاندار کی بیوی ہوتی ہے اور اس میں جو فرق پہلے تھا' وہ آج بھی ہے اور وہ روایتی انداز میں میرا گھر میری جنت کا خواب ضرور دیکھ سکتی ہے مگر یہ گھر اسے ملے گا نہیں۔ وہ اپنے شوہر کو منع بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ سب چھوڑو اور شرافت سے کہیں نوکری کرو یا اپنی وکالت چلاؤ۔ سب سے اچھی سمجھی جانے والی پولیس کی نوکری بھی اسے راس نہیں آئی تھی اور وکالت میں بھی وہ نہیں چل سکا تھا۔ اس کی فطرت جو پہلے تھی وہی آئندہ بھی رہے گی اور اسے بدلنے کی کوشش کرنا بھی لا حاصل ہو گا۔ وہ ہمیں بھی الزام نہیں دے سکتی تھی کہ تمہارا ساتھ دے کے فرید عباسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس جیسے شخص کے لیے زندگی آسان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

جب شبنم اور رئیس نے گیراج میں سے چھوٹی سی سفید رنگ کی آلٹو گاڑی نکال لی تو میں نے فرید کی شیراڈ کو اندر کھڑا کر کے شٹر کو لاک کر دیا۔ گھر کا سناٹا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ لائن ابھی تک کٹی ہوئی ہے مگر پولیس کی مہربانی سے یا کسی کی رپورٹ پر لائن جوڑ دی گئی تھی۔

"ہیلو!" میں نے اپنی آواز بدل کے کہا۔

فرید نے پھر بھی آواز پہچان لی "ناصر' تو آ گیا۔ کہاں مر گئے تھے تم سب۔"

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ سونی کو میں نے نیلم کے گھر شفٹ کر دیا ہے اور وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"یہ نیلم کون ہے؟"

میں نے اسے بتا دیا "رئیس کے ساتھ شبنم ابھی نکلی ہے۔ وہ وہیں جائیں گے۔ جہاں سے جنازہ اٹھے گا ان دونوں کا۔"

"میں بھی یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ فون کب بحال ہوا؟"

"پتا نہیں۔ بس ابھی پہلا فون تیرا ہی ریسیو ہوا ہے۔ کیا تو نے کوشش کی تھی؟"

وہ بولا "ہاں۔ رخشی کہاں ہے؟"

"یہ رہی۔" میں نے ریسیور اسے تھما دیا "بات کر۔"

فرید نے بیوی کا خیال رکھنے والے ایک اچھے شوہر کی طرح اسے تسلی دی کہ وہ بالکل فکر نہ کرے اور تدفین انشاء اللہ مغرب تک ہو جائے گی تو ہم سیدھے گھر ہی آئیں گے۔ اس نے اپنی بیوی سے یہ بھی کہا کہ مجھے باہر نہ جانے دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی یتدفین میں پہنچ جاؤں۔

رخشی سخت افسردہ تھی اور بار بار اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا۔ وہاں سب خیریت تھی۔ میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ سونی کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ بالکل مطمئن رہے۔ ہماری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہو گی کہ اس کے لیے مشکلات پیدا ہوں پھر اس کا شکریہ ادا کر کے میں نے ریسیور رکھا اور نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہ اپنے شیڈول کے مطابق شوٹنگ کے لیے جا چکی تھی اور سونی شاہانہ انداز میں اپنی پیاری اور اس کی میزبانی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بھی رئیس خانے میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں چھ بھی نہیں بتایا اور اپنا وعدہ دہرا کے فون رکھ دیا کہ ہم رات کو ضرور آئیں گے۔

اندر کی طرف سے میں نے رئیس خانے میں جھانک کے دیکھا۔ رخشی نیچے اکیلی ڈرتی تھی۔ وہ میرے ساتھ لگی رہی۔ زینے کا دروازہ کھول کے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ پہلے کمرے میں قدم رکھا پھر دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور یہ یقین آ جانے کے بعد کہ اندر پولیس نہیں ہے' میں نے رخشی کے ساتھ "جائے واردات" کا معائنہ شروع کیا۔ ابھی شام ہونے میں بھی وقت تھا چنانچہ اندر کوئی لائٹ جلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھڑکیوں سے اندر آنے والا سہما ہوا اجالا ظلم و بربریت کی ساری کہانی خود سنا رہا تھا۔ کمرے میں بہت توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ ناکامی کے انتقام کا رد عمل ہر چیز کی تباہی سے عیاں تھا۔ حملہ آوروں نے ٹی وی توڑ دیا تھا اور دھماکے سے پھٹنے والی پکچر ٹیوب کا شیشہ دیواروں سے ٹکرا کے سارے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ وی سی آر اور ڈش ریسیور وہ مال غنیمت کے طور پر اٹھا کر لے گئے تھے۔

انہوں نے ڈیکوریشن پیس گرائے تھے۔ سینٹر ٹیبل کے شیشے چور چور کر دیے تھے۔ کھڑکیوں' دروازوں پر ہاکیاں ماری تھیں۔ دوسرے کمرے میں فرنیچر الٹا پڑا ہوا تھا اور اس میں رکھی ہوئی سب چیزیں فرش پر بہہ گئی تھیں۔

جب میں نے صوفے الٹے ہوئے دیکھے۔ الماریاں کھلی ہوئی اور سوٹ کیس خالی دیکھے تو مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ حملہ آور صرف فرید عباسی کی تلاش میں نہیں آئے تھے۔ وہ اس منحوس مورتی کے سر کی تلاش میں بھی تھے جس کی مالیت کا ابھی تک ہمیں صحیح اندازہ نہ تھا۔ وہ کئی لاکھ کی یا کروڑوں کی بھی ہو سکتی تھی۔ اس تلاش کے دوران میں انہوں نے جی کھول کے لوٹ مار کی تھی۔ وہ بہت سی قیمتی چیزیں بھی اٹھا کے لے گئے تھے۔ نقصان کی مالیت کا صحیح اندازہ شاید خود رئیس کے لیے بھی آسان نہ تھا۔

ضابطے کی کارروائی کرتے ہوئے پولیس نے باہر سے دروازوں کو مقفل اور سیل کر دیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں سے جھانک کے میں نے برآمدے کا منظر دیکھا۔ وہاں فرش پر تیمی مار خان کے لہو کی سرخی اب سیاہی میں بدل رہی تھی۔ خون کے چھینٹے دیواروں پر بھی تھے۔ کمرے کے اندر جو خون کے دھبے تھے وہ غالباً چھوٹی کا خون تھا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا اور ایک پرتشدد موت کی تصویر اس میں اپنی ساری جگر خراشی کے ساتھ نظر آتی تھی۔ مین گیٹ کے باہر شاید پولیس کا کوئی سپاہی پہرے پر مامور تھا لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ شاید ابھی پولیس کی کچھ کارروائی باقی تھی۔ وہ جائے واردات یا "قوعہ" کی تفصیلات اپنے روایتی گورا شاہی انداز میں اکٹھا کرتے ہیں۔ چند تصویریں بنانا' خون کے نمونے لینا اور فنگر پرنٹ حاصل کرنے کے علاوہ وہ خود بھی نقشے بناتے ہیں اور ہر چیز کا اندراج اپنی رپورٹ میں کرتے ہیں۔ یہی ابتدائی تفتیش کے مراحل ہیں جس میں ڈنڈی مار کے وہ پورے مقدمے کی نوعیت بدل سکتے ہیں۔ متاثرہ شخص یا اس کے لواحقین تو سرکاری کارروائی میں دخل در معقولات کا جرم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ خاموشی سے سب دیکھتے رہتے ہیں۔ بعد میں یہ ثابت ہو جائے کہ خون کا بلڈ گروپ تو کچھ اور تھا یا وہاں کوئی مرغی ذبح کی گئی تھی اور یہ کہا جائے کہ اہل خانہ کے سوا کسی کے فنگر پرنٹ نہیں ملے تو تفتیش الٹی مدعی کے گلے پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ میاں یا بیوی نے ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے لیے ڈکیتی کا ڈراما کیا اور حملہ آوروں کی کہانی گھڑ لی۔ ان کے ازدواجی تعلقات خراب تھے اور فلاں کا فلاں سے یارانہ چل رہا تھا۔

یہاں یہ سب ممکن نہیں تھا چنانچہ جو چیز جیسی تھی اسی حالت میں موجود تھی۔ جو لوٹ مار ہوئی تھی' وہ حملہ آوروں نے کی تھی اور جو پہلے ایک قتل کی واردات تھی وہ چھوٹی کے مرنے سے دہرے قتل کا کیس بن گیا تھا۔ یہ رئیس پر منحصر تھا کہ وہ کسی چیز کے غائب ہونے کی رپورٹ کرتا ہے یا نہیں۔ بالفرض محال حملہ آور پکڑے جاتے تب بھی نقصان کی تلافی ممکن نہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مالی نقصان بھی لاکھوں کا تھا۔ دو انمول جانوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس معائنے کے دوران میں جو سوال مسلسل میرے ذہن میں موجود رہا تھا یہ تھا کہ آخر رب نواز کو رئیس خانے کا فون نمبر کیسے معلوم ہوا تھا۔ بلاشبہ وسائل رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر وہ باتیں ناقابل فہم تھیں۔ ایک یہ کہ کسی نے فرید عباسی کے لیے یہ محنت کی تھی۔ میرے اور شبنم یا رئیس اور سونی کا سراغ لگانے کے لیے نہیں کیونکہ فرید اور اور رخشی کو یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیا رئیس خانے کا فون آبزرویشن پر تھا؟ اس سوال کا جواب نفی میں آتا تھا کیونکہ رب نواز آج تک ہمارے اس خفیہ ٹھکانے کا سراغ لگانے میں ناکام تھا۔ اس زمانے میں یقیناً رب نواز نے سرتوڑ کوشش کی ہو گی جب اس کا بیٹا دل نواز یہاں قید تھا مگر وہ قید خانے تک نہیں پہنچ سکا تھا ورنہ اسے ضرور چھڑا لے جاتا۔ چنانچہ دوسری غور طلب بات یہ تھی کہ رب نواز نے کسی کی فون کال سے فرید کا سراغ لگایا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا' فرید کے نام پر کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اسے کال کرنے والا اس کے پرانے پتے پر فون کرتا۔ اس گھر کا نمبر ملاتا جس کو وہ چھوڑ آیا تھا۔ یقیناً جان پہچان والے اب بھی وہی نمبر ملا رہے ہوں گے۔ گھنٹی بجتی رہتی ہو گی تو وہ مایوس ہو جاتے ہوں گے۔ یہ سمجھ لیتے ہوں گے کہ میاں بیوی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کسی کو ابھی تک ان کی مستقل نقل مکانی کا علم نہیں تھا اور یہ کوئی جان بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنا گھر چھوڑ کے وہ گئے تو کہاں گئے؟ یہاں فرید کو یا رخشی کو کمال اسپتال سے فون آ سکتا تھا لیکن چندا' تمرا کمال میں سے کسی نے بھی اسے فون نہیں کیا تھا اور اگر وہ ایسا کرتے تو اس سے بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ کمال اسپتال سے ہمارے تعلق کا کسی دشمن کو علم نہیں تھا اور وہاں کی فون کال ٹریس کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے اتنے بڑے شہر میں کوئی بچہ گم ہو جائے تو نام سے اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلاش کرلیا جائے۔

اس صورت حال میں میرا ذہن دو ہی امکانات کو قبول کرتا تھا۔ ایک یہ کہ کسی نے فرید عباسی کا تعاقب کیا۔ کورٹ سے کوئی اس کے پیچھے لگ گیا اور فرید کو پتا نہیں چلا لیکن ایسا ہوتا تو ملک رب نواز فون کرکے کیوں پوچھتا۔ یہ ڈیوٹی جن کے ذمے لگائی گئی تھی وہ اطمینان سے رات کے وقت آتے اور اپنی کارروائی کرکے چلے جاتے۔ وہ تیس مار خان یا چھوٹی کو بلاوجہ اس جرم میں قتل کیوں کرتے کہ انہوں نے فرید عباسی کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کردیا تھا اور یہ مرتے دم تک نہیں مانا تھا کہ وہ اور رخشی یہیں رہتے ہیں۔ چنانچہ دوسرا امکان یہ تھا کہ کسی نے بطور خاص رب نواز کو فون کرکے یہ نمبر بتایا۔ اس فون نمبر کا سراغ لگا کے اس نے اپنے بندے بھیجے اور انہوں نے بھی آس پاس کے لوگوں سے پوچھا۔ ظاہر ہے فرید عباسی یا رخشی کو کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ مستقل آتے جاتے مجھے اور شبنم کو دیکھا گیا تھا۔ ہمارے نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ حملہ آور یہ پوچھتے رہے کہ وہ داڑھی والا فرید عباسی نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اور وہ عورت رخشی نہیں تو کیا شبنم ہے؟

صاف ظاہر تھا کہ وہ فرید عباسی کے اور رخشی کے دشمن بھی تھے لیکن یہ رب نواز کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس فون نمبر سے میرا یا شبنم کا سراغ مل جائے گا۔ فرید یا رخشی کا ایسا دشمن کون تھا؟ اس سوال کا جواب ایک ہی تھا کہ رب نواز۔ گھوم پھر کے میرا شک چندا پر جاتا تھا کہ اس نے رب نواز کو یہ فون نمبر دیا۔ نام فرید عباسی کا بتایا مگر درحقیقت اس نے سب کا سراغ دے دیا۔ وہ شبنم اور سوہنی کے ساتھ مجھ سے بھی بدظن تھی اور مجھے بھی جرم بے وفائی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ یہ بات جتنی بعید از امکان لگتی تھی، اتنی ہی قرین قیاس بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے خلاف اور اس کے حق میں دلائل کا توازن برابر تھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چندا ایسا نہیں کرسکتی۔ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں وہ کچھ بھی کرسکتی تھی لیکن اس کی تصدیق کرنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ بات اس سے براہ راست پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں کمال سے پوچھتا تو وہ مجھ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کرتا۔

رخشی چپ چاپ اور دہشت زدہ کھڑی تھی اور نہ جانے کن خیالوں کے گرداب میں غوطہ زن تھی۔ شاید وہ شاہ عالم کی موت کے بعد پیش آنے والے واقعات میں کارفرما قدرت کی ستم ظریفی کے انداز دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی حالات کے مسلسل فریب کا عنوان بن کے رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب شاہ عالم کو پا کے اس نے سمجھا تھا کہ اس نے اپنے سارے خوابوں کی تعبیر پالی ہے اور اپنی تقدیر پر رشک کیا تھا ورنہ دنیا میں کون ہے جو اپنی خواہشات کا کشکول لیے نہیں پھر رہا ہے اور جس پر تقدیر بہت مہربان ہوا سے بھی ایک اشارے میں عزت، دولت، شہرت کی اس بلندی تک کہاں پہنچاتی ہے جہاں سے دیکھنے پر ساری دنیا یوں لگے جیسے صحن گلشن میں آشیاں رکھنے والی بلبل کو گزشتہ رہنے والی حشرات الارض کی بستی۔ جہاں کبھی خود اس کا گھر تھا پھر کچھ سالوں میں اسے احساس ہوا کہ اس کے خواب کتنے جھوٹے اور دھوکا دینے والے تھے۔ وہ پتھر کی دیواروں کے زنداں سے نکل کے سونے کے پنجرے میں بند ہوگئی تھی۔ اس کی حالت صحرا کے اس مسافر جیسی ہوگئی تھی کہ جس کے پاس ہیرے جواہرات کا خزانہ تھا مگر پانی جیسی بے وقعت چیز نہیں تھی پھر شاہ عالم ایک ناقابل یقین حادثے کا شکار ہوا اور قدرت نے اسے ایک موقع فراہم کیا کہ وہ عزت اور شہرت کی آب و تاب رکھنے والی زندگی کے بدلے گمنامی قبول کرے تو محرومیوں کا آزار بن جانے والی سب خوشیاں اسے مل سکتی ہیں چنانچہ اس نے مجھ سے ایک سودا کرلیا۔ اس نے مجھے شاہ عالم مان لیا اور میں نے اپنے وعدے کے مطابق اسے اس کی ساری دولت کے ساتھ وہ آزادی بھی دے دی جو شاہ عالم کے جیتے جی اسے صرف موت کی صورت میں مل سکتی تھی۔ فرید کا بننا اس کے لیے محبت کے خواب کی یقینی تعبیر تھا اور اسے یوں لگا جیسے قدرت نے اس کے ساتھ ہونے والے ماضی کے ہر دکھ، ہر ناانصافی اور محرومی کے ہر عذاب کی تلافی کردی ہے۔ گمنامی کی زندگی وہ پہلے بھی قبول کرچکی تھی۔ خیالوں کی تنہائی دور ہوئی تو گزر جانے والے وقت پر احساس زیاں کا ملال بھی اسے اپنی بے وقوفی لگا۔ ابھی زندگی کی ساری مسافت باقی تھی۔ چند قدم کسی راہزن کو راہرو سمجھنے سے منزل تو کھوٹی نہیں ہوتی۔ شاہ عالم کے ساتھ گزارے ہوئے چھ سال تو اس عمر کے سفر کی زکوٰۃ بھی نہیں جو اس کے سامنے خوشی کے خزانے لیے انتظار میں ہے کہ وہ فرید کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھے اور ان خوشیوں کو سمیٹ لے۔

اب شاید اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے لیے خوشی ایک سراب ہے۔ شاہ عالم مرنے کے بعد بھی آسیب بن کر اس کی زندگی پر اپنے منحوس سایوں کے ساتھ مسلط ہے۔ پہلے رب نواز اس کے لیے عذاب بن کر نازل ہوا کہ شاہ عالم اگر لندن

میں ہے تو اس کا پتا بتاؤ پھر میری اور فرید کی دوستی نے اس کے مستقبل کے اس خواب کو منتشر کردیا جس میں ہر عورت خود کو ایک محبت کرنے والے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ کسی گھر کے محفوظ حصار میں دیکھنا پسند کرتی ہے۔

میں نے اسے آہستہ سے ہلایا تو وہ چونک پڑی۔ میں نے کہا "تم یقیناً سوچ رہی تھیں کہ میری وجہ سے تم کس مصیبت میں پڑ گئیں۔"

اس نے جھوٹ سے نفی کرنے کی کوشش کی "نہیں۔ ایسی بات نہیں، یہ سب تو نصیب کے کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "فرید کو اس ایف آئی آر کی وجہ سے ہی رب نواز کی دشمنی بھگتنی پڑ رہی ہے۔ جو اس نے میری طرف سے کٹھوائی۔ بلکہ کٹھوانے کی کوشش کردی ہے۔"

"یہ تو ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ اس سے پہلے رب نواز میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کے ذمے دار تم تو نہیں تھے۔"

"چلو آؤ۔ سوچ سوچ کے ہلکان ہونے سے نہ دکھ کم ہوتا ہے نہ پریشانی دور ہوتی ہے۔ میں فرید کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ تمہارے ساتھ کہیں اور چلا جائے۔"

"بے فائدہ ہے۔ میں تم سے پہلے اس کوشش میں ناکام ہوچکی ہوں۔ اس کا عقیدہ محض زبانی نہیں کہ زندگی اور موت پر خدا کے سوا کسی کا اختیار نہیں۔ نہ ہم بھاگ کے زندہ رہ سکتے ہیں اگر وقت آگیا ہو ورنہ اس وقت سے پہلے یہ کسی انسان کی طاقت میں ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کے حق سے محروم کرسکے۔"

"لیکن کوشش تو ضرور کرنی چاہیے اپنی حفاظت کرنے کی۔"

"وہ کہتا ہے کہ کوشش اور فرار میں بہت فرق ہے۔ کوشش ضرور کریں گے ہم یہاں رہ کے۔ عقل سے اور ہمت سے مقابلہ کریں گے۔ خودکشی تو ویسے ہی حرام ہے اس لیے جانتے بوجھتے موت کے منہ میں نہیں جائیں گے۔ باقی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھ لو رزق کے معاملے میں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"وہ کہتا ہے کہ پولیس کی نوکری سونے کی کان تھی۔ وہ چھن گئی۔ وکالت پڑھی تھی، وہ کام نہیں آئی اور گھر بیٹھے خدا نے تم جیسی دولت مند بیوی بھیج دی، اب ایسی باتوں کا بھلا کوئی جواب ہے؟" وہ بولی۔

اوپر آکے میں نے کمال کو فون کیا "تو مصروف ہے؟"

"ہاں۔ فراغت تو مجھے سونے کے بعد بھی نہیں ہوتی۔ بہت سے خواب ہیں جو ابھی نہیں دیکھے۔ دن میں مریض دیکھتا ہوں یا فائلیں، شام کو بیوی اور نرتی دی۔"

میں نے کہا "آج میں نے سوہنی کو غائب کردیا۔"

"اچھا کیا۔ ورنہ دس لاکھ کے انعام کے چکر میں میرا اسٹاف بھی کام چھوڑ کے نکل جاتا اسے تلاش کرنے۔"

"ہاں۔ ان سب نے تو دس لاکھ کے چیک کو دیکھا تھا اور غالباً ایک دیکھنے والا اس چیک کو کیش کرانے کے چکر میں عائشہ کلینک تک پہنچ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ کس کی بات کررہا ہے تو۔ اپنی بہن کی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "میری بہن ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتی۔ اس کا بھائی ایک کروڑ پتی ہے۔ دس لاکھ اس پر ویسے ہی وار کے پھینک سکتا ہے۔ میں چندا کی بات کررہا تھا۔"

"چندا کی۔ سور کے بچے! میں وہاں آکے ماروں گا تجھے۔"

میں نے کہا "چندا وہاں آئی تھی، سوہنی سے سوری کہنے۔"

"بکواس مت کر۔ وہ آج کہیں بھی نہیں گئی اور تو کیا سمجھتا ہے، آخر اسے۔ وہ سوہنی جیسی لڑکی سے معافی مانگ سکتی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں لگتا تو مشکل ہے۔ اسے کمپلیکس ہے آج کل کہ وہ ایک کرمل کی بیٹی اور خاندانی ہے۔ سوہنی، میں یا شبنم اور رئیس۔ سب حرامی ہیں۔ کسی کے ماں باپ کا پتا نہیں لیکن جو میں کہہ رہا ہوں وہ بھی حقیقت ہے۔ وہ اسپتال کی ایمبولینس میں آئی تھی۔ شبنم سے بھی ملی۔ اس نے اپنے گزشتہ روز کے رویے پر معافی مانگی۔ یہ کہا کہ باقی سب سے بھی کہہ دے کہ اسے بہت افسوس ہے۔ شبنم نے کہا بھی کہ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ناصر آنے والا ہے، جو کہنا ہے، خود کہہ دینا اس سے مگر وہ بڑی عجلت میں بھاگ گئی۔"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟" کمال متفکر لہجے میں بولا۔

"گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کی۔"

"اسپتال کی ایمبولینس کس نے دیکھی تھی؟"

میں نے کہا "خود شبنم نے۔ وہ عائشہ کلینک کے اندر لے گئی تھی اور خود ہی ڈرائیو بھی کررہی تھی۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے کہا "میں تجھے پوچھ کے بتاؤں گا۔"

"تجھے معلوم نہیں؟"

"نہیں۔ گیارہ سے بارہ کے درمیان میری معلومات کے مطابق وہ یہیں تھی لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ میں کہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور معصوف تھا۔ شاید کوئن کو پتا ہو۔ وہ گئی ہوگی تو خود بتادے گی مگر ایمبولینس لے کر۔ جسے وہ خود چلا رہی تھی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

پھر میں نے اسے کمال کو وہ سب بتادیا جو رئیس خانے میں ہوا تھا۔ اس نے سخت افسوس کا اظہار کیا "یار' میں تمیں مارخان کو جانتا تھا اور چھوٹی کو لیکن بڑے دکھ کی بات ہے کہ وہ لاقانونیت کی بھینٹ چڑھ گئے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

میں نے کہا "یہی تو ہماری انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ دن دہاڑے کچھ لوگ آئے اور سب لوگوں کے سامنے ان کو مار گئے۔ اب ملزم کون ہے یہ ہم سب جانتے ہیں مگر انہیں اسی قانون کا تحفظ حاصل ہے جس کا اصل مقصد انہیں سزا دلوانا ہونا چاہیے۔ کہنے کو قانون کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے۔"

"رب نواز جیسے لوگ بالآخر اپنے ہی غرور کی سزا پاتے ہیں اور سزا وہی دیتا ہے جس نے اس کی رسی دراز کر رکھی ہے۔ تو نے اب کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "کس بارے میں؟"

"اپنے بارے میں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا آخر؟" وہ بولا "مجھے تیری طرف سے پریشانی ہوگئی ہے۔ ان لوگوں سے میرا براہ راست کوئی ایسا بنیادی رشتہ نہیں۔"

میں نے کہا "فی الحال تو قمر کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ رونا شروع کردے گی۔ انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں رات کے وقت پھر فون کروں گا تجھے۔ ذرا چندا سے پوچھنا۔"

"کیا تجھے چندا پر شک ہے کہ اس نے رب نواز کو ہمارے گھر کا فون نمبر دیا ہوگا؟"

میں نے کہا "اگر وہ انکار کرتی ہے کہ آج عائشہ کلینک میں گئی اور یہ بات تجھ سے چھپاتی ہے پھر شک کی گنجائش کہاں رہے گی۔ یہ بات ثابت ہوجائے گی۔"

"کتنے شرم کی بات ہے یہ بھی کہ آج تو اس پر شک کرتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ دکھ کی بات ہوگی اگر تیری بات سچ نکلی۔ حالانکہ مجھے اس کا ایک فیصد بھی یقین نہیں" اس نے فون بند کردیا۔

میں کچھ دیر اپنے خیالوں میں گم بیٹھا رہا۔ ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ گھر کے اندر چھپ کے بیٹھے رہنا میرے لیے بزدلی کے طعنے کی طرح شرمندگی کا باعث بن رہا تھا مگر ایک تو میں رخشی کو اکیلا چھوڑ کے نہیں جاسکتا تھا۔ دوسرے مجھے رئیس' فرید عباسی یا شبنم کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار تھا کہ تمیں مارخان اور چھوٹی کی تدفین کب اور کہاں ہوگی۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ رسک کتنا بھی کیوں نہ ہو' میں جنازے کے ساتھ قبرستان ضرور جاؤں گا۔

رخشی بالکل گم صم بیٹھی تھی اور میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کو فرید سے زیادہ کسی کی سلامتی کی فکر نہیں ہوگی لیکن وہ اس کے لیے دعائے خیر مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ رسم و رواج کے مطابق جس گھر میں کسی کی موت ہوجائے وہاں سوئم کی فاتحہ تک چولھا نہیں جلتا۔ محلے والے اور عزیز و اقارب ہی گھر والوں کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر اس کی کوئی شرعی حیثیت ہوتی تب بھی مخصوص حالات میں اس روایت کی پابندی لازمی نہ رہتی کیونکہ یہاں ہمارا خیال رکھنے والا کون تھا۔ میں نے رخشی سے کہا کہ اٹھو اور کچن میں جاکے کچھ چائے کافی بناؤ تو وہ کچھ تذبذب میں پڑ گئی۔

میں نے کہا "دیکھو۔ اب چولھا جلانے نہ جلانے سے انہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی کرتے رہیں اور دعا مانگتے رہیں۔ بس یہی ان کے لیے سفر آخرت کا زادِ راہ ہوگا۔"

وہ بولی "وہ۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تم یہاں اکیلی رہوگی پھر بھی ڈروگی۔" میں نے کہا اور کچن میں ہینڈ کے ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ورق گردانی کرتا رہا۔ رخشی نے الیکٹرک کیتل لگا کے کافی بنائی اور مگ مجھے پکڑا دیا۔

"کس کا نمبر تلاش کررہے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے اس وقت تک مطلوبہ نمبر تلاش کرلیا تھا۔ میں کافی کا مگ اٹھا کے واپس کمرے میں آگیا۔ ریسیور اٹھا کے میں نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر کسی عورت نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر امجد کا گھر ہے۔"

"جی۔۔۔ لیکن وہ تو گھر نہیں آئے ہیں ابھی تک" وہ بولی۔

میں نے شائستگی سے کہا "آپ ان کی واقف ہیں۔"

"جی۔۔۔ آپ کون صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میں ان کا ایک بہت پرانا دوست ہوں۔ کنگ ایڈورڈز' میں ہم ساتھ تھے بلکہ روم میٹ تھے۔ رضوان صدیقی نام ہے میرا۔ میں آج ہی لندن سے پہنچا تھا۔ کراچی سے دو گھنٹے پہلے لاہور پہنچا ہوں اور مجھے رات کی

فلائٹ سے واپس جانا ہے۔ امجد سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے اس وقت؟"

اس کا لہجہ بدل گیا "بھائی صاحب! عام طور پر وہ اسپتال سے گھر ہی آتے ہیں اور پھر چھ بجے کلینک جاتے ہیں۔"

"آپ ذرا مجھے گھر کا اور کلینک کا ایڈریس سمجھادیں اور ہاں' کلینک کا فون نمبر بھی دے دیں۔ اگر میں آنہ سکا تو فون پر ہی بات کرلوں گا۔"

اس نے مجھے پتا سمجھادیا اور فون نمبر بھی دے دیا "اتنی جلدی میں آئے ہیں آپ لندن سے؟"

میں نے کہا "بس بھابی۔ مجبوری تھی اس لیے آنا پڑا۔"

اس نے اخلاقاً کہا کہ میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں مگر میں نے معذرت کرلی۔ ایک بار پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری کو چھان کے میں نے دوسرا نمبر تلاش کیا۔ تھانے میں حسب توقع ڈیوٹی افسر نے فون اٹھایا۔

میں نے کہا "کیانی صاحب کا ریڈر یہاں ہے؟"

اس نے کہا "کون سرجی! علاؤالدین!"

میں نے خفگی کا اظہار کیا "ان کے کتنے ریڈر ہیں؟"

وہ کچھ محتاط ہوگیا "علاؤالدین آیا تھا سر۔ اپنے انچارج صاحب کے ساتھ نکلا ہے۔"

میں نے اور کچھ کہے بغیر فون بند کردیا۔ میرے ذہن میں امکانات کا تانا بانا جس صورت حال کو واضح کررہا تھا وہ ایک اہم کامیابی کی ضامن ہوسکتی تھی۔ میں نے تیسرا فون ڈاکٹر امجد کے کلینک میں کیا۔ ابھی پانچ بجے تھے۔ اس کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ چھ بجے تک کلینک جاتے ہیں مگر ریسیور خود اس نے اٹھایا۔

میں نے کہا "یہ ڈاکٹر امجد کا کلینک ہے؟"

"یس۔۔۔ میں بول رہا ہوں" اس نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا تصور اب ایک حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے ناصر!" رخشی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔

میں نے کہا "ابھی تو کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہوسکتا ہے' مجھے ٹالو نہیں۔ پوری بات بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

مگر اس سے پہلے کہ میں رخشی کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ یا سچ کا سہارا لیتا' فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

فون رخشی نے اٹھایا اور مجھے دے دیا "آزاد صاحب ہیں۔"

"آزاد صاحب!" میں نے پریشانی سے کہا۔

آزاد صاحب ہم سے اتنے خفا تھے کہ کئی دن سے ان کی کسی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مایوس ہو کے انہوں نے ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے اور ہمارے معاملات پر اور ہم پر لعنت بھیج دی ہے۔ ان کی ناراضی برحق تھی لیکن مجھ سے زیادہ یہ شبنم کا فرض بنتا تھا کہ ان سے جھوٹ بول کر ہی سہی مگر اپنی خیریت کی خبر دیتی رہے اور اخلاقاً ان کا حال پوچھتی رہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی السلام علیکم۔"

وہ بولے "ہاں بھئی' وعلیکم السلام۔ یہ ہماری اشد مجبوری اور سخت بے غیرتی ہے گویا کہ خود ہی پوچھ رہے ہیں تم سے۔ یعنی کہاں ہو تم اس کرۂ ارض پر اور وہ خاتون۔۔۔؟"

میں نے کہا "جی۔۔۔ شبنم تو نہیں ہے۔"

"اچھا مختصراً ایک بات گوش گزار کرتی تھی گویا۔۔۔ وہ یہاں کچھ پولیس وغیرہ آئی ہے۔ سرراست انہیں باہر ہی روک لیا ہے۔ اس جواہر لال نہرو کے فرزند نسبتی نے گویا۔ اور ہمیں موقع مل گیا ہے تمہیں بتانے کا۔"

میں نے کہا "کیا پولیس ہمارے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ میاں سوال وجواب کا کرو ورنہ مت کرو۔ ہمارے بارے میں کوئی کیا معلوم کرنا چاہے گا گویا؟"

اچانک فون بند ہوگیا۔

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گُر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 200 روپے

اپنے بک سیلر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیلی فون لائن کے اچانک کٹ جانے سے میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آزاد صاحب بھی کسی مشکل میں پڑگئے ہوں' میں نے سوچا۔ غنڈاگردی اور لاقانونیت کی طاقت کا مظاہرہ کرنے والوں کو صرف رب نواز کی سرپرستی حاصل نہیں تھی' پولیس بھی ان کی پشت پناہی میں پیش پیش تھی لیکن آزاد صاحب اپنی ضعیف العمری' دھان پان جسم اور مضحکہ خیز شخصیت کے باوجود اتنے کمزور' بے حیثیت اور لاوارث نہیں تھے کہ کوئی دن دہاڑے سب کے سامنے ان کے دفتر میں گھس جائے اور انہیں بھی اسی طرح مار دے جیسے تیس مار خان اور اس کے دکھ سکھ کی شریک سفر چھوٹی کو مار دیا گیا تھا۔ وہ ایک طاقت کی علامت تھے اور یہ قلم کی طاقت تھی جو آج بھی تلوار سے زیادہ قوتِ تسخیر رکھتی تھی۔

آزاد صاحب نے تو مجھے بتادیا تھا کہ دفتر میں پولیس کی آمد بے سبب نہیں ہوسکتی مگر قانون کے رکھوالے کسی وجہ کے بغیر کہیں بھی جاسکتے ہیں اور کسی کی عزت آبرو کا خیال' چادر اور چاردیواری کے احترام کا کوئی قانون یا کسی عدالت کا حکم امتناعی بھی انہیں روک نہیں سکتا۔ ان کے پاس تفتیش کے نام پر کسی سے پوچھ گچھ کرنے' اسے یا اہل خانہ کو اٹھا کرلے جانے اور کسی بھی کیس میں ملوث کردینے کا کھلا اجازت نامہ ایک بلینک چیک کی طرح ہے جسے وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں جہاں چاہیں کیش کرالیں۔

کسی اخبار کے دفتر میں پبلک کی طرح پولیس کو بھی داخلے کا اختیار ہے اور یہ آنا جانا صبح شام کا معمول ہے مگر میرا قیاس کہتا تھا کہ پولیس شاید انہی معاملات کی ٹوہ میں ہوگی جن میں میرے ساتھ شبنم بھی ملوث ہوچکی تھی۔ وہ کوئی بھی وجہ ایجاد کرکے آزاد صاحب سے پوچھ سکتے تھے کہ ان کی دنیائے صحافت میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے تہلکہ مچا.... دینے والی پری چہرہ رپورٹر آج کل کہاں اور کس کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ وہ کیا کررہی ہے اور کیوں کررہی ہے؟

وہ براہِ راست آزاد صاحب سے بھی دریافت کرسکتے تھے کہ محترم ایڈیٹر صاحب' کیا یہ سچ ہے کہ کچھ دن پہلے آپ نے اسی دفتر کے اس کمرے میں اسی کرسی پر بیٹھ کے اغوا کے ایک معاملے میں ثالث کا کردار ادا کیا تھا۔ کیا یہ بھی سچ ہے کہ مبینہ طور پر آپ کی لے پالک' رپورٹر اور دوست راست مس شبنم فاروقی کو ملک رب نواز نے اغوا کرایا تھا تو جوابی کارروائی کے طور پر ملک رب نواز کے بیٹے دلنواز کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ ملک رب نواز کو شبنم سے کیا دشمنی تھی اور شبنم کی رہائی کے لئے اس کے بیٹے کو اٹھا کرلانے والے کون تھے؟ قانونی طور پر خود آپ نے ثالث کا کردار کس حوالے سے ادا کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

جواب میں آزاد صاحب اپنے مخصوص انداز بے اعتنائی اور قلندرانہ شانِ بے نیازی کے ساتھ فضول سوالات کرنے والوں سے زیادہ فضول سوالات کرسکتے تھے کہ بھئی یہ کیا گمراہ کن افشانی فرمارہے ہیں آپ گویا۔ یہ کیا قصہ ہے اور کیا ماجرا ہے؟ کہیں آپ خدانخواستہ چنڈوخانے سے تو تشریف نہیں لائے ہیں گویا۔ وہاں ایسی ہی بے پر کی اڑائی جاتی ہیں۔ بھئی ہم کچھ آشنا محسوس کرتے ہیں اس نام سے۔ ملک رب نواز تو خیر سبحان اللہ مگر ان کے ہونہار سپوت دلنواز یا نظرنواز ہیں تو مزید سبحان اللہ۔

چنانچہ آزاد صاحب کی طرف سے متفکر ہونے کی وجہ ہی مجھے بے وجہ لگی۔ وہ کسی بھی طرم خاں ایس پی یا پاٹے خاں ڈی آئی جی کو صرف اپنی گفتگو کے بے ضرر اور معصوم انداز سے اس حد تک پاگل کردینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ اپنی مفروضہ موچھوں کو تاؤ دیتا آئے تو دیوانہ وار بال نوچتا جائے۔ انہیں اتنا ہی موقع ملا تھا کہ مجھے مطلع فرمادیں کہ خبردار جو ادھر کا رخ کیا تم نے یا شبنم نے۔

میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جارہا ہوں۔"

رخشی نے میرا ہاتھ پکڑلیا "تم بھی جارہے ہو۔ میں اکیلی رہوں گی یہاں؟"

میں نے اسے تسلی دی "اندر سے سب دروازے بند کرلو۔ یہ جگہ کسی فوجی قلعے سے زیادہ محفوظ ہے' کوئی نہیں آسکتا یہاں۔"

"نہیں ـــ ڈر لگتا ہے مجھے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ماحول کے آسیب سے خوف زدہ ہے۔ "لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا۔"

"میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ تم رک جاؤ فرید کے آنے تک۔"

میں نے کہا "فرید آئے گا تدفین کے بعد۔ اور مجھے بھی قبرستان جانا ہے۔"

"فرید نے منع کیا تھا تمہیں۔ جانتے بوجھتے کیوں خطرے میں ڈالتے ہو اپنی جان کو۔ وہ یہاں تمہیں اور شبنم کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ سب سے زیادہ رسک تمہارے لئے ہے۔ شبنم اس لئے محفوظ ہے کہ وہ صحافی ہے۔ فرید نے بھی گارڈ لے لیا ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا "رخشی۔ تم کو چلنا ہے تو میرے ساتھ چلو لیکن ایسی دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔ حفاظت کرنے والا بس ایک خدا ہے۔ باقی سب دل کی تسلی کے بہانے ہیں۔ محفوظ کوئی بھی نہیں ہے۔ امریکی صدر تک غیر محفوظ ہے جس کی حفاظت کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن کینیڈی کے قاتل نے چند سینٹ کی ایک ہی گولی چلائی تھی' صرف ایک۔"

رخشی نے کہا "پھر تو مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہئے' خدا پر بھروسا کرکے۔"

باہر ہر روز جیسی شام تھی۔ کہیں کچھ بھی خلاف معمول یا بدلا ہوا نہیں تھا مگر میرے دل کے اندر کی افسردگی نے ہر چیز پر اداسی کی ایک تہ چڑھادی تھی جیسے کسی غبار کے طوفان میں زمین آسمان کے درمیان سب گرد آلود نظر آتا ہے۔ ایک بے نام' پرخوف سکوت نے کائنات پر تسلط حاصل کرلیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے چلتے پھرتے اور اسپتالوں یا قبرستانوں میں لیٹے ہوئے انسان درختوں میں چھپے ہوئے اور آسمان تک اڑتے پرندے' حشرات الارض' فجر' جھر' سب دم سادھے صورِ اسرافیل کے لئے گوش بر آواز ہیں۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" رخشی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

میں نے کہا "یہی سوچ رہا تھا میں ـــ کہ تمہیں کہاں' کس کے پاس چھوڑا جاسکتا ہے۔ تمہاری کوئی دوست یا سہیلی ہے؟"

"مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے بس۔"

"گیا بس ـــ" میں نے جھنجلا کے کہا "بلاوجہ کی ضد کیوں کرتی ہو۔"

"ضد تم کررہے ہو' آخر ایسی کون سی جگہ ہے؟"

"اوکے' اوکے! بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم کو ٹیکسی میں بیٹھ کے انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے آدھا گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک گھنٹا لگ جائے۔ میں اکیلا جاتا تو ٹیکسی چھوڑ دیتا۔ ٹیکسی ڈرائیور نہ جانے کیا سمجھے۔"

وہ سر جھکائے میرے ساتھ چلتی رہی "ہو اس کا جی چاہے سمجھے' ریوالور ساتھ لائی ہوں میں بھی۔"

میں نے چونک کے اسے دیکھا "ریوالور ـــ چلو اچھا کیا۔"

ڈاکٹر امجد کے کلینک کا پتا بتانے سے پہلے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ سودا کرلیا۔ اس نے فاصلے کے حساب سے دو سو روپے فی گھنٹا مانگے جو بہت زیادہ تھے مگر میں نے اس شرط کے ساتھ منظور کیے کہ وہ کوئی سوال نہیں کرے گا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے تذبذب کا شکار ہوا پھر رات دس بجے تک ایک ہزار کما لینے کا لالچ غالب آگیا اور اس نے صرف اتنا کہا کہ "سرجی! جیسا حکم ـــ بس آپ ہی خیال رکھنا ہم غریبوں کا۔"

ڈاکٹر امجد کا کلینک روز سائڈ پر بہت شاندار تھا۔ اس کی بناوٹ اور آرائش سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کی پریکٹس اچھی چلتی ہوگی۔ بورڈ پر نام کے ساتھ ایم بی بی ایس۔ ایم آر سی پی (ایڈنبرا) بھی لکھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے شیشوں والے دروازے سے گزر کے میں چھوٹے سے ہال یا بہت بڑے کمرے جیسے ویٹنگ روم میں داخل ہوا تو مجھے دیوار کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ایک جیسے صوفے نظر آئے۔ درمیانی قالین پر چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز لگی ہوئی تھی اور اس کے کاؤنٹر ٹاپ پر ایک فیکس مشین کے ساتھ تین الگ فون نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک انٹرکام ٹائپ تھا اور اندر ڈاکٹر کے ساتھ رابطے کا ذریعہ تھا۔ میز کے ایک طرف نرم سیاہ چمڑے کے کشن والی کرسی تھی۔ دوسری طرف کی دو کرسیاں بھی ایسی ہی تھیں مگر وہ گھومنے والی نہیں تھیں۔ ظاہر ہے' یہ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ یا ریسپشنسٹ کی ٹیبل تھی جو مریضوں کو اپائنٹ منٹ کے اعتبار سے ترتیب وار اندر بھیجتی تھی۔

اس وقت ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے آنے کا وقت اگر ساڑھے چھ تھا تو مریضوں کی آمد بھی ساڑھے چھ سے پہلے شروع نہیں ہوسکتی تھی اور ڈاکٹر امجد کا اسٹاف بھی چھ بجے سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ میں نے اندر آتے ہوئے پوری کوشش کی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو لیکن بند ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر امجد کو نہ جانے کیسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی ہال میں داخل ہوا ہے۔ شاید دروازے پر نظر رکھنے والے کسی خفیہ کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے نے میری تصویر اندر ڈاکٹر کے مانیٹر پر پیش کردی تھی۔

وہ بڑی برہمی کے ساتھ باہر آیا "کیا بات ہے' کہاں گھسے چلے آرہے ہو' ابھی ٹائم نہیں ہوا۔"

میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اوہ۔ کیا آدمی ہے۔ سمجھتا ہی نہیں" ڈاکٹر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا "یار' ساڑھے چھ بجے آنا' تم نے ٹائم لیا تھا آج کا؟"

اگر میں مضبوطی سے قدم جما کے نہ کھڑا ہوتا اور ڈاکٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات نہ کرتا تو شاید وہ مجھے بازو سے پکڑ کے باہر نکال دیتا۔ "میں کوئی مریض نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب!"

وہ رک گیا "پھر کیا ہو؟"

"مجھے آپ سے کام ہے" میں نے کہا۔

"دیکھو' اس وقت میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں' تم پھر آجانا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کو کس کا انتظار ہے؟"

وہ چونکا "نہیں تم..... تمہیں ملک رب نواز نے تو نہیں بھیجا ہے؟"

میں نے آہستہ سے مسکرا کے سر ہلایا "آپ کی بات ہو گئی تھی ان سے؟"

اس نے جواب دیے بغیر پلٹ کے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے نفاست سے آراستہ کمرے میں لگی ہوئی خوبصورت میز کے پیچھے جا بیٹھا۔ میز پر معائنے کے آلات' میڈیکل سٹریچر' دو اسازمپنیوں کے اشتہاری کلنڈر اور ٹیبل سیٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

اس نے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا "تم کیش لائے ہو؟"

میں نے کہا "کیش.....؟"

"ہاں۔ میں نے کہا تھا ملک صاحب سے یہ کیا کاغذ کا ٹکڑا دے دیا ہے آپ نے مجھے۔ میں کیا کروں اس چیک کو۔ اکاؤنٹ میں جمع کراؤں تو کل کو میرے ہی گلے کا پھندا بن جائے گا۔ ابھی تو بینک بھی بند ہیں اور صبح اگر چیک واپس کر دیا بینک والوں نے تو میں کیا کروں گا؟ وہ خواہ مخواہ چلا رہا تھا کہ کسی کی مجال ہے جو ملک رب نواز کے چیک کو آنر نہ کرے۔ میرے دستخط سادے کاغذ پر ہی ہوں تو کافی ہوتے ہیں۔ تم بے عزتی کر رہے ہو میری۔ میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ایسے معاملات میں ادھار یا اعتبار کا رسک کوئی نہیں لیتا۔"

میں نے کہا "یہ تو ہے۔"

وہ بولتے بولتے اچانک رک کر مجھے گھورنے لگا "کتنا کیش لائے ہو تم؟"

میں نے کہا "جتنی مالیت کا چیک تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ کہاں ہے وہ کیش؟ تمہیں رب نواز نے نہیں بھیجا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے کسی نے بھی نہیں بھیجا۔ وہ سب جھوٹ تھا جو میں نے کہا۔ میں یہاں خود آیا ہوں اپنی مرضی سے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "کون ہو تم؟ گیٹ آؤٹ.....!"

میں نے جیب سے ریوالور نکال کے میز پر رکھ دیا "بیٹھ جاؤ۔ اور اپنی آواز کم رکھو۔ میں بہرا نہیں ہوں۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "تم..... کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "پلیز سٹ ڈاؤن۔ تمہیں اس ریوالور سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈرنا چاہئے تمہیں میرے ہاتھوں کی مار سے۔ کیا ثبوت کے لئے میں کوئی عملی مظاہرہ پیش کروں مثلاً ہاتھ مار کے اس میز کو درمیان سے توڑ دوں؟ یا کرسی کے دو ٹکڑے کر دوں۔ تمہاری گردن تو بالکل ٹکڑی جیسی نازک ہے ان کے مقابلے میں۔"

وہ بیٹھ گیا۔ "بولو' کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "آج تم نے ایک مری ہوئی عورت کے نزع کی کیفیت میں دیے ہوئے بیان پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔"

اس نے سر ہلایا "یس۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا ہے؟"

"میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم کو دستخط کرتے وقت واقعی یہ علم نہیں تھا کہ اس عورت نے بیان میں کیا لکھوایا ہے اور لکھنے والوں نے کیا لکھا ہے؟"

"لکھنے والا ایک ڈی ایس پی کا ریڈر تھا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ وہاں مجسٹریٹ بھی بیٹھا ہوا تھا۔"

"صمد خان۔ ڈی ایس پی تھا خورشید کیانی اور بیان لکھا تھا اس کے ریڈر علاؤالدین نے' رائٹ!"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "تم سب کو جانتے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر دیا "تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو اور شکل سے اتنے بے وقوف بھی نہیں لگتے کہ کسی قانونی دستاویز پر آنکھ بند کر کے دستخط کرو۔ کیا ابھی تم نے کہا نہیں تھا کہ ایسے معاملات میں اعتبار کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے پڑھے بغیر بیان پر دستخط کر دیے تھے۔ تم اسے غلطی کہہ سکتے ہو لیکن میری جگہ تم ہوتے تو شاید ایسا ہی کرتے۔ شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی وہاں۔ وہ عورت مر رہی تھی اور جو کچھ وہ بول رہی تھی' ریڈر ساتھ ساتھ لکھتا جا رہا تھا۔ مرنے والا جھوٹ نہیں بولتا اور مرنے والے کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرتا۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں..... عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے..... یہ خاص معاملہ تھا۔ اس میں مرنے والے نے بھی جھوٹ بولا اور لکھنے والے نے بھی غلط لکھا۔"

میں نے آگے جھک کر اسے غور سے دیکھا۔ "ملک رب نواز کے چیک سے کیا ثابت ہوتا ہے ڈاکٹر امجد۔ اتنی بڑی رقم کا چیک تمہاری فیس کے واجبات اور علاج معالجے کے اخراجات کا نہیں ہو سکتا۔ ملک رب نواز کبھی بھی تمہارا مریض نہیں رہا۔"

اس کا چہرہ اعترافِ جرم کی تصویر بن گیا "تم کون ہوتے ہو مجھ سے یہ سب پوچھنے والے۔ اپنی شناخت کراؤ پہلے۔"

میں نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ "یہ ہے میرا شناختی کارڈ۔ کیسا ہے؟ تمہیں پہچان ہے اصلی اور نقلی کی؟ کچھ جانتے ہو ریوالور کے بارے میں۔ یہ کس کمپنی کا اور کہاں کا بنا ہوا ہے؟ کس کیلی بر کا ہے؟"

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔ میرا اسٹاف آنے والا ہے بلکہ آگیا ہے۔"

"اگر ان میں سے کوئی یہاں آ کے دیکھے تو اسے ایسا نظر آنا چاہئے جیسے ہم باہمی دلچسپی کے کسی مسئلے پر دوستانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ ایسے حالات مت پیدا کرنا کہ میرے لئے تمہیں گولی مار کے رخصت ہونے کے سوا چارہ نہ رہے۔ میں یہاں ہرگز قتل کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ میں تمہیں کچھ سمجھانے آیا تھا۔"

اس نے مردہ لہجے میں کہا "کیا سمجھانے آئے تھے؟"

"تم نے جس بیان پر گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ اس میں نہ جھوٹ بولا گیا نہ لکھا گیا۔ وہی بیان عدالت میں پیش ہو گا۔ وہ بیان بدلنا نہیں چاہئے۔ یہ بڑی غیر قانونی' غیر اخلاقی اور گناہ کی بات ہو گی کہ مرنے کے بعد اس عورت سے دوسرا بیان منسوب کر دیا جائے اور تم گواہی دو کہ یہی اصل بیان ہے۔ یہاں مسئلہ ضمیر کا نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا ہے۔ اگر تم نے ریڈر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کسی دوسرے بیان پر دوبارہ دستخط کیے اور پہلے بیان کو ضائع کیا گیا تو تم خود بھی ضائع ہو جاؤ گے۔ اور یہ دیکھو کہ اس کے ساتھ ہی تمہاری زندگی کے کتنے مواقع ضائع ہو جائیں گے۔ تم ایک سینئر ڈاکٹر ہو۔ اچھی پریکٹس چلتی ہے تمہاری۔ لاکھوں کما لیتے ہو اور زندہ رہو گے تو بہت ترقی کرو گے۔ کروڑوں کما لو گے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟ بھول جاؤ اس رقم کو جو رب نواز نے دی ہے۔ یہ رقم کچھ بھی نہیں۔ اگر تم اس کا موازنہ اپنے روشن مستقبل کے امکانات سے کرو۔ یہ سوچو کہ تمہاری ایک بیوی ہے۔ وہ بیوہ ہو جائے گی۔ تمہارے بچے ابھی سے یتیم کہلائیں گے۔ بے شک وہ بھوکے نہیں مریں گے۔ جو کچھ تم چھوڑ جاؤ گے وہ ان کو غیرت کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے یقیناً کافی ہو گا مگر کیا اتنی محنت تم نے صرف اس لئے کی تھی کہ ایک مجرم کی طرح ہلاک کر دیے جاؤ۔ اپنے فیوچر پلان ادھورے چھوڑ کے قبر میں جا لیٹو۔ میں دوسری دنیا کی بات نہیں کرتا کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔"

ڈاکٹر امجد کی حالت غیر ہو چکی تھی "میں..... میں واپس کر دوں گا وہ چیک۔"

"THAT IS LIKE A GOOD BOY"

میں نے کہا "ابھی میں وہ چیک ایک نظر دیکھ سکتا ہوں۔ یہ جاننے کے لئے کہ تم نے اپنا ضمیر اور ایمان کتنے میں بیچا تھا؟"

"میں تمہیں یقین دلا چکا ہوں کہ..... جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ اب تم جاؤ۔"

میں نے مسکرا کے ریوالور کی نال پر پیار سے ہاتھ پھیرا "ویسے تو مجھے کوئی ڈر نہیں اس بات کا کہ تم بد عہدی کرو گے۔ تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ دس بیس لاکھ کے لیے کتے کی موت مارے جانے کا رسک لو۔ یو سی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ راہ چلتے آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ گولی کدھر سے آئی اور گولی اس کے سر میں یا دل میں گھس جاتی ہے۔ جو آس پاس ہوں وہ بھی کچھ نہیں بتا پاتے یا کبھی بے قابو ہو کے کوئی جیب فٹ ہاتھ پر چلنے والے کو کچل جاتی ہے اپنی حفاظت کے لیے کوئی گن مین ساتھ لے چلے۔ بلٹ پروف کار میں پھرے۔ گھر کو قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر بنا لے۔ سب بیکار ہے۔"

ڈاکٹر نے ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس سے پانی پیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "اور ویسے بھی۔ دس بیس لاکھ کے لیے کوئی اس حد تک رقم اپنی حفاظت پر خرچ کرے۔ خوف اور پریشانی الگ مول لے۔ ایسا پاگل کون ہو گا؟"

"خدا کے لیے۔ تم صرف اتنا بتا دو کہ میں کیا کروں....."

ڈاکٹر نے رومال سے منہ صاف کیا اور ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔

میں نے کہا "بعد میں تمہارے لیے ہی پریشانی ہو اور میرے لیے بھی' یہ میں نہیں چاہتا۔ آدمی کو وقت کی قدر کرنا چاہیے۔ اور اپنا کام کرنا چاہیے سکون سے۔ میرے جانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد اگر تم نے چیک واپس کیا اور کیش لے لیا تو مجھے معلوم ہوجا۔ گا۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی کیونکہ میرا سراغ لگانا بالکل ناممکن ہوگا۔ مجھے معلوم ہے اس عورت نے مرتے وقت کیا کہا تھا۔ اگر عدالت میں بدلا ہوا بیان آیا تو میں دیکھ لوں گا۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو میں نے کہا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک بے ضمیر آدمی ہو اور لالچ میں بے وقوفی ہی کرسکتے ہو اس لیے میں نہ تمہارے وعدے پر اعتبار کروں گا اور نہ تم سے کوئی ضمانت مانگوں گا۔"

باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز سن کے ڈاکٹر چوکنا ہوا "میرا اسٹاف۔۔۔"

میں نے مسکرا کے کہا "آنے دو۔ پہلے کون آتا ہے؟"

"پیون جو صفائی بھی کرتا ہے۔" وہ بولا "پچھ بجے سیکریٹری آتی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی جو شخص یہاں آئے گا۔ بدلے ہوئے بیان پر پھر سے تمہارے دستخط کرانے۔ ڈی ایس پی کا ریڈر علاؤالدین ہوگا۔"

ایک کامیڈین ٹائپ لڑکے نے آدھا دروازہ کھول کے جھانکا اور اندر آگیا "سلام واں لیکم ڈاکٹر صیب۔" اس نے سوالیہ نظریں مجھ پر ڈالیں۔

ڈاکٹر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا "جاؤ باہر صفائی کرو۔ شمانہ آئی ہے؟"

"نئیں سر جی۔۔۔ لیکن اس سے بھی زوردار شے آئی بیٹھی ہے۔"

ڈاکٹر کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں "ابھی سے؟ خیر بیٹھی رہے۔ ہوگی کوئی مجبوری کہ وقت سے پہلے آگئی۔"

اسی وقت باہر سے کسی نے کہا "ہاں جی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے آپ کو۔" "اپائنٹ منٹ ہے تو ساڑھے چھ کے بعد آنا۔" پھر جواب میں رخشی کی آواز آئی "میں یہاں بیٹھ کے انتظار کروں گی۔" میں نے صورت سے بھی حیرانی کے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ شاید ٹیکسی میں انتظار کرنا رخشی کے لیے مشکل ہوگیا تھا چنانچہ وہ کلینک کے ویٹنگ ہال میں آگئی۔ وہاں اس کے کانوں تک ہماری گفتگو بھی صاف پہنچ رہی ہوگی۔ اس کا میں اندازہ کرسکتا تھا کیونکہ باہر سے اس کی آواز مجھ تک بہت صاف پہنچی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا "میرا کلرک ہے۔"

میں نے سرہلا کے اپنی بات پھر شروع کی "علاؤالدین ایک نیا بیان لکھ کر لائے گا اور تم سے کہے گا کہ اس پر دستخط کردو۔ شاید اس بیان پر پہلے سے ڈی ایس پی صاحب کے اور ایس ڈی ایم کے دستخط موجود ہوں گے۔"

"پھر میں کیا کروں۔ اسے انکار کردوں؟"

"نہیں۔ تم اس سے دونوں بیان لے لو۔ پہلا بھی اور دوسرا بھی اور اس سے کہو کہ تم بیان کو پڑھ کے دستخط کرو گے۔ ابھی تم مصروف ہو۔ ظاہر ہے وہ تم سے زبردستی سائن نہیں کرا سکتا' وہ چلا جائے گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ بیان بعد میں اس کو بھجوا دیا جائے گا یا وہ خود آکے لے جائے۔ رات کو یا کل۔۔۔"

وہ پریشانی سے مجھے دیکھتا رہا "اور اس کے بعد؟"

میں نے کہا "کچھ دیر بعد تم فون پر کسی سے بات بھی کرلینا۔ رب نواز سے کہہ دینا کہ اپنا چیک منگوا لے یا ڈی ایس پی کو بتا دینا کہ بیان بدلا نہیں جاسکتا کیونکہ تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اس کی وجہ تم کچھ بھی بیان کرسکتے ہو مثلاً یہ کہ تم غیر قانونی کام نہیں کرسکتے کیونکہ تمہیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ تمہارا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا پھر یہ کہ اصل بیان کے بارے میں اور لوگ بھی جانتے ہیں۔"

"وہ پوچھیں گے کہ کون جانتا ہے؟"

"ہاں اور اب میں کیا ہر سوال کا جواب بتاؤں۔ تم خود سیانے ہو۔ اپنی پرابلم خود سمجھ سکتے ہو کہہ دینا کہ کسی نے فون پر مجھے دھمکی دی ہے چنانچہ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔"

ڈاکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گھڑی دیکھی "ٹھیک ہے لیکن فرض کرو وہ نہ مانا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی۔ ابھی سائن کرکے دو مجھے۔"

"میری موجودگی میں ایسی ضد اسے مہنگی پڑے گی اور اگر۔۔۔"

میری بات کے مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آگیا۔ جس کے انداز و اطوار ہی نہیں چہرے کے خدوخال بھی گواہی دیتے تھے کہ وہ کڑوا کریلا ہے جو نیم بھی چڑھا ہے۔ وہ صرف پولیس والا ہی نہیں ڈی ایس پی کا ریڈر بھی ہے۔ اس کی صورت کے نقوش میں برسوں کی شقاوت سے آجانے والی کرختگی تھی اور آنکھوں میں ایک سفاک وحشیانہ چمک جو از خود پکارتی تھی کہ بچ جھ سے اور میرے عتاب سے کیونکہ میں بڑا زہریلا بڑا خطرناک اور موذی ہوں۔

اس نے مجھے سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور کسی حد تک یہ پیغام بھی دیا کہ اب مجھے شرافت سے اٹھ جانا چاہیے کیونکہ وہ آگیا ہے۔ میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں

کیا۔ وہ سلام دعا کیے بغیر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر امجد نے بے چینی سے پہلو بدلا "ہاں۔ کیا بات ہے علاؤالدین۔"

علاؤالدین نے پھر مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ حلیے اور اطوار سے میں معمولی آدمی نظر آتا ہوں جسے وہ حکم دے سکتا ہے "دیکھو بھائی صاحب۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔۔۔"

میں نے کہا "اور میں کیا یہاں ان کے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہوں۔"

"آپ تھوڑی دیر بعد آجانا۔۔۔"

میں نے کہا "تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اندر آنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کون ہے۔"

اس نے ڈاکٹر کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا "میں ڈی ایس پی خورشید کیانی کا ریڈر ہوں۔"

"میں گورنر کا پی اے ہوں۔ آغا قزلباش۔" میں نے اس سے اسی کے لہجے میں بات کی۔

میرے اعتماد نے اس کے غرور کے غبارے کی خاصی ہوا نکال دی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ڈاکٹر سے کہا "میں اس کام سے آیا تھا۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ آگے بڑھایا "لاؤ۔ کاغذات مجھے دے دو۔"

علاؤالدین نے اپنے سیٹ میں جیسے چمڑے کے بریف کیس میں سے فل اسکیپ سائز کے تین کاغذ نکالے "اس پر اپنے کیانی صاحب نے بھی دستخط کردیے ہیں اور دیر اس لیے ہوگئی کہ میں پہلے چلا گیا ایس ڈی ایم صاحب کی طرف مہر لگوانے۔ ان کی شام کو ائرپورٹ پر ڈیوٹی تھی۔"

ڈاکٹر نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی "ٹھیک ہے۔ وہ دوسرے پیپر کہاں ہیں؟"

"کون سے دوسرے پیپر؟"

ڈاکٹر نے کہا "پہلے والے۔"

"ان کا کیا کرنا ہے آپ نے؟ وہ تو بیکار ہوگئے۔۔۔"

ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا "بیکار ہوگئے ہیں اسی لیے مانگ رہا ہوں اور جب تک وہ نہیں دو گے میں ان پر سائن نہیں کرسکتا۔"

ریڈر کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار نمودار ہوگئے "یہ بات ہے۔ اگر میں کہوں کہ وہ نہیں ہیں میرے پاس۔"

"تو پھر جاؤ تلاش کرو۔" ڈاکٹر نے پیپر اپنی دراز میں ڈال لیے۔

ریڈر اندر سے یقیناً آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہوگا مگر ایک سینئر ڈاکٹر کے مقابلے میں اس کی کیا اوقات تھی کہ وہ اسے اپنے اختیار سے ذرا تا یا اس کی دراز میں سے پیپر زبردستی نکال سکتا۔ وہ دستخط اور مہر تصدیق رکھنے والے اصل بیان کو ڈاکٹر کے حوالے کرکے بالکل بے بس ہوگیا تھا۔ اس نے سخت جبر و کراہیت کے ساتھ پھر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے مرحومہ چھوٹی کا اصل بیان برآمد کیا۔ ایک لمحے کے لیے میں جذباتی ہوگیا۔ یہ اس کے اپنے الفاظ تھے جو مرنے سے کچھ دیر پہلے اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے اور کاغذ پر یوں ٹھہر گئے تھے جیسے ہوا کی نمی برف بن کے اترتی ہے۔

ڈاکٹر نے اس بیان پر بھی ایک نظر ڈالی اور پھر اسے بھی دراز میں پھینک دیا۔

"یہ کیا جی ڈاکٹر صاحب! سائن کرو۔" ریڈر نے برہمی سے کہا۔

"ایسے ہی سائن کردوں تمہارے حکم پر۔" ڈاکٹر بگڑ گیا "پڑھوں بھی نہیں کہ تم نے کیا لکھا ہے؟"

"جو لکھا ہے اس کی تصدیق فرما دی ہے مجسٹریٹ صاحب نے۔"

"اگر مجسٹریٹ نے تصدیق کی ہو کہ اسپتال میں مرنے والی عورت کو میں نے ہی غلط انجکشن لگا کے ہلاک کیا تھا یا گلا گھونٹ کے مارا تھا تو میں اس اعتراف جرم پر دستخط کرکے پھانسی چڑھ جاؤں؟" ڈاکٹر کا پارا چڑھ گیا "تم نے پہلے سے کیوں فرض کرلیا تھا کہ تم جو بھی لکھو گے میں سائن کردوں گا۔ کیوں دستخط کرا کے لائے ہو ڈی ایس پی سے اور ایس ڈی ایم سے۔"

ریڈر پریشان ہوگیا "وہ تو ٹھیک ہے جی۔ لیکن ہم ماتحت لوگ کیا کرسکتے ہیں۔ جو افسروں کا حکم ہو وہ کرنا پڑتا ہے۔"

ڈاکٹر نے چٹکی بجائی "اوکے مسٹر ماتحت! تم جاؤ۔ میں خود افسران سے بات کرلوں گا۔"

"مجھے آرڈر نہیں ہے بغیر دستخط کرا کے واپس جانے کا۔۔۔"

"پھر تم باہر جا کے بیٹھو۔ میں ابھی مصروف ہوں لیکن جو کچھ تم کہہ رہے ہو یا کررہے ہو' وہ آغا صاحب بھی دیکھ اور سن رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

ریڈر کا رنگ فق ہونے لگا "ہماری کیا غلطی ہے سر جی؟"

ڈاکٹر نے کہا "ان کے جانے کے بعد میرے کلینک کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹائم شروع ہوجائے گا۔ مریض تو آئے بیٹھے ہیں۔ دس بجے کے بعد میں پیپرز دیکھوں گا اپنے گھر جاکے۔ صبح ڈی ایس پی صاحب کو بھجوادوں گا یا تم خود آکے لے جانا میرے گھر سے۔ ابھی تم جاؤ۔ میرا بہت وقت ضائع ہوگیا ہے پہلے ہی۔"

ڈاکٹر امجد میری دھمکی سے واقعی ڈر گیا تھا۔ اس میں یقیناً میری متاثر کرنے والی اداکاری کا کمال شامل تھا۔ ڈاکٹر نے قائل ہو کے مان لیا تھا کہ میں خود کوئی ایسا خطرناک بدمعاش ہوں جس کے لیے ایک دو بندے پھڑکا دینا کوئی مسئلہ نہیں یا پھر میں پیشہ ور قاتلوں کے کسی گروہ کا نمائندہ ہوں جن سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہیں۔ قانونی طریقے سے وہ اپنی حفاظت کرسکتا تھا اور اپنے اثر رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ایک ڈی ایس پی یا ایس ڈی ایم کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ بھی کرسکتا تھا مگر لاقانونیت اور دہشت گردی کی طاقت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔

ابھی تک ڈاکٹر نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ بظاہر سوسائٹی کے سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک چھوٹی سی عورت کے ساتھ میرا کیا جذباتی تعلق تھا کہ اس کی موت نے مجھے انہی لوگوں کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور کردیا جو عام طور پر بدمعاشوں کے سرپرست سمجھے جاتے ہیں مگر میری یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کی زندگی کا مول صرف دس بیس لاکھ روپے نہیں ہوسکتے۔ اس کا نام پیشہ صلاحیت اور تجربہ آج سونے کی کان سے کم نہ تھے جس میں سے بشرط زندگی' دس دس لاکھ کرکے ایسے نہ جانے کتنے خزانے برآمد ہونا باقی تھے۔ چنانچہ اس نے میری بات مان لی تھی اور فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ رب نواز کا چیک واپس کردے گا اور دباؤ کے تحت کسی بدلے ہوئے بیان پر دستخط نہیں کرے گا۔ کوئی رسک نہ ہوتا تو اس جعل سازی کے جرم میں ایک دستخط کے بدلے دس لاکھ برے نہ تھے۔

علاؤالدین اپنا بریف کیس اٹھا کے زخم خوردہ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا نکل گیا۔ باہر کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ معمول کے مطابق ڈاکٹر کا اسٹاف ڈیوٹی پر آگیا ہے اور مشورے کے لیے اپائنٹ منٹ رکھنے والے مریض بھی آنے لگے ہیں۔

ڈاکٹر نے تلخی سے کہا "اب آپ مطمئن ہیں آغا قزلباش صاحب؟"

"میرا جھوٹ اس وقت تمہارے کام آگیا ورنہ وہ تمہارے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا تھا۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے حقارت سے برا سا منہ بنایا "اس بات کو جانے دو۔ بہت سے اعلیٰ پولیس افسران مجھے جانتے ہیں۔ ان کی فیملی کا ٹریٹ منٹ کرتا ہوں میں۔ اے ایس آئی کے عہدے کا کوئی ریڈر تو کیا خود وہ ڈی ایس پی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بہتر ہوگا کہ تم پہلے ہی ان سے رابطہ کرکے انہیں ساری صورت حال سمجھادو۔" میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔ اس کیس میں تمہاری دلچسپی کے پیچھے کیا ہے؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں۔ وہ عورت میرے لیے بہن کی طرح تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے قاتلوں کو قانون کے مطابق سزا ہو۔"

ڈاکٹر مسکرایا "اور اصل بیان عدالت کے سامنے جائے گا تو کیا ان کو سزائے موت ہوجائے گی۔ قاتل پھانسی چڑھ جائیں گے؟"

میں نے کہا "مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ وہ قانون کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہ کرپائیں۔"

"ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک پیپروں کے لیے وہ کسی بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کرلیں گے۔ جو قانونی موشگافی اور نظام انصاف کی ہر کمزوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں باعزت طور پر بری کرالے گا۔"

"ثابت بالآخر یہ ہوگا کہ مرنے والی کا قتل کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ بالکل ٹھیک ہے تمہارا خیال مگر اس خیال سے DISCOURAGE ہوکے میں حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں۔ میں ان کے لیے پھانسی کے پھندے سے بچنے کی جدوجہد کو زیادہ سے زیادہ مشکل بناتا رہوں گا۔ انہیں مسلسل سزائے موت کی دہشت میں مبتلا رکھوں گا۔ انہیں اندازہ ہوجائے گا کہ اس چھوٹی سی عورت کا قتل کتنی بڑی غلطی تھی۔ وہ لاکھوں خرچ کریں گے اور زندہ رہنے کی پوری قیمت ادا کرنے کے بعد جب انہیں عدالتی فیصلے کی صورت میں بے گناہی کی سند اور اپنی فتح کا غرور مل جائے گا تو میں خود انہیں اپنے نظام انصاف کے مطابق وہ سزا دوں گا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں اسی طرح انہیں مار ڈالوں گا جیسے انہوں نے۔ خیر۔"

ڈاکٹر دم بخود بیٹھا۔ میری صورت دیکھتا رہا "اپنی باتوں سے تم کوئی تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے آدمی لگتے ہو۔ پیشہ ور مجرم نہیں۔"

"مجرم بھی وہی بنتا ہے جسے اس کا حق نہ ملے۔ جینے کا حق' عزت پانے کا حق' انصاف کا حق۔"

"یعنی ابھی تم مجرم نہیں ہو؟" وہ مجھے غور سے دیکھ کے بولا۔

میں نے کہا "ایک DESPERATE آدمی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مایوسی کی انتہا تک پہنچے ہوئے شخص سے ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ نہ مرنے سے ڈرتا ہے اور نہ مارنے سے جیسے کہ میں۔"

"مطمئن رہو۔ میں ڈی ایس پی کو اصل بیان واپس کروں گا۔ اپنے پاس ایک فوٹو کاپی رکھنے کے بعد۔"

میں نے کہا "اور وہ دوسرا بیان۔ جو ابھی علاؤالدین لے کر آیا تھا؟"

"میں اس پر سائن نہیں کروں گا۔ اسے ضائع کردوں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں چاہتا ہوں کہ وہ تم مجھے دے دو۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ تمہارے سامنے اسے جلادوں۔" اس نے میز کی دراز کھولی۔

ایک جست لگا کے میں دوسری طرف پہنچ گیا "تم وہی کرو گے جو میں نے کہا۔"

ڈاکٹر میری پھرتی سے خوف زدہ ہوگیا "اب تک میں نے وہی کیا ہے جو تم نے کہا مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ باہر اتنے لوگ موجود ہیں اس وقت۔۔۔"

میں نے معاملے کو مزید طول نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے زیادہ دیر وہاں ٹھہرکے خطرات کے نازل ہونے کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ڈاکٹر واقعی شور مچادیتا تو اس کے نمک خوار اسٹاف کے لوگ سب سے پہلے دوڑتے۔ ان کی چیخ وپکار سے مریض نہ جانے کیا سمجھتے۔ کوئی پولیس کو فون کردیتا یا باہر سے لوگوں کو بلالیتا تو کلینک میں ایک مجمع اکٹھا ہوجاتا۔ مجھے اپنا راستہ بنانے کے لیے دو چار بندوں کو لمبا لٹانا پڑتا اور پھر رخشی کو ساتھ لے کر فرار ہونا پڑتا۔ وہ نہ جانے کیوں ٹیکسی سے اتر کے اندر آ بیٹھی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ناکامی کا داغ ندامت لے کر جانے والا ریڈر اپنے آقا ڈی ایس پی صاحب بہادر کو یا علاقہ مجسٹریٹ سے فون پر فریاد کرے کہ ایک دستخط کرنے کے دس لاکھ وصول کرنے والا ڈاکٹر کچھ قابو سے باہر ہوتا لگتا ہے اور اعلیٰ اختیارات رکھنے والے ڈاکٹر کو سمجھانے کے لیے بقلم خود کوئی کارروائی کرنے پہنچ جائیں۔

ان سب امکانات پر ایک سیکنڈ میں غور کرنے کے بعد میں نے بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ ناپ تول کے ڈاکٹر کی گدی پر کان کے قریب کھڑی ہتھیلی کا ایک وار کیا۔ یہ ڈاکٹر کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اسے حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف جھک گیا اور اسے گرنے سے بچانے کے لیے میں نے کرسی کی اونچی پشت کا سہارا دے کر ایسے ٹھکا دیا کہ کوئی اچانک اندر آجاتا تو اسے یہی نظر آتا کہ ڈاکٹر صاحب آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہے ہیں۔

یوں میں نے وہ کاغذات نکالے جن کے لیے ڈاکٹر نے دراز باہر کھینچی تھی۔ کمرے کے دروازے سے باہر جھانک کر میں نے کلرک کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ کے سامنے میز پر بہت آگے جھکا ہوا بڑی نیازمندی سے کچھ عرض کررہا تھا۔ جس ناز سے وہ عرض حال سن رہی تھی اس سے دیکھنے والوں کو بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ میز پر لیوں کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ ان کے دل مل چکے ہیں۔ تاہم انہیں دیکھنے والوں کی پروا ہی کہاں تھی۔ امانتاً وہ سب کو یہی دکھانا چاہتے تھے کہ محبت کس کو کہتے ہیں محبت کیسی ہوتی ہے۔ دیکھنے والے بھی صرف تین بیمار بوڑھے تھے جو اس منظر کو بھی ٹی وی کے خبرنامے کی طرح برداشت کررہے تھے۔

میرے اشارے پر کلرک بڑی مستعدی سے آگے آیا۔

"جی سر؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ یہ کاغذات فوراً فوٹو اسٹیٹ کرا کے لاؤ اور شمانہ سے کہہ دو کہ ابھی کسی کو اندر نہ بھیجے۔"

"ساڑھے چھ کی اپائنٹ منٹ کینسل ہوگئی ہے پہلے ہی۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا گویا۔" میں نے کہا اور کلرک کو باہر جاتا دیکھتا رہا۔

کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کرکے میں نے ڈاکٹر کی درازوں کو دیکھا پھر اس کے کوٹ کی جیب میں سے والٹ نکالا۔ رب نواز کا دیا ہوا چیک بہت سے نوٹوں کے درمیان موجود تھا۔ اس پر دس لاکھ کی رقم لکھی ہوئی تھی اور آج کی تاریخ تھی۔ رب نواز نے اسے کراس کردیا تھا چنانچہ ڈاکٹر کا وصول جائز تھا کہ اسے وہ اکاؤنٹ میں جمع کرا کے خود اپنے خلاف ایک ثبوت کیسے فراہم کرے۔

پہلے میں نے چیک اپنے پاس رکھنے کا سوچا۔ یہ کوئی فراڈ نہ ہوتا۔ چیک ڈاکٹر کے نام پر تھا اور صرف اسی کے اکاؤنٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جمع ہو سکتا تھا۔ کوئی اور اسے کیش نہیں کرا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ چیک کے چوری ہونے کی اطلاع ملتے ہی رب نواز اسے کینسل کرا دیتا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر امجد کو پولیس کو بلانے کی ضرورت محسوس ہو۔

میں نے پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ رخشی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں میں نے چیک کو کاغذ کے پرزے کی طرح ہلایا۔ وہ اٹھ کر آگے آئی "کیا بات ہے؟"

"اس کی ایک فوٹو کاپی بنوا لاؤ۔ فوراً۔ خود جاؤ۔"

وہ کچھ گھبرائی "میں۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "معلوم ہو جائے گا باہر جا کے۔ ہر جگہ ہوتی ہے فوٹو اسٹیٹ مشین۔"

اس نے سرگوشی میں اپنی تشویش کا اظہار کیا "تم اتنی دیر کیوں کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر کی سیکریٹری کی نظر ہم پر تھی چنانچہ میں نے رخشی کو صرف مسکرا کے دیکھا اور جواب دیے بغیر دروازے کو پھر اندر سے بند کر لیا۔ ابھی تک صورتِ حال مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ کلینک کا وقت ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا تھا اور ہال میں لگے ہوئے کلاک کے مطابق ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ اپنی باری کا انتظار کرنے والے تین سے دو ہو گئے تھے۔ ایک نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مریض انتظار کے عادی ہوتے ہیں۔ جس کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے بلایا گیا تھا وہ دس پندرہ منٹ صبر کے ساتھ گزار سکتا تھا۔

دروازے پر انگلی سے ناک کرنے کی آواز پر میں نے باہر جھانکا تو کلرک فوٹو کاپیاں لیے کھڑا تھا "میں نے دو دو کاپیاں بنوائی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بتا دیں۔"

میں دروازے میں کھڑا رہا "تھینک یو۔ مس شبانہ سے کہنا کہ بس پانچ منٹ اور۔۔۔"

"آپ فکر ہی مت کرو جناب۔ جلدی کوئی نہیں۔ اگلا بندہ پونے سات بجے والا ہے۔" وہ بولا اور پھر اپنے پہلے والے رومانٹک پوز میں ہیروئن کے سامنے جا بیٹھا۔ شارٹ کرسٹل بریک کے بعد فی وی ڈراما پھر شروع ہو گیا۔

وقت سے پہلے آ جانے والے ایک شخص نے بے چینی سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب تو آ گئے ہیں نا؟"

"میں نے بتایا نا کہ آ گئے ہیں۔ آپ کا وقت تو پونے سات کا ہے۔" مس شبانہ نے جھنجلا کے جواب دیا۔

عین اسی وقت رخشی تیز تیز نروس قدموں سے چلتی اندر آ گئی۔ مس شبانہ کی شک بھری نظر نے اس کا تعاقب کیا۔ ساڑھے چھ ہو گئے تھے۔ میں نے رخشی سے کہا "تم بھی جا کے ٹیکسی میں بیٹھو اور جیسے ہی مجھے دیکھو ٹیکسی والے سے کہنا کہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ یہ فوٹو کاپیاں لے جاؤ اپنے ساتھ۔"

میں نے واپس کمرے میں جا کے دیکھا تو ڈاکٹر اسی طرح بیٹھا تھا لیکن اب وہ سر ہلا کے آوازیں نکال رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ چند منٹ بعد اسے ہوش آ جائے گا۔ دراز کھول کے میں نے بیان نمبر ایک اور دو کی اصل کاپی اپنی جگہ رکھی پھر ڈاکٹر کے پرس میں چیک کو نوٹوں کے درمیان رکھ کے اس پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کر دیے اور پرس دوبارہ اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

ساری کارروائی سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے چند مرتبہ سر کو جھٹکا اور پھر آنکھیں کھولنے کے بعد مجھے دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر امجد۔ آئی ایم سوری۔ یہ لو پانی پیو۔"

"تم۔۔۔ ایسا کیوں کیا۔ تم نے۔" اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔

میں نے کہا "اچھی طرح دیکھ لو۔ تمہاری کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہوئی ہے۔"

بے اختیار اس کا ہاتھ پہلے اپنے پاکٹ کی طرف گیا۔ اس نے پرس کو نکال کے دیکھا۔ پھر دراز میں ہاتھ مارا "میں کو آپریٹ کر رہا تھا تم سے۔۔۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں کچھ شارٹ ٹمپرڈ ہوں۔ سوری ایگین۔" میں نے کہا اور اس نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ ٹھیک ہے' میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب دفع ہو جاؤ۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تاہم میں اس کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار تھا کہ میرے پیچھے ڈاکٹر شور مچاتا آئے تو میں دوڑ کے باہر نکل جاؤں۔ شاید ڈاکٹر جسمانی اعتبار سے بالکل فٹ اور مستعد ہوتا تو ایسا کرتا۔ ابھی وہ گردن کو دائیں بائیں ہلانے اور ہوش سنبھالنے میں مصروف تھا۔ میرا اندازہ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے ہونے والی گفتگو اور کمرے کے اندر پیش آنے والے واقعات کا ذکر اپنے ماتحتوں سے کر کے شرمندہ ہونا پسند نہیں کرے گا۔

جب میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے پوچھا "سب خیر ہے نا جی؟"

میں نے دروازہ بند کیا "ابھی تک تو ہے۔ اب چلو میانی صاحب کے قبرستان۔"

ٹیکسی چلی تو رخشی نے مجھے فوٹو کاپیاں دکھائیں "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تحریرِ پولیس کے رسم الخط میں ہے اور لکھنے والا شاید محرر ہی بھرتی ہوا ہوگا۔ اس جناتی زبان کو ماہرین بھی نہیں پڑھ سکتے۔"

"میں نے بھی کوشش کی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

میں نے اسے مختصراً اپنی ڈاکٹر امجد سے ملاقات کا حال بتا دیا "چیک پر تو ہمارے مہربان ملک رب نواز کے دستخط بھی بہت واضح ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اب ڈاکٹر دوسرے بیان پر دستخط نہیں کرے گا؟ اور یہ چیک واقعی واپس کر دے گا؟"

میں نے کہا "دانش مندی کا تقاضا یہی ہے مگر اس نے میری دھمکی کو اہمیت دی اور دس لاکھ نہ چھوڑے تو اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت سے لوگ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ مثلاً ڈی ایس پی خورشید کیانی اور مجسٹریٹ۔ ڈاکٹر نے رب نواز سے کیش مانگا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رب نواز اس کا مطالبہ تسلیم کر لے۔ کیش دیکھ کے ڈاکٹر کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ وہ سوچے گا کہ آخر وہ داڑھی والا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ وہ جتنا بڑا بدمعاش بن رہا تھا اتنا تھا نہیں۔ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں اور کل کو خدانخواستہ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس سے بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنے تعلقات کا بھی کچھ غرور ہے۔ اس جیسے لوگ ذاتی حفاظتی انتظامات پر بھی بہت بھروسا کرتے ہیں۔"

"اگر اس نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی تو میرا اور تمہارا حلیہ بتا دے گا اور اس سے رب نواز فوراً سمجھ جائے گا۔"

میں نے کہا "اگر وہ دس لاکھ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے پھر تو وہ یقیناً رب نواز سے بھی ذکر کرے گا اور دوسرے لوگوں کو بھی بتائے گا کہ اسے کس قسم کی دھمکی دی گئی ہے اور یہ دھمکی کون دے کر گیا ہے۔ ڈی ایس پی خورشید کیانی اور مجسٹریٹ یقیناً اپنی خدمات کا معاوضہ رب نواز سے پہلے ہی وصول کر چکے ہوں گے۔ ان کے لیے ڈاکٹر کے انکار سے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے چنانچہ وہ سمجھا بجھا کے تسلی دے کے اور دباؤ ڈال کے ڈاکٹر کو دستخط کرنے کے لیے مجبور کریں گے۔ بصورتِ دیگر انہیں بھی رب نواز کے دس دس لاکھ واپس کرنے پڑیں گے۔ اب یہ صرف ڈاکٹر کے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ دباؤ میں آ کے ان کی بات مانتا ہے یا نہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کسی کو کچھ نہ بتائے۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ قانونی طور پر اس کے لیے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ دوسرے بیان پر سائن کر کے ڈی ایس پی کے حوالے کرے اور پہلے بیان کو جلا کے ضائع کر دے۔۔۔"

میں نے کہا "میری خواہش ہوگی کہ وہ ایسا ہی کرے۔ اسے یہ علم نہیں کہ پہلے والے اصل بیان کی فوٹو کاپی ہمارے پاس ہے۔ میں ایک کاپی کسی نوٹری پبلک سے تصدیق کرا کے بینک کے لاکر میں رکھوا دوں گا۔ دوسری تصدیق شدہ کاپی فرید عباسی کے پاس رہے گی۔ مقدمۂ قتل کے چالان میں اور تفتیشی افسر کے سامنے دوسرا بیان پیش کیا گیا تو سمجھو تینوں مارے گئے۔ ڈاکٹر بھی' خورشید کیانی بھی اور مجسٹریٹ بھی۔"

میانی صاحب کے قبرستان میں داخلے کے کئی راستے تھے۔ کچھ قدیم اور زیادہ استعمال ہونے والے باقاعدہ راستوں پر گیٹ تھے تو کچھ راستے لوگوں نے بنا لیے تھے یا کہیں سے بیرونی چار دیواری کا کوئی حصہ گر جانے سے وجود میں آ گئے تھے۔ بیشتر لوگ سڑک کی طرف سے آتے جاتے تھے۔ ہر گیٹ کے لیے پھول اور اگربتیاں وغیرہ بیچنے والوں کی دکانوں کا پورا بازار سا بن گیا تھا۔ ہر گیٹ کے اندر ایک مسجد بھی تھی۔ شام کے وقت اور جمعرات کو فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ جنازے ان راستوں سے دن رات گزرتے دکھائی دیتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے قبرستان کی حدود کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال کیا کہ مجھے قبرستان کے اندر جانا ہے تو کس راستے سے جانا ہے۔ اس سوال کا جواب میرے ذہن میں واضح نہیں تھا چنانچہ میں نے اسے آہستہ آہستہ چلتے رہنے کے لیے کہا۔

"رفتار جتنی کم رکھ سکتے ہو رکھو۔ میں دیکھتا جاتا ہوں۔"

اس نے کہا "کوئی میت آئی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ کس راستے سے اندر لے جائی گئی ہوگی۔ کہیں ساتھ آنے والے لوگ نظر آ جائیں گے۔"

ٹیکسی بالکل رینگنے لگی۔ ایک ایک کر کے اندر جانے والے گیٹ گزرتے گئے۔ میری نظر ہر راستے پر اندر تک بے مقصد بھٹکتی رہی۔ اتنے بڑے قبرستان کا ٹیکسی میں بیٹھ کے گزرتے ہوئے جائزہ لینا عملاً ناممکن تھا۔

"آپ پوچھ لو کسی سے۔" ٹیکسی والے نے مجھے مشورہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔

میں نے کہا "ہاں۔ تم واپس چلو۔ اور آگے سے پھر گھما کے لاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا مشورہ غلط نہیں تھا مگر میں کسی سے پوچھتا تو کیا پوچھتا۔ تیس مار خان اور چھوٹی کے جنازے میں شرکت کرنے والے گنتی کے چند لوگوں میں رئیس خاں، فرید عباسی، ڈاکٹر کمال اور تیرا بلیڈ ہو سکتے تھے۔ شبنم بھی تدفین میں شریک ہونا چاہتی تھی لیکن مجھے اندر باہر کسی کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے باہر کھڑی گاڑیوں پر غور کیا۔ ان میں فرید عباسی کی شیراڈ۔ رئیس خاں کی پے جیرو یا ڈاکٹر فاروقی کی ہائی روف ایمبولینس مجھے کہیں دکھائی نہ دی پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے ٹیکسی کو پہلے گیٹ پر رکوالیا۔

گیٹ کے ساتھ والی پھلی پھولوں کی دکان پر بیٹھے ہوئے پہلوان نے ہار پروتے ہوئے گردن نفی میں ہلا دی "ادھر تو ڈیڑھ سو جنازے آتے ہیں روز۔ گزرتے رہتے ہیں۔ ہمیں کہاں فرصت کہ دیکھیں۔"

میں نے کہا "ایدھی ایمبولینس میں آئی ہوں گی دو میتیں۔"

اس نے غرا کے کہا "اوئے صوفی۔ کہا نا نہیں دیکھا کسی اور سے بھی پوچھ لے۔"

میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے دوسرے سے اور پھر تیسرے گیٹ سے یہی معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔

ایک لڑکے نے جو قبروں پر چھڑکے جانے والی پانی کے ڈول لیے کھڑا تھا' میری بات سن لی۔ اس وقت میں گیٹ کے دونوں طرف قطار میں بیٹھے ہوئے فقیروں سے یہی سوال کر رہا تھا اور ظاہر ہے وہ آتے جاتے لوگوں کے سامنے اپنی دکھ بھری فریاد کا ریکارڈ بجانے میں اتنے مصروف تھے کہ میری بالکل نہیں سن رہے تھے۔

"ابھی ابھی آئی تھی ایدھی والوں کی گاڑی۔" لڑکا بولا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا "دو جنازے لے کر؟"

"آہو۔ جنازے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر سے کچھ لوگ لے کر گئے۔" اس نے مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ پتا ہے کہ کدھر لے گئے تھے انہیں۔"

اس نے سوچ کے کہا "اس طرف سیدھا' آگے کا مجھے نہیں معلوم۔ کسی سے پوچھ لینا۔"

میں نے تصدیق کے لیے پوچھا "کوئی۔ لڑکی بھی ساتھ تھی۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں جی۔ بالکل جوہی چاولہ۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک نوٹ نکالا۔ یہ سو کا نوٹ تھا "یہ لو۔ تم نے بڑی مدد کی میری۔"

وہ ہکا بکا نوٹ پکڑے کھڑا رہا۔ دو چار روپے میں کسی کے ساتھ پانی کا ڈول لے کر قبر تک جانے والے کو وہیں کھڑے کھڑے سو روپے مل گئے تھے۔ باقی فقیر اسے رشک اور حسد سے دیکھ رہے تھے اور شاید پچھتا رہے تھے کہ یہ بات انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتائی۔ وہ تو میری بات سننے پر بھی راضی نہیں تھے اور میرے سوالات کو کاروباری اوقات میں دخل اندازی سمجھ رہے تھے۔

میں لوٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی تک گیا "رخشی۔ ان کے جنازے ابھی ابھی اندر گئے ہیں۔"

وہ بولی "میں بھی چلتی ہوں۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا "عورتوں کو قبرستان میں نہیں جانا چاہیے۔ ویسے بھی مجھے اندر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ نہ جانے وہ کہاں ہوں۔ قبرستان بہت بڑا ہے۔"

"کیا شبنم ساتھ نہیں گئی؟"

میں نے کہا "گئی ہے۔"

"پھر میں کیوں نہیں جا سکتی۔ وہ عورت نہیں ہے کیا؟" رخشی نیچے اتر آئی۔

"پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ شبنم کو بھی جانا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اس نے تو رسک لیا ہے اس لیے کہ وہ رپورٹر ہے۔"

رخشی نے میری دلیل کو یکسر مسترد کر دیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے لگی "تم گاڑی کو کہیں کنارے پر لگا دو اور یہ لو۔"

"یہ کیا ہے بی بی جی۔"

"پانچ سو ہیں۔ رکھ لو۔ ہم واپس آئیں گے ویسے تو۔ کہیں تمہیں خیال ہو کہ ہم کسی اور راستے سے نہ نکل جائیں۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا "توبہ کرو جی۔ ہم بھی اعتبار کرنے والے بندے ہیں اور ادھر تو بندہ آتا ہے عبرت کے لیے۔ دھوکا کرنے والے کی شکل ہی اور ہوتی ہے۔" اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

میں نے ایک بار پھر رخشی کو روکنے کی ناکام کوشش کی

مگر وہ مجھ سے آگے چلنے لگی۔ ہماری معاشرتی اقدار اور عقائد کے باعث خواتین پہلے تو قبرستان میں بالکل نظر نہیں آتی تھیں مگر اب یہ روایات بدل ہیں تو عورتیں بھی اکا دکا قبروں پر فاتحہ خوانی کرتی مل جاتی ہیں۔ لوگ اسے اچھا نہ سمجھنے کے باوجود ایک جذباتی مجبوری کی غلطی سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں یا نظر جھکا کے گزر جاتے ہیں کہ ہمیں کیا جی۔

میں کچھ دور ہی... گیا تھا کہ مجھے معلومات فراہم کرنے والا لڑکا دوڑتا ہوا آیا "صوفی صاحب۔"

میں رک گیا۔ اس کے پاس یقیناً میرے لیے کوئی مفید اطلاع تھی۔ سو روپے کے انعام نے اسے جذباتی کر دیا تھا اور وہ شکر گزاری کے لیے میری کچھ اور مدد پر آمادہ تھا "کیا بات ہے؟ نوٹ نقلی تھا؟"

وہ جھینپ کے اور شرمندہ ہو کے مسکرانے لگا "وہ جی۔" میں نے ایک بندے سے پوچھ لیا۔ اس نے بھی کندھا دبا دیا تھا۔ آپ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ قبرستان کے جغرافیے سے اس طرح آشنا تھا جیسے اپنے محلے کے گلی کوچوں سے ہوگا۔ اس شہر خموشاں میں رہنے والوں کے بھی پتے ٹھکانے تھے اور ان تک پہنچنے کے اتنے ہی پُرپیچ راستے تھے۔ وہ ہمیں قبروں کے درمیان سے گزارتا۔ شارٹ کٹ لیتا اتنی تیزی سے آگے جا رہا تھا کہ رخشی بار بار پیچھے رہ جاتی تھی۔

بالآخر میں نے ڈوبتی شام کے دھندلکے میں چار افراد کو دیکھا جو ایک گورکن کو قبر میں مٹی ڈالتا ہوا دیکھ رہے تھے اور سایوں کی طرح ساکت تھے۔ دوسری قبر ایک مٹی کے ڈھیر کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ تیس مار خان اور چھوٹی اپنی اپنی قبروں میں ساتھ ساتھ چار گز لیٹ گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ انہیں رئیس خانے کے کچن میں ساتھ ساتھ سوتا ہوا دیکھ کے سوئی کس قدر خفا ہوئی تھی اور اس نے ان کو کتنا ڈانٹا تھا کہ شرم نہیں آتی۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور ایسے رہتے ہو۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے تھے۔ کچن میں سونا ان کی مجبوری تھی مگر انہوں نے اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ پاس رہ کے بھی وہ کچن میں اتنے ہی دور رہتے تھے جتنے اب اپنی اپنی قبروں میں تھے۔

مکمل خاموشی میں صرف بیلچے کی مٹی میں گاڑے جانے کی آواز سنائی دیتی تھی پھر گورکن کی ہلکی سی "ہاہ" کی آواز جو مٹی کو قبر پر اچھالتے وقت آتی تھی۔ اس کے بعد مٹی کے گرنے کی خفیف سی دھمک اور پھر وہی پہلی آواز۔ میں ہاتھ باندھ کے رئیس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ رخشی کچھ پیچھے ایک درخت سے ٹیک لگا کے کھڑی ہوئی شبنم کے پاس چلی گئی۔ درختوں کے اوپر پرندے آشیانوں میں لوٹ آئے تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ان کے شور میں بس خاموشی اور سناٹے کا جمود قائم تھا۔

ہم سب کی نظریں مٹی کے ڈھیر پر تھیں لیکن تصور میں ہم سب ایک ہی فلم کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ یہ تیس مار خان اور چھوٹی کی چھوٹی سی زندگی کے وہ سین تھے جو ہم سب کے ذہن میں تصویر کی طرح ٹھہر گئے تھے۔ میرے کانوں میں تیس مار خان کی آواز گونج رہی تھی۔ صاب آپ کس لیے اتنا زحمت فرماتی۔ ام بے حد شرمندہ ہوتی کہ آپ کی خدمت سے محروم ہوتی۔ اگر زندگانی ہوتی تو خانہ آبادی ہوتی۔ آپ دعا فرماتی تا چیز کوشش کرتی اور آبادی میں سالانہ اضافہ کرتی انشاء اللہ۔

رئیس نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں چونکا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر مجھے کچھ نہ سوجھا کہ میں اس کے لیے خدا سے کیا مانگوں۔ خدا سب کی نیت کا اور اعمال کا سب حال جانتا ہے اور پھر مجھ گنہگار کو اس سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ادائے فرض اور وفاداری میں استقامت کی راہ پر چلتے ہوئے جان دینے والے اس جوڑے کی مغفرت فرما اور ایمانداری سے دنیا میں جینے اور خدمت سے حق نمک ادا کرلے۔ جھوٹ غیبت اور دل آزاری اور منافقت سے خود کو محفوظ رکھے پھر اسے جنت میں جگہ دے۔ کون کیا ہے۔ کیسا ہے۔ خدا کو تو معلوم ہے۔

قبر پر پانی چھڑکنے کے بعد گورکن نے اپنا رجسٹر نکالا۔ وہ ہم سے زیادہ قانون جانتا تھا۔ اندراج کرنے سے پہلے اس نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ مانگا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ کے بولا "اس کی ایک نقل دے دینا مجھے۔ یہ قانونی معاملہ ہے جناب۔ قتل کا کیس ہے۔"

اس کے بعد ادائیگی کا معاملہ آیا تو گورکن نے دو قبروں کے دو ہزار مانگے۔ اس کا موقف تھا کہ عام معاوضہ بارہ سو ہے لیکن اس نے پسند کی جگہ دی ہے "آپ تو جانتے ہو۔ یہ قبرستان کب کا بند ہو گیا۔ یہاں جگہ نہیں ملتی کسی کونے میں بھی۔"

رئیس نے اسے دو ہزار دے دیے "یہ صرف تمہارا کمال ہے کہ تم پھر بھی ہر ایک کے لیے چھ فٹ جگہ نکال لیتے ہو۔"

شبنم نے گورکن کو نیم کے دو پودے دیے "یہ سرہانے کی طرف لگا دو اور ان کو پانی دیتے رہنا۔ کہتے ہیں نیم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ایک دن یہ پورے درخت بن کر سب کو سایہ فراہم کریں گے۔"

گورکن نے اس اضافی خدمت کے سو روپے ماہانہ بتائے۔ شبنم سے پہلے رخشی نے اسے ایک نوٹ تھمادیا "یہ لو۔ مگر بھولنا مت۔"

شبنم نے کہا "میں دیکھنے آؤں گی۔"

میں جانتا تھا وہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ ہم سب کے دل پر اس المناک حادثاتی موت کا اثر تھا۔ یہ رات گزر جائے گی اور اگلا دن طلوع ہوگا تو ہمارے معمولات اور ہماری زندگی میں بے حد اہمیت رکھنے والے سارے مسائل ہمیں ہر طرف سے گھیر لیں گے اور ہماری ساری توجہ مانگیں گے تو چھوٹی اور تیس مار خان کے نہ ہونے کا غم خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔ ایک اور دن "اگلا ہفتہ۔ پھر یہ مہینہ گزرے گا تو ان کی یاد شعور سے لاشعور کی پناہ گاہ میں منتقل ہو جائے گی۔ سوئم کے بعد چہلم آئے گا تو گویا سوگ کی تقریبات کا اختتام۔ چار جمعراتوں تک شاید ہم خود کو شرمندگی سے بچانے کے لیے پھول چڑھانے اور چراغ روشن کرنے آجائیں پھر یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ نیم کے پودے سوکھ جائیں گے یا کوئی آوارہ بکری اکھاڑ کے کھا جائے گی۔ قبر کی مٹی بارشوں میں بہہ جائے گی۔ کاروبار کی سمجھ بوجھ رکھنے والا گورکن ایسی لاوارث قبروں کا نشان مٹانے میں خود بھی عناصر قدرت کی مدد کرتے ہیں۔ چھ ماہ یا سال بعد وہ پھر کسی کو پسند کی یہی جگہ فراہم کرنے کے تین ہزار مانگے گا۔ وہ سوگوار لواحقین کے جذبات کو کیش کرانے کا ہنر جانتے ہیں۔

مرنے والوں کو رات کی تاریکی کے حوالے کر کے ہم نے زندہ انسانوں کی دنیا کے راستے پر قدم بڑھائے۔ ایک احساس زیاں سے ہمارے دل بوجھل تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ شبنم کے ساتھ رخشی سب سے آگے تھی۔ رئیس کے ساتھ جیرا بلیڈ اور ڈاکٹر کمال آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں فرید کے ساتھ سب کے پیچھے چلتا رہا۔ اسے ڈاکٹر امجد کے کلینک میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔

"کہاں ہیں وہ فوٹو کاپیاں؟" وہ بولا "ان کی تو میں ایسی تیسی کر دوں گا۔"

"رخشی کے پاس ہیں۔" میں نے کہا "رب نواز کی ضمانت کی توثیق کب ہوگی؟"

"کل۔۔۔ لیکن اب ناممکن ہے۔ اس چیک سے ثابت ہو جائے گا کہ اسے ضمانت پر چھوڑا گیا تو وہ مقدمے پر اور گواہوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گا۔"

"یہ کوشش تو وہ جیل میں رہ کے بھی کرے گا لیکن وہ جیل پہنچ جائے۔ ہمارے لیے یہی اہم ہے۔" میں نے کہا۔

"اب تو رب نواز کا نام دوسری ایف آئی آر میں شامل کرنے کی درخواست بھی کی جا سکتی ہے۔ ہم تیس مار خان اور چھوٹی کے قتل میں اسے ملزم نامزد کروں گے۔ ہمارے پاس ثبوت ہے کہ اس نے چھوٹی کا نزع کے وقت کا بیان بدلوایا ہے کیونکہ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیان میں قتل کا ذمے دار ملک رب نواز کو بنا دیا تھا۔ اگر یہ جھوٹ تھا تو ملک رب نواز کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ بیان کو تبدیل کرانے کے لیے دس دس لاکھ ان سب میں بانٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ وہاں موجود تھے۔"

میں نے کہا "یہ خورشید کیانی بھی رب نواز کا خاص آدمی ہے۔"

"دیکھتے ہیں عدالت میں خاص آدمی کیا کہتا ہے۔ اپنے ساتھ اس نے مجسٹریٹ کو بھی ہروا دیا۔"

میں نے کہا "مجھے زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔ نزلہ بر عضو ضعیف برطرف ہوگا صرف ریڈر۔ ڈی ایس پی زیادہ سے زیادہ ٹرانسفر ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ معطل رہنے کے بعد۔ مجسٹریٹ کو بس ایک شوکاز نوٹس ملے گا۔"

"تو دیکھتا جا۔ سارے ثبوت مع کارڈ میرے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ معاملہ ہے ہائی کورٹ میں۔ شبنم کے پریس کو سٹنل دے دیا ہے کہ اس کیس کو اچھالنا ہے اور چونکہ وہ خود رب نواز کا ٹارگٹ تھی اس لیے پریس خود اس کیس میں شبنم کے ساتھ ہے۔ کسی صحافی کے ساتھ زیادتی ہو تو وہ اپنے انٹرسٹ میں متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچتے ہیں سب کہ کل کوئی اور ملک رب نواز ہمارے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔

قبرستان کے دروازے سے اب بھی لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مسجد کے باہر کسی کی میت رکھی ہوئی تھی اور جنازے کے ساتھ آنے والے وضو کر رہے تھے۔ باہر سڑک پر شام کی ٹریفک کا رش بڑھ گیا تھا۔ دکانیں جگمگانے لگی تھیں اور دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں زندگی کی گہما گہمی عروج پر نظر آتی تھی۔ اس کے تضاد میں قبرستان کی حد بندی کرنے والی دیوار کے پیچھے شہر خموشاں کا پُر سکوت اندھیرا زیادہ گہرا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے سڑک کے پار ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا۔ وہ بونٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رخشی اور شبنم اس انتظار میں تھیں کہ ٹریفک کی روانی میں وقفہ آئے تو وہ سڑک پار کریں۔

اچانک میں نے پولیس کی دو گاڑیوں کو ان کے سامنے رکتے دیکھا۔ ایک میں سے بندوقوں والے چار کانسٹیبل کود کر اترے۔ اس وقت تک رئیس اور کمال بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ دوسری گاڑی میں سے اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے دو افسران اترے۔

فرید نے مجھے روک دیا "یہ تو وہی خبیث ہے۔"

"کون۔۔۔ خورشید کیانی؟" میں نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں تھا۔

"ہاں۔ اور اس کے ساتھ جو انسپکٹر ہے۔ راؤ انور علی۔ اسے بھی خوب جانتا ہوں میں۔" فرید نے کہا "تو تماشہ میں دیکھتا ہوں۔"

مگر میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا "اگر وہ مجھے بھی پکڑنا چاہتے ہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔"

ڈی ایس پی کی شبنم سے گرما گرمی ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور انسپکٹر سے کچھ کہا۔ چاروں کانسٹیبل ایک اشارے پر بندوقیں اٹھائے اندر دوڑے۔ شک و شبے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میرے لیے چھپنے یا فرار ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ عین وقت پر مجھے اس ریوالور کا خیال آگیا جو میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے وہ فرید کے قدموں میں ڈال دیا "اسے اٹھا لے۔"

فرید نے ریوالور پر پاؤں رکھ دیا اور میرے سامنے آگیا "کیا بات ہے؟"

پولیس والوں میں سے ایک نے اسے دھکا دیا "چل ہٹ پراں۔ بات دا پتر۔"

فرید مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا رہا۔ اس نے دھکا دینے والے کا ہاتھ پکڑ لیا "میں فرید عباسی ایڈووکیٹ ہوں۔"

دوسرے نے صورتِ حال کو سنبھالا "او جی وکیل صاحب۔ ہم آپ کو نہیں۔ اس داڑھی والے کو پکڑنے آئے ہیں۔ آپ ہٹ جاؤ۔"

"خبردار۔ میرے مؤکل کو ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔ وارنٹ ہے تمہارے پاس گرفتاری کا؟" فرید عباسی نے دھاڑ کے کہا۔

انسپکٹر راؤ انور علی رعونت سے چلتا ہوا اندر آگیا تھا "میں دکھاتا ہوں وارنٹ وکیل صاحب کو۔ تم پکڑو اس۔۔۔ کو۔" اس نے غلط مجھے گالی دی۔

پولیس والے ہر طرف سے مجھے چمٹ گئے۔ میرا مقابلے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ورنہ دو منٹ میں وہ سب چت پڑے نظر آتے۔ باہر ڈی ایس پی کی صرف شبنم سے بحث چل رہی تھی۔ رئیس اور جیرے بلیڈ کے ساتھ رخشی سڑک پار کر گئی تھی اور ان سے کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ پولیس سے نہ الجھیں۔ ڈاکٹر کمال پولیس کے نمودار ہونے سے پہلے ہی ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تھا۔ غالباً اس کی گاڑی کہیں اور کھڑی تھی۔

یک لخت شبنم غصے میں پلٹی اور تیر کی طرح ہماری طرف آئی۔ سڑک پر بہت سے لوگ اب تجسس سے مجبور ہو کے یہ تماشا دیکھ رہے تھے جس میں بظاہر کسی کے لیے دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ ڈی ایس پی بڑے باوقار انداز میں چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔

"فرید صاحب۔ یہ کیا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں کہ یہ داڑھی والا کون ہے؟" شبنم نے کہا۔

فرید کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا "واٹ از دس کیانی صاحب۔ آپ کسے پکڑنے آئے ہیں۔ اس وارنٹ میں تو کسی کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ بلینک وارنٹ سائن کس نے کیا ہے۔"

"یہ سوالات تم عدالت میں کرنا مسٹر ایڈووکیٹ۔ اور اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ باسٹرڈ کون ہے۔"

"میں جانتا ہوں؟ اوکے میں جانتا ہوں۔ لیکن تم کو اس کا نام ولدیت پتا کچھ معلوم نہیں اور تم پولیس کی اتنی نفری کے ساتھ آگئے ہو اسے گرفتار کرنے۔"

جس کانسٹیبل نے فرید کو دھکا دیا تھا وہ بولا "سر جی۔ وکیل صاحب نے ابھی کہا تھا کہ یہ میرا مؤکل ہے۔"

ڈی ایس پی طنز سے مسکرایا "تم سب بڑے ڈرائے باز اور اچھے ایکٹر ہو لیکن میں نے دس سال پولیس کی نوکری میں جھک نہیں ماری۔ میرے پاس تم سب کی پوری رپورٹ ہے۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

شبنم نے کہا "کیانی صاحب۔ آپ کے لیے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ یہ لاقانونیت بہت مہنگی پڑے گی آپ کو۔"

"مہنگائی کا زمانہ ہے مس شبنم۔ سستی کیا چیز ہے؟" وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولا "آپ بہت بڑی توپ ہو صحافت کی۔ میں جانتا ہوں لیکن میں کوئی رسک نہیں لے رہا ہوں۔ میں نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے۔ اپنا نام یہ خود بتائے گا۔ ولدیت اسے ہم بتائیں گے پھر یہ بلینک وارنٹ نہیں رہے گا؟" اس نے اشارہ کیا اور پولیس فورس حرکت میں آگئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرید سمجھ گیا تھا کہ اس فورس کے سامنے قانون کی کوئی دلیل یا شبنم کی کوئی دھمکی کارگر نہیں ہوگی۔ وہ مجھے اٹھا کر لے جانے کے قانونی اختیار کا بلینک چیک اس لیے لائے تھے کہ کسی کو میرا نام معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر پیچھے والی گاڑی میں پھینک دیا۔ پولیس کی پکڑ میں آنے سے پہلے ہی میں نے اپنی ہر جیب خالی کردی تھی۔ مجھے رات کی تاریکی کے علاوہ فرید عباسی کی پناہ حاصل تھی۔ میں نے ہر چیز اس کے پیچھے ایسے گرائی تھی کہ کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بعد میں فرید عباسی نے ریوالور کے ساتھ وہ سب چیزیں اٹھالی ہوں گی۔

پولیس والوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور کسی وجہ یا ضرورت کے بغیر مجھے گالیاں دے رہے تھے اور پیروں کی ٹھوکریں مار رہے تھے۔ ان کے نزدیک میں مجرم تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔ وہ ہر ملزم کو مجرم سمجھنے کے عادی تھے اور اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ بعد میں عدالت مجھے سزا دیتی ہے یا باعزت طور پر بری کردیتی ہے۔

میں کچھ بولنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ گرفتاری کے وقت میرے ساتھ فرید عباسی کے علاوہ شبنم بھی تھی۔ اگر وہ مجھے اکیلے میں پکڑ لیتے جہاں میری گرفتاری کا گواہ کوئی نہ ہوتا تو وہ وارنٹ بھی نہ نکالتے۔ جب تک چاہتے مجھے کسی نامعلوم مقام پر تشدد کا نشانہ بناتے رہتے اور مجھ سے ہر سوال کا جواب اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے میں ناکام رہتے تو خود مار مار کے کہیں گاڑ دیتے یا مجھے رب نواز کے حوالے کردیتے کہ اپنے مجرم کو جو سزا چاہے دے۔ تلاش کرنے والوں کو میدان حشر سے پہلے میں کہیں نظر نہ آتا۔

لیکن اب ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ وارنٹ کی ضرورت اس لیے پڑی تھی کہ ملک رب نواز کے بندے جب فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے تو چھوٹی اور تیس مار خاں کی جان لینے کے باوجود انہیں صرف اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ وہاں شبنم کے ساتھ ایک داڑھی والا نظر آتا ہے۔ اس داڑھی والے کو یعنی مجھے ملک رب نواز نے سوفی کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔ اس وقت جب ہم اس کے بیٹے کو اغوا کرکے لا رہے تھے۔ ملک رب نواز مجھے شبنم کے ڈرائیور کی حیثیت سے بھی جانتا تھا مگر وہ میرے نام سے ناواقف تھا۔ اسے ہر معاملے میں میرا مرکزی کردار نظر آتا تھا لیکن میرے ساتھ ایک فرید عباسی جیسا وکیل تھا تو دوسری شبنم جیسی رپورٹر تھی۔ چنانچہ ڈی ایس پی خورشید کیانی نے اپنا پانسہ اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس نے ساری معلومات اکٹھی کرکے اس کھیل کی صورت حال کو سمجھا تھا اور بازی جیتنے کا یقین رکھتے ہوئے پانسہ پھینک دیا تھا۔ اس نے جانتے بوجھتے رئیس خاں کو جانے دیا تھا کیونکہ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ ملک خدا بخش سندرال کا خاص آدمی ہے اور جس بیورو کریٹ کے فون پر اسے ایک مجسٹریٹ کے ساتھ اسپتال جاکے چھوٹی کا بیان لینا پڑا تھا وہ فون بھی رئیس نے ہی کرایا تھا۔ اس نے فرید عباسی ایڈووکیٹ کی بیوی رخشی سے بھی کچھ نہیں کہا تھا اور جیرے بلیڈ کو شاید وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ وہ قبرستان سے نکلنے والے بہت سے لوگوں میں سے ایک ہے جو اتفاق سے ہمارے ساتھ ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے پُراذیت سفر کے بعد جو میرے لیے آدھے دن کے عذاب سے زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے مجھے گھسیٹ کر اتارا اور تھانے کی روایات کے مطابق استعمال کرنے والے مجھے روایتی کتے کی طرح مارتے ہوئے اندر لے گئے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہے مگر اکثر تھانوں میں یہ دستور ایسا ہی ہے کہ گرفتار کرکے لائے جانے والے کو گارڈ آف ڈس آنر پیش کرنے والے اس کار خیر میں بڑے خشوع و خضوع سے حصہ لیتے ہیں۔ یہ پوچھے اور جانے بغیر کہ ملزم کون ہے اور کیوں لایا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ تھانے کے مہمان کو بے لباس کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔ دراصل یہ ایک عقوبت گاہ سے تعارف کا موثر انداز سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ملزم پر پہلے سے تفتیش کی دہشت طاری ہوجاتی ہے اور وہ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ یہی سوچ کے آدھا حوصلہ ہار دیتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ رسوا کن اور پر تذلیل استقبال سزا یافتہ مجرم کا جیل میں پہنچنے پر ہوتا ہے۔

میرے کپڑے اس لیے نہیں اتارے گئے کہ قانون اور رائے عامہ کے نمائندے میرے ساتھ تھے اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ فرید عباسی کے ساتھ شبنم بھی تھانے پہنچ چکی ہے۔ رئیس اور جیرے بلیڈ کے ساتھ رخشی اس ٹیکسی میں واپس چلی گئی تھی جو میں نے رات دس بجے تک کے لیے ایک ہزار میں لی تھی۔ فرید عباسی اور شبنم نے انہیں مطمئن کرکے گھر جانے پر مجبور کردیا تھا۔

رئیس نے "عائشہ کلینک" کے باہر کھڑی ہوئی پجیرو انہائی تھی۔ شبنم اور فرید اسی میں ڈی ایس پی کی جیپ کا تعاقب کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ قدرتی طور پر پولیس کی خواہش تھی کہ مجھے غائب کردیا جائے اور کم سے کم ایک رات یہ معلوم نہ ہو کہ مجھے کس تھانے میں رکھا گیا ہے لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔

مجھے فوری طور پر تھانے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ایک کوارٹر میں منتقل کردیا گیا اور وہاں وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا مگر میں اب اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ ماہرین نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے اور مجھے نگا کرکے زبردست قسم کی وہ مار لگائی جس کو وہ اپنی زبان میں "لیدر کٹ" کہتے ہیں یعنی مخصوص طریقے سے جسم کو یوں کوٹا جاتا ہے کہ آدمی اذیت سے مرنے کے قریب ہوجاتا ہے مگر نہ اس کے جسم پر کوئی نشان پڑتا ہے اور نہ کوئی ہڈی ٹوٹتی ہے۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے رہے کہ میرا نام کیا ہے جو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں اپنا نام چراغ علی اور باپ کا نام باغ علی بتاتا رہا۔ انہوں نے مجھ سے گھر کا پتا اور کاروبار یا ملازمت کے بارے میں پوچھا۔ یہ پوچھا کہ میں شبنم کو کیسے اور کب سے جانتا ہوں۔ سونی کہاں ہے جس کے ساتھ مل کر میں نے ملک دل نواز کو گھر سے اغوا کیا تھا۔ یہ سب انہوں نے شرافت کی زبان میں نہیں پوچھا تھا۔ تفتیش کے عمل میں گالی گلوچ اور فحش کلامی تو گویا نصاب میں شامل ہے۔

میں نے انہیں کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا "تم بے شک مجھے مار ڈالو مگر میں اس کے سوا کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں کسی سونی سے واقف نہیں۔ میرا کسی شبنم سے کوئی تعلق نہیں اور میرا نام چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ میں نے ملک رب نواز یا دل نواز کا نام بھی کبھی نہیں سنا۔" وہ جانتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے اگر میں اپنی شناخت کے دیگر حوالے بتا دیتا تو وہ اپنے ذرائع سے اس کی تصدیق کرسکتے تھے مگر میں اپنی بات پر اڑ گیا تھا کہ اس سے زیادہ وہ میری لاش سے بھی نہیں پوچھ سکتے۔ انہوں نے بہت کم وقت میں مجھ پر ایسے حربے آزمائے تھے جو اذیت کی انتہا تھے۔ انہوں نے مجھے الیکٹرک شاک دیے جن سے تقریباً بے ہوش ہوگیا مگر ہوش میں آنے کے بعد میرے ریکارڈ کی سوئی وہیں اٹکی رہی۔ دراصل مجھے امید بلکہ یقین تھا کہ یہ سلسلہ بہت دیر جاری نہیں رہ سکتا۔ فرید عباسی صبح سے پہلے قانونی چارہ جوئی نہیں کرسکتا تھا مگر شبنم یقیناً آزاد صاحب کو سب سے پہلے مطلع کرسکتی تھی اور پھر اپنے دوسرے جرنلسٹ ساتھیوں کے اثر رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اعلیٰ پولیس افسران سے اور سیاسی شخصیات سے رابطہ کرسکتی تھی۔

بالآخر میری امید بر آئی۔ مجھے دوسرے کمرے میں لے جاکے "ری کنڈیشن" کیا گیا۔ ان کے پاس ہر کام کے ماہرین تھے۔ مالش اور مساج کے بعد چند منٹ میں مجھے گرم پانی میں بھگوئے ہوئے تولیے سے رگڑ کر صاف کیا گیا۔ کپڑے پہنا کے میرے بال ٹھیک کیے گئے اور زبردستی میرے حلق میں سیاہ کافی کے ساتھ اسپرو فن اتاری گئی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ تفتیش صرف بیس منٹ جاری رہی اور دس منٹ میں مجھے "فٹ فاٹ" کرکے ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں پیش کردیا گیا۔

مجھ پر ابھی تک شدید نقاہت طاری تھی اور میرا سارا بدن درد سے ایسے ٹوٹ رہا تھا کہ میں سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ دو سپاہی مجھے سنبھال کے لائے اور انہوں نے مجھے ایک کرسی میں فٹ کردیا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے اپنا سر نیچے کیا اور گہری لمبی سانس لینے لگا۔

وہاں تھانہ انچارج کی کرسی پر خورشید کیانی بڑے کروفر کے ساتھ متمکن تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا ایتھلیٹک ٹائپ باڈی رکھنے والا گورا چٹا اور خوب رو شخص تھا۔ وہ یقیناً تعلیم یافتہ اور کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور ڈی ایس پی کے عہدے پر اس عمر میں فائز ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ڈائریکٹ اے ایس پی کے عہدے کے لیے منتخب ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے انداز میں بیورو کریٹک رعونت تھی اور رعیت کی جان و مال اور عزت و آبرو پر اختیارات کا غرور اپنی جگہ تھا۔

حالات کی اس کروٹ نے ہم سب کو ایک ایسے ڈرامے کا کردار بنا دیا تھا جو ہم مصلحت کی مجبوری میں کر رہے تھے اور جیسے اسٹیج کے اداکار جانتے ہیں کہ ڈراما دیکھنے والے اسے کھیل ہی سمجھ کے دیکھ رہے ہیں۔ ایسے ہی پولیس جانتی تھی کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ حقیقت نہیں ہے مگر مشکل یہ تھی کہ خود ان کے پاس حقیقت جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ وہ سچ اگلوانے کے اپنے پسندیدہ اور موثر طریقوں کا استعمال کرنے سے قاصر تھے تو یہ ان کی مجبوری تھی۔

شبنم میری حالت دیکھ کے سمجھ گئی تھی کہ آدھے گھنٹے میں پولیس کے ڈرائنگ روم میں میری کس قسم کی خاطر مدارت ہوئی ہے۔ صحافت کے پیشے میں اس نے ہر پیشے اور محکمے۔ ہر ادارے اور کاروبار کو اوپر نیچے اور اندر باہر سے سارے پردے ہٹا کے دیکھا تھا اور ظاہر کے پردے میں باطن کی ہر خرابی جو عام آدمی کی نظر سے پوشیدہ تھی، اس پر عیاں تھی۔ پولیس کی حد تک فرید عباسی بھی جانتا تھا کہ تھانے میں نچلی سطح سے ڈی آئی جی کے لیول تک کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم کی آنکھوں میں اس کے دل کا سارا درد ایک شرارہ بن کے چمکا اور پھر اجنبیت کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ وہ پھر انجان بن گئی کیونکہ ڈی ایس پی بڑے غور سے ہم سب کے جذباتی ردِعمل اور تاثرات کا مشاہدہ کررہا تھا۔

ڈی ایس پی نے فرید کو مخاطب کیا "اچھی طرح سوچ لو وکیل صاحب۔ اس بندے کو آپ جانتے ہو یا نہیں؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں۔" فرید نے کہا "تم نے اسے گرفتار کیا ہے تو یقیناً تمہاری معلومات ہوں گی اس کے بارے میں اور اس کے جرم کے بارے میں۔"

"مجھے چکر مت دو۔ قبرستان میں تم نے کہا تھا کہ یہ تمہارا موکل ہے۔ اب تم اس کا نام تک نہیں بتا سکتے پھر یہاں کیوں آئے ہو اس کے پیچھے پیچھے۔ کیوں پریشان ہو ایک اجنبی کے لیے۔"

فرید نے کہا "میں ایک وکیل ہوں۔ کسی کو بھی لاقانونیت کا شکار ہوتے دیکھوں تو اس کی مدد کرسکتا ہوں۔"

"خدمتِ خلق پہلے کبھی کی ہے تم نے؟"

"میں ایک ہیومن رائٹس ACTIVIST ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں؟" میرے سامنے آپ نے ایک آدمی کو قبرستان سے پکڑ لیا جس کا آپ نام بھی نہیں جانتے۔ اس کے خلاف الزامات کی ایک لمبی فہرست بنا دی اور الزامات بھی وہ جن میں آپ کی کوشش سے اسے سزائے موت بھی ہوسکتی ہے۔ میں کیا اپنی آنکھیں بند کرلوں؟" فرید نے انگریزی میں کہا۔

شبنم نے اس کی تائید میں سر ہلایا "میرے ساتھ تو اس شخص کا زبردستی تعلق جوڑنا چاہتے ہیں آپ۔ جس کا مجھے نام بھی نہیں معلوم۔"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے کہا "چراغ علی ولد باغ علی۔"

"شٹ اَپ۔ شٹ اپ! کس نے کہا ہے تم سے بولنے کو۔ منہ بند رکھو اپنا کتے۔" ڈی ایس پی نے غصے میں میز پر مکا مارا۔

افسر کی خوشنودی کے لیے تھانہ انچارج نے مجھ پر مکوں کی بارش کردی۔ میں کرسی سے گر گیا لیکن میں نے اپنے دفاع میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔

"اسٹاپ آل دس!" شبنم نے چلّا کے کہا۔

"یو اسٹاپ دس گیم۔ مس شبنم۔" ڈی ایس پی دہاڑا "تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اس سے تو تم جاؤ۔ گیٹ آؤٹ بوتھ آف یو۔"

فرید عباسی نے چلا کے کہا "ڈونٹ شاؤٹ ایٹ ہِر۔ تم قانونی اختیار سے تجاوز نہیں کرسکتے۔ یہ تمہارا گھر نہیں پولیس اسٹیشن ہے۔"

"اور تمہارا یہ لاقانونیت کا مظاہرہ دیکھنے والے اور بھی آرہے ہیں۔ وہ اب تک تمہارے افسرانِ بالا کو بھی فون کرچکے ہوں گے۔"

"میں کسی اُلّو کے پٹھے کی پروا نہیں کرتا۔ جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں تم جیسے جز ٹلمٹوں کو اور افسروں کو۔" وہ دہاڑ کے بولا "انسپکٹر۔ یہ کہتا ہے کہ اس کا نام چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ ٹھیک ہے۔ لکھ دو یہی نام وارنٹ پر اور اسے لے جاؤ تفتیش کے لیے کسی اور جگہ۔ کوئی پیچھے آئے تو گولی مار دو اسے۔ جب تک یہ سارا سچ نہ اگل دے اس کو مہمان رکھو۔ دو چار دن۔ ایک ہفتہ۔ ایک مہینہ۔ عدالت سے میں نمٹ لوں گا۔"

انسپکٹر نے سر ہلایا "یہ لوگ بات کرتے ہیں شرافت کی۔ شرافت سے کون تعاون کرتا ہے۔"

ڈی ایس پی نے چٹکی بجائی "آپ صحافی صاحب۔ ابھی اخبار پریس میں نہیں گیا ہوگا۔ جاؤ سب جگہ خبر لگوا دو۔ میرے اور تھانے کے خلاف۔ دل کھول کے لکھو اور وکیل صاحب آپ بھی صبح ہائی کورٹ میں جس بنچ کا کیس کردو۔ جس عدالت میں چاہو جاؤ۔"

عین اس وقت جب دو خوں خوار خون آشام اور خوں ریز قسم کے تشدد پیشہ ور سادہ کپڑوں میں بھی جلاد نظر آنے والے ماتحت مجھے دبوچ کرلے جارہے تھے۔ صورت حالات تھوڑی سی بدل گئی۔ پہلے ایک موٹر سائیکل پر آنے والے دو افراد سیدھے اندر گھس آئے۔ ان میں ایک کوئی رپورٹر تھا جسے پولیس والے اچھی طرح جانتے تھے۔ دوسرا فوٹو گرافر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈی ایس پی کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ فون اٹھا کے باہر نکل گیا۔

شبنم کا مایوسی کی تصویر بن جانے والا چہرہ ایک دم پُرامید ہوگیا "اوہ برادر۔ بڑے وقت پر آگئے تم یہاں تو۔۔۔"

"ٹیک ایٹ ایزی گرل۔" برادر نے ہاتھ اٹھا کے اور مسکرا کے شفقت اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ اس کے ساتھ آنے والا فوٹو گرافر بھی اسی جیسا تھا۔ دونوں کے سر کے بال لمبے اور بے ترتیب تھے اور موٹر سائیکل پر آنے سے بکھر کے چہرے پر آرہے تھے۔ دونوں کی گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور بالوں کے اس جنگل میں ان کے چہرے پر صرف آنکھیں اور ناک واضح نظر آتے تھے۔ دونوں کے کپڑے بد

وضع اور گھٹیا تھے۔ جینز کی پرانی پتلونیں اور رنگین اسپورٹ شرٹس جن پر بے ہودہ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک پر مائیکل جیکسن کی سٹر بسن جینٹ کے مشہورِ عالم کا ٹائٹل پرنٹ تھا تو دوسری پر ایک مرد عورت کا سایہ انہیں یک جان دو قالب ظاہر کرتا تھا اور نیچے لکھا ہوا تھا "لو برڈز۔"

میرا اندازہ فوراً ہی درست ثابت ہوگیا۔ وہ ایک بہت بڑے اخبار کے کرائم رپورٹر تھے۔ تھانے والے اگر لحاظ کرتے ہیں تو صرف کرائم رپورٹر کا جس کے تعاون کے بغیر کوئی خبر نہ دبائی جاسکتی ہے نہ مسخ کی جاسکتی ہے۔ اسے تھانے والا اپنا بندہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اس کی مانی پڑتی ہے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن یقیناً تھانہ انچارج نے کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ لے جانے والوں نے مجھے چھوڑ دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دھمکی سے واضح کرکے چلے گئے کہ پتر کسی غلط فہمی میں مت پڑ جانا۔ قربانی کا بکرا آیا ہے تو ذبح بھی ہوگا۔ آج نہ سہی کل سہی۔

انسپکٹر کے کہے بغیر برادر نے جس کا اصل نام ابراہیم درانی تھا چنانچہ ابتدائی حروف ملا کے برادر کردیا گیا تھا۔ ایک کرسی دیوار کے پاس سے گھسیٹ کے میز کے قریب کرلی۔ اس کے ساتھی فوٹو گرافر نے بھی ایسا ہی کیا پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا "راؤ صاحب چائے منگواؤ فٹافٹ۔ بڑی دور سے آرہے ہیں ہم۔"

انسپکٹر نے غالباً ڈی ایس پی کی موجودگی کے باعث اس اظہارِ بے تکلفی کو پسند نہیں کیا "یہ تھانہ ہے۔ چائے خانہ نہیں۔"

برادر کا لہجہ ایک دم بدل گیا "اچھا! تو پھر کیا خبریں ہیں۔ سنا ہے کوئی ایسا بندہ پکڑ لیا ہے آپ نے جس کا نہ اپنا نام ہے نہ باپ کا۔ پتا ٹھکانا کچھ نہیں اور جرم بڑے بڑے ڈال دیے ہیں اس کے کھاتے میں۔"

شبنم نے کہا "یہی ہے وہ بندہ۔ تھانے دار صاحب نے اسے بڑا خاص بندہ بنا دیا ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ کون ہے۔"

"وارنٹ بھی ہے مگر بلینک۔ ملزم سے پوچھ کے نام ڈالیں گے۔" فرید عباسی نے طنز سے کہا۔

ڈی ایس پی اندر آیا تو اس کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر اس کے لہجے نے بتا دیا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ اس نے برادر سے ہاتھ ملایا اور سیٹ پر بیٹھ کے بولا "راؤ صاحب۔ بھئی کچھ چائے وائے منگوائی ہے ان کے لیے یا نہیں۔"

انسپکٹر نے سر ہلایا "بولا تو ہے جی۔" اور پھر کسی کو آواز دی۔ برادر اور فوٹو گرافر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اب میرے معاملے پر نئے سرے سے بحث شروع ہوئی۔

ڈی ایس پی نے کہا "دیکھو۔ یہ سب بیکار ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے لڑ کے اور الزامات عائد کرکے کسی کی مدد نہیں کرسکتے۔ کوئی جھوٹ کو سچ یا سچ کو جھوٹ نہیں بنا سکتا اور ہم جیسے بھی کریں مگر سچ بہرحال معلوم کرلیتے ہیں۔ ہم آف دی ریکارڈ بات کریں گے۔"

"اوکے۔ سچ کیا ہے؟" برادر نے میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔

"ہم ان خاتون کے آفس گئے تھے۔ ابوبکر آزاد صاحب کے پاس۔ ہم نے انہیں بتایا کہ مس شبنم اپنے لیے مسائل پیدا کررہی ہیں۔ وہ ملک رب نواز کے کاروباری اور سیاسی دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہیں اور یہ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں نقصان پہنچ جائے۔ صحافی ہونے کا فائدہ ضرور حاصل ہے انہیں لیکن اس ملک میں جہاں وزیراعظم تک محفوظ نہیں۔ کوئی بھی اپنے PRIVILIGE کو اپنی لائف انشورنس نہیں بنا سکتا۔"

"یعنی ملک رب نواز قتل کرا سکتا ہے شبنم کو۔ انوا تو کیا ہے ایک بار۔" برادر نے تلخی سے کہا "کیا وہ جانتا نہیں؟"

"ایک منٹ۔ پہلے مجھے کہنے دو۔" ڈی ایس پی بولا "آزاد صاحب نے کہا کہ شبنم کے خلاف کوئی کیس بنتا ہے تو اسے گرفتار کرلو۔ وارنٹ لے آؤ اور پوچھ لو اس سے کیا پوچھنا ہے لیکن اس کے ساتھ رب نواز کو بھی پکڑو۔ میں نے تو کہا کہ آپ شبنم کو بلا لیں تو ہم آپ کے سامنے بات کرلیں گے مگر انہوں نے ٹال دیا ہمیں کہ میں کہاں سے بلاؤں۔ وہ اب اخبار کے دفتر کم آتی ہے۔ ملک صاحب اور شبنم کے درمیان جو جنگ چل رہی ہے ہم اس میں فریق نہیں بن سکتے۔"

"فریق بنے ہو تم۔ تم رب نواز کے ساتھ ہو۔" فرید نے کہا۔

"سوچے سمجھے بغیر الزام مت لگاؤ وکیل صاحب۔" ڈی ایس پی برہمی سے بولا۔

"میں بات کرتا ہوں ثبوت کے ساتھ۔" فرید نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس دکھاؤ مجھے۔"

فرید نے کہا "دکھا دوں گا مگر ابھی نہیں۔ وقت آنے پر۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم نے بھی تائید میں سر ہلایا "اس دستاویزی شہادت کو کسی عدالت میں غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈی ایس پی نے بے نیازی سے ہاتھ ہلایا "آج جب ہم دہرے قتل کی ایک واردات کے سلسلے میں تفتیش کے لیے گئے۔ ایک سیاسی کارکن رہتا ہے وہاں رئیس خان۔ اس کے گھر کا نام بھی رئیس خانہ ہے۔ قتل اسی کے دو ملازمین کا ہوا تھا۔ وہاں آس پاس کے لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔"

شبنم نے کہا "یہ معلوم نہیں ہوا تھا آپ کو کہ قاتل کس کو پوچھتے ہوئے آئے تھے؟ کس کی گاڑی میں آئے تھے؟"

"وہ فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے آئے تھے مگر پتا یہ چلا کہ اسی رئیس خانے میں فرید عباسی کے علاوہ لوگوں نے ایک خاتون کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ اب خاتون تو وکیل صاحب کی واقف بھی ہیں۔ جو پہلے شاہ عالم کی واقف تھیں مگر پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ ویسے تو یہ تعریف ہے آپ کی۔ لوگوں نے کہا کہ وہ انڈین فلم اسٹار جوہی چاولہ جیسی ہیں۔ تو قدرتی طور پر کسی اور کا نہیں مس شبنم کا خیال آیا مجھے بھی اور اپنے راؤ صاحب کو بھی۔ پھر پتا چلا کہ جوہی چاولہ کے ساتھ جانی میور بھی ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا۔"

"آپ کامیڈین بننے کی کوشش مت کریں۔" شبنم نے کہا۔

"سوری۔۔۔ لوگوں نے اس داڑھی والے کا حلیہ بتایا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ میں اسے جانتی نہیں۔ کیا آپ بھول گئی ہیں کہ اس داڑھی والے کو آپ نے ملک رب نواز کے سامنے اپنا ڈرائیور کہا تھا۔ یہ پتا نہیں کہاں کہاں آپ کے ساتھ دیکھا گیا۔"

شبنم اپنی بات پر اڑی رہی "یہ غلط ہے!"

"ابھی ہم ملک رب نواز کو بلا لیتے ہیں۔ ان کی شناخت کے بعد شک کی کوئی سی گنجائش رہ جائے گی۔ یہ داڑھی والا ایک دہشت گرد قسم کی لڑکی ثمینہ عرف سونی کے ساتھ ملک رب نواز کے گھر میں گھسا اور اسلحے کے بل پر بیڈ روم میں سے اس کے بیٹے دل نواز کو اغوا کر کے لے گیا۔ ملک صاحب کے گھر کا بچہ بھی اسے پہچان سکتا ہے۔ بس بات اتنی ہے کہ کوئی نام نہیں جانتا تھا اس کا۔ وہ ہم پوچھ لیں گے۔"

فرید نے کہا "یہ کیس کہ زبردستی اس سے اعترافِ جرم کرا لیں گے۔"

"اگر یہ سچا ہے تو بتا دے کہ یہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا "یہ قبرستان میں کیا کر رہا تھا ورنہ ہم اپنے طریقے سے پوچھیں گے۔ صبح تک یہ سب کچھ بتا دے گا۔"

ڈی ایس پی کے والہ کل نے برادر کو قائل کر لیا تھا۔ فرید عباسی اور شبنم کا کیس کمزور پڑنے لگا تھا "یار تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کون ہو۔ بعد میں بھی تو بتاؤ گے۔ سو پیاز اور سو جوتے کھا کے۔"

میں نے کہا "میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں۔"

برادر نے کہا "شناختی کارڈ بنا ہوا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا "ابھی نہیں۔۔۔"

"اس شہر میں کوئی ہے جو تمہیں شناخت کر سکے۔ جو کہہ سکے کہ پولیس نے تمہیں بے گناہ پکڑ لیا ہے۔ تم شریف آدمی ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے اور میرے لیے اپنے موقف پر قائم رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس کے سامنے بیک وقت شبنم، رئیس خان، رخشی اور فرید عباسی سے کسی قسم کے تعلق کو تسلیم نہ کرنا ایسا ہی تھا جیسے میں یہ بات ماننے سے انکار کر دوں کہ دن کے اجالے کا سورج کی روشنی سے تعلق ہے۔ میں ہر جگہ۔ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ آتے جاتے مجھے نہ جانے کتنے لوگ دیکھتے تھے۔ پولیس کے پاس ایسے گواہوں کی کمی نہ تھی جو حلف اٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ میں رب نواز کے خلاف سارے معاملات میں براہِ راست ملوث تھا۔ شبنم کا مجھ سے لاتعلقی کا اظہار اور میرا اس سے ناآشنائی کا دعویٰ ایک ایسی غلطی تھی جسے نبھایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہم نے سوچے سمجھے بغیر جھوٹ بول کے جان چھڑانے کی احمقانہ کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اب میرے ساتھ سب ہی پھنس گئے تھے۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دس اور دس کو نبھانے کے لیے سو جھوٹ بولنے کا سلسلہ ایک دلدل بن گیا تھا جس میں ہم دھنستے چلے جا رہے تھے۔

میری سمجھ میں اس مشکل کے دو ہی حل آتے تھے۔ ایک یہ کہ میں اپنی شناخت کے معتبر حوالے پیش کر کے ثابت کر دوں کہ سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میں اس جھوٹ پر ڈٹا رہوں اور پولیس کو موقع دوں کہ وہ مجھ سے سچ اگلوا لے۔ مجھے دوسرا حل آسان لگا جس میں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں کسی کو بلانا بالکل ضروری نہیں تھا اور میں اپنی مدد آپ کے اصول پر سارا قضیہ ہی ختم کر سکتا تھا۔

برادر نے کہا "دیکھو ہم تمہاری مدد کے لیے آئے ہیں

بلکہ بلوائے گئے ہیں۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن یہ تو پتا چلے کہ تم کون ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اپنی بے گناہی کا۔ مجھے بتاؤ۔"

میں نے کہا "دیکھو جی۔ الزام مجھ پر پولیس نے لگائے ہیں۔ اگر میں نے جرم کیے ہیں تو مجھے سزا بھی ہو جائے گی۔ فیصلہ کرنا تو عدالت کا کام ہے۔ میں نے اپنا نام بتا دیا اور میں کچھ نہیں بتاؤں گا اس لیے کہ میری وجہ سے دوسرے لوگ مشکل میں نہ پڑیں۔"

"کون دوسرے لوگ؟" ڈی ایس پی بولا۔

"میرے۔۔۔ گھر والے۔ ماں باپ بھائی بہن۔ بیوی۔ بچے۔ پولیس تو کسی کو نہیں چھوڑتی۔ وہ پہنچ جائیں گے میرے گھر۔ سب کو اٹھا لائیں گے۔"

برادر نے کہا "نہیں۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ پولیس ان سے تفتیش ضرور کرے گی لیکن یہ سوال جواب تک محدود رہے گی۔ ان کا صرف بیان لیا جائے گا۔"

میں نے کہا "اجی رہنے دو۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پولیس گھر میں گھس کے سب کی ایسی کی تیسی کرے گی۔ یہ باپ کے سامنے بیٹی کو بے آبرو کر دیتے ہیں۔ بیٹے کے سامنے ماں کی عزت لوٹ سکتے ہیں۔ وہ سب برباد ہو جائیں گے۔"

"شٹ اپ!" ڈی ایس پی دہاڑا "ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے۔ ہوتا ہے اور میرے ساتھ بھی ہو گا۔ اس لیے میں ان کو بچاؤں گا۔ ان کی محلے اور خاندان میں عزت ہے۔ میری وجہ سے وہ سب کی نظر میں ذلیل کیوں ہوں۔ اگر کوئی جرم میں نے کیا ہے تو اس کی سزا میرے بیوی بچوں کو کیوں ملے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے جیل میں ڈال دیں ساری عمر کے لیے۔ پھانسی پر لٹکا دیں۔ میں ہر جرم کا اعتراف کر سکتا ہوں۔ یہ لوگ کرا لیں گے لیکن میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں تو یہی رہوں گا۔ اسی نام سے جیل میں رہوں۔ اسی نام سے پھانسی بھی چڑھ جاؤں گا مگر کسی سے اپنے تعلق کے بارے میں میری زبان بند رہے گی، یہ لوگ جتنا چاہیں تشدد کر لیں۔ مار ڈالیں مجھے مگر میں اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

ڈی ایس پی نے کہا "ہم دیکھیں گے۔ ہمارے پاس تو پتھر بولنے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "آزما لینا ڈی ایس پی صاحب۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں کیس کام بھی کرتا ہوں۔ روزگار کے سلسلے میں بہت لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میرا گھر گاؤں شہر سب ہے۔ عزیز رشتے دار اور دوست ہیں مگر تم تلاش کر سکتے ہو تو کرا لو۔"

انسپکٹر راؤ انور علی نے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کی "بھونکتا جا رہا ہے کتے کی اولاد۔ ہم تیری ایک تصویر شائع کریں گے تو آنے والے خود ہی آ جائیں گے تجھے پہچان کے۔"

میں نے کہا "یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

میری حکمت عملی میں تبدیلی نے فرید عباسی اور شبنم کو کچھ حیران کیا تھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پائے تھے۔ مجھے بھی موقع نہیں ملا کہ ان کو آنکھ مار کے ہی یہ بتا سکتا کہ یہ سب میں ایک خاص مقصد کے تحت کر رہا ہوں۔ انہیں مجھ پر بھروسا تھا۔ میری عقل پر بھروسا تھا اور قوت فیصلہ پر بھروسا تھا۔ خطرات سے اور مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت پر بھروسا تھا مگر اس کے باوجود وہ میرے لیے پریشان تھے اور دکھی تھے۔ صورت حال بے چیدہ اور ان کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

چائے ختم کر کے ڈی ایس پی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی سگریٹ جلانے سے پہلے برادر کو پیش کی "یوسی درانی صاحب اور مس شبنم فاروقی۔ یہ بندہ بڑا ٹیڑھا ہے یا خود کو ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے میں اس کی مدد کیوں کی جا رہی ہے۔ یہ گفتگو ابھی تک آف دی ریکارڈ ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں کہ ہم نے اسے بلاوجہ نہیں پکڑا۔ بہت سے جرائم میں اس کا ملوث ہونا صاف نظر آتا تھا۔ مثلاً یہ ایک لڑکی سونی کے ساتھ ملک رب نواز کے گھر گیا تھا اور سونی کا باقاعدہ ریکارڈ ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی۔ انہوں نے رب نواز کے بیٹے کو گن پوائنٹ پر اغوا کیا۔"

"اور اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ شبنم کو رہا کرانے کے لیے۔ جسے رب نواز نے اغوا کرایا تھا۔" برادر بولا۔

"اس کا ثبوت کوئی نہیں لیکن فرض کر لیں ایسا ہوا تھا۔ تب بھی اس بندے کا جرم تو اپنی جگہ رہا۔ یہی بندہ مس شبنم اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ جن میں سونی بھی شامل ہے، ملک رب نواز کے پولٹری فارم بھی پہنچا۔"

"جہاں دو قتل ہوئے۔ ان کا کیس الگ ہے۔"

"لیکن اسی پر بس نہیں۔" ڈی ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی "یہ بندہ اس بس میں بھی موجود تھا جو کوئٹہ جاتے ہوئے ہائی جیک کی گئی اور جیسا کہ میں نے سنا ہے۔ یہ آپ کے ساتھ تھا مس شبنم۔ اس بس کو سونی نے آگ لگا دی تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم نے بڑے اعتماد سے اسے جتلا دیا "یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے۔"

"مس شبنم پھر وہ داڑھی والا کون ہے جو آپ کے ساتھ اکثر دیکھا جاتا ہے؟"

شبنم نے کہا "کچھ عرصے ایک ڈرائیور تھا میرے پاس۔ اس کا حلیہ کچھ ملتا تھا چراغ علی سے۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ نوکری چھوڑ کے چلا گیا۔" شبنم بولی۔ "مس شبنم۔ کیا آپ جیسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت بغیر کسی حوالے کے ایک شوفر کو ملازم رکھ سکتی ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟"

"اسے ایک جاننے والے نے بھیجا تھا۔ اس جاننے والے کا انتقال ہو گیا۔"

ڈی ایس پی مسکرانے لگا "مس شبنم۔ آپ ایسی باتوں سے خود اپنی پوزیشن کو کتنا مشکوک بنا رہی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ضمانت قبل از گرفتاری کرالیں۔ بیان تو ہم آپ کا بھی لیں گے مگر ابھی مسئلہ ہے اس بندے کا جو خود کو چراغ علی ولد باغ علی بتاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم وارنٹ میں یہی نام لکھ دیتے ہیں۔ نام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ غلط ہو گا تو معلوم ہو جائے گا اور عدالت کو یہ خود بتائے گا کہ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کیوں کیا تھا۔ ہم رئیس خاں سے بھی پوچھیں گے کہ رئیس خانے میں جو لوگ رہتے تھے۔ کیا ان میں چراغ علی بھی تھا یا کیا مس شبنم فاروقی بھی وہاں رہتی تھیں؟"

برادر نے پریشانی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا "شبنم۔ تم خود کو بچاؤ مزید بدنامی سے۔ یہ تم کس چکر میں پڑ گئی ہو صحافت چھوڑ کے۔"

"برادر۔ نہ میں نے صحافت چھوڑی ہے اور نہ میں ڈرتی ہوں ایسی بدنامی سے۔ میں کبھی نیک نام نہیں تھی ملک رب نواز جیسے لوگوں کی نظر میں" شبنم نے برہمی سے کہا "میں اپنا دفاع کر سکتی ہوں۔"

ڈی ایس پی اپنی کامیابی سے بہت مطمئن تھا "ہم اس یقین کے ساتھ قبرستان گئے تھے کہ وہاں مس شبنم ہوں گی اور یہ بھی ملے گا۔ گو سی' ہمارا اندازہ کتنا صحیح تھا۔ اب یہ وکیل صاحب بھی بتائیں مجھے کہ آخر چراغ علی ان کا موکل کیسے ہو گیا۔ یہ کیوں ایک بندے کی وکالت پر آمادہ ہیں جو۔"

فرید نے اس کی بات کاٹ دی "کیا میں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرالوں؟"

کیانی ہنسنے لگا "وہ آپ کرا لینا اگر ضرورت پڑے۔ آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ قانون کو سمجھتے ہیں آپ۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور آپ بھی مس شبنم۔ اس چکر میں مت پڑیں۔ آپ لوگ جائیں۔"

شبنم خود کو بہت کنٹرول کر رہی تھی مگر خوف اور الجھن کے آثار اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔ ظاہر ہے اس کی جذباتی کیفیت کو فرید کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن فرید خود آپ سیٹ تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہی تھا کہ وہ مجھ سے کہیں علیحدگی میں بات کرتا۔ ایک موکل کے ساتھ مشورے کا قانونی اختیار ہر وکیل کو حاصل رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تھانے میں کوئی قانون نہیں ہوتا اور کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ سوائے تھانے دار کے۔ ابھی تو فرید نے مجھ سے باقاعدہ وکالت نامے پر دستخط بھی حاصل نہیں کرائے تھے۔ اس کے باوجود وہ چاہتا تو شاید ڈی ایس پی اسے فراخ دلانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دیتا مگر میری بات نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"تھینک یو جنٹلمین' اینڈ لیڈی!" ڈی ایس پی اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا "اب آپ لوگ جا کے سوچیں کہ یہاں آپ نے اپنا کتنا وقت برباد کیا۔ ہمارا وقت تو خیر ہوتا ہی ہے ضائع کرنے کے لئے۔"

"تم بھی چھوڑو سارے چکر" برادر نے شبنم کو مشورہ دیا "اس ٹیڑھی چال والی دنیا کو میں یا تم سیدھا چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

شبنم نے آہستہ سے کہا "ٹھیک ہے برادر!"

"دیکھو' یہ کوئی تمہاری پرسنل پرابلم نہیں ہے۔ فار گیٹ اٹ۔ اب کام کرو۔" وہ اپنے ساتھی فوٹو گرافر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بالکل ٹھیک ہے' یہ مشورہ ان حالات میں۔" ڈی ایس پی بولا "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آپ کی پوزیشن محفوظ ہے لیکن اسے محفوظ رکھنا' آپ کا اپنا کام ہے۔ صحافی صرف صحافت کرے تو ٹھیک۔"

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی "میں اپنا برا بھلا بھی سمجھتی ہوں سر اور آپ کا برا بھلا بھی جانتی ہوں۔ مجھے یہ نصیحت کا تو کرامت دیں تحفے میں۔"

وہ فرید کے ساتھ باہر چلی گئی۔ برادر نے مسکرا کے انسپکٹر سے اور پھر ڈی ایس پی سے ہاتھ ملایا۔ "ذرا خیال رکھنا اس

کا۔ یہ لڑکی ایسی ہی سرپھری ہے شروع سے۔ ایڈونچر اس کی نیچر میں ہے۔"

"آئی نو۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں مگر برادر' اس کو بتاؤ کہ اس ملک میں صحافت کر رہی ہے جہاں محبت کرنے پر بھی عورت کو مار دیا جاتا ہے۔ وہ کرنا چاہتی ہے ایڈونچر ملک رب نواز کے ساتھ۔"

انسپکٹر نے ایک بڑی فحش بات کی "ایک رات کے ایڈونچر میں پتا چل جائے گا اپنی اوقات کا۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی تھی۔"

"ایک بات بتاؤ برادر۔" ڈی ایس پی بولا "اس کا چکر کیا ہے آج کل۔ یہ کیا کر رہی ہے۔"

"سچ تو مجھے بھی علم نہیں۔"

"اس کا رابطہ ہو گیا ہے کچھ ایسے لوگوں سے۔ جو مال ادھر سے اُدھر کرتے ہیں؟" ڈی ایس پی نے کہا۔

"سنا ہے میں نے بھی۔ یقین نہیں آتا کیونکہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"یار ایسی ویسی کیا۔ پیسہ آئے سیلاب کی طرح تو یہ اصول پرستی وغیرہ سب تنکے کی طرح بہہ جاتی ہے۔" انسپکٹر بولا۔

"یہ تو ہے۔" برادر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

سب کے جاتے ہی تھانہ صرف تھانہ رہ گیا اور میں صرف مجرم۔ ایک مکا مار کے راؤ انور علی نے مجھے نیچے گرا دیا۔ اس کے نزدیک میرا کرسی پر بیٹھے رہنا بہت بڑی گستاخی تھی۔ اس نے پچھلے ایک گھنٹے کی کوفت دور کرنے کے لیے میز پر سے وہ بید اٹھالی جس کے ایک نسبتاً موٹے کنارے پر چاندی کی مٹھ کسی تھی اور آخری پتلے حصے پر بھی چاندی چمک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ میری کھال ادھیڑتا' ڈی ایس پی نے اسے روک لیا "ایک منٹ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر راؤ انور علی کو بادل ناخواستہ باہر جانا پڑا۔ وہ چھڑی میز پر پھینک گیا "آپ بتا جانا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

خورشید کیانی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے نظروں میں تولتا رہا "پہلے کبھی پکڑے گئے ہو تم۔ کسی جرم میں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔"

"یعنی تھانے میں سہاگ رات ہو گی آج تمہاری۔ جو تمہاری حمایت پر آمادہ تھے۔ ایک ہیومن رائٹس کا دعوے دار اور ایک صحافت کی علم بردار۔ وہ تو گئے اور شاید لوٹ کر نہ آئیں۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"جو کرنا ہے آپ کو کرنا ہے۔ مجھے ماریں یا چھوڑ دیں۔"

وہ بولا "راؤ بہت حرامی ہے۔ تفتیش میں چار بندے مار چکا ہے مگر کہتا ہے سات خون معاف ہیں مجھے۔ جو مرنے سے بچ گئے وہ لنگڑے لولے اندھے یا نامرد ہو گئے۔ کسی کا اثر رسوخ انہیں بچا نہیں سکا اور اس کیس میں رب نواز ہی پیچھے لگا ہوا ہے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اگر ایسے ہی مرنا لکھا ہے نصیب میں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"نہیں۔ ہم کر سکتے ہیں۔ اگر تم مجھے بتا دو کہ تم کون ہو۔ تو میں رب نواز کو یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ بندہ مجرم نہیں ہے۔ کوئی اور ہے جو دھوکے میں پکڑا گیا۔ تم واقعی نہیں جانتے اس کنجری کو۔ جس کا نام شبنم ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ خورشید کیانی کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ میں وہی داڑھی والا ہوں جو شبنم کا ڈرائیور تھا یا کوئی اور۔ شبنم کا کہنا تھا کہ ڈرائیور اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ غلطی پولیس سے بھی ہو سکتی تھی اور خود ملک رب نواز کے سمجھنے میں بھی۔ وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوال کرتا رہا اور یقین دلاتا رہا کہ سچ بولنے کی صورت میں میرے لیے تفتیش کا کوئی عذاب نہیں ہو گا ورنہ میرے جیسے لاوارث آدمی کو پولیس بالآخر مار کے کہیں گاڑ دے گی۔ میرے گھر والوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ میں کہاں گیا۔ مجھے اپنی شناخت چھپانی نہیں چاہیے۔ اس نے یہ بھی پوچھ لیا کہ میں فرید عباسی کو نہیں جانتا تو وہ کیوں میری وکالت کے لیے اتنا زیادہ مستعد اور بے چین ہے کہ قبرستان سے پولیس کا تعاقب کرتا ہوا تھانے آیا اور یہاں زبردستی خود کو میرا وکیل کہتا رہا۔ اس کا کیا انٹرسٹ تھا؟ پھر شبنم نے میرے لیے فون کیوں کروائے۔ خورشید کیانی نے تسلیم کیا کہ ابھی اس کو ایس ایس پی نے فون کر کے پوچھا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے لیکن اس نے ایس ایس پی صاحب کو مطمئن کر دیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ضابطے قاعدے اور قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

میں نے اسے ہر بات کا ایک ہی جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم فرید عباسی میرے ساتھ کیوں آیا تھا اور شبنم نے میری حمایت کیوں کی تھی۔

بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ اپنے عہدے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقار بھول کے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی زبان سے گالیوں کا ایک سیلاب بہہ نکلا۔ ان میں سے کچھ بڑی SOPHISTICATED قسم کی اور انگریزی میں تھیں لیکن بیشتر پولیس کی قومی زبان میں تھیں۔

"یو بلڈی سوائن۔ بکواس کررہا ہے اتنی دیر سے۔ میرے سامنے بھونکتا جارہا ہے۔ کیا ہے تو۔ میں تیری یہ کرکے۔۔۔ وہ کردوں گا۔ تو کیا مجھے۔۔۔ سمجھتا ہے۔۔۔ وہ۔ وکیل اور وہ۔ جرنلسٹ کی۔ وہ جانتے نہیں کہ خورشید کیانی کیا چیز ہے۔۔۔ سب کی۔۔۔ وہ تیرے ساتھی نہیں تو تم سب قبرستان میں ایک ساتھ کیا کررہے تھے۔ تو وہاں۔۔۔ گیا تھا؟"

میں اس کی ساری بکواس اور مار برداشت کرتا رہا کیونکہ میرے پلان پر عمل درآمد کے لیے وہ جگہ قطعی نامناسب تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد از جلد مجھے اس تھانے سے کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کردیں گے جہاں کسی وکیل یا صحافی کی مداخلت کا امکان ہی نہ ہو۔ دو چار دن تو عدالتی کارروائی کو اور افسران بالا کے امکانات کو ٹال کے بھی گزارے جاسکتے ہیں۔ ایک معمولی ایس ایچ او عدالت عالیہ کے طلب کرنے پر حاضر نہیں ہوتا اور سمن کو ذرا اہمیت نہیں دیتا۔ جب قابل ضمانت اور ناقابل ضمانت وارنٹ کی نوبت آجائے تو افسران بالا بھی کہتے ہیں کہ بس اب ایک بار حاضری دے کے عدالت میں کچھ بھی کہہ دو۔ غیر مشروط معافی مانگ لو اور بات ختم۔ چھ مہینے سال کی چھٹی۔ بندہ غائب ہوجاتا ہے اور عدالت عالیہ میں مختلف ایجنسیوں کے نمائندے حلف نامے داخل کرتے رہتے ہیں کہ بندہ ہماری تحویل میں نہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل سے اٹارنی جنرل تک یہاں تک کہ سیکریٹری داخلہ اور وزیر داخلہ کو خبر نہیں ہوتی۔

یہ سب میرے ساتھ بھی ہوسکتا تھا۔ پولیس کے اپنے ذاتی ٹارچر سیل اور قید خانے ہیں۔ وہ مجھے کہیں بھی شفٹ کرسکتے تھے پھر سارا پریس دہائی دیتا رہے اور بڑے بڑے وکیل عدالتوں میں درخواست لگاتے پھریں۔ خود افسران بالا اپنی اتھارٹی پر کسی اور کا رعب پسند نہیں کرتے اور کسی عدالت کا اختیار نہیں مانتے چنانچہ ماتحتوں کو شہ ملتی ہے کہ ہمارے بیانات پر مت جاؤ۔ ہم جو پریس اور پبلک کے سامنے کہیں گے وہ سیاسی بیان ہوگا۔ تم اپنا کام کرو بے فکری سے۔ یہ ملک پولیس اسٹیٹ ہے اور رہے گا۔

افسر اعلیٰ کی چیخ پکار پر دوبدست نچلے درجے کے ماتحت فوراً نمودار ہوگئے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے ڈائریکٹ آنے والے افسر کے طریقہ تفتیش کا جائزہ لیا پھر ایک نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں "سر جی آپ کیوں زحمت کرتے ہو۔ ہم سے فرمائیں۔"

کیانی کا غصے اور مشقت کے باعث سانس پھول گیا تھا "لے جاؤ اسے مگر یہاں نہیں رکھنا ہے۔ انچارج صاحب کو بولو کہ اس سے اپنی جگہ پر تفتیش کرنی ہے۔"

"یس سر۔" ان میں سے ایک نے مجھے بالوں سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"ادھر آجائیں گے اس کے حمایتی۔ اب کوئی بھی آئے کہہ دو کہ اس بندے کو ہم نے چھوڑ دیا۔ فون کرے کوئی تو ٹرخادو۔ ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں گیا۔"

"جیسا حکم جناب عالی۔"

"اور دیکھو۔ مجھے بتادینا کہ اسے کہاں رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک رب نواز صاحب اس سے خود کچھ پوچھنا چاہیں۔"

اب میں تھانے والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ عام آدمی کے لیے ڈی ایس پی کا فرمان ایک دہشت ناک اور لرزہ خیز حکم تھا۔ اجازت نامہ تھا کہ اب وہ بلا روک ٹوک اور سارے اندیشوں سے بے نیاز ہو کے مجھ پر مشق ستم کے سارے ارمان نکال سکتے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن میں نے سب پہلے ہی سوچ لیا تھا اور یہ سب کچھ میری توقعات اور پلاننگ کے مطابق ہورہا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں میری رخصتی کے انتظامات کو قطعی شکل دی گئی۔ یہ طے ہوا کہ مجھے کہاں لے جایا جائے گا۔ حفاظتی دستے میں کون شامل ہوگا۔ یہ کسی سینئر سرجن کے خصوصی آپریشن کی طرح کی تیاری ہوتی ہے کہ آپریشن تھیٹر کون سا ہوگا اور وہاں سرجری میں جونیئر ڈاکٹر کون ہوں گے۔ نرس اور ہیلپر کسے رکھا جائے گا۔

بالآخر ایک ٹیکسی لائی گئی اور مجھے ہتھکڑی لگا کے دو سپاہی یوں باہر لائے کہ ہتھکڑی کی فولادی زنجیر کا دوسرا سرا ایک کی بیلٹ کے ساتھ منسلک تھا اور دوسرا مجھ سے دو قدم پیچھے اسلحہ اٹھائے مجھے گولی مارنے کے لیے کسی بہانے کا منتظر نظر آتا تھا۔ بیگار میں ایک ٹیکسی ہی پکڑی گئی تھی۔ مجھے اس کی پچھلی سیٹ پر بٹھانے کے بعد دونوں محافظ دائیں بائیں دروازوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تیسرا جو تفتیش کا ماہر تھا۔ بعد میں نمودار ہوا اور آگے بیٹھ گیا۔ بلحاظ عہدہ وہ تین قیمتی والا حوالدار تھا جس کے پروموشن آرڈر جاری ہونے والے تھے چنانچہ وہ کسی تھانے دار کی طرح BEHAVE کررہا تھا۔ یہ انکشاف اس نے دوران سفر اپنے ماتحتوں کو امپریس کرنے

کے لیے کیا۔

ٹیکسی چلی تو ایک کانسٹیبل نے ڈرائیور سے کہا "اوئے سگریٹ نکال۔" ڈرائیور نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

آگے تشریف رکھنے والے مستقبل کے تھانے دار نے اسے عاقلانہ مشورہ دیا "تو یار گڈی سائیڈ میں لگا کے ایک ڈبی لے لو۔ بندہ آپ بے شک روٹی بھی نہ کھائے مگر خاطر تواضع تو کرتا ہے مہمان کی۔"

ٹیکسی والا عقل مند تھا۔ وہ اشارہ سمجھ گیا۔ خون کے گھونٹ پی کے اس نے ٹیکسی روکی اور سگریٹ لینے اتر گیا۔ میں صورت سے انتہائی سنگین اور مظلوم ہی نہیں بے وقوف اور بزدل نظر آنے کی کوشش بھی کررہا تھا تاکہ میرے محافظ ایزی رہیں۔ ٹیکسی کا رک جانا بھی میرے حق میں نیک فال ثابت ہوا۔ اب کسی جدوجہد کے نتیجے میں حادثہ ہونے کا امکان بھی نہیں رہا۔

میں نے سر جھکائے ہوئے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ سگریٹ کی فرمائش کرنے والا کچھ فاصلے پر پان سگریٹ کی دکان پر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دوسرے کو اپنا پہلا شکار منتخب کیا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو سگریٹ کا پیکٹ لیتے دیکھا۔ اسے قیمت ادا کرنے اور باقی رقم واپس لے کر ٹیکسی تک آنے میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگتے۔

میرے ہتھکڑی میں بندھے ہوئے ہاتھ اٹھے تو زنجیر کھنکی۔ کانسٹیبل کو میری طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ زنجیر سمیت میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے۔ دو ہاتھوں کی دس انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے مل گئی تھیں۔ یہ زبردست فولادی مکا کانسٹیبل کے چہرے پر بھرپور قوت کے ساتھ پڑا۔ شاید اس کی ضرب سے کانسٹیبل کے دانت اور جبڑوں کی ہڈیاں اور ناک سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں گے۔ وہ اچھل کے پیچھے گیا اور ایک چیخ کے ساتھ آگے آیا مگر میں اس وقت تک دوسرے کانسٹیبل کو نشانہ بنا چکا تھا۔ بدقسمتی سے اس کا سر کھڑکی میں تھا۔ اس کی گردن فریم کے نچلے حصے پر لگی اور سر پیچھے ٹکرایا تو اس نے ایک بھیانک آواز نکالی۔

اس وقت تک پہلا بھی ہاتھوں میں چہرہ تھام کے بلبلانے لگا اور مستقبل کا تھانے دار خطرے کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن کو زنجیر کے حلقے میں لے کر دبالیا۔ یہ گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا جسم سیٹ سے اوپر اٹھ کر نیل کھانے لگا۔ میرے دائیں ہاتھ والا سر کو معلق خیز طریقے پر کھڑکی میں رکھے سو رہا تھا۔ سر یا گردن کی چوٹ نے اسے ہوش سے بیگانہ کرکے تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ مرگیا ہو لیکن تصدیق میرے لیے غیر اہم تھی۔

جو کانسٹیبل ہوش میں تھا اس کی گن بھی نیچے گر گئی تھی اور میں نے اس پر ایک پاؤں رکھ دیا تھا۔ میری گرفت میں پھڑکنے اور کراہنے والا مستقبل کا تھانے دار کوشش کررہا تھا کہ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود ریوالور تک پہنچ جائے مگر اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا اس کا چہرہ میری طرف تھا اور ٹانگیں ڈیش بورڈ کے نیچے کی خالی جگہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا "اگر تو نے وہی نہ کیا جو میں کہہ رہا ہوں۔ تو تیری یہ گردن ٹوٹ جائے گی۔"

"آ۔۔۔ آچھا۔۔۔ اچھا؟" وہ ہانپ کے بولا۔

میں نے غنتے اور مجروح کانسٹیبل کو ٹیکسی کے دروازے سے لگا کے دبادیا تھا اور تقریباً اس کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے قریب آکے اچانک ایک بالکل بدلا ہوا منظر دیکھا تو بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ وہ میرے لیے بڑا فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اگر اس وقت ٹیکسی ڈرائیور پولیس کی مدد کے لیے لوگوں کو متوجہ کرنے کا فیصلہ کرلیتا تو میری ناکامی یقینی ہوجاتی۔ میرے خلاف فرد جرم میں پولیس پارٹی پر حملے اور اقدام قتل کا جرم شامل ہونے کے بعد شاید مجھے جائے واردات پر "پولیس مقابلے" میں مار دیا جاتا۔

لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے جو یقیناً پہلے ہی پولیس سے خوش نہیں تھا پولیس کی مدد نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گھبرا کے کمائی کرنے نکلا تھا کہ پولیس نے ٹیکسی کو پکڑلیا اور جتنی رقم اس کی جیب میں تھی وہ بھی زبردستی سگریٹ منگوانے پر خرچ کرادی۔ وہ پولیس کے ساتھ یہ نیکی کیوں کرتا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے کچھ نہیں دیکھا اور سیدھا آگے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے مستقبل کے تھانے دار سے کہا "اسے کہو گاڑی چلائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گھبراہٹ میں کہا "چلاتا ہوں۔ چلاتا ہوں۔ تم تھانے دار صاحب کی گردن کیوں توڑ رہے ہو۔"

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی ٹشویش کس حد تک جینوئن تھی۔ جب اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے آنکھ ماری تو مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس کی یہ درگت دیکھ کے اسے دلی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ عوام کی اکثریت پولیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اپنا دشمن سمجھتی ہے کیونکہ پولیس کا رویہ کسی کے ساتھ دوستانہ نہیں ہوتا۔ بے چارے عوام بے بس ہیں۔ وہ پولیس کے ساتھ درجواب آں غزل جیسا کوئی ویسا والا سلوک نہیں کرسکتے لیکن موقع ملے تو وہ اپنے جذبات کا ایسے ہی اظہار کرتے ہیں۔

تقریباً ایک فرلانگ دور آکے میں نے کہا "ٹیکسی روک لو۔"

ڈرائیور نے تعمیل کی "او یار دیکھو خیال سے۔ تھانے دار صاحب کا قتل نہ ہو جائے تمہارے ہاتھوں۔ تم مارے جاؤ گے۔"

میں نے گالی دے کے کہا "بکواس بند کر۔ چابی نکال اس کی جیب سے۔"

ڈرائیور نے کچھ تذبذب کی اداکاری کی "تم ایک مجرم ہو۔ میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔"

"مدد کے بچے!" میں نے دہاڑ کے کہا "کیا میں توڑ دوں اس کی گردن؟ تو اسے مروانا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم تو بھاگ جاؤ گے۔ میں پکڑا جاؤں گا قتل کے الزام میں۔ میں چابی نکالتا ہوں۔" اس نے بے بس حوالدار کی وردی کی جیب کھنگالتے ہوئے کہا "خدا کے لیے کسی کی جان مت لو۔ میں اسی لیے تمہاری بات مان رہا ہوں۔"

میں نے چابی اس کے ہاتھ میں دیکھی تو میرا دل خوشی سے اچھلا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے زیرلب کہا "میرے مولا۔ کی پے گیا رولا....." اور چابی کو ہتھکڑی کے تالے میں گھما دیا۔ ایک دم میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔

میں نے چیختے چلاتے اور میرے نیچے سے نکلنے کی کوشش کرتے پولیس کانسٹیبل کو ذرا سی دیر کے لیے آزاد کیا۔ وہ سخت اذیت میں تھا۔ خون اس کی ناک سے دھارے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے ٹپک رہا تھا۔ میں نے مستقبل کے تھانے دار کو ایک بازو کی گرفت میں رکھا اور کانسٹیبل کو صحیح جگہ پر ایک ہاتھ مار کے خاموش کردیا۔ وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں ڈھیلا پڑ گیا۔ میرے بائیں ہاتھ والا پہلے ہی چپ تھا۔ اب اس کا سر کھڑکی سے نکل کے سیٹ سے ٹک گیا تھا۔

"ٹیکسی آگے بڑھاؤ۔" میں نے حکم دیا اور ڈرائیور نے بظاہر مجبوراً مگر درحقیقت خوشی خوشی ایسا کیا۔ اس کی نظر میں میرے لیے پُرستائش جذبات تھے۔

حوالدار صاحب کی حالت بہت غیر تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں اور زبان باہر آگئی تھی۔ وہ حلق سے ناقابل فہم قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے مچل رہا تھا۔ ہاتھوں کو دھڑا دھڑ گاڑی کے فرش پر مار رہا تھا اور ہاتھ ہوا میں چلا رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ناک آؤٹ کیا اور چھوڑ دیا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور پر گرا۔ ٹیکسی تھوڑا سا لہرائی اور سڑک سے اتر گئی۔ اسٹیئرنگ سنبھال کے ہوشیار ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دھکیلا "او چل پرا۔ مصیبت۔"

میں نے کہا "مجھے اتار کے تم ان تینوں کو کسی تھانے پہنچا دینا۔"

"میں....؟ یہ ٹوٹا پھوٹا سرکاری مال تھانے لے جاؤں....؟"

"تم پر آنچ نہیں آسکتی۔ تم نے انہیں بچانے کے لیے سب کچھ کیا جو تم کرسکتے تھے۔"

"تم نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈاکا ڈالا تھا؟"

"اگر آج رات میں ان کا مہمان رہتا تو صبح تک چور ڈاکو قاتل سب کچھ بن جاتا۔ بنا دیا جاتا۔ میں اعترافِ جرم بھی کرلیتا مگر ابھی تک پرچا بھی نہیں کاٹا گیا ہے میرے خلاف اور انہیں میرا نام تک نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"کیا ایسے ہی پکڑا گیا تھا تمہیں۔ راہ چلتے۔"

"یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ اصل مجرم یہ خود ہوتے ہیں یا ان کے پالے ہوئے۔ اب تم ٹیکسی یہاں روک لو۔"

ٹیکسی رک گئی تو میں نے کہا "میں کچھ بھی لے کر نہیں جارہا ہوں۔ نہ سرکاری اسلحہ اور نہ مال۔ تم چاہو تو مال اپنے قبضے میں کرلینا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ان کا پیسہ مجھے راس نہیں آئے گا۔ تم کو ضرورت ہوگی۔ تم لے جاؤ۔ کہاں جانا ہے تمہیں۔"

میں نے کہا "ریلوے اسٹیشن۔ جو گاڑی جارہی ہوگی اسی میں بیٹھ کے شہر سے نکل جاؤں گا۔ تم تھانے میں جھوٹ بالکل مت بولنا۔ جو دیکھا یا سنا سب بتا دینا۔ اس سے تمہاری پوزیشن بہت محفوظ ہو جائے گی۔"

اس نے کہا "چلو میں چھوڑ دوں تمہیں اسٹیشن....."

میں نے کہا "نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"احسان کیسا؟"

"تم چاہتے تو پبلک کو اکٹھا کرسکتے تھے شور مچا کے۔ میں پھنس جاتا۔" میں نے تلاشی کے دوران میں سب کے بٹوے

نکال لیے۔

وہ عیاری سے بولا "مجھے تو گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پتا چلا کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ ویسے تم نے کمال کردیا۔ ایسے سین تو میں نے صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ کیا تم جوڈو شوڈو جانتے ہو۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور نیچے اتر گیا۔ ٹیکسی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بہت بڑی مشکل میں پڑنے سے بچ گیا۔ اگر پولیس کو موقع ملتا تو وہ مجھے شناخت کرنے والے ایک سو ایک گواہ حاضر کردیتی۔ سب سے بہتر گواہ ہی ملک رب نواز کی ہوتی۔ اس کی فیملی کے ہر ممبر کی ہوتی مگر ایک معمولی سے اتفاق نے مجھے بچا لیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ شبنم نے یا سونی نے ایک بار بھی مجھے نام سے نہیں پکارا تھا۔ میرے دشمن مجھے پہچانتے تھے مگر میرا نام نہیں جانتے تھے۔

ابھی رات کے صرف دس بجے تھے۔ مال اور میکلوڈ جیسی سڑکوں پر اس وقت بھی ٹریفک کا رش ہوگا یا پھر ان علاقوں میں جہاں لوگ رات گئے تک کھانے پینے کے لیے آتے رہتے تھے۔ بازار اور کاروباری ادارے بند ہو گئے تھے لیکن ہوٹل ریسٹورنٹ پوری طرح آباد تھے۔

تھانے میں ہونے والے سلوک کے باعث میرا پیدل چلنا مشکل ہو گیا تھا مگر میں اس لیے دکانیں دیکھتا جارہا تھا کہ شاید کہیں سے مجھے بدلنے کے لیے نئے کپڑے مل جائیں۔ ابھی تک کوئی خالی ٹیکسی بھی میرے قریب سے نہیں گزری تھی۔ بالآخر شباب اسٹوڈیو کے سامنے ایک رکشے میں بیٹھ گیا۔ ریلوے اسٹیشن تک جھٹکوں اور ہچکولوں کے باوجود میں تینوں بٹوے خالی کرنے میں کامیاب رہا۔ اندازاً یہ دس بارہ ہزار روپے تھے جو ان کم تنخواہ والے پولیس مینوں کی اوقات سے بہت زیادہ تھے۔

راولپنڈی جانے والی خیبر میل لیٹ آئی تھی اور ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے بکنگ آفس سے رجوع کیا۔ مجھے پشاور کی ایک برتھ چاہیے۔

بیزار کلرک مجھ پر طنز سے مسکرایا "کون سی دنیا میں رہتے ہو صوفی صاحب۔ اس وقت برتھ دے گا قلی۔ ٹرائی کرلو۔"

یہ بات میں جانتا تھا مگر میں بکنگ کلرک کو گواہ بنانا چاہتا تھا "میں دیکھ لیتا ہوں کوشش کرکے۔" میں نے چلتے چلتے مایوسی سے کہا اور پھر جھک کے بٹوے کو اٹھایا "یہ کس کا گرا ہے؟" میں نے بکنگ کلرک کے سامنے اسے کھولا۔

بکنگ کلرک کی نظریں لالچ سے چمکنے لگیں "ادھر لاؤ۔"

میں نے پرس میں دیکھا "یہ تو کسی پولیس والے کا ہے۔ چلو آپ دے دینا یہاں کسی پولیس کے بندے کو۔"

دوسرا پرس میں نے ایک قلی کو دیا جس نے مجھے پشاور کی برتھ دلوانے میں مدد کی تھی۔ تیسرا میں نے ایک بینچ پر چھوڑ دیا جہاں ایک کانسٹیبل اونگھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ مالکوں تک پہنچ جائیں گے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلا بٹوا بکنگ کلرک کے پاس چھوڑنے والا کوئی صوفی تھا جو آخری وقت میں پشاور جانے والی خیبر میل میں برتھ کی ریزرویشن مانگ رہا تھا۔ بکنگ کلرک میرا حلیہ بھی بتا دے گا اور اس کے بیان کی تصدیق قلی کردے گا جس سے میں نے برتھ خریدی تھی۔ اصل برتھ اس کے فرضی نام پر خالی جارہی تھی۔ یہ غیر اہم تھا۔ پولیس کو ثبوت شہادت سے معلوم ہو جائے گا کہ مفرور مجرم پشاور جانے والی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ راستے کے سارے اسٹیشنوں پر تلاش کی رسمی کارروائی ضرور کریں گے اور شاید پشاور اور اسلام آباد کی پولیس کو دیگر تفصیلات بھی فراہم کردیں گے۔ پولیس کو بے وقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ چالاک ملزم انہیں غلط راستے پر ڈال کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر آکے میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے اور کہاں جانا چاہئے۔ بے شک اب تک ٹیکسی ڈرائیور نے میرے ساتھ جانے والے دو محافظوں اور ایک ماہر تفتیش کو بے ہوشی کی کیفیت میں تھانے پہنچا دیا ہوگا اور سمجھ داری سے کام لیا ہوگا تو تھانے کے آس پاس ہی کہیں ڈراپ کردیا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے بعد بہت سنسنی پھیلی ہوگی اور اس واردات کی اطلاع ایس ایچ او صاحب کو سب سے پہلے دی گئی ہوگی۔ کچھ دیر میں ڈی ایس پی خورشید کیانی کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ نااہل لوگوں نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ تینوں بھرپور غفلت کے مرتکب پولیس والوں کو پہلے اسپتال پہنچایا جائے گا اور ہوش میں آتے ہی انہیں سب سے پہلے معطلی کی خوش خبری دی جائے گی۔ ممکن ہے بے بسی کا غصہ اتارنے کے لئے کیانی ان کے خلاف زیادہ سخت قدم اٹھائے مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جگہ وہ خود تھانہ انچارج بھی ہوتے تو انجام یہی ہوتا۔

تاہم میری دوبارہ گرفتاری کے لئے پورے جوش و خروش کے ساتھ مہم صبح سے پہلے شروع نہیں ہوگی۔ ایک نئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دی جائے گی جو ہر ممکن جگہ چھاپے مارے گی اور مفرور ملزم سے تعلق کے شبے میں ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب لوگوں سے پوچھ گچھ کرے گی جو گزشتہ شب قبرستان میں چراغ علی ولد باغ علی کے ساتھ تھے۔ رئیس اور شبنم۔ رخشی اور فرید عباسی کے نام ملزم سے تعلق رکھنے والوں میں سرفہرست تھے۔ کمال فاروقی اور جیرا بلیڈ میری گرفتاری سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اگر یہ سب عام لوگ ہوتے تو پولیس انہیں راتوں رات اٹھا لیتی اور صبح تک مار مار کے ان سے پوچھتی کہ بتاؤ تم نے ملزم کو کیسے فرار کرایا اور کہاں چھپا کے رکھا ہے لیکن کسی واضح ثبوت کے بغیر پولیس ان کے خلاف محض شبے کی بنا پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب قانون کو جاننے اور سمجھنے والے باشعور اور معزز شہری تھے۔

مجھے اندازہ تھا کہ میری گرفتاری سے سب لوگ کتنے پریشان ہوں گے۔ یہ سب بالکل اچانک اور غیر متوقع انداز میں ہوا تھا۔ رب نواز کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر پولیس نے قبرستان پر چھاپا مارا تھا اور مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ یہ کہنا غلط ہوتا کہ شبنم اور فرید عباسی کی وجہ سے میں مصیبت میں پڑا۔ انہوں نے فوری طور پر وہ کیا جو انہیں صحیح لگا لیکن ان کے مقابلے پر شاطر سیاست داں کا دماغ رکھنے والا ڈی ایس پی خورشید کیانی تھا جس نے ان کی ہر چال کو ناکام بنا کے بازی پلٹ دی۔

شاید بعد میں وہ پچھتائے ہوں کہ انہوں نے مجھ سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی غلطی کیوں کی۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ شبنم مجھے اپنا وہی شوفرمان لیتی جس کی مجرمانہ کارروائیوں کے بارے میں پولیس کو رب نواز نے مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں جو فرید عباسی اپنی پوری صلاحیت بروئے کار لا کے میرے دفاع کی قانونی جنگ کر سکتا تھا اور شبنم اپنے تعلقات کے اثر و رسوخ کو میری ضمانت اور رہائی کے لئے بے خوفی سے استعمال کر سکتی تھی لیکن ایسی صورت میں مجرم صرف چراغ علی ولد باغ علی نہ رہتا۔ وہ سب بھی برابر کے شریک جرم قرار دیے جاتے اور خورشید کیانی بالآخر ثابت کر دیتا کہ ہم سب معزز کہلانے والے لوگ درحقیقت ایک جرائم پیشہ اور دہشت گرد گروہ کے ارکان ہیں۔

غلط محسوس ہونے کے باوجود میرے ساتھیوں کی حکمتِ عملی کے صحیح نتائج برآمد ہوئے تھے۔ انت بھلا سو بھلا۔ اب مجرم صرف میں تھا اور باقی لوگ اس لئے محفوظ تھے کہ وہ میرے نام سے بھی ناآشنائی کا اعتراف اور اعلان کر چکے تھے۔ تاہم میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس صورتِ حال میں ان کے لئے پریشانی سے زیادہ پشیمانی کے خیالات کا عذاب ہوگا۔

وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے بچانے کے لئے وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ وہ صرف سوچ ہی نہیں رہے ہوں گے۔ انہوں نے میری مدد کرنے کے لئے مشورے اور رابطے جاری رکھے ہوں گے۔

مگر ان کے اضطراب، عذاب اور مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن کا اجالا یقیناً ہوگا۔ تھا۔ میں میرا رویہ اچانک بدلا تھا۔ میں ان سے لاتعلق یا بدگمان نہیں تھا۔ میں نے کچھ اور سوچ کے ان سب کو رخصت ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاید میں خود کچھ کرنا چاہتا تھا۔ روز و شب کی مسلسل رفاقت نے ہم سب کے درمیان ذہن اور فکر کی یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔ شاید وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اپنی مدد آپ کے اصول پر کیسے عمل کروں گا اور اب بڑی بے چینی سے میری خیر و عافیت کے ساتھ واپسی کے انتظار میں ہوں گے۔

میں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ان کے پاس جا سکتا تھا مگر میں فی الحال ایکسپوزنٹ کا رسک بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس میرے پہنچنے تک رئیس خانے کا محاصرہ کر لے اور آس پاس کی گلیوں میں بھی پھیل جائے۔ وہ رئیس خانے کا فون ٹیپ کر سکتے تھے یا کاٹ سکتے تھے اور آزاد صاحب کی آزادیٔ صحافت کی ایسی تیسی کرتے ہوئے اخبار کے دفتر میں بھی گھس کے بیٹھ سکتے ہیں۔ جب صحافی احتجاج کریں گے تو انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ عہدے دار یا وزارت داخلہ کا افسران سے معافی بھی مانگ لے گا۔

چنانچہ آزاد صاحب کے آفس جانا بھی کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوتی۔ کسی سے فون پر بات کرنے میں بھی خطرہ تھا لیکن اپنے ساتھیوں کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ میں آزاد اور محفوظ ہوں۔ تاکہ ان کا فکر و تردد ختم ہو۔ اس کے بعد جب مل کر بیٹھیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

بہت سوچ سمجھ کے میں نے ایک پی سی او سے رئیس خانے کا فون نمبر ملایا۔ وہ سب غالباً فون ہی سے لگے بیٹھے تھے۔ ریسیور اٹھانے والی شبنم تھی۔ وہ اپنے لہجے سے اتنی نروس اور EXCITED لگتی تھی کہ فوراً میری آواز سنتے ہی چیخ پڑی۔ "وہ ہیلو ہیلو" چلاتی رہی اور میں نے فون بند کر دیا۔ پی سی او والے نے مجھے یاد دلایا کہ رانگ نمبر کی کال بھی چارج ہوتی ہے۔ دوسری بار فون اٹھانے والی پھر شبنم تھی۔ شاید وہ فون پر قبضہ کیے بیٹھی تھی یا سب سے پہلے جھپٹ پڑتی تھی۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار میں نے فرید کی آواز

سنی۔

اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "بھئی خالہ غفورن کا گھر ہے نا یہ۔ ہم لندن میاں بول رہے ہیں۔"

میں نے کچھ سنا تو نہیں مگر تصور میں فرید کے چہرے پر پھیل جانے والی خوشی اور اطمینان کی مسکراہٹ ضرور دیکھی جس نے ایک ساتھ شبنم، رئیس اور رخشی کو یہ خوش خبری سنا دی ہوگی کہ میں خیر و عافیت کے ساتھ پولیس کی تحویل سے نکل آیا ہوں۔

فرید نے ہنس کے کہا "رانگ نمبر!" جو بے حد عقلمندی اور دور اندیشی کی بات تھی۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ میرا نام لے کر کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر فون لائن پر کوئی اور یہ گفتگو سن رہا ہوگا، جس کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ تو وہ اسے واقعی رانگ کال سمجھ کے نظرانداز کر دے گا۔

میں نے پھر نمبر ملایا اور کہا "بھئی یہ کیا ہے۔ ہم بتانا چاہتے تھے کہ ہمارا قیام اس یتیم خانے میں رہے گا۔"

فرید نے کہا "دیکھئے، یہ خالہ غفورن کا گھر نہیں ہے۔"

"کیوں؟ نمبر تو یہی ہے۔ بھئی ہمیں کراچی سے آتے وقت دیا تھا ماموں جان نے" میں نے ایک عدد کے فرق سے نمبر بتایا۔

اس نے پھر فون بند کر دیا "آپ نے غلط نمبر ملایا ہے لندن میاں!"

میں نے پی سی او والے کو پانچ کالوں کے پیسے دیے۔ وہاں میرے علاوہ بھی چار افراد فون پر باتیں کر رہے تھے چنانچہ کسی کو کسی کی بات سننے کی فرصت نہ تھی اور نہ ضرورت۔ میں نے اپنی بات کہہ دی تھی اور فرید نے سمجھ لی تھی۔ اس خیال سے میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اچانک مجھے بھوک محسوس ہوئی اور میں اپنی جسمانی اذیت کو بھول کے ان چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا جو میں کھانا چاہتا تھا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں وہ شاپنگ بیگ اٹھائے رکشے سے اترا۔ یہ سب اپنی مسک سے اشتہا بڑھانے والی بہت سی چیزوں سے بھرے تھے جو میں نے لکشمی چوک سے خریدی تھیں۔ اپنے پرانے آفس تک میں نے آدھے کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر کیسے جاؤں گا۔ میرے پاس اندر باہر کے کسی گیٹ کی چابی نہیں تھی۔ ٹیلی فون پر فرید کو یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ چابیاں بریف کیس میں ہیں اور بریف کیس الماری میں۔ یہ بات شبنم بھی جانتی تھی اور میرے اندازے کے مطابق رئیس کو بھی معلوم تھا۔ وہ میرے پیغام کو سمجھ گئے ہوں گے تو چابیاں بھی ساتھ لائیں گے مگر ان کے آنے تک میں بیگ اٹھائے سڑک پر کھڑا رہا تو مشکوک نظر آؤں گا۔

یہ دس کنال سے زیادہ جگہ تھی جہاں کبھی میری کنسٹرکشن کمپنی کا دفتر بھی تھا اور میری رہائش بھی تھی۔ اس کے آخری حصے میں قمر اپنا بوتیک چلاتی تھی جو بعد میں گردشِ حالات کے باعث بند ہو گیا تھا۔ یہ ساری جگہ بہت عرصے تک متنازعہ اور کورٹ کی تحویل میں رہی پھر مقدمہ میرے حق میں فیصل ہو گیا اور میں نے یہاں ایک ملٹی اسٹوری شاپنگ پلازا پلان کیا۔ اس کا ڈیزائن اور نقشہ بھی منظور ہو گیا تھا اور کام شروع کرنے کے لئے اسٹاف کا انتخاب بھی ہو گیا تھا کہ اچانک ناصر عظیم نہ رہا۔ زیادہ مناسب یہ کہنا ہوگا کہ شاہ عالم نہ رہا اور ناصر عظیم کو اس کا ڈبل رول کرنا پڑا۔ اس کے دوبارہ ناصر عظیم بننے تک سب کچھ بدل گیا۔ پرانے رشتے، پرانے خواب، پرانے منصوبے۔ سب پر وقت کی اتنی گرد پڑ گئی تھی کہ اپنی اصل صورت میں کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

میں نے دوبارہ اپنی پہلی زندگی کا سفر نئے حالات میں شروع کیا تو شاپنگ پلازا کا پلان بھی ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ میں نے ایک مثالی قسم کا یتیم خانہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جہاں کچھ خوش قسمت یتیم بچوں کو رہنے کے لئے اچھا ماحول، عزت اور خود اعتمادی کا احساس اور اعلیٰ تعلیم کے سب مواقع حاصل ہوں۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی ختم ہو چکا تھا مگر میرا کروڑوں کا سرمایہ بینکوں میں محفوظ تھا۔ اس میں سے کچھ میں نے کمال اسپتال کے لئے وقف کر دیا تھا اور کچھ اس یتیم خانے کے پروجیکٹ کے لئے۔ یہ سب کر کے بھی میرے پاس اتنا بچتا تھا کہ میں ساری عمر کچھ نہ کروں تب بھی آرام سے زندگی گزار سکوں۔

یتیم خانے کے بارے میں رئیس شروع سے سب کچھ جانتا تھا اور اس منصوبے میں وہ جذبات کی پوری شدت کے ساتھ میرے ساتھ تھا لیکن میں نے شبنم کو بھی پوری طرح شریک کر لیا تھا۔ میں نے اسے یہ جگہ بھی دکھائی تھی اور اپنے ماضی کے گم گشتہ اوراق سے میں نے جو کہانی اسے سنائی تھی، اس میں میری یتیم خانے کی زندگی کا تکملہ بھی تھا اور میرے منصوبوں کا تذکرہ بھی تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ ایک مثالی یتیم خانہ میرا مقصدِ حیات اور ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر میرا OBSESSION بن گئی تھی۔ ساتھ رہنے سے رخشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور فرید بھی سب جان گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے یتیم خانے کا حوالہ دیا تو کسی دشواری کے بغیر فرید نے بھی سمجھ لیا کہ میں انہیں کہاں ملوں گا۔

دس فٹ اونچی فصیل میں لگا ہوا آٹھ فٹ اونچا فولادی گیٹ بند تھا۔ اس کی چوڑائی سولہ فٹ تھی اور اس میں سے بڑا ٹرک بھی آسانی سے گزر جاتا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کے لئے بڑے گیٹ کے ایک پٹ میں تین فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا چھوٹا گیٹ تھا جو اندر سے بند رہتا تھا۔ کسی کو موجود نہ پا کے مجھے مایوسی ہوئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں گیٹ پر چڑھ کے اندر اتر جاؤں۔ دیوار سپاٹ اور زیادہ اونچی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ میرے ہاتھ میں دو تھیلے تھے جو باہر نہیں چھوڑے جا سکتے تھے۔ انہیں گیٹ کے اوپر سے اندر اچھالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اس احاطے کا بڑا گیٹ اس سڑک پر تھا جہاں تعمیراتی کام میں استعمال ہونے والے سامان' الیکٹرک اور سینٹری فٹنگ' پینٹ' ٹائلز اور شیشے وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ کچھ چھوٹے انڈسٹریل یونٹ تھے جہاں لکڑی اور جست کی چادر کی کھڑکیاں دروازے بنتے تھے اور بڑی بڑی چٹانوں سے ہر سائز کے ماربل ٹائل کاٹے جاتے تھے۔ راج مزدور' الیکٹریشن' رنگ وروغن کرنے والے اور پلمبر یہاں صبح دم یلغار کرتے تھے چنانچہ یہاں کاروبار صبح صبح شروع ہوتا تھا۔ سیل دن بھر جاری رہتی تھی مگر شام کے بعد گاہک نہیں آتے تھے چنانچہ آٹھ بجے تک سارا علاقہ سنسان ہو جاتا تھا اور سڑک پر سے وہی گاڑیاں گزرتی تھیں جن کو آگے جانا ہوتا تھا۔

دوسرا گیٹ سائڈ روڈ پر تھا مگر وہاں قمر کے بوتیک کا بڑے بڑے شیشوں والا ہال تعمیر ہو گیا تھا۔ اب یہ ہال خالی اور سنسان پڑا تھا۔ اس کا ایک شیشہ پتھر لگنے سے چٹخ گیا تھا تو اسے گرنے سے بچانے کے لیے اس پر ٹیپ سے مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ باقی شیشے گرد سے دھندلا گئے تھے۔ جو فرش کبھی اندر سے شیشے کی طرح چمکتا تھا اس پر بھی دھول جم گئی تھی۔ یتیم خانے کی تعمیر کا آغاز ہونے سے پہلے اس کا گرایا جانا لازمی تھا۔ عمارتیں گرانے والے کام کی ہر چیز کو نکال سکتے تھے مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کا کوئی مصرف نہیں تھا۔

میں نے اسی کو راستے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیشے کے زخموں پر لگایا جانے والا ٹیپ بھی بہت پرانا ہو گیا تھا۔ اگر میں اسے اپنے ہاتھوں سے دھکا دیتا تو شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے الگ ہو کے مجھ پر آ گرتے۔ میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر پڑی ہوئی آدھی اینٹ اٹھائی اور آہستہ سے شیشے پر پھینک دی۔ ایک معمولی سا دھماکا ہوا اور سات فٹ اونچا چار فٹ چوڑا شیشہ ٹوٹ کے فرش پر بکھر گیا۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز مجھے بم کے دھماکے جیسی لگی مگر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی یا اسے کسی نے اہمیت نہیں دی۔ میں قلعے کی فصیل میں تجنیق سے راستہ بنانے والے کمانڈر کی طرح دروازے کے خلا سے گزر گیا۔ بوتیک کے بعد دو کمروں پر مشتمل میرا اور قمر کا آفس تھا۔ پھر میرا دو کمروں کا رہائشی یونٹ تھا جس میں ایک بیڈ روم کے ساتھ ڈرائنگ روم' کچن اور باتھ شامل تھے۔

میں اندر سے ملے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے راستے اپنے آفس اور پھر رہائشی یونٹ میں پہنچ گیا۔ آفس کا حال بھی تباہ تھا مگر اپنی پرانی رہائش گاہ کو دیکھ کے مجھے دکھ ہوا۔ وہ سب چیزیں جو میں بڑے شوق سے استعمال کرتا تھا' عدم توجہی سے غارت ہو کے رہ گئی تھیں۔ ٹیلی وژن' ڈش ریسیور' وی سی آر' سب کباڑی کا سامان نظر آتے تھے۔ میرے شوق سے جمع کیے جانے والے میوزک کے کیسٹ اور میری کتابیں کس مپرسی کا شکار تھیں۔ میں نے ریسیور اٹھا کے دیکھا۔ فون ڈیڈ تھا۔ عدم ادائیگی پر اسے نہ جانے کب بند کیا گیا ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر لائٹ تھی۔ بجلی کا کنکشن کاٹا نہیں گیا تھا۔

اس جگہ کی صفائی ایک بہت مشکل کام تھا جسے صرف خواتین ہینڈل کر سکتی تھیں۔ اس وقت وہاں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بیڈ پر سے چادر ہٹائی اور تمام گرد و غبار کے ساتھ سمیٹ دی۔ نیچے بیڈ پر بھی چھنی ہوئی دھول تھی مگر میں نے اسے بھی آہستہ آہستہ اٹھایا اور پلٹ دیا۔ نیچے والا حصہ بالکل صاف تھا۔ میں نے کھانے کے بنڈل اس پر رکھ دیے۔ پھر فریج کھول کے دیکھا۔ اس میں سے ایسی بو آئی جیسی دھوپ میں کچرا خانے سے اٹھتی ہے۔ میں نے فوراً بند کر دیا۔ مناسب صفائی کے بغیر اسے بھی نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ پھر مجھے اے سی کا خیال آیا۔ میں نے اس کا بٹن آن کیا اور تین منٹ بعد کمپریسر چلا دیا۔

فرید عباسی سے بات ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اگر اس نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا تھا تو اب تک ان سب کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سب میری خوش فہمی ہو۔ فرید نے لندن میاں کی کال کو سچ مچ رانگ نمبر کی کال ہی سمجھا ہو۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ گیٹ پر کھڑے رہ کر انتظار میں وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ لائٹ دیکھتے ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار

آ گیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور اسی وقت کسی کار کی گھومتی ہیڈ لائٹس نے ایک لمحے کے لیے شیشوں کو روشن کیا۔ پھر انجن غرا کے بند ہوا اور گاڑی کے دروازے دھڑدھڑا مارے گئے۔

میں نے تھوڑی سی تفریح کے لیے شاپنگ بیگ چھپائے اور خود اپنی پرانی وارڈروب میں بند ہو گیا۔ میرے کانوں نے ان سب کی جذباتی باتیں سنیں۔ پہلی آواز شبنم کی تھی جس نے پکار کے میرا نام لیا "ناصر!" پھر وہ قریب آ کے پریشانی سے آوازیں دینے لگی "ناصر... کہاں ہو تم؟" دوسری آواز رئیس کی تھی۔ اس نے بھی پکار کے کہا "ناصر' ابے ہم آ گئے۔"

فرید نے کہا "وہ ہے کہاں جو آوازیں دے رہے ہو؟"

رخشی نے کہا "ہاں۔ وہ آیا بھی ہے کہ نہیں؟"

شبنم نے تیز لہجے میں کہا "لائٹس جو جل رہی ہیں۔ اور اے سی چل رہا ہے۔"

رئیس نے بھی کہا "یہ دیکھو' بیڈ کی چادر سمیٹی گئی ہے۔"

"اور بیڈ الٹا گیا ہے" شبنم بولی "رئیس' تم باہر دیکھو۔"

اگلے پانچ منٹ تک میں ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتا رہا مگر رفتہ رفتہ ایک الماری میں بند رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کھیل زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

رئیس بولا "وہ آ کے کہیں گیا ہوگا۔"

"کہاں گیا ہوگا؟" شبنم کے لہجے میں اب پریشانی بہت عیاں تھی۔

"کیا پتا ہمیں پھر فون کرنے گیا ہو" فرید نے اسے تسلی دی "ہمیں آنے میں بہت دیر ہو گئی۔"

"اتنی زیادہ دیر بھی نہیں لگی' پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔ نکلنے میں بھی وقت لگا" رخشی بولی "ایسے منہ اٹھا کے کیسے آ جاتے۔"

شبنم نے کہا "رئیس' تم پتا کرو۔"

"کیا؟ میں کہاں سے پتا کروں؟ اگر وہ آواز اسی کی تھی اور فرید نے ٹھیک سمجھا تھا۔"

"یار خدا کرتے ہو تم بھی" فرید بگڑ گیا۔ "کیا میں ناصر کی آواز پہچاننے میں غلطی کر سکتا ہوں۔ اور مطمئن خود تم نے بھی یہی سمجھا تھا۔"

"کہیں سے یہاں آنے کے بعد تو کچھ نہیں ہوا ناصر کے ساتھ؟" شبنم نے بالآخر اپنے خوف کا اظہار کر دیا۔

فرید نے اسے تسلی دی "اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ بے وقوف ہے اور نہ کسی کے قابو آنے والا۔"

رئیس بولا "سالا کہیں پریشان نہ کر رہا ہو ہمیں۔ چھپ گیا ہو؟"

ایک منٹ بعد اس نے وارڈروب کا دروازہ کھولا اور میں نے پوری بتیسی کی نمائش کی "ہم یہاں تھے' تم پہلے ہی دیکھ لیتے۔"

اس نے ایک گالی دے کے میرے پیٹ میں مکا مارا اور مجھے باہر گھسیٹ لیا۔ "ابے ہم پہچانتے ہیں شہر کے ہر حرامی کی رگ رگ کو" رئیس نے کہا۔

میں نے شبنم کو دیکھا "بڑے افسوس کی بات ہے خاتون۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مجھے کچھ ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔ انسانوں کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ملیریا سے عشق تک۔ بھوتوں کو کیا ہوگا؟" رئیس بولا۔

شبنم کو دیکھ کے صاف لگتا تھا کہ وہ فرط جذبات سے رونے کے قریب ہے اور زبردستی مسکرا رہی ہے "خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔"

"کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ سب کی دعائیں ہیں میرے ساتھ" میں نے کہا "اب پہلے یہ بتاؤ کہ کھانا کھایا ہے تم لوگوں نے؟ باقی باتیں بعد میں۔"

فرید بولا "کیسی فضول بات ہے۔ کھانے کا ہوش کسے تھا۔ سارا دن ویسے ہی نحوست میں گزرا تھا۔"

میں نے کہا "چلو پھر دسترخوان پر" اور بیگ نکال کے بیڈ پر رکھ دیے "کھانا ابھی گرم ہے۔"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "تم لوگ کھاؤ۔ میرا دل نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "کھانا جاتا ہے پیٹ میں۔ دل کی بات مت کر۔ اگر ہمارا کوئی خاندان ہوتا' دوست اقارب یا محلے دار ہوتے تو سوئم تک میت والے گھر میں کھانا پہنچاتے مگر یہاں تو ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے ہم ہی ہیں۔"

فرید نے میری تائید کی "پورا دن کچھ کھائے پیے بغیر دوڑ بھاگ اور پریشانی میں گزر گیا۔ کسی کو خیال تک نہیں آیا کھانے کا مگر زندہ رہنے کے لیے سب ضروری ہے۔"

سب نے اصرار کر کے رئیس کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ تیس مارخان کے ساتھ اس کا تعلق بہت پرانا تھا لیکن جس طرح اس کے ساتھ چھوٹی نے جان دی تھی' اس کا صدمہ سب کو تھا۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا۔ کسی نے بات کرنے کی کوشش بھی کی تو اسے دوسروں نے چپ کرا دیا۔ وہاں کھانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے برتن تھے مگر استعمال کے قابل نہ تھے چنانچہ کھانے کو شاپنگ بیگ پھاڑ کے پھیلا دیا گیا تھا۔ وہاں پینے کے لیے صاف پانی تک نہ تھا۔ فریج میں نہ جانے کتنی پرانی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اوپر والے ٹینک میں بھی مہینوں پرانا پانی تھا۔ میں نے باہر جا کے چیک کیا تو ڈائریکٹ لائن کے ایک نل میں پانی آ رہا تھا۔

شبنم نے فوراً ایک گلاس دھویا "یہ تم پہلے دیکھ لیتے تو کھانے کے لیے برتن ہو جاتے۔"

"کھانا تو خیر کھا لیا ہم نے۔ لیکن اب آپ برتن دھولیں چائے کے لیے۔ کچن میں ہر چیز موجود ہونی چاہیے۔ گیس بھی آ رہی ہوگی ورنہ الیکٹرک کیتلی ہے۔ رخشی تم کچھ جگہ صاف کرلو" میں نے کہا۔

رخشی نے صاف انکار کر دیا۔ "اس وقت صفائی کیسے ہو سکتی ہے۔ اتنی دھول اڑے گی کہ بھوت بن جائیں گے سب۔ بس جتنی جگہ ہے' وہ کافی ہے۔"

شبنم نے اس کی حمایت میں بیان دیا "ورنہ اپنے لیے خود جگہ صاف کرلو۔ بیٹھو یا لیٹو۔"

"تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ ہمیں کون سا یہاں قیام فرمانا ہے" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "کیا پتا اب یہیں رہنا پڑے۔ وہ جگہ بہت غیر محفوظ ہو گئی ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "اپنا بھی یہی خیال ہے' یہ جگہ بری نہیں۔"

"بہت بری جگہ ہے" رخشی نے خفگی سے کہا "آسیب زدہ لگتی ہے' یہاں کیسے رہ سکتے ہیں ہم سب؟"

میں نے کہا "یہ دس کنال سے زیادہ جگہ ہے۔ اور ہم ہیں پانچ افراد۔ ایک کے حصے میں دو کنال کیا کم ہیں۔ رہی آسیب کی بات تو ہم جہاں جاتے ہیں وہاں الو بولنے لگتے ہیں۔"

"جیسے کہ اس وقت بول رہے ہیں" فرید نے کہا۔

رئیس نے اور فرید نے ناک پر رومال رکھ کے گزارے لائق صفائی کی اور صوفوں پر بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ مجھے انہوں نے کچھ نہیں کرنے دیا۔ میری اپنی جسمانی حالت بھی ایسی نہ تھی کہ میں کوئی مشقت کا کام کر سکتا۔ میں بیڈ پر لیٹا رہا۔ رخشی نے کچن میں سے چلا کے پوچھا "گیس کیوں نہیں آ رہی ہے؟" اور پھر خود ہی کہا "آ رہی ہے' نیچے سے والو بند تھا۔"

پھر شبنم نے سوال کیا "دودھ کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ملک پاؤڈر ہوگا ورنہ قہوہ چلے گا۔"

اب رخشی کی باری تھی "چائے کی پتی کہاں ہے؟"

فرید نے بھنا کے کہا "کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ اتنا سا کچن ہے۔ دیکھ لو خود' نہیں تو آ کے بیٹھ جاؤ ادھر۔"

"ہاں' ہم نے صفائی کرنا ہے۔ چائے بھی بنالیں گے۔"

چائے آنے تک رئیس اور فرید کی محنت سے بیڈ روم اس حد تک ضرور صاف ہو گیا تھا کہ وہاں سب آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے دھول بھی نہیں اڑائی تھی مگر ان کے اپنے ہاتھ اور کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ میرے کہنے پر رخشی نے وارڈ روب میں دیکھا اور ایک صاف تولیہ نکال لیا۔

"یہاں تو ہر چیز ہے" رخشی نے کچھ تعریفی انداز میں حیرانی ظاہر کی۔

میں نے کہا "ہاں' جب ناصر عظیم یہاں رہتا تھا تو پوری گھر گرہستی چلاتا تھا۔ اور گھر والی سے زیادہ سگھڑپن کے ساتھ۔"

"اچھا! اور گھر والی کیا کرتی تھی؟" شبنم نے پوچھا۔

"وہ بس میرے خوابوں میں آتی تھی۔ اب یہ مت پوچھنا سب کے سامنے کہ خوابوں میں وہ کیا کرتی تھی؟" میں نے کہا۔

چائے کے لیے دودھ دستیاب نہیں تھا۔ اس سے صرف رئیس اور رخشی کو فرق پڑا۔ انہوں نے یہ زہریلا کڑوا جگر جلانے والا مشروب پینے سے معذرت کر لی۔ "ہمیں کوئی مجبوری نہیں۔ چائے کے بغیر رہ سکتے ہیں ہم۔"

فرید نے کہا "چند تو مجھے بھی نہیں مگر ضرورت ایک مجبوری بن گئی ہے۔"

میں نے اور شبنم نے کالی چائے کو بھی انجوائے کیا۔ ہمیں اس کی عادت تھی۔ پھر میں نے تفصیل کے ساتھ وہ واقعات دہرائے جو پولیس کی تحویل سے میری نجات کا سبب بنے تھے۔ یہ کوئی ایڈونچر اسٹوری نہیں تھی۔ دستِ غیب کی دستگیری اور میری خوش قسمتی کا ایک واقعہ تھا۔ لیکن اس میں مستقبل کے اندیشوں اور خطرات کے سارے امکانات کو دیکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ سننے والے زیادہ فکرمند ہو رہے تھے۔

"یہ ڈی ایس پی خورشید کیانی بڑی خطرناک اور کمینی چیز ہے۔ وہ پوری طرح بکا ہوا ہے ملک رب نواز کے ہاتھوں۔ حکم کے غلام کو بھی کچھ احساس ہوتا ہے عزتِ نفس کا۔ یہ تو اس کے اشارے پر دُم ہلانے والا کتا ہے۔ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ کوئی ثبوت نہیں تھا میرے خلاف۔ لیکن ملک رب نواز نے کہا کہ ایک داڑھی والا ہے اس حلیے کا اور ہر جگہ وہی نظر آتا ہے۔ کبھی شبنم کے ساتھ تو

کبھی سونی کے ساتھ۔ اس کو پکڑو کسی طرح اور کیانی نے بڑا پکا انتظام کر کے مجھے صحیح جگہ پر پکڑ لیا۔ اسے اندازہ تھا کہ مداخلت کس طرف سے ہوگی۔ وہ وارنٹ کے ساتھ آیا تھا۔ قانونی طور پر اس کی پوزیشن محفوظ تھی۔ افسرانِ بالا سے نمٹنا اسے آتا تھا۔ اور اخبار والوں کے کرائم رپورٹرز کو اس نے دلائل سے قائل کر لیا۔"

شبنم نے کہا "برادر نے مجھے سخت مایوس کیا۔"

"معاملہ اگر تمہارا ہوتا تو کچھ اور بات ہوتی۔ چراغ علی ولد باغ علی سے تم نے آشنائی کے رشتے کو بھی تسلیم نہیں کیا تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ میری حمایت کرے۔"

شبنم نے کہا "بس وہی بنیادی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ کیا ضرورت تھی مجھے انکار کرنے کی۔ کس کا ڈر تھا مجھے۔ میں کہہ دیتی کہ ہاں' میرا شوفر ہے۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتا تو شوفر کے بجائے شوہر کہتا" میں بولا۔

"تم تو ضرورت پڑنے پر کسی گدھے کو باپ بنا سکتے ہو" رئیس بولا۔

میں نے کہا "نہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ خود کو الگ رکھا۔ ورنہ میرے فرار ہو جانے کے بعد پولیس تم سب کو پکڑ لیتی کہ بتاؤ' چراغ علی کہاں ہے۔ اب یہ سوال کوئی تم سے نہیں کر سکتا۔"

"اب تک میرے فرار کی خبر نے تھانہ نچارج کی نیند حرام کر رکھی ہوگی۔ اب وہ ڈی ایس پی کو کیا جواب دے گا؟ اور ڈی ایس پی کیا کہے گا اپنے آقا ملک رب نواز سے۔ اس نے تو بڑے فخر کے ساتھ اپنی کامیابی کی اطلاع دی ہوگی کہ آپ کا مجرم ہمارے پاس ہے۔ آپ ملنا چاہو تو آ جاؤ۔ اور ابھی ملک نے تیاری بھی نہیں کی ہوگی کہ دوسری اطلاع آئی۔ وہ پولیس کی مسلح نفری کو ناک آؤٹ کر کے نکل گیا۔"

رئیس بولا "یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ ہم رئیس خانے سے نکل آئے۔"

میں نے کہا "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ فی الحال کسی کا بھی وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا آتے جاتے تو خفیہ راستہ بھی خفیہ نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ ہم سب کو ایک جگہ بھی نہیں رہنا چاہیے۔"

فرید بولا "میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"کیوں؟ ایک جگہ رہنے میں کیا ہے؟" شبنم نے کہا۔

رخشی اس کی حمایتی بن گئی "ساتھ تھے اسی لیے تو بچے رہے۔ ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مل کے ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔"

"UNITY IS STRENGTH" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ اچھا ہوگا اگر ایک ساتھ پکڑے جائیں۔ ایک ساتھ سب جیل جائیں۔ ایک ساتھ جہنم رسید ہوں" فرید بولا۔

میں نے کہا "صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے خواتین کہ ایک کے جرم کی سزا دوسرے کو نہ ملے۔ اب دیکھو ایک معاملہ ہے رب نواز اور سونی کے درمیان۔ سونی کی بہن کو اور بہنوئی کو رب نواز نے مروا دیا۔"

"اس کی بیوی نے مروایا۔" شبنم بولی۔

"چلو ٹھیکے کی بیوی اور سونی کی بہن ماری گئی رب نواز یا اس کے بیٹے کی وجہ سے۔ پھر ٹھیکے نے انتقامی کارروائی کی۔ اس نے بس کو اغوا کیا اور آگ لگا دی۔ ہماری بدقسمتی کہ مسافروں میں ہم بھی تھے۔ مزید بدقسمتی یہ کہ ایک جگہ پہچان لیا گیا ہمیں۔ اب رب نواز سمجھتا ہے کہ سونی کا ساتھ دینے والے ہم بھی تھے یعنی یہ دہشت گردی کی کارروائی بن گئی جس میں ہم نے ایک گروہ کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اب کچھ عرصے کے لیے میں نے سونی کو غائب کر دیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں اور شبنم بھی الگ ہو جائیں۔"

"الگ کیسے ہو جائیں" شبنم ہنک کے بولی۔

رخشی طنز سے بولی "وہ کیا گانا ہے۔ جیون کے سفر میں ساتھی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو۔ شادو' نیلم اور چاندنی' شبنم کے بعد بھی کوئی اور مل جائے گا۔"

"انشاء اللہ" فرید نے کہا "خدا شکر خورے کو ہی شکر دیتا ہے۔"

"اور بالآخر ہو جاتی ہے شکر کی بیماری" شبنم بولی۔

میں نے کہا "ابھی سے بددعائیں مت دو۔ پہلے میری پوری بات سن لو۔ میں چاہتا تھا کہ شبنم صحافت کے شعبے سے اپنا تعلق پھر بحال کرے۔ وہ جو کہتے ہیں نا' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ برادر ابراہیم درانی کرائم رپورٹر کے کل کے رویے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ جو فیلڈ میں نہ ہو اسے صحافی بھی بھول جاتے ہیں اور وہ ہو جاتا ہے ریٹائرڈ تھانے دار کی طرح بے اختیار۔"

"یہ تو خیر سچ کہا تو نے پیارے!" رئیس آہ بھر کے بولا۔ "اپن کو سب سالے سیاست کرنے والے بھول گئے۔ بڑا مسکا تھا اپنا کبھی۔ سب بلاتے تھے اپنی غرض کے لیے۔ اب کوئی پوچھتا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ دنیا کا دستور ہے۔ عزت ہوتی ہے کرسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی۔ بڑے بڑے پھنے خاں بعد میں ذلیل ہوتے ہیں۔ جب کرسی نہیں رہتی۔"

شبنم سوچ میں پڑ گئی "دنیا کی نظر لگی ہوئی تو محسوس ہوتی ہے مجھے۔"

"یہی حال رہا تو کسی دن خورشید کیانی تم پر بھی ہاتھ ڈال دے گا۔"

"ابے قسم اللہ کی یار۔ ہاتھ توڑ دوں سالے کے۔ ٹانگیں توڑ کے ہاتھ میں پکڑا دوں" رئیس نے غصے سے کہا۔

"میرا مطلب تھا عام لوگوں کی طرح پکڑ لے گا اور پھر وہی ہوگا کہ جو آج ہوا۔ شاید اس سے بھی بدتر۔ صحافی نظریں چرا کے نکل جائیں گے۔ تمہاری سپورٹ میں کوئی آدھی ادھوری آواز اٹھے گی تو غیر مؤثر ہو جائے گی۔ صرف اس لیے کہ تم نے وہ قلم رکھ دیا ہے جو آگ اگلتا تھا اور تلوار سے زیادہ کاٹ رکھنے والے الفاظ کی طاقت کا سرچشمہ تھا" میں نے کہا۔

"شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم!"

"چلو ایک تو قائل ہوئی" فرید مسکرایا "ابھی دونوں اتفاق میں برکت ہے کا وہ گانا مل کے گا رہی تھیں۔"

رخشی نے کہا "وہ بات کیا غلط ہے؟"

"اور عملی صحافت میں پھر نام کی ساکھ بحال کرنے کا مطلب یہ کیسے ہوا کہ میں سب کو چھوڑ دوں گی" شبنم بولی۔

"کوئی کسی کو نہیں چھوڑ رہا۔ میں نے الگ ہونے کی بات کی تھی۔ ہم ملیں گے، روز ملیں گے۔ لیکن سرعام نہیں اور ایسے نہیں کہ کوئی ہم پر مجرمانہ سازش میں ساتھ ہونے کا الزام عائد کر سکے" میں نے کہا۔

وہ بولی "فرض کرو میں نے پہلے کی طرح کام شروع کر دیا۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "میں بھی پہلے کی طرح کام شروع کر دوں گا۔ بلکہ ہم سب کی یہی حکمتِ عملی ہوگی۔ رئیس کو بھی اپنے پرانے سیاسی رابطے بحال کرنے میں فائدہ ہے۔ اور دیکھا جائے تو یہ فائدہ بھی ہم تک پہنچے گا بالواسطہ طور پر۔ فرید کو اپنی وکالت جاری رکھنی چاہیے۔ بلکہ بہتر ہوگا اگر یہ کسی سینئر ایڈووکیٹ کو پارٹنر بنا کے اپنی لا فرم قائم کر لے۔"

"سوچتا تو میں بھی ایسے ہی تھا۔ مگر پھر وکالت کے پیشے کو دیکھا تو اس میں بھی گزارا مشکل ہو گیا۔"

"اب کہیں تو گزارا کرنا سیکھو" رخشی بولی۔

"یار، تمہارے ساتھ گزارا کرنا سیکھ لیا، یہ کافی ہے" وہ بولا۔

رخشی نے کہا "گزارا کرتی ہیں بے چاری بیویاں، مرد تو رہتے ہیں اکڑفوں میں۔"

"مجازی خدا جو ہوئے" شبنم نے کہا۔

"اور ہم پاؤں کی جوتی" رخشی نے سرہلایا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ تم کہاں کی بات لے بیٹھیں" میں نے ناراضی سے کہا۔

فرید بولا "میں عدالتوں میں بولے جانے والے اور سنے جانے والے جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "یار، تو مت جا کسی کیس کی پیروی کے لیے لیکن ایک لا فرم ضرور بنا لے۔ اس کا اپنا ٹیکا ہوتا ہے۔ آمدنی الگ ہوتی ہے۔ پولیس اور جرائم کی دنیا سے رابطہ رہتا ہے۔ کسی سینئر وکیل کے ساتھ پارٹنر شپ میں تیرا نام خود بخود بڑا ہو جائے گا۔ کیس لیں دوسرے وکیل جو فرم کے ملازم ہیں۔ تجھے کون کہتا ہے عدالت میں حاضر ہونے کے لیے۔ تو قانونی مشیر بن کے کام کر۔"

"کس کا قانونی مشیر؟"

"میرا، ہم سب کا۔ اس جگہ قائم ہونے والے یتیم خانے کا۔ یہ کام تجھے کرنا ہے رخشی کے ساتھ مل کے۔ تمہارے ساتھ ہم سب ہیں ویسے تو مگر کرنا دھرنا تم ہی رہو گے۔ رخشی کے ساتھ تم یہاں رہائش بھی اختیار کر لو تو سب سے بہتر۔"

رخشی نے دلچسپی سے ادھر اُدھر دیکھا "یہاں۔۔۔؟"

"یہ دس کنال جگہ تمہاری ہے۔ جہاں چاہو رہو" میں نے کہا "یہ جگہ پسند نہیں تو اسے گرا کے اپنی ضروریات کے مطابق نیا گھر بنوا لو۔"

"نہیں۔ اتنی بری بھی نہیں ہے یہ جگہ۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "مجھے یقین تھا کہ تم میری مخالفت نہیں کرو گے۔ یہ تجویز ایک ٹھوس پلان ہے۔ ایسی STRATEGY ہے جس میں سب کے لیے سیکیورٹی ہے۔ ابھی ہم کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ ہم ملک رب نواز جیسے معمولی سیاسی وڈیرے کی طاقت سے پریشان ہیں۔ پولیس کا ایک معمولی ڈی ایس پی کے عہدے کا افسر ہمارے سامنے فرعون بن کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ کسی صحافی یا وکیل کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس پوری طاقت ہونی چاہیے۔ صحافت کی طاقت شبنم، سیاست کی طاقت رئیس۔ وکالت کی طاقت فرید عباسی۔"

"اور حماقت کی طاقت آپ" رئیس بولا۔

"تم سب کی طاقت میری طاقت۔ لیکن ایک اور طاقت ہے جو سب سے بڑی ہے۔ وہ ہے دولت کی طاقت جو نہ جانے کب سے میرے پاس ایسے بے مصرف پڑی ہے جیسے زرخیز زمین جسے کاشت کوئی نہ کرے۔ جس کی پیداوار سے کسی بھوکے کا پیٹ نہ بھرے۔"

"یہ فضول چیز میرے پاس بھی بہت ہے" رخشی نے کہا۔

"دیکھو۔ کفرانِ نعمت مت کرو۔ خدا نے تمہیں اتنی دولت دی ہے۔ یہ مہربانی ہے اس کی۔ دولت کبھی فضول نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال فضول ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے غریبوں، بیماروں، فاقہ کشوں کو دیکھو تو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس سے ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا سب کو۔ سب بیماروں کو ایک وقت کی دوا نہیں مل سکتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا جا سکتا ہے کچھ لوگوں کے لیے۔ ایک نیکی ضرور کی جا سکتی ہے نیک نیتی کے ساتھ۔ کسی اجر یا ثواب کی خواہش کے بغیر۔ خیر، تم خود سمجھ دار ہو۔"

رئیس نے نفی میں سرہلایا "سمجھ دار ہوتے تو اس وقت یہاں بیٹھے ہوتے اس کباڑ خانے میں۔"

"یہ تو سچ فرمایا آپ نے رئیس خاں صاحب۔" فرید آہ بھر کے بولا "ہم نظر آتے کہیں پیرس کے پری خانوں میں۔ کبھی یورپ کے شبستانوں میں۔"

رخشی نے کہا "تو اب چلے جاؤ۔ روکا کس نے ہے۔"

"وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔ قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں۔" فرید نے کہا "سوال اس وقت یہ ہے کہ کیا فیصلہ ہو گیا؟ اور ہو گیا تو اس پر کب سے عمل درآمد ہوگا؟"

"بزرگ فرما گئے ہیں کہ نیک کام میں دیر کیسی۔ اور آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔" رئیس بولا۔

"میرے بزرگ اس کے برعکس یہ فرما گئے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ دیر آید درست آید۔"

شبنم ہنسنے لگی "یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ کس کے بزرگ صحیح تھے۔"

"ہو جائے گا کسی دن تلوار کی دھار پر۔ ابھی کیا کرنا ہے؟ واپس جانا تو پڑے گا رئیس خانے۔" فرید نے کہا۔

"ہاں۔ سب کچھ وہیں ہے ابھی تو۔" شبنم بولی۔

رخشی نے کہا "یہ سوچ کے تو نہیں آئے تھے ہم گھر سے۔"

میں نے کہا "سوچ لو۔ میرے نزدیک ابھی ادھر جانا رسک ہے۔ ممکن ہے کچھ نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ گلی کے باہر ہی دھر لیے جائیں۔ رہی سامان کی بات تو کوئی اور لے آئے گا۔ دو چار دن تو کہیں بھی گزارے جا سکتے ہیں۔"

میری بات سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ میں اور رئیس یہ رات اسی جگہ گزاریں گے۔ ہم اگر وقتی طور پر کمال اور فرح کے گھر چلے جاتے تو وہ ہمیں خوش آمدید کہتے اور نیلم کے پاس پہنچ جاتے تو اسے کچھ بتائے بغیر بھی مہمانی کے مزے لوٹتے مگر یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ ہم ایک رات کے لیے کسی ہوٹل میں بھی شفٹ ہو سکتے تھے مگر اب رات چند گھنٹوں کی رہ گئی تھی۔

"ابھی تو میں جاتی ہوں اپنے اخبار کے دفتر۔ پہلے آزاد صاحب کی سن لوں۔ پھر کچھ اپنی سناؤں اور ایک دو خبریں لگوانی ہیں مرچ مسالے والی۔ انہیں بھی دیکھ لوں۔" شبنم نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"تم سے کل ملاقات ہوگی کورٹ میں۔" فرید عباسی بولا "مجھے واپس جا کے کچھ کام کرنا ہے۔ رب نواز کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے لیے کورٹ کے آرڈر لینے ضروری ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس کافی مواد ہے اب۔"

میں نے کہا "اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کی تو یقیناً اب مشکل لگتی ہے۔"

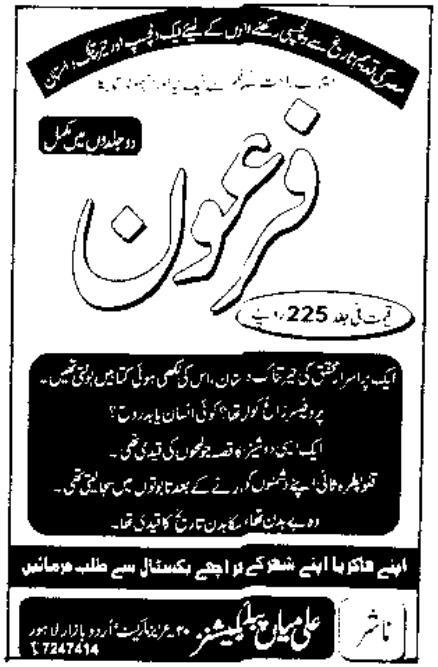
دو جلدوں میں مکمل
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
ایک پراسرار محقق کی حیرت ناک داستان، اس کی لکھی ہوئی کتابیں ہوش ربا تھیں۔
پروفیسر زاغ کون تھا؟ کوئی انسان یا بہروپ؟
ایک ایسی دوشیزہ کا قصہ جو لمحوں کی قیدی تھی۔
تھوتھرہ کائی اپنے دشمنوں کو رنج کے بعد تابوتوں میں سجا لیتی تھی۔
وہ بے مثال کردار جو کبھی تاریخ کا قیدی تھا۔
اپنے ناکام یا اپنے شوق کے ناجائز بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"...تنی شہادتوں کے پیشِ نظر یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔"

شبنم نے کہا "کیا وہ پیش ہوگا۔"

"پیشی کے بغیر درخواست ہی نہیں کی جاسکتی۔" فرید بولا۔

"میں بھی آؤں گا۔" میں نے کہا۔

فرید اور رئیس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "تو آئے گا؟"

"ہاں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

فرید نے کہا "وہاں وہ بھی ہوں گے۔ انسپکٹر راؤ نور علی۔ اور ڈی ایس پی خورشید کیانی۔"

"میں بھی اسی لیے آنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں موقع دینا چاہتا ہوں کہ وہ سب کے سامنے مجھے گرفتار کرلیں۔"

شبنم بولی "گرفتاری کا اتنا شوق ہے تو رہائی کیوں حاصل کی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے کل قبرستان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ چراغ علی ولد باغ علی تھا۔ اس کے بارے میں تم یہ خبر لگوا چکی ہو کہ پولیس نے اسے کوئی الزام عائد کیے بغیر پکڑا تھا۔ پولیس کو اس کا نام تک معلوم نہیں تھا اور وہ خلافِ قانون ایک بلینک وارنٹ لائے تھے جس پر نام تھانے میں لکھا گیا۔ راؤ اور کیانی دونوں ہی سخت مشتعل ہوں گے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ زخمی شیر کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوں گے۔"

"اور اس بار وہ کوئی موقع نہیں دیں گے تجھے۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں گے۔ زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیسے؟ چراغ علی ولد باغ علی کو؟ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر کچھ صحافی ہوں۔ کچھ وکیل ہوں۔ ظاہر ہے ڈی ایس پی کیانی انہیں میرے جرائم کی تفصیل بتائے گا۔ یہ بتائے گا کہ اس نے کتنی محنت اور دیانت سے میرا سراغ لگا کے مجھے گزشتہ رات قبرستان میں پکڑ لیا تھا اور کس طرح مس شبنم نے اور فرید عباسی نے مجھے بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر کیسے میں پولیس پارٹی پر حملہ کرکے فرار ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ سب وہ کسی پریس کانفرنس میں بتائے اور صحافیوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ آج کل یہ بھی ہو رہا ہے پھر جب میری باری آئے گی تو میں دوں گا اسے ایک کھلی چٹھی۔ میں بتاؤں گا کہ میں واقعی چراغ علی ولد باغ علی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں ڈی ایس پی نے یہ نام کہاں سے اور کس سے سن لیا۔ میں تو ناصر عظیم ہوں۔ بزنس مین۔ امپورٹر۔ ایکسپورٹر۔ بلڈر۔ اس شہر میں میری ایک شناخت ہے۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے نام پیش کروں گا جو معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کمال۔ کلم سپر اسٹار نیلم۔ جناب ابوبکر آزاد اور وہ بینک منیجر جہاں میرے اکاؤنٹ ہیں۔"

رئیس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "اے واہ۔ کیا آئیڈیا ہے۔"

فرید نے بھی سر ہلایا "اس ڈی ایس پی کی تو ہوگئی ایسی تیسی۔"

شبنم نے کہا "یہ خیال تمہیں آیا کیسے؟"

میں نے کہا "پہلے میں نے سوچا تھا کہ روپوش ہوجاؤں لیکن روپوشی کتنے دن چل سکتی تھی۔ اس دنیا میں اس شہر میں سب کے درمیان رہ کے کوئی کیسے روپوش رہ سکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ گیٹ اَپ بدل لوں۔ جس چراغ علی کو پولیس نے ملک رب نواز کے اشارے پر گرفتار کیا تھا اسے غائب کردیا جائے۔ میں یہ داڑھی صاف کرتا تو شاہ عالم نظر آنے لگتا۔ وہ زیادہ سنگین مسئلہ ہوجاتا۔ ملک رب نواز سمجھتا کہ میں لندن سے لوٹ آیا ہوں۔ وہ پرانے حساب چکانے آجاتا اور میں جس دلدل سے نکل گیا ہوں اس میں پھر ڈوب جاتا۔ بالآخر مجھے ناصر عظیم بننے کا خیال آیا تو میں حیران رہ گیا کہ یہ سیدھی سی بات مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھی۔ کیا ضرورت ہے مجھے پریشان ہونے کی اور الٹے سیدھے راستوں پر بھٹکنے کی۔ سیدھا صاف راستہ وہی ہے جو سچ کا راستہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ میں ناصر عظیم ہوں تو ہوں۔ کون نفی کرسکتا ہے اس کی اور ناصر عظیم کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں۔ وہ ایک کروڑ پتی ہے۔ اتنے معتبر حوالے رکھنے والا کہ ڈی ایس پی کو نام سن کے پسینے آجائیں گے اور ملک رب نواز کی عقل خبط ہوجائے گی کہ یہ کیا چکر ہے۔"

"آف کورس۔ ناصر عظیم کی شناخت بہت مضبوط ہوگی۔"

میں نے کہا "وہ محفوظ بھی ہوگا۔ وہ چاہے تو اس کے آگے پیچھے ذاتی باڈی گارڈ چل سکتے ہیں۔ وہ بلٹ پروف کار میں پھر سکتا ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ ملک رب نواز بھی اس سے ملنا چاہے تو اسے تلاشی اور سیکیورٹی چیک کے عمل سے گزرنا پڑے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟" شبنم نے کہا۔

"لیکن ایک تو ناصر عظیم ایسی قید و بند اور پابندیوں کی زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ شبنم کے نام سے صرف اسی حد تک واقف ہے جس حد تک کوئی اخبار کا قاری۔ وہ کسی فرید عباسی، رخشی کو بھی نہیں

جانتا۔"

"وہ جانتا ہے صرف رئیس کو۔" رئیس نے کہا۔

"ڈاکٹر کمال کو اور قمر کو۔" میں نے کہا۔

"اور چندا کو جو کرنل خاں کی بیٹی ہے۔" شبنم نے اداس اور کسی حد تک تلخ لہجے میں کہا۔

میں ہنس پڑا "بس اتنا ہی حوصلہ تھا۔ ارے بابا یہ تو دنیا کو دکھانے کے لیے ہوگا۔ دنیا میں زندہ رہنے کی طاقت حاصل کرنے کے لیے ہوگا۔ یہ ظاہر کا پردہ ہوگا۔ اندر سے سب وہی ہوگا جو آج ہے۔"

"لیکن ہم ایسے ساتھ نہیں رہیں گے۔"

میں نے کہا "ایسے ہی رہیں گے ایک دن۔ یہ تو مصلحت کا تقاضا ہے کہ فی الحال۔ شعر میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم چاروں۔"

"مجھے یہ آئیڈیا بالکل اچھا نہیں لگا۔" شبنم بولی۔

"دنیا میں ہر جگہ ہر وقت سب کچھ اپنی مرضی اور پسند کا نہیں ہوتا۔ ہم نہ ملنے کے پابند نہیں ہیں۔ بس ابھی ہمارے ٹھکانے الگ ہوجائیں گے اور ہم ملنے میں احتیاط سے کام لیں گے۔ رخشی تو اسی جگہ ملے گی ہر وقت۔ فرید عباسی اپنی قانونی فرم کے آفس میں ہوگا یا پھر یہاں۔ ویسے بھی تمہارا ٹھکانا اخبار کا دفتر ہی ہوگا یا پھر آزاد صاحب کے گھر میں؟"

"تم اپنی بتاؤ۔ تم کہاں ملو گے؟" فرید نے کہا "رئیس کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ابھی تو ہم کوئی مکان کرائے پر لے کر سب کے ملنے کا ایک ٹھکانا بنالیں۔ جیسے رئیس خانہ تھا۔ کوئی کسی وقت بھی آئے جائے، قیام فرمائے۔"

رئیس نے سر ہلایا "ابے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اپنا سارا سامان رئیس خانے سے اٹھا کے وہاں لے جاتے ہیں۔ کرائے کے مکان کا یہ ہے کہ جب خطرہ محسوس ہو بدل دو بلکہ ایک جگہ رہنا ہی نہیں چاہیے دو مہینے سے زیادہ اور ٹھکانے بھی دو ہونے چاہئیں ایک وقت میں۔ اپنی پے جیرو بھی میں نے جیرے بلیڈ کے حوالے کردی ہے۔ اسے کسی شوروم میں کھڑا کردے۔"

میں نے کہا "ہم سب کو اپنی گاڑیاں بدل دینی چاہئیں۔"

فرید بولا "گاڑیاں بار بار بدلنا تو مشکل ہوگا۔ احتیاط ٹھیک ہے لیکن اتنا ڈرنا بھی ٹھیک نہیں۔ کچھ تقدیر پر اور خدا پر بھی بھروسا کرنا چاہیے۔"

شبنم نے صاف اعلان کردیا "میں اپنی پیاری کار کسی اور کے حوالے نہیں کرسکتی۔ اس سے میری ایک جذباتی وابستگی ہے۔ وہ میرے لیے خوش بختی کی علامت ہے۔ کامیابی اور ترقی کے راستے پر سب سے پہلے اسی نے میرا ساتھ دیا۔"

میں نے کہا "آخر ہونا آزاد صاحب کی شاگرد۔ وہ بھی اپنی چلبلی کو رفیقِ حیات کی طرح عزیز سمجھتے ہیں۔ اس سے جدا ہونے کے لیے تیار نہیں۔"

"شاید رفیقِ حیات ہوتی تو روز نظر آتی کہ میری اوقات تو پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں۔ اسے یوں ساتھ نہ رکھتے۔" فرید نے کہا۔

"تم کچھ بھی کہو۔ وقت کی کچھ یادیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میرے پاس بچپن کی بہت سی چیزیں ابھی تک محفوظ ہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "سب سے بہتر رہتی ہے کرائے کی کار۔ ٹیکسی ہو یا کوئی عام گاڑی۔"

فرید نے گھڑی دیکھی "ایک بج گیا۔ میرا خیال ہے ہم چلتے ہیں۔ میری تو رات لگ جائے گی کیس کی تیاری کرتے پھر مجھے کورٹ پہنچنا بھی ضروری ہے۔"

"تم بھی آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا۔" شبنم نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنے لیے دوائیں بھی لے آیا تھا۔ دوائیں کیا بس جسم میں کچھ درد تھا۔ صبح تک ٹھیک ہوجائے گا۔"

"تم اب سوجانا۔" شبنم نے مجھے تاکید کی۔

اسے دوسروں کا خیال نہ ہوتا تو وہ مجھ سے پوچھ لیتی کہ میں تمہارے ساتھ ہی ٹھہر جاتی ہوں یہاں۔ یہ خواہش ایک سوال بن کے اس کی نظروں میں مچل رہی تھی لیکن میں خود یہ رسک ہرگز نہ لیتا۔ سب کے درمیان ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ یہ ویران تنہائی ہمارے جذبات کو بے لگام کرسکتی تھی اور میں اب شبنم کو عزت اور احترام کے اس مقام سے گرانا نہیں چاہتا تھا جو شادو کو حاصل رہا تھا اور پھر چندا کو۔

وہ سب چلے گئے تو مجھے اپنی تنہائی کا آسیب ڈرانے لگا۔ میں نے پرانی یادوں سے پیچھا چھڑا کے سونے کی بہت کوشش کی مگر گزرے ہوئے وقت کے قبرستان سے سارے بیتے ہوئے مدفون لمحے نکل کر بدروحوں کی طرح میرے گرد منڈلا رہے تھے۔ بالآخر میں نے فرار ہی میں عافیت جانی۔ میں نے لائٹ آف کی۔ دروازے بند کیے اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منہ سے باہر نکل آیا۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ برسوں سے بند جگہ کو ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ کے کوئی چور ڈاکو راتوں رات صاف کردے۔

میں پیدل چلتا رہا۔ رات خنک اور پرسکون تھی۔ سڑکوں پر خاموشی تھی۔ آخری دنوں کا ادھورا چاند بے نام سی روشنی کا دھندلکا پھیلائے اداس اور شرمندہ لگتا تھا۔ درد کش دواؤں نے بہت کم اثر کیا تھا۔ میرا جسم تکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ چلتے چلتے میں اچانک گر پڑوں گا۔ میری توانائی کی بیٹری زیرو پر آچکی تھی۔

اچانک ایک خالی رکشا میرے قریب سے گزرا۔ ڈرائیور نے مجھے سوالیہ پُر امید نظروں سے دیکھا تو میں دوڑ کے اس میں بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد میں نے اسے کمال اسپتال کے دروازے پر رخصت کیا۔ رکشے کو اسپتال کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ گیٹ پر چوکیدار مستعد کھڑا تھا۔ اس نے فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھ لیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس اسپتال میں ایمرجنسی اور CASUALTY کا کوئی سلسلہ نہیں تھا چنانچہ شام کے بعد نہ کسی کو علاج کے لیے داخل کیا جاتا تھا اور نہ کوئی ڈسچارج ہوتا تھا۔ رات کے وقت کسی مریض کے تیماردار بھی اسی صورت میں آتے تھے جب کوئی اشد ضرورت کے تحت اپنی ڈیوٹی بدلنا چاہے۔

میں نے چوکیدار سے کہا "قمر کے گھر جانا ہے مجھے۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ وہ قمر کو مسز کمال کے نام سے جانتا تھا "کون قمر؟"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا مسز کمال۔ ڈاکٹر کمال بہنوئی ہیں میرے۔"

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ میرا اعتماد اپنی جگہ ٹھیک تھا مگر اس نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور حلیے سے میں اسپتال کے مالک کا سالا بہرحال نہیں لگتا تھا۔ وہ گیٹ سے میرے ساتھ گھر تک گیا اور جب کمال مجھے اندر لے گیا تو معذرت کرکے واپس گیا۔

قمر بال بکھرائے آنکھوں میں خیند کا خمار لیے اٹھی "بھائی۔۔۔؟"

میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا "گھبرا مت۔ سب ٹھیک ہے۔"

"کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟" وہ دوپٹہ سنبھال کے کھڑی ہوگئی۔

"پریشان کیوں ہوتی ہے۔" میں نے سوتے ہوئے بچے کے گال کو انگلی سے چھو کے کہا "اب اٹھ ہی گئی ہے تو چائے بنا کے پلا اپنے بھائی کو۔"

کمال مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا "جھوٹ مت بولنا مجھ سے سؤر کے بچے۔ بہت ماروں گا قمر کے سامنے۔"

میں جوتے اتار کے صوفے پر لیٹ گیا "میں پولیس کی تحویل سے فرار ہو کے آرہا ہوں۔ تین بندے ایسے ٹھکانے کرتے فٹافٹ لٹا کے۔" میں نے ہاتھ ہوا میں چلا کے بتایا "تو نے بک بک کی تو چوتھا نمبر تیرا ہوگا۔ ذرا میرا پوسٹ مارٹم کرکے دیکھو۔ میں کتنے فی صد زندہ ہوں۔"

قمر کے چائے لے کر آنے سے پہلے میں اسے بتا چکا تھا کہ قبرستان سے اس کے آنے کے بعد کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اِدھر اُدھر سے ٹٹول کے دیکھا اور بولا "ایسے نہیں مرے گا تو سالے۔ میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

قمر آئی تو ہم بالکل نارمل تھے اور اسی طرح باتیں کررہے تھے۔ جیسے ہمیشہ کرتے تھے "تمہارا یہاں آنا بے سبب تو نہیں ہو سکتا بھائی۔"

میں نے کہا "یہ کیسی نامعقول بات ہے بہن۔ کیا مجھے اپائنٹ منٹ لے کر آنا چاہیے یہاں۔ پہلے سے ٹائم لینا چاہیے۔ سبب کا کیا مطلب ہے آخر۔ جو محبت ہے مجھے تجھ سے۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر آہ بھر کے بولی "وہ نہیں جب سے برائی ہوئی ہے تم بھول چکے ہو اسے۔ خالی ہاتھ آتے تھے پہلے کبھی باہر سے۔"

میں نے کہا "یا میرے خدا۔ آدھی رات کو میں چاکلیٹ کہاں سے لاتا اور پھر میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں شہر بھر کے پاگل کتے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم قبرستان سے کمال کے ساتھ آجاؤ گے۔" وہ بولی۔

"خیال تو آیا تھا مجھے لیکن سب ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ رئیس بہت اداس اور پریشان تھا۔"

"مجھے کمال نے سب بتایا۔ بس اب تم یہیں رہو بھائی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ کسی دن خدانہ کرے تمہیں کچھ ہوگیا تو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ہے نا پاگل۔ اوئے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ تیری جیسی بہن کے دل سے نکلنے والی ہر دعا میری حفاظت کرتی ہے۔" میں نے کہا "اور یہاں میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ تو نے سنا نہیں۔"

"بہن کے گھر بھائی کتا۔ ویسے ایک کتے کی ضرورت تو

ہے ہمیں۔" کمال نے کہا "جو بھونکنے والا ہو۔ کاٹنے والا نہیں۔"

قمر نے خفگی سے کہا "کمال۔ تمہاری بہن نہیں ہے نا۔ اسی لیے کرتے ہو ایسی باتیں۔"

میں نے کہا "تمہاری ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن مس چاندنی خان کا کیا حال ہے۔ تم نے اس سے پوچھا۔"

کمال نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات بھی قمر کے سامنے آجائے "میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"کون سی بات؟" قمر نے پہلے مجھے اور پھر کمال کو دیکھا۔

کمال نے کہا "چندا کہتی ہے وہ کہیں بھی نہیں گئی تھی۔"

میرے ذہن کو صدمہ ہوا "یہ اس نے کیوں کہا۔ جھوٹ کیوں بولا آخر اس نے۔"

کمال سوچ میں ڈوبا رہا "ہاں۔ یہی سوال میرے لیے بھی ایک عذاب بنا رہا۔ اگر یہ واقعی جھوٹ ہے۔"

میں نے بگڑ کے کہا "صرف سونی یا شبنم کی گواہی کافی نہیں تو پوچھ لے ڈاکٹر عائشہ سے۔ وہاں کا چوکیدار۔ ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی۔ سب نے دیکھا ہوگا اسے۔"

"میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ایسا کرسکتی ہے۔"

"وہ ایسا کرچکی ہے اور اس سے زیادہ کرے گی۔ وہ پاگل ہوگئی ہے کمال۔ تو اسے سمجھا ورنہ بڑی خرابی ہوگی۔"

قمر نے چلا کر کہا "یہ کیا باتیں کررہے ہو آپس میں۔ مجھے بھی بتاؤ ورنہ میں چائے پھینک دوں گی تم پر۔"

میں نے کہا "تمہاری چندا کا دامن تو بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہے۔ وہ ذمے دار ہے چھوٹی اور تیس مار خان کے قتل کی۔"

"چندا۔۔۔؟ نہیں بھائی۔۔۔!" قمر بڑی مشکل سے بولی۔

"ہاں۔ اس نے رب نواز کو فرید عباسی کا فون نمبر بتا دیا۔ فون نمبر سے پتا معلوم کرکے قاتل وہاں پہنچ گئے۔ چھوٹی اور تیس مار خان سے ہمارے بارے میں پوچھتے رہے اور انہوں نے جان بوجھ کر بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا بھائی۔"

"پوچھ لینا تم بھی چندا سے۔ کل دن میں ساڑھے گیارہ بجے وہ اسپتال کی ایمرجنسی میں عائشہ کلینک کیوں گئی تھی؟ اور گئی تھی تو انکار کیوں کرتی ہے۔"

اچانک میں نے چندا کو دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح ساکت دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔

ایم اے راحت
کی
ایک خوبصورت تحریر
★
ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کرکے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جاسکتی —— ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا
سمندر کا بیٹا
سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے
قیمت ۱۸۰/-
ڈاک خرچ ۳۰/-
ناشر علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیرانی اور صدمے کا ایک لمحہ جو سکوت اور جمود سے عبارت تھا، ایک ہولناک حقیقت کو سمجھنے میں گزر گیا۔

پھر قمر نے ایک چیخ ماری "چندا۔ یہ کیا کر رہی ہو تم!"

اس کے ساتھ ہی کمال نے چلّا کے کہا "چندا۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔"

مگر اس سے پہلے کہ چندا کا ردِ عمل سامنے آتا یا وہ کوئی جواب دیتی، میں نے اپنے قریب سے قمر کے بیٹے کا ایک کھلونا اٹھالیا۔ یہ اچھا خاصا بڑا بیٹری سیل سے چلنے والا ٹینک تھا۔ شاید وہ سوتے وقت اس سے کھیل رہا تھا کہ ٹینک ابھی تک اس کے ایک ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

سوچنے سمجھنے اور نشانہ لینے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اچانک میرا ہاتھ ٹینک پر جم گیا اور میں نے اندازے سے اسے چندا پر کھینچ مارا۔ چندا نے غیر ارادی طور پر بچنے کی کوشش کی اور مجھے وہی ایک لمحہ ملا جس سے فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔ اس وقت چندا کی ساری توجہ ایک دفاعی پوزیشن لینے پر مرکوز ہوگئی تھی۔

ادھر ٹینک اس کے سر پر توپ کے گولے کی طرح لگا ادھر میں ٹینک کے گولے کی طرح تقریباً اڑتا ہوا گیا اور چندا سے ٹکرا گیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ دروازے کی چوکھٹ سے لگا۔ ریوالور کمرے کے اندر رہ گیا۔ میں چندا کو ساتھ لیتا ہوا یوں باہر گرا کہ چندا نیچے تھی اور میں پوری طرح اس کے اوپر منطبق ہو گیا تھا۔

سر پر کھلونے کی چوٹ نے بھی چندا کو چکرا دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ پیٹھ کے بل فرش پر گری تو اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس نے مزاحمت کی واجبی سی کوشش کی تھی اور میں نے اس کے لبوں سے صرف ایک بار سنا تھا "چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔ مرجانے دو" پھر وہ خاموش اور ساکت ہوگئی۔

میں نے اٹھنے کے بعد اسے جھنجوڑا "چندا! ہوش میں آؤ۔"

کمال بولا "اسے اٹھالے یار۔ یہ تو بے ہوش ہوگئی ہے۔"

میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ قمر نے مجھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کے دی۔ میں نے اس کے منہ پر چھینٹے مارے اور اسے آوازیں دیں مگر وہ صرف کراہتی رہی۔ قمر سخت نروس تھی اور بار بار پوچھ رہی تھی۔ "آخر یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟" مگر ظاہر ہے کہ اس سوال کا مقصد کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے بھی اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

کمال نے اس کی نبض دیکھی اور مطمئن انداز میں سر ہلایا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"یہ کانپ کیوں رہی ہے؟" قمر نے کہا۔

"اس پر ایک کمبل ڈال دو اور تھوڑا سا دودھ گرم کر کے لاؤ" کمال نے کہا۔

"یار اسے ــــ کوئی انجکشن وغیرہ لگا دے" میں نے کہا۔

"لگا دوں گا اگر ضروری ہوگا۔ ڈاکٹر تو ہے یا میں؟" کمال بولا۔

میں کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور قالین پر پاؤں پھیلا دیے۔ "ایسا لگتا ہے کہ چندا نے ہماری باتیں سنی تھیں۔"

کمال ایک گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگیا۔ "ہم اپنی باتوں میں مگن تھے۔ پتا بھی نہیں چلا وہ کس وقت اندر آئی لیکن یار، یہ تو حد ہوگئی۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں تو اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آتا۔"

کمال چھت کو دیکھتا رہا "اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔"

"یہ ریوالور کہاں سے آگیا چندا کے ہاتھ میں؟"

کمال نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا سوال انتہائی احمقانہ ہے "کرنل صاحب کے پاس ریوالور تھا یا نہیں؟"

"تھا تو سہی۔" میں نے کہا "دکھا مجھے۔"

"میں نے چھپا دیا ہے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں۔" کمال بولا۔

"یہ چندا نے کیا حرکت کی تھی، اور کیوں؟"

"کیوں کا میں کیا جواب دوں۔ کیا تو نہیں جانتا الو کے پٹھے۔ اتنا انجان بن کے مجھ سے پوچھ رہا ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے ــــ چندا کس کی جان لینا چاہتی تھی؟"

"اپنی ــــ اور صرف اپنی۔ تیری زندگی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ چندا کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے، اس کا ذمہ دار وہ خود ہی بھگت رہی ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "تیرے لہجے سے الزام کی بُو آتی ہے مجھے۔ آخر کیا کہنا چاہتا ہے تو سؤر کے بچے۔ کیا یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"نہیں۔ تیرے باپ کی وجہ سے ہوا۔ جس نے تیرے جیسے مداری کو پیدا کیا۔ کل تک چندا کے عشق کی ڈگڈگی تھی

تیرے ہاتھ میں۔ اس سے پہلے شادو تھی۔ آج شبنم ہے اور خیر سے آنے والے کل کے لیے نیلم آگئی ہے میدان میں۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر ورنہ میں ماروں گا ایک جھانپڑ اور کوئی یہ بات کہتا ہے تو مین معاف کر دیتا ہوں اسے لیکن تو سب جانتا ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے ایک ٹانگ ہلاتا رہا۔ "نہیں، میرے ناقص دماغ میں نہیں آتے تیرے دلائل۔ نہ میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں اور نہ بحث سے تجھے قائل کر سکتا ہوں۔"

قمر کوشش کر رہی تھی کہ گرم دودھ کو چمچے سے چندا کے حلق سے اتار دے۔ اس نے پلٹ کے دیکھا "کیوں۔ بھائی کا کیا قصور ہے اس میں۔ چندا نے جو کیا وہ ٹھیک تھا؟"

کمال نے دونوں ہاتھ جوڑے "تم اور تمہارے بھائی صاحب دونوں بچے۔ جورو کے ساتھ جورو کا بھائی ایک طرف تو ساری خدائی کی دلیل کے دوسری طرف ہونے سے بھی کیا فرق پڑ سکتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میرا دل بہت دکھی ہے چندا کے لیے، کس جذبے کے ساتھ وہ شریک ہوئی تھی میرے مشن میں۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی اور کر سکتی ہے لیکن اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں وہ صرف خودکشی کر سکتی ہے۔"

"وہ بھی میرے سامنے آ کے" میں نے افسوس سے سر ہلایا "پہلے ہی اس نے دنیا کی نظر میں مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے سوفیصد اپنی غلطی کی وجہ سے پیدل چلنے والا کار کے نیچے آجائے تو سب کی ساری ہمدردی اس کے لیے وقف ہوتا ایک فطری بات ہے۔ گاڑی والا سب کی نفرت اور عتاب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ کوئی سوچتا بھی نہیں کہ کسی انسان کی جان لینا تو دور کی بات ہے، وہ کاکروچ کو نہیں مار سکتا۔ وہ خود کتنے ذہنی عذاب میں مبتلا ہے۔ خدانخواستہ چندا کو موقع مل جاتا میرے سامنے مرنے کا، تو مجھ پر کیا گزرتی۔ میں پہلے ہی ایک ناکردہ گناہ کے احساسِ جرم کا بوجھ لیے پھر رہا ہوں۔"

کمال پر میری بات کا زیادہ اثر نہیں ہوا "چندا کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے ہیں۔ اب اسے رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ میں نے اور قمر نے کئی بار دیکھا۔ وہ برآمدے میں کھڑی ہے یا باغ کی کسی بینچ پر بیٹھی ہے اور دیکھ رہی ہے خلا میں۔ ایک بار میں نے کہا تھا کہ تم کام کی بہت ٹینشن لے رہی ہو۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم خود اپنے پیدا کیے ہوئے حالات کے جذباتی بحران میں مبتلا ہو۔ میں نے مشورہ دیا تھا کہ اسے کوئی TRANQUILISER استعمال کرنا چاہیے تو وہ ہنسنے لگی کہ میں تو بہت پُرسکون ہوں۔ کوئی پریشانی نہیں مجھے۔ خواہ مخواہ دوا کیوں کھاؤں۔ وہ خود بھی جانتی ہوگی کہ یہ جھوٹ ہے مگر خود فریبی میں مبتلا رہنا ایک الگ نفسیاتی بیماری ہے" اس نے اٹھ کے چندا کو پھر چیک کیا۔

میں نے کہا "یار، تو اسے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں چھوڑ دے۔"

"ہاں۔ جیسے فی وی خراب ہو جائے تو اسے ورکشاپ میں چھوڑ آتے ہیں۔ چندا کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" کمال نے اب اسے ایک انجکشن لگانا ضروری سمجھا۔

"اس میں غلط کیا ہے؟" قمر نے پھر میری حمایت کی۔

"چندا اول تو مانتی ہی نہیں کہ اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش ہے اور اگر کسی طرح میں اسے قائل کر لوں تو عائشہ کلینک وہ بہرحال نہیں جائے گی۔ وہاں شبنم رہی، پھر سونی ــــ ڈاکٹر عائشہ سے ویسے ہی چڑتی ہے وہ۔"

"نفسیاتی معالج بہت ہیں شہر میں۔ یہ خالص سائیکاٹرک علاج کا کیس ہے۔"

کمال نے سر ہلایا "میرے ذہن میں اس سے بہتر خیال ہے۔ کیوں نا چندا کو لندن بھیج دیا جائے۔ لندن میں علاج بھی اچھا ہو جائے گا اور ماحول کی تبدیلی سے بہت فرق پڑے گا۔ علاج کی ذمے داری چندا کے کزن کو سونپی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی پہلے اسی کے پاس جا رہی تھی۔"

میں نے کہا "تو جانتا ہے اس کزن کو؟"

"نہیں لیکن وہ بھروسے کے قابل ہوگا ورنہ چندا اس کے بلانے پر ــــ"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "پہلے کی بات مت کر۔ چندا کا ڈراما تھا وہ بھی۔ میری توجہ حاصل کرنے کے لیے۔"

"ہر بات ڈراما نہیں ہوتی" کمال بگڑ کے بولا۔

"ڈراما تو چل رہا ہے کب سے۔ پہلے اس نے خود مجھے نظرانداز کیا۔ خوب ذلیل کیا۔ دھتکار دیا کتے کی طرح اور جب ایک انتہا کے بعد میں مایوس ہو کے چلا گیا تو وہ پھر چاہتی ہے کہ اس کے اشارے پر میں دُم ہلاتا آجاؤں۔ کس لیے؟ مزید ذلت برداشت کرنے کے لیے۔ تو اسے لندن بھیج یا کہیں اور۔"

کمال نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "یار، وہ اب میری ذمے داری ہے۔ میرا لندن کے بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ رابطہ ہے۔ میں سب انتظام کر لوں گا مگر ایک بات تجھ سے بھی کہنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں تو کیا کہے گا۔ فکر مت کر۔ جب تک چندا یہاں ہے ' وہ میری صورت نہیں دیکھے گی۔ میں ادھر نہیں آؤں گا۔"

قمر نے کہا "کیوں نہیں آؤ گے بھائی۔ مجھ سے ملنے آتے ہو تم۔"

کمال نے بیوی کو ڈانٹا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ناصر کو دیکھ کر اسے کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ جذباتی بحران میں پڑ جاتی ہے۔ تمہیں ملنا ہے تو دس بار ملو ناصر سے۔ میں کوئی دیوار نہیں کھڑی کر رہا ہوں بہن بھائی کے بیچ۔ تم سے زیادہ ناصر کی پروا ہے مجھے مگر تم بھائی بہن کی محبت کا ڈھول زیادہ پیٹتی ہو۔"

قمر رونے پر آمادہ ہو گئی "کیا؟ میں ــــ میں ڈھول پیٹتی ہوں؟"

میں نے اسے اپنے قریب کر کے پیار سے تسلی دی "برا مت مانا کر چھوٹی چھوٹی باتوں کا' ہم سب کا رشتہ ایسا نہیں ہے۔"

وہ آنسو صاف کر کے بولی "پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے ہمیں بھائی!"

میں نے کہا "دیکھ' ڈریسنگ ٹیبل میں وہ ریوالور رکھا ہو گا۔"

قمر نے دراز کھول کے ریوالور نکالا اور یوں ڈرتے ڈرتے مجھے پکڑا دیا جیسے وہ دستی بم ہے جو پھٹنے ہی والا ہے۔ "یہ خان جی کا ہے۔"

میں نے ریوالور کا معائنہ کیا "ہاں۔ وہی ہے مگر یہ چندا کے پاس کیوں ہے؟"

قمر نے کہا "خان جی کی ہر چیز اسی کی ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف۔ وہ ایک سینئر آرمی آفیسر تھے۔ ان کا اسٹیٹس تھا ان کی ذاتی حیثیت میں۔ وہ جیسا اسلحہ چاہیں رکھیں مگر چندا کو ان کا اسلحہ ورثے میں نہیں مل سکتا۔ ان کے ذاتی استعمال کی چیزوں کی طرح۔"

کمال نے کہا "اس کا لائسنس بھی انہی کے نام پر ہو گا۔"

"ظاہر ہے اور لائسنس TRANSFERABLE نہیں ہوتا۔ چندا کو چاہیے کہ اسے واپس کر دے ورنہ یہ غیر قانونی اسلحہ شمار ہو گا۔"

کمال نے کہا "ابھی تو میں نے ضبط کر لیا ہے لیکن میں اسے تھانے میں جمع کرا کے رسید لے لوں گا۔"

نہ جانے کیوں مجھے ریوالور کچھ ہلکا لگا۔ میں نے اس کا چیمبر کھول کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ اس میں ایک بھی گولی نہیں تھی۔ میری حیرانی نے کمال کو متوجہ کیا۔ کچھ کہے بغیر میں نے مسکراتے ہوئے ریوالور اسے دے دیا۔

"یہ ــ یہ تو خالی ہے" کمال نے کہا۔

قمر چونکی "کیا ــ ریوالور خالی ہے؟"

میں نے تیقن سے کہا "جی جناب! اور یہ خالی ریوالور اٹھا کے وہ آئی تھی میرے سامنے خودکشی کا ڈراما کرنے۔ یہ ظاہر کرنے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے اور اسے پاگل کیا ہے میں نے۔"

قمر نے غصے سے کہا "یہ اچھا پاگل پن ہے۔ ہمیں پاگل بنا رہی تھی۔"

کمال کی پریشانی اور بڑھ گئی "کیسی عجیب حرکت کی ہے چندا نے۔"

میں نے کہا "نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ فارمی میں کہتے ہیں نا۔ دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ دنیا کے لیے پاگل خود اپنے معاملے میں سیانا۔ چندا کا ایسا ہی معاملہ ہے۔ جب یہ ہوش میں آئے تو اسے مت بتانا کہ اس کا راز ہم پر کھل گیا ہے لیکن اس سے قمر کے سامنے پوچھنا کہ آخر وہ خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھی۔ میں بتا سکتا ہوں کہ چندا جواب میں کیا کہے گی؟"

"کیا کہے گی؟"

"وہ کہے گی کہ ناصر مجھے جھوٹا سمجھتا ہے۔ میں نے رب نواز کو فرید عباسی کا فون نمبر نہیں بتایا تھا۔ قاتل میری غلطی کی وجہ سے رئیس کے گھر نہیں پہنچے تھے۔ چھوٹی اور تیمور مارخان کے قتل کی ذمے دار میں نہیں ہوں لیکن ناصر سمجھتا ہے کہ میں ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی بے گناہی کا کیسے یقین دلاؤں۔ خود اپنی نظر میں ذلیل ہو گئی ہوں اور ایسی ذلت سے تو بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔"

کمال نے ایک گہری سانس لی "اب وہ کچھ بھی کہے۔"

"نہیں۔ یہی کہے گی چندا۔ انکار تو کر ہی چکی ہے وہ کہ عائشہ کلینک نہیں گئی تھی" میں نے گھڑی دیکھی "صبح ہونے میں دیر ہے ابھی۔"

"ہاں۔ چائے بنا کے لاؤں بھائی؟"

"نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا" میں نے کہا۔

کمال نے کہا "ہم سو جاتے ہیں ڈرائنگ روم میں۔"

چار گھنٹے بے ہوشی جیسی نیند کے بعد میں اٹھا تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔ کمال مجھ سے پہلے اٹھ کے نہانے کے لیے

باتھ روم میں گھسا ہوا تھا۔ میں قمر کے پاس کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے ایک کپ چائے پکڑا دی "تمہارا اب کیا ارادہ ہے بھائی؟"

میں نے جماہی لے کر کہا "یہ چائے پینے کا۔"

وہ ہنسنے لگی "میرا مطلب تھا ــ اب کیا کرو گے تم؟"

"وہی جو پہلے کرتا تھا" میں نے ایک چسکی لے کے کہا "پھر غلط مطلب مت نکالنا میری بات کا۔ میں ایک تو اپنا بزنس پھر شروع کروں گا۔"

"کنسٹرکشن کا اور امپورٹ ایکسپورٹ کا" اس نے پراٹھے بناتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرا بھی کتنا اچھا بوتیک تھا' کتنا چلتا تھا۔"

میں نے کہا "تیرا یہ اسپتال زیادہ شاندار ہے۔ وہاں میں ایک یتیم خانہ بنوا رہا ہوں۔"

"وہ تو پرانا خواب ہے تمہارا۔"

میں نے کہا "اب تعبیر ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کام میں رخشی اور فرید عباسی کے سپرد کر رہا ہوں۔ میں خود اس پروجیکٹ سے لاتعلق رہوں تو بہتر ہے ورنہ کچھ بعید نہیں' کل کسی مرحلے پر کوئی یتیم خانے کو نقصان پہنچانے کا سوچ لے تو مارے جائیں معصوم بچے۔"

"تم خود کہاں رہو گے؟"

"میں کسی کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ دراصل یہ فیصلہ ہم سب نے کیا ہے۔ سب الگ الگ رہیں گے۔"

"اس پورشن ــ شبنم کے ساتھ رہنے سے تمہاری بہت بدنامی ہو رہی تھی بھائی!"

میں نے کہا "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ تو اپنے بھائی کو جانتی ہے تو پھر پروا کرنا چھوڑ دے۔"

"نہیں بھائی ــ مجھے اچھا نہیں لگتا جب کوئی ایسی ویسی بات کہے تمہارے بارے میں۔ وہ خود تو بدنام ہے پہلے سے۔ محض صورت پر اتراتی ہے ورنہ کیا ہے' نہ خاندان کا پتا نہ ماں باپ کا۔"

میں نے کہا "تو ایک روایتی نند کے لہجے میں بات کرنے لگی ہے۔ بہت ذہین اور بہت اچھی لڑکی ہے۔ یہاں جو خاندانی لوگ ہیں نا' ان کا حال مجھ سے پوچھ اور پھر ہم خود کیا ہیں نام نسب کے حوالے سے۔ خیر اب میں الگ گھر لے کر رہوں گا۔ خفا مت ہو۔"

"گھر بسانے کی بات کرو بھائی۔ یا فیصلہ کر چکے ہو پہلے ہی؟"

اس کا مطلب سمجھنے کے باوجود میں نے گول مول لہجے میں کہا "یہ فیصلے تو ہوتے ہیں آسمانوں پر بہنا!"

"مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتی" قمر نے منہ پھلا کے کہا "میں بتا دوں۔"

"میں نے تو اعتراض نہیں کیا تھا تیری پسند پر۔ کیا تھا اس میں' نہ صورت نہ شکل' بھاڑ میں سے نکلا ــ پرلے درجے کا بے وقوف تھا۔ نقل کر کے پاس ہوتا رہا اور ڈاکٹر بن گیا۔ دولت تو ورثے میں مل گئی ورنہ فیملی پلاننگ والوں کی ڈسپنسری میں بیٹھا ہوتا یا نسخوں سے بندے مار مار کے قبرستان آباد کرتا۔ بس قسمت اچھی ہے کہ پھانس لیا میری سیدھی سادی بھولی بھالی بے وقوف' پاگل' عقل کی اندھی بہن کو۔"

قمر ہنسنے لگی "اتنی تعریف' صبح صبح۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بھی نہا لینا چاہیے۔ کپڑے چاہے نہ بدلوں۔"

"ذرا اپنا حلیہ دیکھو بھائی۔ لگتا ہے جیل سے نکلے ہو یا جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ بو آ رہی ہے تمہارے پاس سے اور ان کپڑوں سے۔"

"کپڑے تو میں نہیں بدل سکتا' سوری۔"

"کیوں؟ کمال کا اور تمہارا ایک ہی سائز ہے" وہ بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے انہی کپڑوں میں جانا ہے کورٹ۔"

"ان کپڑوں میں؟" اس نے بڑے رنج سے کہا "پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں بھائی۔ ایک تو یہ داڑھی رکھ لی ہے نہ جانے کیوں اور رکھی ہے تو اسے جنگل کی جھاڑی کیوں بنا رکھا ہے۔ پہلے کتنے نفاست پسند تھے تم۔ صبح شام کپڑے بدلتے تھے۔ موقع محل کے حساب سے تمہاری چوائس تھی۔ اتنے صاف ستھرے ہو کے جاتے تھے۔ پرفیوم کیسی اچھی اچھی استعمال کرتے تھے۔ اب تو بالکل جنگلی اور وحشی لگتے ہو۔"

میں نے تولیا اٹھا کے کہا "شبنم کو ایسے ہی اچھا لگتا ہوں میں۔"

وہ چراغ پا ہو گئی "بھاڑ میں گئی شبنم۔ وہ خود تو بڑی چھیل چھبیلی بن کے گھومتی ہے۔ خوب میک اپ کرتی ہے اور کپڑے پہنتی ہے ماڈلوں جیسے۔"

میں نے ہنس کے کہا "جل جل کے مر جائے گی تو دیکھنا۔ ڈبل رول ہو گا تیرا۔ ساس کا کردار بھی تجھے ہی ادا کرنا ہے۔"

جب میں نہا کے آیا تو ناشتا میز پر لگا ہوا تھا مگر چندا' جسے میں نے باتھ روم میں جاتے وقت سوتا دیکھا تھا' بستر پر نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی "وہ چلی گئی؟"

"ہاں۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس انھی اور چلی گئی۔ کوئی بات ہی نہیں کی مجھ سے یا کمال سے" قمر نے کہا۔

"اس کو یاد آگیا ہوگا کہ گزشتہ رات اس نے کیا بے وقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ بھی سمجھ گئی ہوگی کہ باتھ روم میں میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ویسے وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں۔ دیکھنے میں تو ٹھیک ہی ہے۔ تم ناشتا کرو۔ میں ذرا اسپتال کا ایک چکر لگا کے آتا ہوں' کچھ دیر میں" کمال نے جاتے جاتے کہا۔

میں نے چلا کے کہا "مجھے بھی کورٹ جانا ہے یار۔ میں انتظار نہیں کروں گا۔"

قمر نے کہا "کورٹ؟ آج کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "تجھے یاد ہوگا۔ ایک بار میں نے عدالت میں گواہ پیش کیے تھے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں؟"

"ساری بربادی تو وہیں سے شروع ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "آج میں دوسرے گواہ پیش کروں گا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

قمر مجھے سلائس پر مکھن لگا کے دیتی رہی "یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے بھائی!"

"ضرورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مجھے پھر شاہ عالم نہ سمجھ لیا جائے حالانکہ شاہ عالم تو بھاگ گیا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے۔ سنا ہے لندن میں تھا۔ کسی ماڈل سے شادی کی تھی۔ اس کی تصویر بھی آئی تھی اخبار میں۔ اب سنا ہے کہ مر چکا ہے۔"

"پھر تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں شاہ عالم سمجھا جائے۔"

میں نے کہا "اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ ایک ڈی ایس پی ہے جس نے کل مجھے گرفتار کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں چراغ علی ولد باغ علی ہوں۔"

قمر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کون چراغ علی؟"

"مجھے کیا معلوم بہن۔ اس کم بخت ڈی ایس پی سے جا کے پوچھ۔ میں تو مار دھاڑ کر کے فرار ہو گیا تھا کل رات۔ آج میں کورٹ جاؤں گا تو وہاں وہ بھی موجود ہوگا۔ وہ پھر مجھے پکڑلے گا۔ میں تین معتبر گواہ پیش کر کے ثابت کروں گا کہ میں چراغ علی نہیں ناصر عظیم ہوں۔ ایک گواہ ہوں گے تمہارے سرتاج من سلامت باشد۔ دوسرے اپنے ابوبکر آزاد صاحب گویا اور تیسری گواہی کے لیے عدالت میں سنسنی پھیلانے آئے گی نیلم!"

قمر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگی "میری سمجھ میں نہیں آیا بھائی۔ یہ کیا نیا چکر ہے۔"

میں نے چائے ختم کی "یہ چکروں کو ختم کرنے کا چکر ہے۔ دیکھ تیرا لختِ جگر کیسے دیکھ رہا ہے مجھے۔ کیا اس نے گھر میں انسان پہلی دفعہ دیکھا ہے؟ آخر ہے ننالو کا پٹھا۔"

میں نے اسے اٹھالیا مگر وہ رات بھر کے اخراج میں شرابور تھا۔ اس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ میں نے اسے فوراً قمر کے حوالے کردیا اور نیلم کو فون کرنے بیٹھ گیا۔ اس کی کنیز خاص نے نیلم کو جگانے سے صاف انکار کردیا۔

"میڈم آدھی رات کے بعد شوٹنگ کر کے آئی تھیں' سو رہی ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا سونی سے بات کروں گا میں۔ کیا وہ بھی سو رہی ہے؟"

"وہ باغ میں جھولا جھول رہی ہیں" کنیز خاص نے مجھے مطلع کیا "میں فون وہیں لے جا کے انہیں دے دیتی ہوں۔"

وہ کارڈلیس فون تھا جو سونی نے جھولے میں ہی ریسیو کیا "ہاں' ہیلو!"

میں نے کہا "خوب عیش ہو رہا ہے بھئی۔"

وہ ہنسی "ہاں۔ بڑا مزہ آرہا ہے سچ مگر تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا "وقت کم ہے اس لیے تم سے پھر بات کروں گا۔ مجھے بات کرنی تھی نیلم سے مگر کسی میں ہمت نہیں کہ اسے جگائے۔ یہ نیک کام تم کرو۔"

"ابھی جگاتی ہوں" وہ بولی پھر ایک شڑپ سی آواز آئی "میں پی رہی ہوں فروٹ جوس۔ یہ دوسرا گلاس ہے ناشتے سے پہلے۔ نو بجے ناشتا ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا۔ وہ سب جو آپ سوچ سکتے ہیں۔ انڈے' مکھن' جام' جیلی' پنیر' ملائی۔ بادام والا دودھ۔ توبہ' سب مجھے ٹھونس ٹھونس کے کھلایا جاتا ہے۔ صبح دوپہر شام' بس کھانا۔ میں تو تھک جاتی ہوں کھاتے کھاتے" وہ ہنسی۔

"تمہاری ہنسی بتاتی ہے کہ تم کچھ ضرورت سے زیادہ صحت مند ہو۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بیماری تو یاد بھی نہیں ہوگی تمہیں۔"

وہ مزید ہنسی "سچ بڑا مزہ آرہا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اتنی بڑی فلمسٹار اتنی اچھی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں کیا چھاپتے رہتے ہیں اخبار والے سب کے بارے میں اور خواہ مخواہ کی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔"

میں نے کہا "سب ایسی نہیں ہوتیں اور سب ویسی بھی

نہیں ہوتیں۔ تم سے میرے بارے میں پوچھا ہوگا نیلم نے۔"

"ہاں۔ پرسوں رات ہم جاگتے رہے۔ باغ میں جھولے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایک صوفیہ ٹائپ بیڈ ہے جو لوہے کے اسٹینڈ پر زنجیروں سے لٹکا ہوا ہے۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ سچ مجھے تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خواب نہیں ہے' میں نے سب بتادیا۔"

"یہ بھی۔۔۔ کہ میں شاہ عالم تھا۔"

"نہیں۔ یہ نہیں بتایا' تم سے پوچھا جو نہیں تھا" وہ بولی۔

"خیر' اچھا کیا۔"

سونی ہاتھ میں فون لیے نیلم کے بیڈ روم کی طرف چلتی جا رہی تھی۔ اس نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی اور پھر چلا کے کہا "نیلم باجی' نیلم باجی! فون ہے خاص آپ کے لیے ایک خاص آدمی کا جو کوئی خاص پیغام دینا چاہتا ہے۔"

نیلم کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "یہ تم ہو ناصر!"

میں نے کہا "بالکل صحیح اندازہ ہے تمہارا۔"

وہ بولی "تین دن سے کہاں ہو' یہ بلا میرے گلے ڈال کے بھاگ گئے خود؟"

میں نے کہا "آج آؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کہ کورٹ آرہی ہو نا۔ میں نے اس لیے جگایا کہ کہیں سوتی نہ رہ جاؤ۔"

اس نے غالباً جماہی لے کر کہا "نہیں' مجھے یاد تھا۔"

"رئیس سے بات ہوئی تمہاری؟"

"ہاں۔ سب بتایا اس نے۔ خدا کے لیے ناصر نکل آؤ ان خواہ مخواہ کے چکروں سے۔ زندگی برباد مت کرو اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی۔"

میں نے سعادت مندی سے کہا "جی اچھا۔ ایسا ہی کروں گا لیکن اس سے پہلے جانا ہے کورٹ۔ وہاں رب نواز کی درخواست برائے ضمانت پیش ہوگی توثیق کے لیے۔"

"تمہیں اس کے ساتھ دشمنی پالنے کا بہت شوق ہے۔ کیا ملے گا اس سے تمہیں۔"

میں نے کہا "ماں باپ کو کیا ملتا ہے اولاد کو پال کے؟ بعض اوقات صرف دکھ۔ بہت سے کام دنیا میں اپنے فائدے کو سامنے رکھ کے نہیں کیے جاتے۔"

وہ بولی "تمہیں قائل کرنا آج بھی مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ویسے ہی ضدی اور خبطی ہو تم۔ آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "میں ایسی کی تیسی کرنا چاہتا ہوں ان کی جو دولت یا اقتدار کے نشے میں خود کو فرعون بے ساماں سمجھے ہوئے ہیں۔ ایک وہ ڈی ایس پی ہے خورشید کیانی۔ اس کے ساتھ ایک ایس ڈی ایم ہے صمد خان۔ میں ہرجانے کا کیس کروں گا۔ نوکریوں کے لالے پڑجائیں گے تو میرے پاؤں پکڑیں گے۔"

"اور اگر وہ ایسے ہی تمہارے پاؤں پکڑلیں۔ معافی مانگ لیں تم سے تو تمہاری تسلی ہو جائے گی؟"

"ان کا دماغ اور کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔"

"فرض کرو میں سب ٹھیک کرادوں۔"

"تم کیسے ٹھیک کراؤ گی؟"

وہ ہنسی "ارے بھئی' کچھ تو ہم بھی ہیں۔ ہمیں پوچھنے والے بہت ہیں ابھی۔ یہ ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ کیا بیچتے ہیں۔ تمہیں یہ ثابت کرنا ہے نا کہ تم ناصر عظیم ہو۔ میں تمہیں لے کر چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم۔ اس کے لیے مجھے سفارش کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تم مصروف ہو یا کورٹ میں آ کے گواہی دینے سے اندیشہ ہے کہ تمہاری نیگیٹو پبلسٹی ہوگی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ کہاں آنا ہے مجھے اور کتنے بجے؟"

میں نے کہا "روئیداد خان کی کورٹ میں۔ بارہ ایک بجے تک۔ میں تو ابھی جا کے بیٹھ جاؤں گا کورٹ روم میں۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا میرا نام پکارا جائے گا؟"

میں نے ہنس کے کہا "نہیں یار' وہاں میرا کیس نہیں ہے۔ تمہاری ضرورت تو پڑے گی عدالت کے باہر۔ جب کیانی مجھے پھر پکڑے گا کہ چراغ علی ولد باغ علی۔ دیکھتا ہوں اب تو کیسے نکل کے جاتا ہے۔"

"میں روئیداد خان کے چیمبر میں بیٹھی رہوں گی۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو انہیں؟"

"جب وہ سیشن جج تھے تو بڑے مہربان تھے مجھ پر۔ مجھ پر حملہ کیا تھا کچھ غنڈوں نے۔ مجھے اللہ نے محفوظ رکھا۔ میرا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ رب نواز جیسا ہی ایک وہ تھا۔ کیا کہا تھا ابھی تم نے' فرعون۔"

"فرعون بے ساماں۔"

"ہاں۔ اپنی فلم کے لیے مجھے سائن کرانا چاہتا تھا۔ میں اسکرپٹ دیکھے بغیر یا صرف فلمساز کا پیسہ دیکھ کے فلم سائن نہیں کرتی۔ حملہ اسی نے کرایا تھا۔ حملہ کرنے والے اس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ پکڑے گئے تو انہوں نے سب بک دیا۔ انہیں سات سات سال کی قید ہوئی۔"

"اور وہ فلمساز؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسے میں نے معاف کردیا۔ اس کا دماغ ٹھکانے آگیا تھا۔ میرے پاس دشمنی پالنے کے لیے نہ فرصت تھی نہ ہمت۔"

میں نے کہا "یہ روئیداد خان تمہارا پرستار ہے۔"

"بہت بڑا۔ ایک اشارے کا غلام۔"

میں نے کہا "یعنی تمہارے کہنے سے رب نواز کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے؟"

وہ بولی "دیکھو ناصر۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے کسی اشارے کے غلام کو کبھی غلط اشارہ نہیں کیا کیونکہ غلام تعمیلِ حکم کے بعد انعام مانگتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"دوسری بات یہ کہ تم تو خود سفارش کے قائل نہیں ہو۔ انصاف کے عمل میں سفارش کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں۔"

میں مزید شرمندہ ہوا "آئی ایم سوری!"

"میری بات یہ کہ اس میں رسک ہے۔ وہ مجھے انکار بھی کرسکتا ہے۔ تم اصرار کرو گے تو میں رسک ضرور لوں گی۔"

میں نے کہا "اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ میرے منہ سے ایک غلط بات نکل گئی تھی۔ انصاف کے عمل میں رخنہ اندازی اصولی طور پر غلط ہے۔ دشمنی کے جذبات میں یہ بات بھول گیا تھا میں۔"

آزاد صاحب سے بات کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شبنم نے انہیں قائل کرلیا ہوگا۔ وہ دلیل سے نہ مانتے تو شبنم آنسوؤں سے انہیں منا سکتی تھی۔ وہ آزاد صاحب کو جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی اور انہیں کھینچ کر کورٹ میں لاسکتی تھی۔ ان کے لیے یہ فراغت کا وقت تھا۔ رات بھر جاگنے کے بعد وہ عام طور پر دس بجے تک گھر جا کے سوجاتے تھے۔

میں نکلنے ہی والا تھا کہ چندا آگئی۔ اس نے قمر سے کہا "میں اسپتال جارہی تھی، کمال چلے گئے۔"

"ہاں۔ کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں۔ ایک بات پوچھنی تھی تم سے۔ صبح میں یہاں سو رہی تھی، تمہارے بیڈ پر۔" چندا نے کہا۔

"ہاں۔ تمہیں یاد نہیں۔" میں نے قمر کی آواز سنی۔

"نہیں۔ اتنی شرم آئی مجھے صبح آنکھ کھلنے کے بعد۔ میں تمہارے بیڈ روم میں تمہارے بیڈ پر۔ توبہ توبہ، یہ سب کیسے ہوا؟"

قمر نے تلخی سے کہا "زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔"

"تمہاری قسم۔ مجھے بالکل معلوم نہیں۔ شاید میں سوتے میں چلنے لگی ہوں۔ پلیز، مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔"

یقین مجھے بھی نہیں تھا کہ چندا جھوٹ نہیں بول رہی ہے مگر بحث میں بدمزگی اور تلخ کلامی کی نوبت آنے سے پہلے ہی میں نکل آیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو قمر اس کو وہیں ایسی کھری کھری سناتی کہ چندا سب ڈراما بھول جاتی۔ قمر تخت غصے میں تھی۔

چندا مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "ناصر۔۔۔ تم۔۔۔؟"

مجھے اس کی آنکھوں میں اور اس کی صورت پر حیرانی بالکل جینوئن لگی۔ یہ اس کی اداکاری کا کمال بھی ہوسکتا تھا "کیا حال ہے چندا!"

"تم کب آئے؟"

میں نے قمر کو دیکھا۔ اس کا چہرہ لال ہورہا تھا اور وہ غصے میں پھٹ پڑنے کے قریب تھی "رات کو آئے تھے بھائی۔ دیکھا نہیں تھا تم نے؟"

چندا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کنفیوژن اور شرمندگی کے جذبات سے مغلوب تھی۔ خود کو اس سچویشن سے آؤٹ کرنے کے لیے میں نے فرار اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ "قمر، میں جارہا ہوں" میں نے موقع پاکے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ میرے سامنے ہنگامہ نہ کرے۔

باہر آکے میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ قمر کا گھر میرا اپنا گھر تھا۔ وہ میری بہن نہ ہوتی تب بھی کمال کے گھر کو میں اپنا سمجھتا مگر چندا نے اپنائیت کے اس احساس کو ایک تکلیف دہ احساسِ ندامت میں بدل دیا تھا۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا۔ خیر، آئندہ مجھے چندا کے سائے سے بھی بچ کے رہنا ہوگا۔ اس کا رویہ اتنا غیر یقینی، ناقابلِ اعتبار اور خطرناک ہوگیا تھا کہ میں خود کو غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنے مظلومیت کے تاثر سے میرے خلاف مسلسل جارحیت کا انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔ الٹا مجھ پر ظلم کے الزام کو مسلط کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ انتہائی ہوشیاری سے وہ اپنی نفسیاتی پے چیدگی کو میرے طرزِ عمل سے منسوب کرنے جارہی تھی اور مجھے TORTURE کرنے کے کھیل میں مصروف تھی۔

جیسا کہ مشہور ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ تو چندا نے محبت کو جنگ میں بدل دیا تھا اور اب دہرے جواز کے ساتھ جھوٹ، خود فریبی، منفی ذہانت اور جذباتی بلیک میلنگ کے سب حربے آزمارہی تھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ چندا کی مسحور کن شخصیت کا دوسرا روپ اتنا مکروہ اور بھیانک بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک میں اس کے ساتھ رہا، اس کو ایک ہی انداز سے دیکھتا رہا۔ میں اس الزام کو قبول نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں میرے رویے کو دخل تھا۔ اگر وہ مجھے معاف نہیں کرسکی اور ایک انتقامی ردِعمل کا شکار ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اپنی فطرت میں معاف کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اور وہ منتقم مزاج تھی۔ وہ مجھے قبول کرتی اور غلطی کو انسانی سرشت سمجھ کے درگزر کرسکتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

تحریری حمایت میں لڑنے والی سب سے بڑی سپر پاور تھی۔ اپنے بھائی کے لیے اس کا جانبدار ہونا ایک فطری بات تھی مگر اس سے زیادہ برا چندا کا تریا چلتر والا طرزِ عمل تھا جس نے قمر کو چندا کا دشمن بنادیا تھا۔ وہ اسے کمال کی وجہ سے برداشت کرنے پر مجبور تھی ورنہ اس کا جینا محال کردیتی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے نکلتے ہی قمر نے اس کو سب بتادیا ہوگا۔ چندا نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا ہوگا اور اس کا نتیجہ ایک جنگ کی صورت میں نکلا ہوگا۔ چندا تو یہ ظاہر کررہی تھی کہ اسے کچھ یاد نہیں۔ کیا وہ واقعی نیند میں چلتی ہوئی آئی تھی۔ اگر ایسا تھا تو وہ قابلِ معافی تھی۔ نیند میں چلنے والے نہیں جانتے کہ وہ کیا کررہے ہیں اور صبح انہیں کچھ یاد بھی نہیں ہوتا مگر اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے ریوالور کو خالی بھی رکھا ہو۔ اسپتال کے اندر اس کے لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ بھرا ہوا ریوالور اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتی لیکن ریوالور کسی دراز یا الماری میں ہوگا۔ اس نے ریوالور کیوں نکالا۔ اسے کیسے اندازہ ہوا کہ میں قمر کے گھر میں موجود ہوں؟ کیا وہ میری آواز سن کے اٹھی تھی؟

خدا قمر کو عقل۔۔۔ استعمال کرنے کی توفیق دے۔ میں نے تو اسے سمجھایا تھا کہ چندا سے اس حرکت کا سبب پوچھتی اور اپنا اندازہ بھی بتادیا تھا کہ چندا کا جواب کیا ہوگا مگر چندا نے اپنی بے خبری کا انداز اپنا کے میرے اندازوں کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ اس نے قتل کیا تھا۔ اس سے یہ پوچھنا حماقت کہ اس نے قتل کیوں کیا تھا۔

گزشتہ رات میں نے ایک غلطی یا بے وقوفی کی تھی۔ میں کسی کو بتائے بغیر قمر کے گھر چلا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے نو بجے بھی نہ رئیس نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ شبنم نے۔ شاید وہ سیدھے وہیں پہنچے ہوں گے جہاں مجھے چھوڑ کے گئے تھے اور کچھ دیر میری واپسی کا انتظار بھی کیا ہوگا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں چائے ناشتے کے لیے قریب کے کسی ہوٹل تک ہی ہوں لیکن آدھے پونے گھنٹے بعد ان کو پریشانی لاحق ہوئی ہوگی کہ میں بتائے بغیر کہاں غائب ہوگیا۔

وہ سوچ سکتے تھے کہیں پولیس نے مجھے پھر گرفتار تو نہیں کرلیا۔ جب عقل پریشانی کے جال میں ہو تو ناممکن بھی ممکن نظر آنے لگتا ہے اور ناامیدی کے خیالات کی یلغار کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔

اسپتال سے نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا۔ وہ مریضوں کے آنے کا وقت تھا۔ رات کے تیمار دار جارہے تھے اور صبح سے رات تک ڈیوٹی دینے والے آرہے تھے۔ میں نے رکشے والے کو راستہ سمجھایا اور دس منٹ بعد وہاں جا پہنچا جہاں میں رات گزارنے کے لیے رکا تھا مگر گزار نہیں سکا تھا۔ اپنے اکیلے پن اور ماحول کی ویرانی سے گھبرا کے میں سونے کے لیے قمر کے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے اندر جا کے آفس میں دیکھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس دلانے والا ایک پرچا میز پر موجود تھا۔

پرانے زرد ہوجانے والے ردی کاغذ پر شبنم نے اپنی لپ اسٹک سے لکھا تھا "این اے۔ ہم ایک گھنٹا انتظار کرتے رہے۔ کورٹ میں کسی پچھلے والے گیٹ سے آنا۔ ہاشتار کھا ہے۔ کپڑے بدل لینا۔ دیر مت کرنا، ایس آر۔"

این اے کا مطلب تھا یہ ناچیز اور ایس آر سے شبنم اور رئیس۔ ایک پیغام میں شاید اس کی ایک لپ اسٹک ختم ہوگئی تھی۔ ایسا ہی دوسرا پیغام فریج کے دروازے پر گلابی رنگ سے نظر آرہا تھا۔ تیسری جگہ سینٹ کے فرش پر رئیس خاں نے گردکی سے پر انگلی سے مجھے وہ سب کہا تھا جو شبنم نہیں کہہ سکی تھی۔

ان کی ایک گھنٹے تک موجودگی کے آثار و شواہد بہت سی تبدیلی میں نمایاں تھے۔ فریج صاف کردیا گیا تھا اور اس میں پینے کے لیے پانی کے علاوہ بھی بہت کچھ بھردیا گیا تھا۔ دودھ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی۔ کوک، ریڈی کھانوں کے ٹن۔ سینڈوچ اسپریڈ اور بہت سا الم غلم۔ یہ خاتون خانہ کی شاپنگ تھی۔

ایسی ہی امور خانہ داری میں مہارت کا نمونہ کچن میں پیش کیا گیا تھا۔ کچن اس حد تک صاف تھا کہ لگتا تھا ہر روز استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس میں دھلے ہوئے برتن ترتیب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھے تھے اور یہ سب باہر سے لائے گئے تھے۔ میرے لیے استعمال کے صاف ستھرے کپڑے اور تولیے سامنے بیڈ پر رکھ دیے گئے تھے۔

مجھے سخت ندامت ہوئی۔ میں نے کاغذ کا وہ میلا ٹکڑا اٹھایا جس پر شبنم کے لبوں کی لالی تھی۔ یہ کسی پیار بھرے بوسے کی طرح تھا۔ میں نے اسے سونگھا' چوما اور جیب میں رکھ لیا۔ باہر رکشے والا وقت گزاری کے لیے جھاڑو دینے والی ایک منہ پھٹ خاتون سے فری ہونے کی کوشش میں ذلیل ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی اور وہ رکشے میں مجھے بٹھا کے فرار ہو گیا۔

"موجی۔ کسی سے سلام دعا کرو' خیر خیریت پوچھو تو یہ بھی برائی۔" اس نے جھینپتے ہوئے وضاحت کی جو عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات تھی۔

میں نے کہا "یار چھیڑا تھا تو چھیڑا تھا۔ شرمانے کی کیا بات ہے؟"

وہ ہنس پڑا "سالی' بڑی شریف زادی بن رہی تھی۔ ہم تو شکل سے پہچان لیتے ہیں کہ چالو ہے۔"

پچھلی طرف کورٹ کے دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک ہائی کورٹ کے جج صاحبان کے آنے جانے کے لیے وقف تھا۔ عام پبلک یہ راستہ استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ میں دوسرے گیٹ کی طرف گیا تو رکشے والا ریڑھے والے کی بینچ پر بیٹھا آلو چھولے کھا رہا تھا۔ سی سی کر رہا تھا اور کان کھجا رہا تھا۔

"یہ کوئی شریفانہ حرکت ہے" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

اس کا پارا چڑھ گیا "قسم اللہ کی یہیں جو تا اتار کے زیادہ خوب کروں گا سب کے سامنے۔"

"زیادہ خوب نہیں جاہل کی اولاد' زود کوب۔"

"ابے ہاں وہی۔ کہاں سے آ رہی ہے سواری؟ قمر کے گھر جاتا تو فون کر کے ہمیں بتا نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تم نے فون کیا بالآخر قمر کو اور تم بھی ابھی آئے ہو۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "ہاں مگر تو نے کپڑے نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "ابھی نہیں۔ پہلے کیانی صاحب سے تو مل لیں۔ وہ آیا ہے کہ نہیں؟"

"دونوں آئے ہیں بڑی تیاری سے۔ کیانی اور صمد خان۔"

میں نے کہا "اور رب نواز!"

"میں نے دیکھا نہیں۔ وہ آئے گا بے شک دس بجے پیشی کے وقت۔ اندر ہی چھپا بیٹھا ہو گا کہیں۔"

میں نے کہا "اگر اس کی ضمانت کی توثیق نہ ہوئی تو پولیس اسے فرار کرا دے گی۔"

"فرید اور شبنم بھی کہہ رہے تھے یہی بات لیکن کیا ہو سکتا ہے۔ رب نواز کا انتظام پکا ہو گا اور وقت سے پہلے یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا کہ اس کو فرار میں مدد دینے والے کون ہوں گے اور وہ کس طرف سے نکلے گا۔ ویسے کیا خیال ہے تیرا۔"

میں نے کہا "میرے خیال کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ معاملات اوپر ہی اوپر طے ہو جاتے ہیں۔"

"یعنی ضمانت بھی ہو سکتی ہے اس کی؟"

"یہ عدالت کے اختیار میں ہے اور اگر سرکاری وکیل مخالفت نہ کرے تو فرید عباسی کیا کر سکتا ہے۔"

"یہ جج کیسا ہے؟" رئیس بولا۔

"جج تو بس جج ہوتا ہے۔ میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جج ضمانت کی رقم دس بیس لاکھ نقد طلب کرے اور اس سے وکیل کی شخصی ضمانت مانگے۔ وہ رب نواز فراہم کر دے گا۔ وہ دولت مند ہی نہیں اثر رسوخ بھی رکھتا ہے" میں نے کہا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے عمارت کے پچھلے حصے میں برآمدے تک پہنچ گئے تھے۔ ابھی تک کسی نے بھی ہمیں روکا نہیں تھا۔ ہر کورٹ میں ایک جج کسی نہ کسی کیس کی سماعت کر رہا تھا۔ سٹی کورٹ کے مقابلے میں یہاں کا ماحول زیادہ سنجیدہ اور مرعوب کرنے والا تھا۔ یہاں شور ہنگامہ' افراتفری اور بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ لوگ خاموشی سے آ جا رہے تھے۔

وہاں پر موجود... زیادہ تر وکیل پرانے اور عمر رسیدہ تھے اور اپنے مؤکلوں کو آہستہ لہجے میں سب سمجھا رہے تھے۔ برآمدوں میں پولیس اہلکار بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

گیٹ کی سیکیورٹی پر مامور عملے کے ایک رکن نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میرے پیچھے آنے والے رئیس نے پولیس والوں کے انداز اور لہجے میں کہا "ارے جانے دے۔ اپنا ہی بندہ ہے" رئیس حلیے اور قد کاٹھ سے سادہ لباس پولیس یا ایف آئی اے کا آدمی لگتا تھا جو بڑی تعداد میں عدالت کے اندر بھی گھسے ہوتے ہیں۔ میں جس دروازے سے داخل ہوا وہ عام طور پر عدالتی عملہ استعمال کرتا تھا۔ اگر

میں عام راستے سے آتا تو میری طرف سب کی پشت ہوتی۔ اب میں نے کورٹ روم کا پورا منظر اپنے سامنے دیکھا۔

ہال میں لگی ہوئی بینچوں پر آگے وکیل بیٹھے تھے۔ فرید عباسی اپنے ساتھ کسی سینئر وکیل کو لایا تھا۔ وہ سفید بالوں والا دراز قد شخص تھا جس کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشی میں مشورہ کر رہے تھے۔ فرید عباسی نے مجھے دیکھ کے سر کو خفیف سی جنبش دی اور میں نے اشارے سے جواب دیا۔ رب نواز کی طرف سے پیش ہونے والے صفائی کے وکلا بھی محتاط خاموشی کے ساتھ فائلیں دیکھ رہے تھے۔ عدالت میں ابھی کوئی کرایہ داری کا مقدمہ چل رہا تھا۔

پچھلے والی نشستوں پر ایک طرف میں نے شبنم کے ساتھ اس کے معاون فوٹو گرافر قربی دی کو دیکھا۔ اس کا نام بابر وقار تھا مگر مختصر سب اسے بی وی کہتے تھے۔ میری اس سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ ایک شوخ مزاج لیکن بے حد ذہین اور محنتی نوجوان تھا جسے شبنم سے خصوصی عقیدت تھی۔ بی وی کے ساتھ کرائم رپورٹر ابراہیم درانی عرف برادر کو دیکھ کے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ چوتھے شخص سے میں ناواقف تھا مگر میں نے فرض کیا کہ وہ عدالتی معاملات کی رپورٹنگ کرتا ہو گا۔

جج کے روسٹرم سے سامنے والے دروازے تک جانے والا راستہ عدالت کی سیٹوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اس راستے کے دوسری طرف کی سیٹوں پر مجھے رب نواز کا خاندان نظر آیا۔ ملکانی نے مجھے بڑی کینہ توز نظروں کے ساتھ دیکھا اور شاید حیران ہو کے سوالیہ انداز میں دلنواز سے کچھ کہا۔ دلنواز سر ہلا کے اٹھا اور اس نے آگے جھک کے اپنے وکیل کے کان میں کوئی بات کی پھر وہ دبے پاؤں باہر چلا گیا۔

رب نواز کے کچھ نمک خوار اور دوست تیسری قطار میں بیزاری سے بیٹھے تھے لیکن خود ملک رب نواز کا کہیں پتا نہ تھا۔ میرے چوتھی لائن کی ایک نشست تک پہنچنے سے پہلے ہی ان سب نے مجھے دیکھ لیا جن کے لیے میری حیثیت ایک مفرور اور مطلوب مجرم جیسی تھی۔ دلنواز کا فوراً اٹھ کے باہر جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ پولیس کے ذمے دار اہلکاروں کو میری موجودگی کی اطلاع دینے گیا ہے۔ اس کی تصدیق فوراً ہی ہو گئی۔

دلنواز کی واپسی کے چند منٹ بعد عام سے شلوار قمیص میں ایک شخص اطمینان سے چلتا ہوا اندر آیا اور میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ اپنے حلیے اور اسٹائل سے وہ پولیس یا سی آئی اے والا نظر بھی آتا تھا۔ چند منٹ کے بعد دوسرا شخص اندر آیا۔ اس نے کچھ رعونت اور بے پروائی کے باعث عدالت میں داخل ہوتے وقت سگریٹ کا آخری کش لیا اور سگریٹ بجھانے کے بعد دھواں اندر آ کے خارج کیا۔

جج نے اسے عدالتی آداب کے منافی قرار دیتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہاتھ جوڑے "غلطی ہو گئی مائی باپ!"

ہر جج تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ایسے لوگوں کو پہچانتا ہے مگر عام حالات میں وہ عدالتی کارروائی روک کے ان سے تعرض نہیں کرتا۔ ان کی نظر سادہ لباس میں اندر آ جانے والے پولیس کے اہلکاروں کی شناخت میں دھوکا نہیں کھا سکتی مگر وہ جانتے ہیں کہ ایک جائے گا تو دوسرا آ جائے گا۔ ایسا ہر روز ہوتا تھا اور اگر وہ اپنی توجہ ایسے آنے جانے والوں پر رکھیں' ان کی شناخت طلب کریں اور انہیں نکالتے رہیں تو عدالتی کارروائی متاثر ہو گی اور ان کی یکسوئی میں فرق پڑے گا چنانچہ وہ جانتے بوجھتے انہیں نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن کوئی غلط حرکت برداشت نہیں کرتے۔

اس وقت جج کو یہ ڈھٹائی گراں گزری "اس غلطی کی سزا یہ ہے کہ آپ فوراً باہر نکل جائیں۔"

وہ رک گیا "جناب عالی۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لی۔"

"معافی آپ کا حق نہیں ہے اور یہ معافی ہی ہے ورنہ توہین عدالت بہت سنگین جرم ہے۔" جج نے برہمی سے کہا۔

اسے باہر جانا پڑا۔ وہ غالباً کوئی افسر تھا جس نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ وہاں اس کے ماتحت اور اس کے رتبے کو جاننے ماننے والے بھی تھے۔ وہ احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا لیکن اس کے بعد وقفے وقفے سے چار افراد آئے اور میرے آس پاس مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔ یہ میری گرفتاری کے انتظامات کی پیش بندی تھی۔ پولیس عدالت کے اندر نہیں آ سکتی تھی لیکن انہوں نے اندر باہر ایک ایسا حصار قائم کر لیا تھا کہ جو خطرناک مجرم گزشتہ شب مسلح پولیس کی حراست سے نکل بھاگا تھا' وہ عدالت سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے۔

میرے ساتھ شبنم اور فرید عباسی بھی آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اطمینان سے انجان بنا بیٹھا رہا پھر مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی اور جس راستے سے میں اندر آیا تھا' اسی سے رب نواز نمودار ہوا۔ دونوں طرف کے وکیل مستعد ہو گئے اور فرید عباسی نے رب نواز کو دہرے قتل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی دو وارداتوں میں ملزم نامزد کرنے اور اس کا نام ایف آئی آر میں شامل کرنے کی درخواست کی۔

"قتل کی پہلی واردات اسی سال انیس جنوری کو ہوئی تھی۔ اس میں دو افراد گولی لگنے سے ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کانسٹیبل تھا اور دوسرا ملک رب نواز کا ملازم۔ یہ واردات جس پولٹری فارم کے احاطے میں ہوئی وہ ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔"

وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا "یہ غلط ہے۔ پولٹری فارم کا مالک قلندر شاہ ہے۔ اسے ملک رب نواز کی ملکیت بتانا غلط بیانی ہے۔"

"قلندر شاہ رشتے میں ملک رب نواز کا سالا ہے" فرید عباسی نے کہا "بظاہر یہ کاغذی کارروائی دیگر مقاصد بھی رکھتی ہے کیونکہ ملک رب نواز نے اپنی تمام غیر منقولہ شہری اور دیہی زمین جائداد اسی طرح اپنی بیوی اور بچوں کے نام بھی کرادی ہے۔ میں اس کی ملکیت کے معاملے کو اہم نہیں سمجھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قتل کی یہ وارداتیں ہوئی تو ملک رب نواز خود وہاں موجود تھے۔"

وکیلِ صفائی نے پھر کہا "یہ بھی غلط ہے۔ اس دن میرے مؤکل دو سو میل دور راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر میں تھے۔ اس کے معتبر گواہ موجود ہیں۔"

فرید عباسی نے ایک تصویر پیش کی "اس تصویر میں ایک گاڑی نظر آرہی ہے۔ یہ ملک رب نواز صاحب کی گاڑی ہے۔"

جج نے اس دلیل کو مسترد کردیا "اس تصویر سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

فرید نے کہا "یہ تصویر اتارنے والی ایک خاتون رپورٹر مس شبنم یہاں موجود ہیں۔ وہ بتاسکتی ہیں کہ یہ تصویر انہوں نے کس دن اور کس وقت کھینچی تھی؟"

وکیلِ صفائی نے پھر اعتراض کیا "مس شبنم کے بیان حلفی سے بھی صرف یہ ثابت ہوگا کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے ملک رب نواز کی گاڑی وہاں تھی۔ اس سے ملک صاحب کی موجودگی ثابت نہیں ہوگی۔"

عدالت نے اعتراض کو جائز تسلیم کیا "آپ کے پاس اور کچھ ہے؟"

"یس یور آنر۔ جائے واردات سے جو پستول ملا اور جو قتل کی اس دہری واردات میں استعمال ہوا' وہ ملک رب نواز کا ہے۔"

وکیلِ صفائی نے کہا "لیکن اس پر ملک صاحب کے فنگر پرنٹ نہیں پائے گئے۔ ملک صاحب نے یہ بھی واضح کردیا تھا کہ ریوالور ان کے ملازم نے میز کی دراز سے نکال لیا تھا جس کا انہیں علم نہیں تھا۔ قتل کے دونوں ملزم جائے واردات سے گرفتار ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ ایسی صورت میں ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرنے کا کوئی بھی جواز نہیں بنتا۔"

فرید عباسی نے کہا "جناب والا۔ اعترافِ جرم کرنے والے دونوں ملزم ملک رب نواز کے پرانے وفادار ملازم ہیں۔ انہوں نے یہ اعتراف پولیس کی تحویل میں دہرے دباؤ کے باعث کیا۔ ایک دباؤ پولیس تشدد کا تھا اور دوسرا ملک رب نواز کا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ جرم اپنے سر لے لیں تو رب نواز انہیں قانونی تحفظ فراہم کرے گا۔ انہیں کوئی سزا نہیں ہوگی اور اگر کچھ عرصہ انہیں جیل میں گزارنا پڑا تو ان کے اہلِ خانہ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ انہیں اس خدمت اور جاں نثاری کا معاوضہ اور انعام ملے گا۔"

"کیا میرے فاضل دوست یہ بات ثابت کرسکتے ہیں؟" وکیلِ صفائی نے کہا۔

"یس سر۔ عدالت میں ایک ملزم کی بیوی موجود ہے" فرید عباسی نے کہا "میری استدعا ہے کہ اس کا بیان ریکارڈ پر رکھا جائے۔"

ایک دبلی پتلی مگر تیز طرار عورت چادر سنبھال کے اٹھی۔ بہت قریب ہونے کے باعث میں نے ملکانی کی آواز صاف سنی "حرام زادی۔ اس لیے آئی تھی یہ ہمارے ساتھ۔"

ملک رب نواز کی آنکھوں میں جیسے انگارے بھر گئے تھے مگر اس عورت نے کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ اسے فرید عباسی نے ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ حلف اٹھانے کے بعد اس نے کہا "میرا نام صغراں ہے جی۔ میرے گھر والے کو ملک صاحب نے قتل کے الزام میں بند کرادیا ہے۔ قتل اس نے نہیں کیا تھا لیکن پولیس نے اسے بہت مارا اور کہا کہ تم الزام اپنے سر لو پھر ملک صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ اپنے خصم کو سمجھا۔ نمک حرامی نہ کرے۔ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو سزا سارا خاندان بھگتے گا۔ انہوں نے مجھے بھی دھمکی دی کہ کیا تو گاؤں کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ گاؤں کی سیر دو عورتیں پہلے بھی کرچکی ہیں۔ ان میں سے ایک ملک رب نواز کے مزارع نصیب علی کی بیٹی تھی۔ دوسری دیو موچی کی بیوی اور اصغر کی ماں جو شہر میں کسی افسر کا چپراسی لگ گیا ہے۔ انہیں ننگا کرکے گاؤں کی گلیوں میں

پھرایا گیا تھا۔ ان کے گلے میں انہی کے ازار بند ڈالے گئے تھے جو ملک رب نواز کے ملازم کھینچ رہے تھے۔ وہ ان پر تھوکتے جارہے تھے اور ایسی ایسی بے شرمی کی حرکتیں کررہے تھے کہ دیکھنے والوں نے اپنی آنکھیں اور گھروں کے دروازے بند کرلیے تھے۔ اگر میں انکار کرتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہوتا۔ میں نے تھانے جاکے اپنے گھر والے کو سب بتادیا۔ ملک نے یہ بھی کہا تھا کہ الزام اپنے سر لینے پر ہمیں ایک مربع زمین دی جائے گی جس کے ہم مالک ہوں گے اور ہمارا گھر بھی پکا کروایا جائے گا۔ عدالت میں شہر کا بہت بڑا وکیل ہماری طرف سے پیش ہوگا اور میرے شوہر کو ہوئی تو دو چار سال قید کی سزا ہوگی لیکن جناب' یہ سب جھوٹ اور دھوکا تھا۔ میرے گھر والے نے جو بیان دیا ہے وہ اپنی اور میری جان بچانے کے لیے ہے۔ بعد میں کیا ہوگا' یہ ہم جانتے ہیں۔ ہمیں کوئی وکیل نہیں دیا جائے گا۔ ملک رب نواز کی مہربانی سے میرا گھر والا پھانسی چڑھ جائے گا۔ ایسا دوبار پہلے بھی ہوچکا ہے۔ چار سال پہلے ملک رب نواز نے ایک گاڑی کے ڈرائیور کو مار دیا تھا۔ اس کی گاڑی ملک رب نواز کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ کسی سرکاری افسر کا ڈرائیور تھا۔ ملک رب نواز نے اپنے ڈرائیور کو قربانی کا بکرا بنایا اور اس سے یہی کہا جو آج میرے شوہر سے کہا جارہا ہے۔ اس کی بیوی کو بھی گاؤں کی سیر کرانے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کے باپ کو بلا کے ڈرایا گیا تھا کہ اس پر چوری کا مقدمہ بنادیا جائے گا۔ ڈرائیور نے الزام قبول کرلیا اور پھانسی چڑھ گیا۔ اس کی مدد کرنے والے وکیل نے ہی اسے مروادیا۔ ملک رب نواز کے بڑے بھائی حق نواز کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے ایک مربع زمین نہیں چاہیے۔ میں گاؤں کی سیر کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اگر قانون میری حفاظت نہیں کرسکتا اور میرے شوہر کو نہیں بچا سکتا تو۔"

بیان مکمل ہوتے ہوتے عورت نے رونا شروع کردیا تھا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ بیس منٹ جاری رہنے والے اس بیان کے دوران میں عدالت میں ایک اندوہناک سناٹا طاری رہا۔ بالآخر وہ بے ہوش ہوگئی۔ عدالت میں ایک دم بہت سے لوگوں نے بولنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پہلے کے مقابلے میں حاضرین کی تعداد دگنی ہوچکی ہے۔ پیچھے کی ساری خالی سیٹیں اب بھر چکی تھیں۔

جج نے "آرڈر' آرڈر" پکار کے سب کو خاموش کرادیا تو وکیلِ صفائی اٹھ کھڑا ہوا۔ "جناب والا! اس عورت کے بیان کی صحت مشکوک ہے۔"

جج نے کہا "آپ کو بعد میں جرح کا موقع دیا جائے گا۔"

فرید عباسی نے کہا "جناب والا' صغراں کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قتل کے اس اعتراف کی کوئی حیثیت نہیں۔"

جج نے کہا "فرید صاحب۔ مسئلہ اس قتل میں ملک رب نواز کو ملزم نامزد کرنے کا ہے اور درخواست ضمانت کی توثیق کا ہے۔"

فرید عباسی نے کہا "میں مشہور صحافی شبنم فاروقی کا بیان حلفی عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے تصویر بنانے کے بعد ملک رب نواز کو جائے واردات سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ یہ موقع انہیں پولیس نے دیا تھا۔"

وکیلِ صفائی نے کہا "کیا مس شبنم بتاسکتی ہیں کہ وہ وہاں کیا کررہی تھیں؟"

شبنم نے کہا "مجھے اجازت دی جائے۔"

جج نے اسے روک دیا "فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا بیان حلفی دیکھ لیا ہے۔ مسٹر فرید عباسی' اس کیس میں آپ عدالت کو قائل کرنے میں ناکام رہے کہ ارتکابِ جرم کے وقت ملک رب نواز وہاں موجود تھے اور یہ قتل ان کے ایما پر ہوا یا انہوں نے کیا۔ تفصیلی شہادت اور گواہوں پر جرح بعد میں کی جاسکتی ہے۔"

فرید عباسی نے کہا "صغراں کے بیان کے بعد یہ کہنا غیر ضروری ہوجاتا ہے پور آنر کہ ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو وہ گواہوں پر اثر انداز ہوگا۔"

اچانک ایک شخص نے آگے جاکے وکیلِ صفائی کے کان میں کچھ کہا۔ وکیلِ صفائی نے کہا "میں مداخلت کی معافی چاہتا ہوں جناب عالی لیکن یہ اطلاع شاید عدالت کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ صغراں کے شوہر نے حوالات میں خودکشی کرلی ہے۔ یہ اطلاع مجھے میرے ڈرائیور نے دی ہے جو کسی کام سے تھانے گیا تھا۔"

وکیلِ صفائی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی صغراں نے چیخ ماری۔ ہوش میں آجانے کے بعد وہ کہیں پیچھے بیٹھی آنسو بہارہی تھی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ اسے مار ڈالا ہے انہوں نے۔ اسے بھی قتل کردیا ہے تاکہ وہ میرے بیان کی تصدیق نہ کرسکے۔ یہ سب قاتل ہیں۔ انہیں پھانسی دے دو جج صاحب!"

شبنم نے چلا کے کہا "جانتے بوجھتے یہ خبر یہاں دی گئی ہے۔"

جج نے بلند آواز میں کہا "آرڈر' آرڈر!" مگر عدالت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صحافی اور وکیل پولیس سے الجھ گئے تھے اور اس خودکشی کو روایتی طریقے پر پولیس کی تحویل میں قتل قرار دینے کا معاملہ متنازع بن گیا تھا۔ صفراں کو عدالت کے حکم پر باہر لے جایا گیا اور شبنم کو وارننگ دی گئی۔ نظر یہ آتا تھا کہ عبوری ضمانت کی توثیق کے مسئلے پر عدالت آج فیصلہ صادر نہیں کرے گی اور شاید عبوری ضمانت میں ایک دو دن کے لیے توسیع ہوجائے گی۔ رب نواز کے وکیل یہی چاہتے تھے۔

سماعت عارضی وقفے کے لیے ملتوی ہوگئی تھی۔ جج اپنے چیمبر میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہلے وکیلوں کو طلب کیا گیا۔ پانچ منٹ بعد سب صحافی بلائے گئے۔ میرا خیال ہے کہ جج نے انہیں یہ سمجھانے کے لیے بلایا ہوگا کہ وہ عدالتی آداب کا خیال رکھیں۔ بعد میں شبنم نے مجھے بتایا کہ جج اس کیس کو سیاست اور صحافت کی محاذ آرائی کا تماشا بنانے پر ناراض تھا۔ اس نے کہا کہ یہ عدالت صرف عبوری ضمانت کی توثیق کے سوال پر دلائل سنے گی۔ قتل کے مقدمے سے متعلق ثبوت اور گواہ۔ ان کے بیانات یا دیگر امور جن کا تعلق سیشن کورٹ سے ہے یہاں نہ اٹھائے جائیں۔

ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ فرید عباسی نے ابھی تک تیس مار خان اور چھوٹی کے قتل کا معاملہ نہیں اٹھایا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ملک رب نواز کے خلاف صرف اس کیس میں ناقابل تردید شہادت موجود ہے جسے عدالت مسترد نہیں کرسکتی۔ ابھی تک جناب ابوبکر آزاد کی صورت بھی نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی ان کے پہنچنے کی کوئی خبر تھی۔ وہ آتی تو لوگوں کے جوش و خروش اور ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوجاتا۔

رب نواز اپنے وکیلوں سے مشورہ کرنے تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ یہ ڈی ایس پی خورشید کیانی تھا جس نے مجھے غور سے دیکھا اور سر ہلا کے میرے مفرور مجرم ہونے کی تصدیق کی۔ میں اور رئیس انجان بنے آپس میں باتیں کرتے رہے۔

رئیس نے کہا "صفراں نے بڑی غلطی کی۔ اس کے بیان نے اسے بیوہ کردیا۔"

میں نے کہا "یہ کیسا ظلم اور کیسی اندھیر نگری ہے۔ میں تو بہت مایوس ہوں یار! یہ عدالت کچھ بھی نہیں کرسکے گی۔ صفراں کو گاؤں کی سیر سے بھی نہیں بچا سکے گی۔"

رئیس نے سر ہلایا "عدالت کیا پولیس کا کام بھی کرے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں تو جج بھی سمجھتا ہوگا کہ صفراں کے شوہر کو ایک خاص مقصد کے تحت قتل کرایا گیا اور پولیس نے رب نواز کے ایما اور اس کی خواہش پر ایسا کیا پھر صرف قانون کی عدالت میں قانون کا مذاق اڑانے اور اس کی بے بسی کو تماشا بنانے کے لیے یہ اعلان بھی کیا گیا۔"

"ہاں۔" ادھر صفراں نے بیان دیا۔ ادھر کسی نمک خوار نے رب نواز کے اشارے پر تھانے میں اطلاع کردی۔ ملک رب نواز صاحب کا حکم ہے کہ صفراں کے بغاوت کے جرم کی سزا اس کے شوہر کو فوراً دی جائے۔ جسے کل پھانسی چڑھانا تھا' اسے آج ہی مار دیا گیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ملک صاحب کو بتادو۔"

رئیس نے کہا "سب صحافیوں اور وکیلوں کے منہ پر یہ اطلاع دے کر طمانچہ مارا گیا ہے کہ اب کرلو جو کرسکتے ہو۔"

"کوئی کیا کرسکتا ہے اس کیس میں۔ ہر روز ہوتے ہیں ایسے واقعات۔ عدالت صرف تحقیقات کا حکم دے گی۔ تحقیقات نہیں کرے گی۔ تفتیشی افسر ہوگا نوکر شاہی کا کوئی حقیر سا پرزہ۔ صمد خان جیسا کوئی اور مجسٹریٹ۔ ضابطے کی کارروائی کے مطابق پوسٹ مارٹم رپورٹ بنے گی۔ اس میں تشدد سے ہلاکت کا کوئی ذکر نہیں ہوگا۔ نہ کوئی گواہ سامنے آئے گا نہ کسی کا بیان ہوگا۔ نیچے یہ قتل ہوتے رہتے ہیں' اوپر اعلیٰ افسران' حکومت' سپریم کورٹ اور سیاست داں سب دیکھتے رہتے ہیں۔ پریس' پبلک سب بے بس ہیں۔"

رب نواز کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُرغرور چیلنج تھا۔ اس کی مسکراہٹ صاف کہتی تھی کہ یہ نظام اس جیسے ہر وی آئی پی کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کسی بھی صفراں کو بیوہ بنا سکتا ہے۔ کسی بھی ماں بہن یا بیٹی کو گاؤں کی سیر کرانے پر قانون اس کا پہلے کیا بگاڑ سکا ہے کہ وہ آج فکر کرے۔ اس ملک میں دو قانون ہیں۔ دو انصاف کے نظام ہیں' دو کلچر ہیں۔ دو نظام تعلیم ہیں۔ دو اخلاقی قدروں کے پیمانے ہیں' ایک غریب کے لیے' ایک امیر کے لیے۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سادہ کپڑوں والے نے اچانک مجھ سے کہا "اوئے۔ زیادہ بکواس نہیں کرنی۔"

دوسری طرف والے نے مجھے گالی دی "بہت دیر سے سن رہے ہیں ہم۔"

میں نے بلند آواز میں کہا "کون ہو تم۔ زبان سنبھال کے بات کرو۔"

وہ کچھ دب گیا "چراغ علی۔ تھوڑی دیر کی بات ہے پتر۔"

میں نے چلا کے کہا "واٹ نان سینس! کون چراغ علی!

کس بات کی دھمکی دے رہے ہو تم مجھے؟"

دوسرے نے کہا "ہم نے کون سی دھمکی دی ہے؟"

آگے سے برادر نے پلٹ کر پوچھا "کیا ہوگیا صوفی صاحب!"

میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص مسکرانے لگا "اپنے درانی صاحب' آپ تو پہچانتے ہوا سے۔ یہ بے ناوہی بندہ؟"

درانی نے مجھے غور سے دیکھا "اسے تو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اوجی۔ کل تھانے میں کیانی صاحب کے سامنے نہیں دیکھا تھا؟ چراغ علی ولد باغ علی۔ یہ پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا تھا۔"

شبنم نے کہا "کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟ تم عدالت میں کیا کررہے ہو؟"

نہ جانے کیسے برادر نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کردیا "یہ تو وہ بندہ نہیں ہے' چراغ علی۔"

میں نے کہا "میں ناصر عظیم ہوں۔ میں کسی چراغ علی کو نہیں جانتا۔"

اسی وقت جج چیمبر سے نکل کے آگیا۔ عدالت کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔ اگر میں چاہتا تو شبنم اور دوسرے اخبار والوں کی مدد سے دونوں پولیس والوں کو عدالت سے نکلوا سکتا تھا مگر میں نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ فی الوقت ہنگامہ آرائی سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

جج نے پھر فرید عباسی کو مخاطب کیا "بادی النظر میں ملک رب نواز کا اس قتل میں براہِ راست ملوث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مس شبنم کے بیان حلفی میں دیگر معاملات بھی اٹھائے گئے ہیں اور یہ شک ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک رب نواز بالواسطہ طور پر منشیات کی اسمگلنگ کے ساتھ تاریخی حیثیت کے حامل آثار قدیمہ اور نوادرات بھی باہر بھیجتا ہے اور عورتوں بچوں کو بھی غیر اخلاقی کاروبار کے لیے مڈل ایسٹ کی مارکیٹ میں سپلائی کرتا ہے لیکن کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں ایسے الزامات کی حیثیت ذاتی عناد پر مبنی نظر آتی ہے۔ ایک ذمے دار صحافی کی حیثیت سے ان کو کسی باعزت شخص کے خلاف کچھ کہنے سے پہلے تمام امکانات پر غور کرلینا چاہیے۔"

صاف نظر آرہا تھا کہ جج نے عبوری ضمانت کی توثیق کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ رب نواز کے اطمینان سے بھی یہی عیاں تھا۔ اس نے امین ڈوگر اور اکبر سبحانی جیسے صف اول کے وکیلوں کی خدمات بلاوجہ حاصل نہیں کی تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ بار کے صدر اور سیکریٹری ان ججوں پر دباؤ ڈالتے ہیں جو ذاتی طور پر مضبوط GROUND نہیں رکھتے تھے۔ وہ نااہل یا سفارشی ہوں یا کسی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہوں تو وکیل برادری انہیں اسی طرح بلیک میل کرسکتی ہے جیسے صحافی برادری بدعنوان سیاست دانوں کو کرسکتی ہے۔

اچانک فرید عباسی نے کہا "جناب والا' میرے دلائل ابھی ختم نہیں ہوئے۔"

جج نے کہا "عدالت کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

فرید نے کہا "عدالت کے پاس جو وقت ہے وہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہے۔ عجلت میں انہیں نظرانداز کرنا انصاف کا خون کرنے کے مترادف سمجھا جاسکتا ہے۔"

"دیکھیے۔ میں آپ کو صرف دس منٹ اور دوں گا" جج نے کہا۔

اب فرید عباسی کے ساتھ بیٹھا ہوا سفید بالوں والا شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا "جناب والا۔ میں عزیز ہاشمی ہوں۔"

جج نے مسکرا کے کہا "ہاشمی صاحب۔ آپ کو تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔"

فرید عباسی نے ایک کاغذ شبنم کی طرف پاس کیا۔ کاغذ مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا بی بی تک پہنچا۔ وہ اٹھ کے پیچھے میرے پاس آیا۔ میرے دائیں بائیں منکر نکیر کی طرح سی آئی اے والے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی جگہ سے ہلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر خود میں اٹھ کر کہیں جاتا تو وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے۔ بی وی مجبوراً تیسری سیٹ پر بیٹھ گیا "اس پر سائن کردیں ناصر صاحب!" اس نے قلم بڑھایا۔

میں نے کاغذ لے لیا۔ یہ عزیز ہاشمی کا وکالت نامہ تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے گردن لمبی کرکے دیکھا "یہ کیا ہے؟"

بی وی بولا "نکاح نامہ ہے ناصر عظیم صاحب کا۔"

دوسری طرف والا بولا "اس کا نام تو چراغ علی ہے۔"

بی وی نے کہا "اوجی نام میں کیا رکھا ہے۔ لالٹین خان یا بلب دین کرلو مگر نکاح نامے میں جو لکھا ہوا ہے' وہی اصل نام ہے۔"

میں نے دستخط کیے ہی تھے کہ بی وی نے فارم اچک لیا ورنہ شاید سی آئی اے والا فارم اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرتا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "تو کون ہے اوئے؟"

باوقار مسکرایا "سب مجھے بی وی کہتے ہیں۔ آپ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہہ لو۔ ویسے میں پریس فوٹوگرافر ہوں۔" وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی دبے پاؤں غائب ہوگیا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "جناب والا' قتل کی ایک اور بھیانک واردات ستائیس دن بعد ہوئی۔ تاریخ تھی سولہ فروری۔ اس میں دو انتہائی غریب اور لاوارث گھریلو ملازمین کو چار افراد نے بڑی بے دردی سے مارا۔ ان میں سے ایک مشہور سیاسی کارکن رئیس خان کا چوکیدار تھا۔ چار فٹ قد کے اس گارڈ کا نام تھا تیس مار خان جو شاید کچھ لوگوں کو مضحکہ خیز لگے مگر وہ ایک انتہائی فرض شناس اور وفادار ملازم تھا۔ یہ پیشہ ور قسم کے قاتل فرید عباسی کا پتا معلوم کرتے ہوئے رئیس خانے پہنچے۔ رئیس خانہ وہ گھر ہے جہاں رئیس خان کا قیام کئی برس سے ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں اور وہ ہاکی پلیئروں کی وردی پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرید عباسی کے علاوہ ملازم سے شبنم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کے خطرناک عزائم کو بھانپتے ہوئے ملازم نے انہیں کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا۔ ان چاروں نے ملازم کو اتنا مارا کہ وہ وہیں مرگیا مگر اس جاں نثار نے جان دے کے بھی کچھ نہیں بتایا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی ہڈیاں سات جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ایک آنکھ باہر نکل آئی تھی۔ اس کو بچانے کی کوشش کرنے والی ملازمہ جس کا نام چھوٹی تھا' بری طرح زخمی ہوئی اور اسپتال پہنچ کے مرگئی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ زیادہ وحشیانہ تشدد کو ظاہر کرتی ہے۔"

وکیل صفائی نے کہا "قتل کی جس واردات سے ملک رب نواز کا کوئی تعلق ہی نہیں' اس کا ذکر کرکے عدالت کا وقت کیوں ضائع کیا جارہا ہے؟"

جج نے سرہلایا "ہاشمی صاحب' یہ اعتراض۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "غلط ہے۔ میں نے تمام عمر اعلیٰ عدالتوں میں گزاری ہے۔ میں عدالت کے وقت کی قدروقیمت سمجھتا ہوں اور خود میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ قتل کی اس دہری واردات میں ملک رب نواز براہِ راست ملوث ہے۔ میرے پاس جو ثبوت ہیں ان کی روشنی میں ملک کا نام ایف آئی آر میں ملزم کی حیثیت سے شامل کیا جانا چاہیے۔ اصل ثبوت عدالت کے سامنے رکھنے سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ یہ ایف آئی آر نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج کی گئی ہے حالانکہ حملہ آور نامعلوم لوگ نہیں تھے۔ میں دوسری ایف آئی آر فرید عباسی وکیل کی مدعیت میں درج کرانے کے لیے عدالت کے احکامات چاہتا ہوں۔ وہ ملزم فرید عباسی اور شبنم فاروقی کی تلاش میں تھے اور ان کو قتل کرنے آئے تھے مگر ان کا پتا نہ بتانے کے جرم میں دو وفادار ملازم مارے گئے۔ اس سے پہلے کہ عدالت ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ کرے' میں اس سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔"

عدالت ہاشمی صاحب کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔ جج نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اجازت دے دی۔ وکیل صفائی کے احتجاج کے باوجود ملک کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ اب وہ کچھ نروس تھا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "ملک صاحب۔ آپ صوبائی اسمبلی کے رکن تھے۔"

ملک نے سرہلایا "ہمیشہ سے ہیں جی اور رہیں گے انشاء اللہ۔"

"ابھی عدالت کو ایک تصویر دکھائی گئی تھی۔ آپ مانتے ہیں کہ وہ آپ کی لینڈ کروزر تھی۔ جو پولیس فارم میں کھڑی تھی۔"

"ہاں مگر تصویر پر تاریخ نہیں لکھی تھی" وہ بولا۔

"اپنی گاڑی کا نمبر بتایئے پلیز!"

ملک تھوڑا جز بز ہوا مگر اس نے نمبر بتادیا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "سولہ فروری کو یہ گاڑی کہاں تھی؟"

ملک بولا "یہ کیسا سوال ہے جی۔ ہماری گاڑی ہمارے پاس تھی۔"

"اس دن یہ گاڑی کہاں کہاں گئی تھی؟"

ملک نے کہا "یہ مجھے کیا معلوم۔ دن میں دس جگہ گئی ہوگی۔ ڈرائیور سے بھی پوچھیں گے تو اسے یاد نہیں ہوگا۔"

"لاہور سے باہر تو نہیں گئی تھی۔ مثلاً دو سو میل دور آپ کی سسٹر کے گھر؟" ہاشمی صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں' پچھلے دو ہفتوں سے میں لاہور سے باہر نہیں گیا۔"

"آپ کی گاڑی بھی سولہ فروری کو لاہور میں ہی تھی۔ پکا پتا ہے آپ کو۔ ایسا تو نہیں کہ آپ نے یا ڈرائیور نے گاڑی کسی کو دی ہو اور وہ گاڑی لے کر شہر سے باہر چلا گیا ہو سارا دن کے لیے۔"

ملک نے جھنجلا کے کہا "اونہیں جی! یہ گاڑی کوئی اور نہیں لے جاسکتا۔"

"آپ سے یا آپ کے ڈرائیور سے گاڑی نہ کسی نے

چھینی۔ نہ گاڑی کے چوری ہونے کی رپورٹ ہے۔"

ملک کا حوصلہ جواب دینے لگا "آخر مطلب کیا ہے' آپ کا؟"

ہاشمی صاحب نے اچانک وار کیا "ملک رب نواز۔ یہ تمہاری گاڑی تھی جس میں وہ قاتل آئے تھے۔ یہ بیمانہ واردات دن کے بارہ بجے ہوئی تو تمہاری گاڑی رئیس خانے کے باہر موجود تھی۔"

"یہ غلط ہے' جھوٹ ہے" ملک نے کہا۔

ہاشمی صاحب نے کہا "اب آپ جاسکتے ہیں۔"

جج نے کہا "دلائل کو مختصر کیجئے ہاشمی صاحب!"

"میں صرف پانچ منٹ اور لوں گا" ہاشمی صاحب نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا "جناب والا۔ رئیس خان کی ملازمہ چھوٹی نے مرنے سے پہلے ایک بیان دیا تھا۔ قانون کی نظر میں اس بیان کی بڑی اہمیت ہے اور عام طور پر اسے سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بیان میں واضح طور پر ملک رب نواز کو قتل کا ذمے دار قرار دیا تھا۔ اس نے گاڑی کا رنگ اور آدھا نمبر بھی دیکھا تھا۔ یہ بیان ایک مجسٹریٹ صمد خان نے ڈی ایس پی خورشید کیانی کے سامنے ریکارڈ کیا تھا۔ بیان اس کے ریڈر علاؤالدین نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور اس پر ڈیوٹی دینے والے سینئر ڈاکٹر امجد نے بطور گواہ دستخط کیے تھے۔"

وکیل صفائی نے مسکراتے ہوئے کہا "یور آنر۔ یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ اس میں ایسی کوئی بھی بات نہیں۔"

جج نے فائل پلٹ کے ایک جگہ سے کھولی "یہ بیان موجود ہے۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "میں یہ بیان دیکھنا چاہوں گا۔"

ریڈر نے فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈال کے ہاشمی صاحب نے کہا "محترم وکیل صفائی' اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ مرنے والی نے دیا تھا؟"

وکیل صفائی نے کہا "اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ اس کو مجسٹریٹ نے ATTEST کیا تھا۔"

"یہ ہینڈ رائٹنگ مجسٹریٹ کے ریڈر علاؤالدین کی ہے اور یہ دستخط ڈی ایس پی خورشید کیانی کے ہیں؟ میں نے ایس ڈی ایم صمد خان اور ڈی ایس پی خورشید کیانی کو یہاں دیکھا تھا۔ ان سے معلوم کرلیا جائے۔"

"شک و شبے کی کوئی بات نہیں ہاشمی صاحب!" جج نے کہا "یہی اصل بیان ہے۔"

ہاشمی صاحب نے دہاڑ کے کہا "وہ اصل بیان ہے یور آنر تو پھر یہ کیا ہے۔ وہ بیان جعلی ہے۔ اصل بیان وہی ہے جو میں نے عدالت کو بتایا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اس کی تصدیق شدہ فوٹو کاپی ہے۔"

عدالت میں ایک لمحے کے لیے سناٹا چھاگیا۔ میں نے رب نواز کو دیکھا۔ اس کا رنگ اڑگیا تھا۔ جج اب چھوٹی کے پہلے والے بیان کی فوٹو کاپی دیکھ رہا تھا اور عدالت میں شور مچ گیا تھا۔ جج نے دوبار "آرڈر' آرڈر" پکارا اور پھر دونوں وکیل صفائی کو قریب بلالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس بیان نے ملک رب نواز کے دفاع کی بنیادوں کو ایسے تباہ کردیا ہے جیسے ایٹمی دھماکے نے ہیروشیما کا وجود مٹادیا تھا۔

پانچ منٹ بعد جج نے ڈوگر صاحب اور اکبر سبحانی ایڈووکیٹ کو واپس بھیج دیا۔ انہوں نے پانچ منٹ کے لیے اپنے مؤکل سے مشورے کی مہلت مانگی اور پھر جج سے کچھ کہا۔ پریشانی سب کی صورتوں سے عیاں تھی مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ابھی ان کے پاس لڑنے کے لیے گراؤنڈز موجود تھے۔

جج نے سرہلایا اور کہا "ہاشمی صاحب۔ جس بیان کی یہ فوٹو کاپی ہے اس کا اصل کہاں ہے؟"

ہاشمی صاحب نے ایک ڈرامائی سانس لی "وہ کہاں ہوسکتا ہے جناب والا۔ نقل کو سامنے لانے کے لیے اصل کو ضائع کرادیا گیا ہے۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس بیان کو کس کے ایما پر ہٹادیا گیا ہوگا۔ جس کا نام لیا تھا مرنے والی نے اور جسے اپنا قاتل کہا تھا وہی اس بیان کا خریدار تھا۔ رب نواز نے کوشش کی تھی کہ انصاف کے عمل کو سبوتاژ کردے۔ اس نے ان سب کا ایمان خرید لیا تھا جو وہاں موجود تھے۔ یہ انسانیت کے نام کو رسوا کرنے والے اور اپنے ضمیر کو بے غیرتی کے ساتھ فروخت کرنے والے کون لوگ ہیں جن کو رب نواز نے اس عورت کے مرنے کے بعد خریدا؟ میں بتاتا ہوں ان کے نام۔ سب سے پہلا مجرم ہے ایس ڈی ایم کا ریڈر علاؤالدین۔ پہلا بیان اسپتال میں اس نے خود لکھا تھا۔ یہ دوسرا بیان بھی اسی کے ہینڈ رائٹنگ میں لیا گیا۔ دوسرا مجرم ہے ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ تیسرا مجرم خود وہ مجسٹریٹ ہے جس نے ایک بیان اسپتال میں ATTEST کیا تھا۔ اس وقت وہ عورت زندہ تھی مگر بیان پر دستخط نہیں کرسکتی تھی۔ اسے دستخط کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے انگوٹھا لگایا تھا۔ اسی مجسٹریٹ نے اپنے ریڈر کے لکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے دوسرے بیان کو بھی ATTEST کردیا۔ اس مجسٹریٹ کا نام ہے صمد خان۔ ان سب کو رب نواز نے اپنی زندگی کی قیمت دی۔ ورنہ یہ بیان پھانسی کا پھندا بن کے اس کے گلے میں پڑجاتا۔"

وکیلِ صفائی نے شدید احتجاج کیا "یہ ایک بے بنیاد الزام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

ہاشمی صاحب مسکرائے "خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔ اصل کو رب نواز نے ضائع کرادیا تھا مگر ایک دستِ غیب نے اسے محفوظ رکھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اصل کی یہ نقل میں نے کیسے حاصل کی۔ اپنے SOURCE کی نشاندہی کرنا قانوناً مجھ پر لازم نہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ کوئی تھا جو یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس نے اصل کی ایک نقل بنا کے مجھے بھیج دی۔ اصل بیان پر گواہی تھی اس ڈاکٹر کی جو چھوٹی کے مرنے کے وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے کچھ نہیں سنا تھا اور کچھ نہیں پڑھا تھا۔ اس نے خوش اعتقادی اور خوش اعتقادی میں بطور گواہ اس پر اپنے دستخط ثبت کردیے تھے۔ جب بیان دوبارہ لکھا گیا تو اس گواہ کو دوسری بار دستخط کرنے کا معاوضہ دس لاکھ روپے دیا گیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ڈاکٹر نے بھی دس لاکھ میں اپنا ضمیر بیچ دیا۔"

جج نے کہا "کیا آپ اپنے دعوے کی صداقت ثابت کرسکتے ہیں؟"

"جنابِ والا۔ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ کیا کہہ رہا ہوں اور کس سے کہہ رہا ہوں۔ ثبوت اور گواہ' ان کے بغیر کوئی سچ بھی سچ نہیں ہوتا اور جھوٹ اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ جائے واردات پر کم سے کم نصف درجن چشم دید گواہ تھے۔ پولیس کے آتے ہی سب غائب ہوگئے۔ کیا پولیس انہیں تلاش نہیں کرسکتی تھی؟ وہ سب آس پاس رہنے والے لوگ تھے مگر وہاں پولیس کا ایک معمولی سب انسپکٹر یا کانسٹیبل مارا جاتا تو پولیس سب کو گواہی میں گھسیٹ لاتی۔ جو وہاں نہیں تھے وہ بھی شناختی پریڈ میں قاتل کو پہچان لیتے۔ اس ملک کے پہلے سب سے مقبول وزیراعظم کے قتل کے کتنے گواہ تھے؟ وہ لاکھوں افراد جو اس جلسہ عام میں شریک تھے لیکن ان کے قتل کا سارا انتظام تو خود وزارت داخلہ کی حسنِ کارکردگی کا نمونہ تھا۔ پولیس قاتل کے ساتھ تھی۔ ثبوت' شہادت سب کس نے ضائع کیے؟ خود پولیس نے پھر اس بے چارے لاوارث مظلوم گھریلو ملازموں کے جوڑے کی کیا حیثیت تھی مگر جنابِ والا! قدرت کا نظامِ انصاف کسی دھاندلی سے معطل یا مفلوج نہیں کیا جاسکتا۔ ملاحظہ فرمائیے یہ ثبوت۔"

ریڈر نے کاغذ کا وہ پرزہ پکڑ لیا اور جج کے سامنے رکھ دیا "یہ تو چیک ہے؟"

"یور آنر۔ یہ دس لاکھ کا چیک ہے جو ڈاکٹر امجد کو دیا گیا تھا۔ یہ چیک دینے والا تھا رب نواز۔ یہ اکاؤنٹ نمبر رب نواز کا ہے۔ یہ دستخط رب نواز کے ہیں لیکن یہ چیک کیش نہیں کرایا گیا۔ شاید ڈاکٹر امجد نے چیک سے ادائیگی قبول نہیں کی۔ اسے نقد رقم ادا کردی گئی لیکن ابھی مجھے عدالت کے سامنے آخری ثبوت رکھنا ہے۔ یہ مرنے والی ملازمہ چھوٹی کے شناختی کارڈ کی کاپی ہے۔ اس پر چھوٹی کی تصویر نہیں ہے۔ اس نے دستخط کی جگہ پر اپنا انگوٹھا لگایا ہے۔ اب آپ کے سامنے مقتولہ کے دو آخری بیان ہیں۔ ایک اصل اور دوسرا فوٹو کاپی۔ شناختی کارڈ والے انگوٹھے کا نشان اور فوٹو کاپی والے انگوٹھے کا نشان ایک ہیں کیونکہ یہ اصل نشانات ہیں۔ بعد میں لکھے جانے والے بیان پر سب کے دستخط ٹھیک ہیں مگر اس پر مقتولہ کے انگوٹھے کا نشان کہاں سے آتا۔ اس وقت مقتولہ کا مردہ جسم ایک سردخانے میں پڑا تھا اور اس کی تدفین کے انتظامات ہورہے تھے۔ اپنے انجام سے بے خبر ریڈر نے اس پر ایک انگوٹھے کا نشان لگادیا۔ غالباً یہ اس کا اپنا انگوٹھا یا انگلی کا نشان ہوگا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ کبھی یہ عدالت میں بھی چیلنج ہوجائے گا مگر عدالت ماہرین کی رائے لے سکتی ہے۔"

میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ فرید عباسی نے بڑی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے عزیز ہاشمی جیسے سینئر وکیل کو اپنے ساتھ شامل کرلیا تھا۔ عدالت میں اچانک سناٹا چھا گیا تھا۔ اب فرید عباسی اور شبنم کی حیثیت اس کیس میں ایک مدعی جیسی ہوگئی تھی۔

عزیز ہاشمی کی آواز گونجی "اگر ملک رب نواز کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو یہ ایک آدمی کے خون کا مزہ چکھنے کے بعد آزادانہ گھومنے والے درندے کو شریف' بے بس اور کمزور انسانوں کی بستی میں بے خوفی سے پھرنے کا کھلا لائسنس دینے کے مترادف ہوگا۔ قانون' جو کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے' آخر کب تک ایک خاموش تماشائی بنا خود اپنا مذاق اڑائے گا۔ ابھی جو صفراں نے بتایا اور جوانیس جنوری اور سولہ فروری کے دن ہوا۔ اس کے بعد شک وہی کرسکتا ہے جو عمداً اندھا گونگا اور بہرا بننا چاہے۔ حقائق سے جانتے بوجھتے نظریں چرائے اور مجرم کا ساتھی ہو۔"

زورِ خطابت میں عزیز ہاشمی نے براہِ راست نہ سہی مگر جج

کو خبردار کردیا تھا کہ اتنا ثبوت ملنے کے بعد بھی اس نے رب نواز کی ضمانت کی توثیق کی تو وہ شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔

وکیلِ صفائی نے اٹھ کے کہا "جنابِ والا۔ میرے فاضل دوست صریحاً توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

عزیز ہاشمی نے فوراً جواب دیا "ہرگز نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس عدالت کو شک ہے۔ میں نے جو کہا وہ اس کے لیے ہے جو ملزم کا دفاع کرے۔"

عدالت میں ایک دم شور مچ گیا تھا۔ ملک رب نواز کی حالت قابلِ دید تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پر پارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔ ملکانی زور زور سے رونے لگی تھی اور دلنواز اسے چپ کرانے میں مصروف تھا۔ شبنم کے ساتھی صحافی بہ آوازِ بلند یہ رائے دے رہے تھے کہ رب نواز کو سزا ملنی چاہیے۔ وکیلوں کا تبصرہ بھی ضمانت منسوخ کرنے کے حق میں تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ ان حالات میں رب نواز کی ضمانت پر رہائی کا امکان باقی نہیں رہا اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کے احکامات جاری ہوجائیں گے۔

ابھی جج نے بہ آوازِ بلند "آرڈر' آرڈر" کہا ہی تھا کہ ایک دم صورتِ حال بدل گئی۔ پیچھے کی طرف سے ایک فائر سنائی دیا۔ یہ فائر کمرۂ عدالت میں کسی نے کیا تھا۔ فائر کرنے والا عدالت میں نہیں تھا کیونکہ سب کے ساتھ میں نے بھی پلٹ کے دیکھا تو سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اس کے فوراً بعد دوسرا فائر ہوا۔

اب لوگ بدحواس ہوکے اٹھے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کچھ لوگ "پکڑو' پکڑو" چلا رہے تھے۔ شاید فائر کرنے والا برآمدے میں کھڑا تھا مگر اس نے فائر کورٹ روم میں کیے تھے۔ یہ کنفرمشکل ہے کہ اس نے کسے نشانہ بنایا تھا۔

جج کو فوراً محافظوں نے اپنے نرغے میں لے لیا اور وہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے ہی چیمبر میں چلا گیا۔ کچھ لوگ جان بچانے کے لیے سیٹوں کے درمیان چھپ گئے تھے۔ صحافی اور وکیل چلا رہے تھے کہ کورٹ میں یہ کیا دہشت گردی ہورہی ہے۔ پولیس کورٹ کے باہر فائرنگ کے مجرم کو پکڑنے کی کوشش یا کوشش کا ڈراما ضرور کررہی تھی۔

کورٹ کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہیں جب خود پولیس نے عدالت کا احترام پامال کیا اور عدالت کے اندر گھس کر لاٹھی چارج' شیلنگ اور فائرنگ کی۔ مخالف فریقوں کی فائرنگ تو کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوتی مگر یہ بھی پولیس کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اس ملک کی تاریخ کے بہت سے باب خونی ہیں۔ یہاں قومی اسمبلی کے ایک ڈپٹی اسپیکر کو ایوان کے اندر قتل کیا گیا۔ ہائی کورٹ کی دیواریں خون سے رنگین ہوئیں۔ دہشت گردوں نے سجدے میں نمازیوں پر گولیاں برسائیں۔

شبنم نے چیخ کے کہا "ملزم بھاگ رہا ہے۔"

فرید عباسی چلایا "رب نواز کو جانے نہ دیا جائے۔"

لیکن میں بھی سمجھتا تھا کہ یہ PANIC اور افراتفری پھیلانے کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ فائر کسی کو نشانہ بنا کے نہیں کیے گئے تھے۔ یہ فرار کے طے شدہ منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ ضمانت منظور نہ ہونے کی صورت میں رب نواز کو عدالت سے نکال لے جانے کی STRATEGY تھی اور رب نواز کے ساتھ آنے والے اس کی ہدایات کے مطابق ایک انتظام کرکے آئے تھے۔ وہ رب نواز کے پہنچنے کے بعد عدالت میں داخل ہوئے تھے اور آس پاس کے برآمدوں میں پھیل گئے تھے۔ اگر رب نواز کو نکلنے کا موقع نہ دیا جاتا تو مزاحمت کرنے والوں کو نشانہ بنانے سے گریز نہ کرتے۔

پولیس حسبِ توقع رب نواز کے پلان میں اس کی معاون اور مددگار تھی۔ رب نواز اطمینان سے باہر نکلا اور بھگدڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور نمک خواروں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ جانتے بوجھتے پولیس دیر سے حرکت میں آئی اور اسے اپنی گاڑی تک پہنچنے کی مہلت فراہم کی۔ اس کارِ خیر کا معاوضہ یقیناً انہیں پہلے ہی ادا کردیا گیا تھا۔ وہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد بھی رب نواز سے انعام لے سکتے تھے۔

میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکر نکیر اس افراتفری سے بالکل متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے صورتِ حال کو سمجھتے ہی مجھے دونوں طرف سے دبوچ لیا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور وہ مجھے عدالت کے اندر سے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ عدالت کا کمرا اب تقریباً خالی ہورہا تھا۔ شبنم کے ساتھ آنے والے بارعب وقار نے بڑی ہوشیاری سے تصویر کشی کی تھی جس کی عام حالات میں کورٹ کے اندر اجازت نہیں ہوتی۔

میں نے چلانا شروع کیا "یہ کیا ہے۔ مجھے کیوں پکڑا ہے تم نے۔ میرا اس ہنگامہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"تیری تو شرافت کی ماں۔۔۔" مجھے گرفتار کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

دوسرے نے میری گدی پر ہاتھ مار دیا "چپ کرکے چل۔۔۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رئیس میرے ساتھ ہی اٹھا تھا مگر پھر وہ پیچھے رہ گیا۔ اس نے مجھے مخاطب کیے بغیر کہا "میں دیکھتا ہوں نیلم آئی ہے کہ نہیں؟"

دروازے سے باہر آتے ہی مجھے وردی پوشوں کی ایک فوج نے گھیرے میں لے لیا۔ ذرا سی دیر میں میرے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑ دیے گئے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کے میرے فرار ہونے کے امکانات ختم کر دیے گئے۔ میں نے برآمدے کی سیڑھیوں کے بعد ڈی ایس پی خورشید کیانی اور انسپکٹر راؤ کو کھڑا دیکھا۔ وہ وہاں میری گرفتاری کی ساری کارروائی کی خود نگرانی کے لیے موجود تھے۔ گزشتہ رات نااہل ماتحتوں کی وجہ سے میں نکل گیا تھا۔ دوبارہ وہ کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ موڈ تو ان کا میں دو منٹ میں ٹھیک کر سکتا تھا مگر میں خود مار دھاڑ کے موڈ میں نہیں تھا۔

بہت سے وکیلوں نے پولیس کی اس لاقانونیت کے خلاف احتجاج کیا اور کچھ جوشیلے نوجوانوں نے نعرے بھی لگائے۔ دیکھتے دیکھتے کیانی کی جیپ کے سامنے کالے کوٹوں والے جمع ہو گئے۔ یہ سب طے شدہ منصوبے کا ایک حصہ تھا اور پولیس کی کارروائی میں رخنہ اندازی کرنے والے زیادہ تر وکیل فرید عباسی اور عزیز ہاشمی کے حامی تھے۔ باقی اپنے ساتھیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

جیپ کے پیچھے پولیس کی وہ گاڑی آگئی تھی جس میں ڈال کے مجھے لے جانا مطلوب تھا مگر اب وکیلوں کے ساتھ عام لوگ اور صحافی بھی راستہ روکے کھڑے تھے اور اس مجمع پر لاٹھی چارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک وکیل نے کہا "کیانی صاحب، یہ کیا ہو رہا ہے عدالت کے احاطے میں؟"

"ہم نے ایک مفرور مجرم کو پکڑ کے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا" وہ بولا۔

راؤ نے کہا "مجرم اگر عدالت میں گھس کر بیٹھ جائے یا مسجد میں پناہ لے لے تو ہم کیا اسے چھوڑ کے چلے جائیں؟"

اچانک برادر ابراہیم درانی اور ٹی وی نمودار ہوئے۔ کچھ کہے سنے بغیر ٹی وی نے فلیش چمکا کے ایک تصویر بنالی۔ اس وقت سی آئی اے کا ایک اہلکار مجھے ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ساتھ گاڑی کی طرف کھینچ رہا تھا اور دوسرا مجھے ایسے دھکیل رہا تھا کہ تصویر میں یہ منظر جسمانی زور آزمائی کا نظر آتا۔

"سر جی! کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" برادر نے کہا۔

"کچھ نہیں برادر۔ یہ وہی مجرم ہے، چراغ علی!"۔۔۔۔۔

برادر نے ہاتھ اٹھایا "ایک منٹ۔ عدالت میں بھی کسی نے کہا تھا کہ یہ وہی بندہ ہے۔"

"ہاں جی۔ یہ۔۔۔ کل پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا" راؤ نے کہا۔

برادر نے نفی میں سر ہلایا "یہ کوئی غلط فہمی لگتی ہے مجھے۔ یہ ہرگز وہ بندہ نہیں ہے۔ کیا نام تھا اس کا چراغ علی۔"

میں نے پھر شور مچایا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ میں اس شہر کا ایک بزنس مین ہوں۔"

"چپ کر بزنس مین کے نطفے" راؤ نے مجھے ایک ہاتھ مار دیا۔

وکیل اور صحافی ایک ساتھ بولنے لگے "کیا آپ زبردستی منوائیں گے کہ یہ چراغ علی ہے۔"

"اس بے چارے کی بھی سن لیں۔"

ڈی ایس پی گرم ہو گیا "ہم نے کل اسے قبرستان سے پکڑا تھا۔ وہاں بھی ایسا ہی ڈراما کیا تھا اس نے۔ اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔ برادر، آپ کے ساتھ فرید عباسی وکیل اور مس شبنم بھی تھے، انہی بلائیں۔"

"وہ تو یہاں نظر نہیں آ رہے ہیں" برادر نے کہا۔

پھر کوئی بولا "لو جی ہاشمی صاحب آ گئے۔"

ہاشمی صاحب کی شخصیت اور بزرگی کا احترام تھا کہ نوجوان وکیل ایک طرف ہو گئے۔ ہاشمی صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "بھئی کیانی صاحب، کیا مداری کا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب۔ انہیں سمجھائیں، یہ لوگ بضد ہیں کہ میں چراغ علی ہوں۔"

ہاشمی صاحب نے کہا "بھئی یہ کہتے ہیں تو مان لو ورنہ یہ تھانے لے جا کے منوائیں گے۔"

"ہاشمی صاحب! یہ حرامی ڈرامے باز ہے" کیانی نے برہمی سے کہا۔

"یہ خیال رکھیں کہ ناصر عظیم صاحب میرے مؤکل ہیں" ہاشمی صاحب نے کہا "مجھے بتائیں کہ انہیں کس جرم میں پکڑا ہے آپ نے؟"

"آپ جانتے ہیں اسے۔ یہ ناصر عظیم ہی ہے؟" کیانی بولا۔

"میں کیا۔۔۔ سارا شہر جانتا ہے۔ یہ پرانے بلڈر ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا پرانا بزنس ہے ان کا۔ کرنل خان کے ساتھ بھی رہتے تھے پہلے۔"

فوٹو گرافر ٹی وی نے سرہلایا "غالباً ڈاکٹر کمال بھی ان کے

دوست ہیں۔ کمال اسپتال، کمال کا اسپتال والے۔"

"ہاں۔ وہ بھی دوست ہیں میرے۔ انہیں بلالو۔ ابوبکر آزاد صاحب مجھے جانتے ہیں" میں نے کہا "قلم اٹھا رنیلم دس سال سے جانتی ہیں مجھے۔"

اب صورتِ حال کیانی کے لیے پریشان کن ہونے لگی تھی۔ رائے عامہ پولیس ایکشن کے خلاف ہمیشہ رہتی ہے۔ یہاں مخالفت کرنے والے، معاشرے میں معتبر سمجھے جانے والے لوگ تھے۔ ان کے سامنے کوئی بھی غیر قانونی حرکت بعد میں اس کے لیے پریشانی کا موجب ہو سکتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ان سب کو جھٹلا قرار دے کر ان کی گواہی کو مسترد کر دیا جائے۔

بالآخر چالاک خورشید کیانی نے اس مشکل سے نکلنے کا وہی راستہ تلاش کیا جو آسان اور منطقی تھا۔ "دیکھئے، یہاں بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ میرے آفس آ جائیں۔ میں سب وضاحت کر دوں گا۔ ہم نے اس شخص کو کل رات قتل، اغوا اور ڈکیتی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہونے کی وجہ سے پکڑا تھا۔"

برادر نے کہا "جو آپ کے ہتھے چڑھ جائے اس کے کھاتے میں سب ڈالا جا سکتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں برادر۔ ثبوت گواہ سب ہیں ہمارے پاس" کیانی نے شکایت کے انداز میں کہا۔

"کون ہے آپ کا گواہ؟" ایک وکیل بولا۔

"چور کا گواہ ڈاکو، مجنوں کا گواہ فرہاد" کسی نے مذاق کیا۔

"آپ مطمئن رہیں۔ بہت معزز گواہ ہیں اس کے جرائم کے۔ میں سب کو پیش کروں گا" خورشید کیانی نے کہا۔

بالآخر اس پر اتفاق رائے ہو گیا۔ چار صحافی اور وکیلوں کے چار نمائندے ڈی ایس پی کے آفس جائیں گے۔ وہاں ایک پریس کانفرنس میں کیانی میرے جرائم کی تفصیل پیش کرے گا اور مجھے بھی موقع دیا جائے گا کہ میں اپنی صفائی میں جو کہنا چاہوں کہہ سکتا ہوں۔

عزیز ہاشمی نے کہا "میں تو معذرت چاہتا ہوں لیکن فرید عباسی کو بھیج دیتا ہوں میں۔ کہاں ہے وہ؟" انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

"فرید عباسی تو کل گرفتاری کے وقت بھی موجود تھے اور تھانے بھی آئے تھے۔" کیانی نے کہا "وہ مجرم کو خود شناخت کر سکتے ہیں۔"

فرید عباسی پیچھے سے نمودار ہوا "ہاں، لیکن وہ دوسرا آدمی تھا۔ اس کی جگہ ناصر عظیم صاحب کو کیسے پکڑ سکتے ہیں آپ؟"

برادر نے سگریٹ کا کش لے کر کہا "ارے بھئی، ڈی ایس پی صاحب کی نظر میں ناصر عظیم ہی چراغ علی ہے۔ تو بس ہے، میں نے بھی کہا تھا ان سے۔"

ہاشمی صاحب بولے "بھئی فرید۔ تم چلے جاؤ کیانی صاحب کے ساتھ اور اسے بھی لے جاؤ۔ بار کا سیکریٹری وکیلوں کا صحیح نمائندہ ہوتا ہے۔ اکیلا ہی چار کے برابر ہے۔"

ہاشمی صاحب نے جس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا وہ درمیانی عمر کا ذہین اور تیز طرار شخص تھا۔ "آپ کا حکم ہے تو ٹھیک ہے مائی باپ۔"

صورتِ حالات ہر طرح سے میرے حق میں سازگار ہوتی جا رہی تھی۔ خورشید کیانی کو رب نواز کیس میں بھی ہزیمت اٹھانی پڑی تھی مگر وہ روایتی طور پر بیوروکریسی کی مشینری کو چلانے والا ایک اہم پرزہ تھا اور ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہونا نہیں جانتا تھا۔ رشوت لے کر بیان بدلنے کے الزام کا ثبوت صرف ڈاکٹر امجد کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ اس کا اور مجسٹریٹ کا نام بھی لیا گیا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چراغ علی کا معاملہ بھی گڑبڑ ہو گیا تھا۔ وہ پرانا پولیس افسر ہونے کی وجہ سے اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ غلطی اگر ہوئی ہے تو رب نواز سے۔ سارے غلط کام کرنے والے کو اخبار والوں سے اور وکیلوں سے ایک ساتھ پنگا نہیں لینا چاہیے تھا۔ کوئے سیاست کا پرانا رہ نورد ہونے کے باوجود رب نواز نے ڈپلومیسی سے کام لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی کہ اس کے ساتھ اس کے دوست بھی موردِ الزام ٹھہرائے جا رہے تھے۔

ایک شاطر اور معاملہ فہم انتظامی افسر کی طرح اس نے معاملات کو مزید الجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کی اور پہلا کام یہ کیا کہ سب کے سامنے انہیں معطل کر دیا جو مجھے ہتھکڑی اور بیڑی پہنانے کے ذمے دار تھے۔ اس نے راؤ انور علی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا اور انور علی صاف مکر گیا کہ میں نے کسی کو یہ حکم نہیں دیا تھا۔ نزلہ بر عضو ضعیف۔ افسرانِ بالا کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ماتحت نے الزام قبول کیا اور معطلی کے حکم کو بھی ناانصافی نہیں کہا۔ سب جانتے تھے کہ یہ محض ڈراما ہے۔ اخبار میں کیانی صاحب کے قانونی اقدام کی خبر چھپ جانے کے بعد وہ کسی بھی دن کسی قسم کی ضابطے کی کارروائی کے بغیر خود بخود بحال بھی ہو جائیں گے۔

شاید مجھے کورٹ میں دیکھتے ہی کیانی نے میری گرفتاری کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقینی بنانے کے ساتھ پریس کانفرنس میں مجھے پیش کرنے کے انتظامات بھی کرنے تھے۔ اس نے افسران بالا سے بھی اجازت لے لی ہوگی کہ ایسے خطرناک مجرم کے بارے میں پریس کو بریفنگ دینا ضروری ہوگا۔ اسے یہی یقین ہوگا کہ ملک رب نواز کی ضمانت کی توثیق ہوجائے گی تو وہ خود بھی پریس کانفرنس میں موجود ہی ہوگا اور میرے سارے جرائم کی تفصیل خود فراہم کرے گا۔ اس کی یہ امید تو پہلے ہی خاک میں مل گئی تھی پھر کورٹ کے باہر صورت حال غیر متوقع انداز میں پلٹ گئی۔ وہ مشتعل ہوجاتا تو ایک طرف اخبار والے ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑجاتے تو دوسری طرف اس کے غیر قانونی اقدام کے خلاف کیس شروع ہوجاتے۔ افسران بالا کہاں تک سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرتے۔ اسے یہاں سے ٹرانسفر ضرور کردیا جاتا۔ اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہ پوسٹنگ لینے کے لیے اس نے جو ٹوڑ اور سفارش کے ساتھ اعلیٰ ترین افسران کی "خدمت" بھی کی ہوگی اور اس کی جگہ لینے کے لیے اس کا پتا کاٹنے کے خواہش مند بھی بہت ہوں گے جو اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔

ڈی ایس پی آفس تک پہنچتے پہنچتے خورشید کیانی نے اپنی دفاعی حکمت عملی طے کرلیا تھی۔ مجھے براہِ راست پیچھے کی طرف ایک ایسے کمرے میں پہنچادیا گیا جو شاید افسران کے آرام کے لیے مخصوص تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جس سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا لیکن میں پریس کانفرنس کی ساری کارروائی اور وہاں کہا جانے والا ہر لفظ صاف سن سکتا تھا۔

آغاز میں ہی ایک صحافی نے پوچھ لیا "اسے سامنے کیوں نہیں لایا جارہا ہے جسے ایک شریف آدمی ہونے کے جرم کی سزا دی جارہی ہے؟"

کیانی نے کہا "آپ نے تو ساعت شروع ہونے سے پہلے ہی مقدمے کا فیصلہ سنادیا۔ اسے بھی پیش کیا جائے گا اور آپ اس سے جو پوچھنا چاہیں پوچھیں لیکن پہلے میری عرض سن لیں۔ بلکہ سب سے پہلے تو ایک کپ چائے کا پی لیں۔ ہم سب کورٹ سے تھک کے آئے ہیں۔ بعض دن بڑے تھکادینے والے ہوتے ہیں۔"

"اور تھکن کا فائدہ بھی نہ ہو تو زیادہ افسوس ہوتا ہے" کسی نے طنز کیا۔

کیانی نے کہا "بالکل۔ آپ کا پیشہ الگ ہے مگر ایسا آپ کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ دن رات ایک کردیے کسی خبر کے لیے اور آخر میں پتا چلا کہ رائی کا پہاڑ تو کیا پتھر بھی نہیں بنایا جاسکتا۔"

بار کے سیکریٹری کی آواز آئی "سرجی' کام کی بات کریں۔"

کیانی نے کہا "مجھے احساس ہے کہ آپ سب کا وقت قیمتی ہے' مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ حقائق کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں اور تجزیہ کریں۔ یہ شخص جسے عدالت کے باہر سے گرفتار کیا گیا' آج خود کو ناصر عظیم کہہ رہا ہے' کل جب ہم نے اسے گرفتار کیا تھا۔ آیئے مس شبنم! آپ کی کمی سب کو محسوس ہورہی تھی۔"

شبنم نے کہا "دیکھیے' اس کمی کو میں نے کیسے پورا کیا ہے۔ اب آپ سمیں گے یہ زیادتی ہے۔"

کیانی نے کہا "زیادتی تو خیر ہے۔ میں نے گزارش کی تھی کہ چار نمائندے ہوں تو اچھا ہے۔ آپ نے اتنا مجمع اکٹھا کرلیا۔"

"مداری تو خوش ہوتا ہے جب اس کی ڈگڈگی پر زیادہ لوگ متوجہ ہوں' یہاں اتنے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام نہیں تھا۔"

کسی نے کہا "ہم اسکول میں بھی بینچ پر کھڑے رہتے تھے۔ یہاں آپ کے لیے ایک ٹانگ پر بھی کھڑے ہوسکتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں عرض کررہا تھا کہ کل رات کو ہم نے اس داڑھی والے شخص کو قبرستان سے گرفتار کیا۔ اتفاق سے وہاں فرید عباسی اور مس شبنم موجود تھے۔"

"خدا آپ کو ایسے سنگین اتفاقات سے محفوظ رکھے۔ ہم رب نواز کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کو دفن کرنے گئے تھے" فرید عباسی نے تلخی سے کہا۔

"آپ وکیل ہونے کے باوجود ایسی بات کہتے ہیں۔ آپ کے کہنے سے وہ قاتل نہیں مانا جاسکتا" کیانی نے ناگواری سے کہا "آپ کی ذاتی رائے میں مجھے ذاتی عناد کی بُو آتی ہے۔"

"اور آپ کی طرف داری میں مجھے دس لاکھ کے نوٹوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے" فرید عباسی نے بھی تلخ ہوکے کہا۔

"پلیز' سوچے سمجھے بغیر مت بولیں" کیانی گرم ہوگیا "میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔"

بات بڑھنے سے پہلے دوسرے وکیلوں نے فرید کو روک دیا۔ "او یار جی' ایسے تو کوئی بات نہیں ہوسکتی۔" بار کے سیکریٹری نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

فرید کی طرف سے شبنم نے کہا "ڈی ایس پی صاحب' آپ کیا ہم سے زبردستی اعتراف کرائیں گے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ بندہ چراغ علی نہیں ہے۔"

کیانی بولا "چلیں جی' آپ مت مانیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام وہی ہو جو یہ اب بتا رہا ہے۔"

"آپ کے پاس وارنٹ ہیں چراغ علی ولد باغ علی کے اور پکڑلیا ہے آپ نے ایک شریف اور معزز شہری ناصر عظیم کو" فرید عباسی بولا۔

"ابھی آپ کے سامنے وہ لوگ اسے خود شناخت کریں گے جن کی گواہی اس کیس کی بنیاد ہے۔ میری مراد ہے رب نواز اور اس کی فیملی۔ یہ شخص دن دہاڑے ملک رب نواز کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس نے چوکیدار کو زخمی کرکے بے ہوش کردیا۔ گن پوائنٹ پر اس نے ایک جرائم پیشہ عورت کے ساتھ مل کے ملک رب نواز کے بیٹے ملک دلنواز کو اس کے بیڈ روم سے اغوا کیا اور ملک رب نواز کی گاڑی میں لے گیا۔ اس کے خلاف تین کیس بنتے ہیں۔ مجرمانہ عزائم کے ساتھ گھر میں داخل ہونا۔"

"پرائے گھر میں" ایس ایچ او نے کہا۔

"CRIM INAL TRESPASS" کیانی نے کہا "چوکیدار پر قاتلانہ حملہ۔ اقدام قتل' پھر اغوا اور گاڑی چھین کرلے جانا' دیکھیے۔"

"یہ تو چار کیس ہوگئے۔ ایک منٹ میں ایک کیس بڑھ گیا" کوئی بولا۔

"کیا مقصد تھا ان وارداتوں کے پیچھے؟" بار کا سیکریٹری بولا۔

"کتنا تاوان مانگا تھا اس نے رب نواز کے بیٹے کی رہائی کے بدلے اور کتنا ادا کیا گیا تھا؟" برادر نے سوال کیا۔

"میں بتاتا ہوں۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی اس کا اصل نام ثمینہ ہے مگر وہ سونی کہلاتی ہے۔ وہ جتنی خوبصورت ہے اتنا ہی اس کا کردار خراب ہے۔"

شبنم نے کہا "کیا یہ صحیح ہے کہ اس کی بہن رب نواز کے ایک ڈرائیور کی بیوی تھی۔ جسے رب نواز نے قتل کرادیا تھا؟"

"ہاں اور سونی انتقامی جذبات کا شکار تھی لیکن اس کے جرم میں ملوث ہونے کی یہ وجہ نہیں۔ وہ ایک جرائم پیشہ عورت ہے۔ اس کی زندگی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزری ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل تھی۔ ایک ایک کرکے وہ سب ڈاکو مارے گئے یا روپوش ہوگئے۔ یہ ہوسکتا ہے.... کہ یہ داڑھی والا جو کبھی خود کو چراغ علی اور کبھی ناصر عظیم بتاتا ہے' ڈاکوؤں کے اسی گروہ میں شامل رہا ہو۔"

میں سب سنتا رہا۔ اس نے زیب داستان کے لیے اور اپنے مفروضات میں زیادہ سے زیادہ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تمام واقعات کو خوب مرچ مسالا لگا کے بیان کیا۔ سونی تو اس کے نزدیک ہسٹری شیٹر اور اشتہاری مجرم تھی لیکن میرے بارے میں بھی اس نے شک و شبے کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ میں ایک خطرناک قسم کا دہشت گرد ہوں۔ اس نے دلنواز کے اغوا کا واقعہ ایسے سنایا جیسے وہ خود جائے واردات پر موجود تھا اور کسی فلم ڈائریکٹر کی طرح سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس نے اتنی ہی رنگ آمیزی کے ساتھ ملک رب نواز کی کوٹھی جانے والی بس کے ہائی جیک کیے جانے کی اسٹوری سنائی اور بس کو آگ لگانے سے ڈرائیور کے ہاتھوں فیکے کے ہلاک ہونے کی ساری تفصیل پیش کی تو ساتھ ساتھ فیکے نمک حرام کی چوری اور سینہ زوری کا ذکر بھی کیا۔ یہ بتایا کہ ملک صاحب کی ساری عنایات کا بدلہ اس نے کیسے دیا۔ وہ ان کا لاکھوں کا مال چوری کرکے لے گیا اور ان کے دشمنوں سے مل گیا' وغیرہ وغیرہ۔

کیانی نے کہانی کے بہت سے حصے ضرورت یا مصلحت کے تحت حذف کردیے۔ مثلاً اس نے ملک رب نواز کے چوری ہونے والے مال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ کیا تھا۔ ان کے دشمنوں کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون تھے۔ فیکے کے باغی ہونے کی وجہ گول کردی۔ اس کی بیوی اور سونی کے ساتھ ملک رب نواز اور ان کے ولی عہد کے خصوصی مراسم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس تفصیل میں سے سونی اور شبنم کے اغوا کا ذکر خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے نکال دیا گیا۔ دلنواز کے اغوا کی اصل وجہ چھپالی گئی۔

جو حقائق سے ناواقف تھے' وہ بھی سمجھتے تھے کہ کیانی صاحب ڈی ایس پی ہیں۔ پولیس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کررہے ہیں اور ذاتی طور پر بھی کردار کے اعتبار سے کوئی حق آگاہ' حق پرست اور حق گو نہیں ہیں۔ پولیس ترجمان کے بیان' سرکاری پریس ریلیز اور ٹی وی کے خبرنامے کو سنجیدگی سے کون لیتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ یہ پالیسی اور پروپیگنڈے کا وہ سرکاری کھیل ہے جو پچاس برسوں سے کھیلے ہی جارہی ہے اور زمانہ بدل جانے کے باوجود اس کا انداز نہیں بدلا۔ بتانے والے بھی جانتے ہیں کہ اب ان کی باتوں پر یقین کوئی نہیں کرتا اس کے باوجود پرانی ڈگڈگی پر پرانا راگ چل رہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وکیل اور صحافی عقل و فہم اور پیشہ ورانہ مشاہدے اور تجربے کے باعث سرکار کی کارکردگی کے دعووں کی اصلیت کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور کسی حد تک سچ کو پا ہی لیتے ہیں۔ کیانی خود بھی جانتا تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگ وہی جذبات رکھتے ہیں جو اسمبلی میں حزب اختلاف کے اراکین۔ اس کے باوجود وہ سرکاری بینچ سے اپنی تقریر پیش کرتا رہا۔ یہ ڈھٹائی نہیں' اختیار کی رعونت تھی۔ اس کا مطلب کے بغیر ہی بہت واضح تھا کہ سن کے یقین کرتے ہو تو کرو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ جو بگاڑ سکتے ہو میرا بگاڑ لو۔ اپنی نوکری تو پکی ہے جو یہاں کر رہے ہیں وہی کہیں اور جا کے بھی کریں گے۔

مجھے فکر تھی بیک وقت ان سب کے غیر حاضر ہو جانے کی جو میرے ناصر عظیم ہونے کے گواہ تھے۔ نیلم کے کورٹ نہ پہنچنے کے اسباب ایک سے زیادہ ہو سکتے تھے۔ وہ پبلسٹی اور پرستاروں کے ہجوم سے گھبراتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے لیے کسی سیٹ پر سے شاٹ ادھورا چھوڑ کے آنا مشکل ہو گیا ہو یا اس نے فون پر ذاتی تعلقات کی ڈوریاں ہلا کے خورشید کیانی کو ناصر عظیم سے صحیح انداز میں متعارف کرا دیا ہو۔ جناب ابوبکر آزاد کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ انہیں کچھ یاد ہی نہ رہا ہو۔ یا ان کی آنکھ لگ گئی ہو لیکن کمال کا نہ آنا کمال تھا۔ نہ وہ بھول سکتا تھا اور نہ کوئی معصوفیت اس کی راہ میں حائل ہو سکتی تھی۔

فرید عباسی اور شبنم نے جو مہم چلائی تھی' اس کے نتائج سامنے آ رہے تھے۔ کرائم رپورٹر ابراہیم ربانی عرف برادر جو گزشتہ رات تھانے میں شبنم کے ساتھ صحافیانہ رشتہ نبھانے میں تامل کر رہا تھا اور پولیس کے ساتھ اپنے مراسم سے ہونے والے فائدے کو نظر انداز کرنے کے موڈ میں نہیں تھا' آج ایک فرض شناس جرنلسٹ بن گیا تھا۔ شاید اس پر صحافی برادری نے اخلاقی دباؤ ڈالا تھا کہ کم سے کم شبنم کے معاملے میں وہ ایمانداری سے کام لے۔ ورنہ کل کو وہ کرائم رپورٹر نہ رہا یا جرنلسٹ ہی نہ رہا تو کسی معاملے میں اسے صحافیوں کی حمایت حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

فرید عباسی نے امین ڈوگر اور اکبر سجانی جیسے بڑے وکیلوں کے مقابلے پر عزیز ہاشمی کی مدد حاصل کر لی تھی۔ اس سے نفسیاتی دباؤ بڑھ گیا تھا اور یہاں بار کونسل کے سیکریٹری کا موجود ہونا کیانی کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت اور قانونی سمجھ بوجھ کے ساتھ اپنا کیس پیش کیا تھا مگر اس کی بات ختم ہوتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ شبنم کے زیادہ تر سوالات کا تعلق ملک رب نواز' اس کے غیر قانونی دھندوں اور سیاسی کرپشن سے تھا۔ وکیل میرے' سونی اور فیکے پر عائد کیے جانے والے الزامات کے بخیے ادھیڑ رہے تھے اور اغوا سے قتل تک کے واقعات کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے۔

خورشید کیانی کے لیے پرسکون رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ صورت حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی اس وقت آئی جب ملک رب نواز اپنی فیملی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اس کی آواز سن کے خود میں اچھل پڑا تھا۔ ایک ساتھ ملی جلی آوازوں میں اس سے بہت سے سوالات کیے گئے۔ اس کی ضمانت پر رہائی سے گھر والوں کے سوا کس کو خوشی ہو سکتی تھی۔ یہ حیرت کی انتہا سے جنم لینے والی بے یقینی تھی جو سب کے سوالات میں اتر آئی تھی۔ شبنم اور فرید عباسی کے ساتھ میرے دوست بھی اتنے ہی مایوس تھے جتنے قانون کی روح کو سمجھنے والے۔

کرائم رپورٹر برادر نے کہا "جناب ملک صاحب۔ آپ یہاں۔۔۔؟"

عدالتی رپورٹر نے بھی کہا "یہ تو کمال ہی ہو گیا۔"

بار کے سیکریٹری ہمایوں نے صاف پوچھا "آپ کی ضمانت منظور ہو گئی ملک صاحب؟"

جواب میں ملک نے اپنے مخصوص رعونت آمیز مصنوعی عاجزی کے انداز میں کہا "بس جی دیکھ لو۔ آپ کی دعاؤں سے ہم بھی آ گئے ادھر۔"

پھر اس کی بیوی کی آواز آئی "دشمنوں نے تو بہت چاہا تھا کہ ملک صاحب کو ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔"

پھر دلنواز بولا "ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا ہے ہم پر۔"

اس سے پہلے کہ مزید تبصرے ہوتے' میں نے ڈاکٹر کمال کی آواز سنی "میں ڈاکٹر کمال فاروقی ہوں' ڈی ایس پی صاحب!"

ڈی ایس پی نے کہا "نام سنا ہے جی آپ کا۔ کیا حکم ہے ہمارے لیے ڈاکٹر صاحب!"

کمال نے کہا "مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے عزیز دوست ناصر عظیم کو آپ نے کسی اور کے شبے میں گرفتار کر لیا ہے' کہاں ہے وہ؟"

"آپ تشریف رکھیں ڈاکٹر صاحب" کیانی نے بڑے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔ پھر اس نے اندر کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی "اوئے ادھر لاؤ بندے کا چہرہ کراؤ۔ بڑے بڑے لوگ نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔"

کمرے میں موجود جلاد صفت محافظوں نے مجھے بازو سے

پکڑ کے اٹھایا تو میں نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا "میں تمہارے سہارے کا محتاج نہیں ہوں۔" پھر میں دروازے سے گزر کے ڈی ایس پی کے سامنے پہنچ گیا۔

"ناصر۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ تجھے کیسے پکڑ لیا انہوں نے؟" ڈاکٹر کمال نے کسی کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

برادر نے کہا "ڈاکٹر صاحب! یہ۔۔۔ ناصر عظیم۔۔۔ آپ کے دوست ہیں؟"

"آپ کو شک کیوں ہو رہا ہے آخر؟" کمال بولا۔

کیانی نے فوراً مداخلت ضروری سمجھی "چلو جی آپ بیٹھو ادھر ڈاکٹر صاحب۔ ابھی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

کمال کی نظر رئیس پر گئی "رئیس۔ تم نے بتایا نہیں؟"

رئیس مسکرانے لگا "اوجی ہماری کون سنتا ہے یہاں۔ اتنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں۔"

اندر سے ایک پرانی کرسی لائی گئی جس کے درمیان سے بید کی بنائی نکل گئی تھی۔ اس کے اوپر ایک تختہ ٹھوک دیا گیا تھا اور یہ غالباً ڈرائنگ روم یعنی تفتیش کے کمرے سے لائی گئی تھی۔ میں اس پر ٹک گیا "خدا کا شکر ہے کہ آپ سب لوگ موجود ہیں یہاں۔"

کیانی نے مجھے روک دیا "ابھی سے بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب کہا جائے تب بولنا۔ ملک صاحب' آپ جانتے ہو اس بندے کو؟"

ملک نے بڑے غصیلے انداز میں سر ہلایا "بہت اچھی طرح۔"

شبنم نے کہا "نام ہی کیا' پورا شجرہ نسب معلوم ہو گا آپ کو؟"

"نام تو اس نے کبھی کچھ بتایا کبھی کچھ۔ مگر یہ اس حرام زادی کا خاص یار ہے۔ وہ اسے ہر جگہ ساتھ لیے پھرتی ہے۔"

"اسی نے اغوا کیا تھا آپ کے بیٹے کو؟"

ملک نے کہا "ہاں۔ اسے میں بھول سکتا ہوں؟"

ملکانی بولی "اسے تو میں لاکھوں میں پہچان لوں۔ اور میں کیا' میرا بیٹا دلنواز۔۔۔ اس کی بیوی' دلنواز کے بچے' سب نے دیکھا تھا اسے۔"

باری باری کیانی نے ان سب سے شناخت کی تائید میں بیان حاصل کیا۔ شبنم اور فرید عباسی نے سب سے پوچھا کہ ملزم کا نام چراغ علی ہے یا کچھ اور۔ مگر نام کے بارے میں ان سب کا موقف ایک ہی رہا کہ چراغ علی کے علاوہ بھی میرے بہت سے نام ہیں جو سونی جانتی ہے۔

"سونی کو بلوا لیں گے ہم انشاء اللہ۔"

اب فرید عباسی نے احتجاج کیا "یہ کیا ہے۔ ساری کارروائی یکطرفہ ہو رہی ہے۔ ملزم کو بولنے نہیں دیا گیا۔ شہر کا اتنا معزز ڈاکٹر اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کی بات نہیں سنی جا رہی۔ آپ بضد ہیں کہ یہ چراغ علی ہے۔"

ڈاکٹر کمال نے کہا "واٹ نان سنس۔ میں اور ناصر عظیم بچپن کے دوست ہیں۔ میں' ناصر اور رئیس خان ایک ہی یتیم خانے میں تھے۔ پچھلے بائیس سال سے ساتھ ہیں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "میں ایک مشہور بلڈر ہوں۔ اس شہر میں پتا نہیں کتنی عمارات کھڑی کی ہیں میں نے۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر میرے کاروباری مراسم ہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے مجھے۔"

کیانی نے کہا "کون زمانہ؟"

میں نے کہا "رئیس۔ تو بتا انہیں۔"

رئیس نے کہا "یہ یتیم خانے سے نکلا تو ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہا کئی سال۔ وہ بہت بڑے اسپیشلسٹ تھے۔ آج کل لندن میں ہیں۔"

کمال نے کہا "نہیں۔ وہ واپس آ گئے ہیں۔ میں انہیں فون کرتا ہوں۔"

"ایک منٹ ڈاکٹر صاحب!" کیانی نے کہا "آپ کو یقیناً غلط فہمی ہو گئی ہے کوئی۔ اس ملزم کو ہم نے کل قبرستان سے گرفتار کیا تھا۔"

"میں غیر شائستہ زبان استعمال کرنا نہیں چاہتا ورنہ میں کہتا کہ دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ یہ کل رات میرے ساتھ میرے گھر میں تھا" کمال نے برہمی سے کہا۔

رئیس نے کہا "ناصر عظیم جب ڈاکٹر مشہود کے گھر سے نکلا تو سترہ سال کا تھا۔ پھر سات سال یہ کرنل خان کے گھر میں رہا۔ انہوں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ کرنل خان پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے خطاب یافتہ افسر تھے جن سے کئی انگریز جنرل بڑی عزت کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے لیکن ان کی ایک بیٹی ہے چاندنی خانم!"

کمال نے غصے سے کہا "میں بلا لیتا ہوں اسے۔ کل رات ناصر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر کمال میرے بہنوئی بھی ہیں۔"

صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔ خورشید کیانی کچھ پریشان سا بیٹھا تھا۔ ملک رب نواز کی نظریں مجھ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ شاید اسے پرانے حوالوں سے یاد آ گیا تھا کہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون ہوں' وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

رئیس نے کہا "دس سال سے ناصر کو جاننے والے ایک نہیں سیکڑوں لوگ ہیں۔ کاروباری لوگ۔ بینک منیجرز' اس کے ساتھ کام کرنے والے لیکن میں ایک بہت اہم حوالے کے طور پر نیلم کا نام لوں گا۔"

"کون نیلم؟" ملک نے مجھے گھور کے کہا۔

"فلم اسٹار نیلم۔ اگر وہ آسکتی ہیں تو انہیں کہیں کہ ناصر نے بلایا ہے اور دیکھیں وہ کتنی دیر میں آتی ہیں۔"

شبنم نے کہا "ویسے آپ ان سے فون پر بات کرسکتے ہیں۔"

ملک رب نواز کے لبوں سے بے خیالی میں نکل گیا "تم ...وہ ناصر ہو۔"

اپنی غلطی کا احساس اسے فوراً ہی ہوگیا مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ ملک رب نواز نے مجھے ناصر عظیم کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔ میرے معاملے میں وہی مدعی تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا یہ ایک جملہ میری برأت کے لیے کافی تھا۔ ملکانی کچھ حیران اور مایوسی کا شکار تھی اور دلنواز کنفیوز نظر آنے لگا تھا۔

مگر وہ چالاک آدمی سنبھل گیا "یہ سب جھوٹ ہے۔ تم وہ ناصر نہیں ہوسکتے۔ وہ ناصر عظیم نہیں ناصر حسین تھا۔ اور اس کی تو شکل ہی دوسری تھی۔"

میں نے کہا "ملک صاحب۔ مجھ سے نظر ملا کے بات کرو۔ میں ہی تھا وہ شخص جسے آپ کے مرحوم بڑے بھائی ایک عبرتناک موت کی سزا دے چکے تھے۔ شاید مجھے درخت سے لٹکا کے پھانسی دے دی جاتی یا مجھ پر آپ کے بھوکے شکاری کتے چھوڑ دیے جاتے۔ اس وقت مجھے رئیس نے بچالیا تھا۔ اور آپ کی والدہ نے میری جاں بخشی کرائی تھی۔ وہاں نیلم بھی موجود تھی آپ کے ساتھ۔ اسے بلا کے پوچھیں تو وہ سب بتائے گی۔ سب یاد ہوگا اسے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ وہ بھول سکے۔ آج یہ آپ مجھے دس برس بعد دیکھ رہے ہیں۔ میری صورت کے نقوش میں تبدیلی آگئی ہے۔ شاید میرے چہرے پر یہ داڑھی میری پہچان میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ یا۔ یا پھر آپ مجھے پہچاننا نہیں چاہتے۔"

کیانی نے کہا "ملک صاحب۔ کیا خیال ہے نیلم سے بات کی جائے؟"

اسی وقت نیلم نے ایک ڈرامائی انٹری دی۔ یوں جیسے وہ وہیں پردے سے لگی کھڑی تھی اور اس ڈائیلاگ کی منتظر تھی جس کے بعد اسے اسٹیج پر آنا تھا۔ اس کی گاڑی پورچ کے سامنے آکے رکی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گن مین نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ پچھلے دروازے سے اتری۔ دوسری طرف سے اس کے سیکریٹری نے باہر قدم رکھا۔ پھر ڈرائیور گاڑی کو چلا کے باہر لے گیا۔

چند سیکنڈ کامل سکوت میں گزر گئے۔ وکیل' صحافی' پولیس والے۔ سب اس کے رعب حسن میں مبتلا ناقابل یقین نظروں سے نیلم کو دیکھتے رہے۔ فلموں کی نامور سپر اسٹار' فلمی افق کا سب سے تابناک ستارہ۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ ملک بھر کے سینماؤں میں تماشائیوں کو اپنی جلوہ نمائی سے دیوانہ بنانے والی نیلم خود ڈی ایس پی کے آفس پہنچ گئی تھی۔

اس نے قدم آگے بڑھایا تو صحافی سب سے پہلے دوڑے۔ "مس نیلم' آپ اور یہاں؟" انہوں نے کھٹا کھٹ فلیش چمکانے شروع کیے۔

نیلم رک گئی "جتنی تصویریں اتارنی ہیں آپ کو ابھی اتار لیں۔ لیکن ایک تو میں یہاں کوئی پریس کانفرنس کرنے نہیں آئی۔ میں یہاں کسی کے بھی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"

"پھر کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟" ڈی ڈی نے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے پرانے دوست ناصر عظیم کو پولیس نے غلط فہمی کی بنا پر پکڑ لیا ہے" نیلم نے کہا۔

"وہ کب سے آپ کے دوست ہیں؟" برادر نے کہا۔

"دس سال سے جانتی ہوں میں انہیں۔ اور ایک وضاحت۔ آپ لوگ دوستی کے لفظ کو بہت خراب کرتے ہیں۔ ناصر عظیم میرے لیے بھائی کی طرح ہے۔ جن کی بہنیں ہیں گھر میں وہ میری بات کو سمجھ سکتے ہیں اور میرے جذبات کو بھی۔ پلیز' میری درخواست ہے کہ میری زندگی کے اس پرائیویٹ معاملے کو پبلک پراپرٹی مت بنائیں۔"

پھر وہ آگے آئی اور سب سے پہلے اس نے ملک رب نواز کو دیکھا مگر بڑی صفائی سے نظرانداز کردیا۔ وہ سیدھی میری طرف آئی "ناصر' کیا ہوگیا؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اب کیا پھر سب دہراؤں۔ جو ہونا تھا' ہوگیا۔"

خورشید کیانی نے فوراً پریس کانفرنس کو ختم کردیا۔ اب اس کا مقصد کوئی نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے مجھے ناصر عظیم نہ ماننے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد الزامات کا بھی کوئی جواز نہیں رہتا تھا۔ اب مرحلہ درپیش تھا خود کو جوابی کارروائی کے خلاف دفاع فراہم کرنے کا۔ اس غلطی کا ازالہ

کرنے کا جو حادثاتی طور پر ہوگئی تھی۔ ان معاملات کو سنبھالنے کا جو غلط فہمی میں حد سے زیادہ بگڑ گئے تھے' اس صورت حال نے ملک رب نواز کو سخت مایوس کردیا تھا۔ خورشید کیانی نے صحافیوں اور وکیلوں کے لیے چائے لگانے کا حکم دیا۔ برادر سب سے زیادہ منہ پھٹ تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ وقت تو کھانے کا ہے اور خالی پیٹ میں چائے ڈالنا بھی تھرڈ ڈگری کا طریقہ سمجھا جاسکتا ہے۔ کیانی اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ اس نے تھانہ انچارج اور اپنے ماتحت راؤ انور علی سے کہا "ہاں بھئی' یہ کیسا ہے تمہارا انتظام' کھانے کے وقت چائے؟"

انسپکٹر نے برا مانے بغیر کہا "ابھی کھانا ہوگا آدھے گھنٹے میں سر۔ تب تک چائے چلے گی۔ ٹھنڈا پینا چاہیں تو ان کی مرضی۔"

بیشتر لوگ پولیس کی میزبانی سے معذرت کرکے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ بھی پینے سے انکار کردیا۔ "صرف یہ بتادیں مائی باپ کہ اب کیا خیال ہے آپ کا۔ یہ ملزم چراغ علی ہے یا ایک معزز شہری ناصر عظیم" ہمایوں بولا۔

"ہمایوں صاحب۔ میرا سلام کہیں عزیز ہاشمی صاحب کو۔ اور انہیں بتادیں کہ غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوا۔ بعض اوقات چہرے ملتے جلتے ہوں تو دھوکا ہوجاتا ہے۔ ہم ناصر عظیم صاحب کو چھوڑ رہے ہیں" کیانی نے کہا "معذرت کے ساتھ۔"

شبنم بولی "اور وہ جو سنگین الزامات کی فہرست پڑھی تھی آپ نے؟"

"ظاہر ہے الزامات غلط نہیں ہیں۔ اصل بندہ کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا" کیانی نے کہا۔

باقی لوگ رخصت ہوگئے تو وہاں میرے ساتھ نیلم رہ گئی اور کمال رہ گیا۔ کیانی نے خصوصی درخواست کرکے شبنم کو روک لیا۔ ملک رب نواز نے اپنی فیملی کو گھر بھیج دیا اور تھانہ انچارج کے کمرے میں گنے چنے لوگ رہ گئے تھے۔ کیانی نے کسی نہ کسی طرح سب کو چائے پینے پر راضی کرلیا۔

"ناصر عظیم صاحب۔ سب سے پہلے تو آپ سے کہنا پڑے گا کہ سوری' پولیس والے بھی انسان ہیں۔ ادائے فرض میں غلطی کربیٹھتے ہیں۔"

"بات غلطی کی نہیں' انسان غلطی کرتا ہے تو مانتا ہے۔ پولیس کو احساس دلایا جائے تب بھی وہ مانتے نہیں۔ اب اس شریف آدمی کو جتنی ذہنی اذیت اور جسمانی تکلیف اٹھانی پڑی" شبنم نے کہا "اس کا ہرجانہ طلب کرسکتا ہے۔"

کیانی نے اس سے اتفاق کیا "بالکل کیا جاسکتا ہے مگر شریف آدمی سوری سن کے فراخ دلی کا ثبوت دیتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا ارادہ کسی سے ہرجانہ طلب کرنے کا نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس فضول ضائع کرنے کے لیے وقت ہے" میں نے کہا۔

نیلم نے کہا "چلیے' آپ کی جان سستی چھوٹ گئی' ڈی ایس پی صاحب!"

شبنم نے کہا "ملک صاحب۔ آپ بہت مایوس لگ رہے ہیں۔ آپ کو تو بہت خوش ہونا چاہیے۔"

ملک نے اپنی خفت کو چھپانے کے لیے چہرے پر بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجالی تھی "کس بات پر؟"

"آپ کی ضمانت کی توثیق ہوگئی" شبنم بولی۔

برادر نے چائے پی کے سگریٹ طلب کی "اپنی سمجھ میں آئی نہیں یہ بات۔"

"بھئی ہم عزت دار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ کوئی پیشہ ور مجرم تو نہیں ہیں۔ ایم پی اے ہیشہ رہے۔ آئندہ بھی ہوں گے۔ ہم فرار ہوسکتے ہیں' عدالت بھی جانتی ہے یہ بات۔" ملک نے کہا۔

"کیا ضمانت طلب کی تھی عدالت نے؟" برادر نے پوچھا۔

"اب چھوڑو یار۔ عدالت کہتی کہ ایک کروڑ نقد کی ضمانت چاہیے تو وہ بھی تھا' ہمارے کھیسے میں۔ دس کروڑ طلب کیے جاتے تو دلنواز دس منٹ میں کردیتا اور شخصی ضمانت کا یہ ہے کہ کارپوریشن کا ممبر آیا بیٹھا تھا۔ دو وزیر ہیں ہماری پارٹی کے۔ وہ موجود تھے۔"

شبنم نے طنزیہ کہا "پھر آپ فرار کیوں ہوئے تھے عدالت سے؟"

ملک نے تیز ہوکے کہا "یہ کون ... کہتا ہے ..." غصے میں اس کی زبان پر عادت کے مطابق گالی آگئی تھی "ضمانت تو ہوئی تھی۔"

خورشید کیانی نے سرہلایا "ملک صاحب کو ضامنوں کی کیا کمی۔"

ملک نے کہا "مجھے پتا ہے' کل آپ لوگ اخبار میں کیا لکھو گے۔ یہی کہ ملک رب نواز کے بندوں نے عدالت میں فائرنگ کرائی اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رب نواز عدالت سے نکل گیا۔"

"یہ تو ہمیں بھی ذمے دار ٹھہرائیں گے کہ پولیس ملی ہوئی تھی" کیانی بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اخبار والے کچھ غلط لکھیں تو آپ کیس کر سکتے ہیں ان پر۔ اٹھوا سکتے ہیں انہیں' ان کے گھر پر فائرنگ کرا سکتے ہیں" شبنم نے تلخی سے کہا "طاقتور آپ ہیں' حاکم آپ ہیں' ہو رو کر بھی آپ کے اشارے پر چلتی ہے۔"

"پلیز مس شبنم! ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ معاملہ تو ختم ہو گیا" خورشید کیانی بولا۔

"آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں۔ مجھے تو حیرانی ہے کہ عدالت نے کس بنیاد پر ضمانت منظور کی۔ ملک صاحب کی بات سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ضمانت پر رہائی ان کا حق تھا۔ جج کی کیا مجال کہ انکار کرتا۔"

رب نواز بولا "اگر آپ کا خیال ہے کہ جج نے غلطی کی تو آپ اپیل کریں۔"

"اپیل تو ہو گی۔ ڈویژن بینچ میں۔ پھر سپریم کورٹ میں" شبنم نے کہا۔

خورشید کیانی نے کہا "دیکھئے' میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر کی حیثیت سے نہیں۔ ایک دوستانہ مشورہ کوئی بھی دے سکتا ہے۔ آپ سب مہذب اور عزت دار لوگ ہیں اور یہ سوسائٹی آپ کو FOLLOW کرتی ہے۔ مذہبی اور سیاسی رہنما۔ استاد' وکیل' صحافی اور دانشور۔ یہ معاشرے کو شعور دیتے ہیں۔ اگر آپ نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو بڑی خرابی ہو گی۔ میں کہتا ہوں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں آپس میں طے کر لیں۔ مٹی ڈالیں پرانی باتوں پر۔"

شبنم نے کہا "آپ جنہیں چھوٹی چھوٹی باتیں کہہ رہے ہیں۔"

"چلو جی' بڑی باتیں ہیں تو آپ بڑے لوگ ہو۔ آپ کے دل بھی بڑے ہونے چاہئیں۔ جیو اور جینے دو والی پالیسی اپنائیں۔"

شبنم نے رکھائی سے کہا "قانونی معاملات ایسے طے نہیں ہوتے' تھانوں میں بیٹھ کے۔"

نیلم نے کہا "مس شبنم۔ ڈی ایس پی صاحب کے مشورے سے فائدہ اٹھانا چاہیے تمہیں بھی اور ملک صاحب کو بھی۔"

"مس نیلم۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں میں۔ مجھے بلاوجہ لڑائی کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اور لڑائی کی وجہ ہو تو میں صلح کا جھنڈا نہیں لہرا سکتی۔ ڈی ایس پی صاحب نے مشورہ دے کر اپنا اخلاقی فرض پورا کیا۔"

"لیکن آپ اسے قبول کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔" خورشید کیانی کی خفت اب جھنجھلاہٹ بن رہی تھی۔

"آپ تو سمجھتے ہیں کہ آپ کا مشورہ بھی حکم ہوتا ہے۔ لیکن ڈی ایس پی صاحب' خدا نے مجھے بھی عقل دی ہے۔ میں یہاں کیسے COMMIT کروں کہ ویسا ہی ہو گا جیسا آپ چاہتے ہیں۔ یہ قانونی معاملات ہیں۔ میں اپنے وکیلوں سے مشورہ کروں گی۔ بہت کچھ ملک صاحب کے آئندہ کے طرز عمل پر بھی DEPEND کرتا ہے۔ میں اب اجازت چاہتی ہوں" اس نے بیگ اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

"ایک منٹ۔ مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔"

شبنم نے کلائی کی گھڑی دیکھی "پوچھئے؟"

"ایک بات میرے لیے بڑی کنفیوزنگ ہے۔ رئیس خانے میں آپ کے ساتھ ایک داڑھی والے کو آتے جاتے سب نے دیکھا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ ڈرائیور تھا آپ کا۔ یہ بھی معلوم نہیں آپ کو کہ نوکری چھوڑ کے وہ کہاں گیا۔ اس کا نام بتا سکتی ہیں آپ؟"

"رحمٰن' عبدالرحمٰن۔ یہی نام بتایا تھا اس نے۔"

"شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس تو ضرور دیکھا ہو گا آپ نے اسے ملازم رکھتے ہوئے۔ عورتیں کسی اجنبی شوفر کے ساتھ ہر جگہ آنے جانے سے ڈرتی ہیں' ویسے تو بہت بہادر ہیں آپ۔"

"میں نے اپنی تسلی کی تھی' سب دیکھا تھا۔"

خورشید کیانی نے چند سیکنڈ اسے غور سے دیکھا "دوسرا داڑھی والا بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اسے ملک صاحب نے' ان کی وائف' ان کے بیٹے اور بہو سب نے شناخت کیا ابھی سب کے سامنے۔ وہ ملک دلنواز کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اور سوئی کے ساتھ مسلح ہو کے ملک ہاؤس پہنچا تھا۔"

میں نے کہا "اگر اب بھی آپ کو یقین ہے کہ وہ میں ہی تھا تو مجھے مت چھوڑیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں ایسے کروٹ نہیں بتا۔ ڈاکے ڈال کے اور تاوان وصول کر کے۔"

ڈی ایس پی نے کہا "مجھے اپنی بات ختم کرنے دیں۔ ایک مس شبنم کا ڈرائیور تھا عبدالرحمٰن۔ دوسرا سوئی کا ساتھی۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا نام چراغ علی ولد باغ علی تھا۔ تیسرے یہ ناصر عظیم صاحب ہیں۔ ڈبل رول والی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ جڑواں بھائیوں کے کیس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تین بندے ایک ہی حلئے اور شکل کے۔"

شبنم نے کہا "کسی کی نظر گدھے گھوڑے اور خچر میں فرق نہ کر سکے تو اس میں قصور کس کا ہے؟"

"ہماری نظر کو الزام مت دیں مس شبنم۔ ہم پہچان میں غلطی نہیں کرتے۔" خورشید کیانی نے غصے سے کہا۔

"رہنے دیں کیانی صاحب! کرتا ہے موچھوں والا اور پکڑا جاتا ہے داڑھی والا۔ روز ہوتا ہے یہ تماشا' مارکوٹ کے آپ کسی کو بھی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں مگر وہاں سے کتنے بے گناہ چھوڑے جاتے ہیں۔ کیوں برادر' کیا یہ چراغ علی ہے؟"

برادر نے مجبوراً تائید میں سر ہلایا "ہم تو پہلے ہی بتا چکے تھے کہ کل جسے تھانے میں دیکھا تھا وہ گدھا تھا' یہ گھوڑا ہے۔"

"اور میرا ڈرائیور۔ اسے بھی دیکھا تھا تم نے؟"

برادر انکار نہ کر سکا "ہاں' وہ خچر تھا۔"

شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بلاوجہ مشورہ ضائع نہیں کروں گی ورنہ کہتی کہ اپنی نظر کا علاج کرائیے۔"

کمال نے ابھی تک بالکل خاموشی سے سب کی باتیں سنی تھیں۔ شبنم کے جاتے ہی اس نے میری طرف دیکھا "کیا خیال ہے' چلیں؟"

ملک رب نواز کو نیلم کی اجنبیت کا انداز بڑا گراں گزر رہا تھا۔ میں نے ثبوت کے طور پر دس سال پرانے جس واقعے کا حوالہ دیا اس سے نیلم اور ملک رب نواز کے مراسم کی خصوصی نوعیت سامنے آ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری بات نیلم کو بھی اچھی نہیں لگی۔ گزشتہ دس سال کے حالات اور واقعات سے میں بالکل بے خبر تھا۔ ملک حق نواز مر گیا تھا۔ رب نواز کے ساتھ نیلم کے مراسم کس انتہا تک گئے تھے اور کیسے ختم ہوئے تھے۔ نیلم کی داستانِ حیات کا یہ باب ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھا۔ شاید اس کا ذکر کرنا میری غلطی تھا۔ اس حوالے کے بغیر ہی نیلم نے میری شناخت پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔

ملک نے ہمت کر کے کہا "بھئی نیلم! ہمیں تو پہچانا بھی نہیں آپ نے' ہم اتنے غیر بھی نہیں۔"

نیلم نے ناگواری سے کہا "بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں میں آپ کو ملک صاحب۔ لیکن آپ کو میری گواہی کی ضرورت نہیں۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ آپ کیا ہیں' بڑی چیز ہیں آپ۔"

ملک کو اس جواب میں تعریف سے زیادہ تلخی محسوس ہوئی مگر اس نے اپنی خفت کو چھپا لیا۔ "پھر کسی دن رونق بخشیں ہمارے غریب خانے کو۔ کچھ پرانی یادیں تازہ کر لیں مل بیٹھ کے۔"

نیلم نے کہا "ملک صاحب۔ میں شوٹنگ شیڈول پر ضرور جاتی ہوں مگر اس کے سوا کہیں نہیں جاتی۔ ایوارڈ لینے بھی خود کبھی نہیں گئی۔ اور دعوتیں تو ایوان صدر اور پرائم منسٹر ہاؤس سے بھی دی گئیں مگر میں نے معذرت کر لی۔ نہ میں نے کبھی کسی کو انٹرویو دیا اور نہ کبھی پریس کانفرنس کی ضرورت محسوس کی۔"

نیلم نے بڑی ذہانت سے ایک جواب دے کر دو مقاصد حاصل کئے۔ اس نے کسی غرور کے مظاہرے کے بغیر کہہ دیا کہ وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی اور کسی عام ایکٹریس کی طرح شوبزنس کی اسکینڈل والی مصروفیات سے دور رہتی ہے۔ اس نے ملک رب نواز سے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسی اشتہاری شہرت اس جیسے سیاست داں اور دولت مند مگر بے ہنر لوگ خریدتے ہیں۔

"سب وقت وقت کی بات ہے نیلم!" ملک رب نواز کینہ پرور لہجے میں بولا۔

"ہاں جی۔ وقت سب کا ایک جیسا نہیں رہتا۔ اب میں چلتی ہوں۔ چلو ناصر' تم میرے ساتھ چلو۔" اس نے بڑی اپنائیت سے مجھے حکم دیا۔

میں نے کہا "میں پھر آؤں گا۔ ابھی تو کمال کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ ابھی چلنا ہے تمہیں میرے ساتھ' ڈاکٹر کمال سے۔"

کمال نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

نیلم کا سیکریٹری باہر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک تو اسے انچارج تھانہ کے آفس کے باہر لگی ہوئی بنچ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ انچارج صاحب سے ملاقات کے متمنی اور مظلوم صورت افراد بیٹھے تھے اور انہی کے ساتھ آنے والی دو عورتیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ وہ ان سینکڑوں' ہزاروں ماؤں بہنوں کی طرح تھیں جو اسی طرح ہر تھانے میں اپنے بیٹوں' شوہروں اور بھائیوں کے لیے رحم و انصاف کی بھیک مانگتی نظر آتی ہیں۔ ان کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے یا انہیں پولیس کے تشدد سے بچانے کے لیے جھولی پھیلائے خدا رسول کے واسطے دیتی نظر آتی ہیں اور کانوں کی بالیاں یا ہاتھوں کی چوڑیاں' بیٹی کے جہیز کا زیور یا بہو کے ماتھے کا جھومر نذر کرتی نظر آتی ہیں کیونکہ اندر وہ بیٹے' بھائی یا باپ اذیت سے نیم جاں تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ پولیس کے چہرے سے چیخ رہے ہوتے ہیں اور نزع میں خون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹل رہتے ہوتے ہیں۔ انصاف تو عدالت دے گی۔ یہاں رحم چاہیے تو سودے کی بات کرو' بزنس از بزنس۔"

"آپ کا سارا شیڈول چوپٹ ہوگیا میڈم!" اس نے ڈائری نکال کے شکایت کی۔

"دفع کرو شیڈول کو۔ کہہ دو سب سے کہ آج میڈم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" نیلم نے ناراضی سے کہا "رئیس کو ایڈجسٹ کرلو۔"

"یس میڈم!" سیکریٹری نے کہا۔

ڈرائیور اتنی دیر میں گاڑی سامنے لے آیا تھا۔ گن مین نے نیلم کے لیے دروازہ کھولا۔ "ناصر' تم ادھر آؤ میرے ساتھ۔ رئیس' تم کیسے آئے تھے؟"

رئیس نے کہا "میری گاڑی ہے۔"

"اچھا تو میرے سیکریٹری کو ساتھ لے کر تم بھی آجاؤ۔ چلو ڈرائیور۔"

نیلم نے ایک بدمزاج اور تک چڑھی' اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی اور مغرور عورت کا بڑا اچھا کردار کیا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی ملک رب نواز یا ذی ایس پی کو جوتے کی نوک پر ہی نہیں رکھتی' چلے وقت بھی اس نے کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر کمال سے مصافحہ کرکے اس کا شکریہ ضرور ادا کیا۔ تھانے کا سارا عملہ بڑے اشتیاق سے نیلم کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں مجھے کورٹ گرفتار کرکے یہاں لانے والے بھی شامل تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے بازی پلٹ گئی تھی۔ جسے وہ مجرم کی طرح ذلیل کرتے ہوئے گرفتار کرکے تھانے لائے تھے' وہ بڑی شان سے نیلم جیسی بیوٹین کی شاہانہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کے چلا گیا تھا۔ گزشتہ رات بھی مجرم سب کی دھنائی کرکے اور زنجیریں توڑ کے فرار ہوا تھا اور اس جرم پر اسے درس عبرت بنانے کا پروگرام طے تھا مگر وہ پھر نکل گیا اور اس بار اخلاقی طور پر سب کی دھنائی کرگیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ پیچھے رہ جانے والے ملک رب نواز اور ذی ایس پی خورشید کیانی کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہوں گی اور کس قسم کے الزامات اور جوابی الزامات کا تبادلہ ہوا ہوگا۔ مستقبل کے لیے کیا لائحہ عمل طے کیا گیا ہوگا۔ اور اتفاق میں برکت ہے کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے قانون اور انصاف کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی کیا منصوبہ بندی کی گئی ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک تو صرف ضمانت پر رہائی ہوئی تھی۔ الزامات اور بے گناہی کے ثبوت پیش کرنے کے سارے عدالتی مرحلے اس کے بعد شروع ہوتے تھے۔

نیلم نے سارا راستہ کوئی بات نہیں کی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس کا موڈ خراب ہے۔ وہ مجھ سے سخت خفا تھی مگر کہنے سننے کے عمل کو اس نے گھر پہنچنے تک مؤخر کردیا تھا۔ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ دبا کے شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا تو اس کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہوگئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

نیلم کی لینڈ کروزر اور رئیس خان کی پے جیرو ایک ساتھ ہی نیلم کے گھر میں داخل ہوئیں۔ میں نے اندر جانے کے بعد کہا "نیلم' تم خفا ہو؟"

اس نے کہا "جاؤ چینج کرنا چاہو تو کرلو۔ ہم پہلے کھانا کھائیں گے۔"

میں نے اسے پکڑلیا "نہیں۔ جب تک بات نہیں کروگی' میں کھانا بالکل نہیں کھاؤں گا۔ پانی تک نہیں پیوں گا۔ میں رئیس کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔"

اس کا موڈ کچھ بدلا "ذرا جا کے دکھاؤ۔" وہ بولی اور اندر غائب ہوگئی۔

رئیس کو اور مجھے اس کی ایک خادمہ نے سونی کے کمرے میں پہنچادیا۔ اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری "تم لوگ آگئے۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال تھا' عدالت سے ہمیں سیدھا جیل پہنچادیا جائے گا؟"

"مجھے کہہ' ہمیں نہیں۔ صرف اپنی بات کر۔" رئیس جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا "آج تو مزہ آگیا قسم اللہ کی۔"

سونی چلائی "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کتنے گندے ہو رہے ہیں تمہارے جوتے۔ بیڈ کور پر مٹی کے داغ دیکھو۔"

"تو کیوں شور کر رہی ہے؟ تیرے جہیز کا ہے یہ بیڈ؟" رئیس خان نے ڈانٹ کے کہا "یہاں رہ کے دو دن میں دماغ خراب ہوگیا' الو کی پٹھی!"

سونی نے اسے ٹانگ پکڑ کے کھینچا اور نیچے گرادیا "بدتمیزی کی میرے ساتھ تو بہت ماروں گی" اس نے جوتے اتار کے دور پھینک دیے۔

میں نے کہا "رئیس خان صاحب۔ تھانے میں بڑے ڈھنگ سے بات کر رہے تھے آپ!"

رئیس نے قہقہہ مارا اور پھر بیڈ پر لیٹ گیا "اب وہاں تو سب ہی ڈراما کر رہے تھے۔ اور کیا زبردست دی اینڈ ہوا اس ڈرامے کا۔"

میں نے کہا "نیلم نے کہا ہے کہ چینج کرلو۔ مگر میں کیا بدلوں؟"

سونی نے کہا "کپڑے ہیں یہاں۔ تم نمادھو کے انسان بن جاؤ۔"

رئیس بولا "ابے اس کی زبان تو کچھ زیادہ ہی چلنے لگی۔ ہم کیا جانور نظر آرہے ہیں؟"

گیسٹ روم میں مجھے اپنے سائز کے کپڑے بھی مل گئے۔ نما دھوکے میں کھانے کی میز پر پہنچا تو رئیس وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ سونی اسے نیلم کے گھر میں مہمان رہنے کی پُرلطف اور سنسنی خیز اسٹوری مزے لے لے کے سنا رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کیا۔ شاید یہ رئیس خانے کے ماحول سے نکل آنے کا نتیجہ تھا۔ ایک مدت سے ہم سب وہاں ایسے رہتے تھے جیسے وہ گھر کسی اور کا ہے جس میں ہم جیل سے فرار ہونے والے مجرموں نے قبضہ کرلیا ہے' ہم وہاں چھپ کے اور ڈر کے رہتے تھے۔ ایک مسلسل' اعصاب پر سوار رہنے والے خوف کے آسیب میں جیتے تھے اور حالات کے دباؤ میں زندگی کے حسن' رشتوں کی اچھائی اور پُرامید خیالوں کی خوشی کو بھولنے لگے تھے۔ وہ تہ خانہ جس کے چور دروازے سے آنا جانا ایک معمول بن گیا تھا' ایک منحوس جگہ بن گئی تھی۔ تیس مار خان اور چھوٹی کے قتل کے بعد وہاں رہنا کسی جیل کی کال کوٹھری میں رہنے سے زیادہ اذیت ناک ہوگیا تھا۔

میرے احساس کو حوصلہ اور تقویت دینے اور میرے مایوس ذہن کو انتشار سے تحفظ فراہم کرنے میں اس فیصلے کا بھی دخل تھا جس کے مطابق ہم سب نے ایک مرکز پر ساری توانائی مرکوز کرنے کے بجائے مختلف سمتوں سے الگ الگ رہ کے ایک ہی مقصد کی جدوجہد میں شریک رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سارے خطرات کا بوجھ ایک ساتھ اٹھا کے چلنے اور ایک ہی جگہ رہ کے ہر طرف لڑنے کی پالیسی غلط تھی۔ اب ہم نے خطرات کو بانٹ دیا تھا اور محاذ بھی تقسیم کردیے تھے۔ سونی اس گھر میں بالکل محفوظ تھی اور اسے فی الحال باہر نکل کے عذاب کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ شبنم اپنے اخبار کے دفتر اور صحافت کے حلقے میں زیادہ محفوظ تھی۔ فرید عباسی نے عزیز ہاشمی کے ساتھ اشتراک کرلیا تھا اور اسے قانون کا حفاظتی حصار مل گیا تھا۔ وہ رخشی کے ساتھ سب سے الگ' سکون سے رہ سکتا تھا اور ہمارے ساتھ نظر نہ آکے بھی ہمارا ساتھ دے سکتا تھا۔

رئیس ابھی تک کسی کے ساتھ براہِ راست اختلاف اور تصادم کی راہ پر نہیں چل رہا تھا اور اس کا زیادہ سے زیادہ یہی قصور تھا کہ اس نے ہم سب کو رئیس خانے میں پناہ فراہم کر رکھی تھی۔ وہاں سے نکل کے میں اور رئیس کہیں بھی ٹھکانا بنا سکتے تھے۔ پرانا ناصر نعیم بن کے میری پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی تھی۔ آج میرے مقابلے پر آنے والے رب نواز کو سبکی اٹھانی پڑی تھی اور اس نے اپنی دولت مندی اور طاقت کے غرور کی عمارت میں زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس کیا تھا۔ اس نے خوف کا ذائقہ چکھا تھا اور قانون کے فولادی ہاتھوں کا ٹھنڈا لمس رکھنے والی ہتھکڑیوں سے ڈر کے وہ عدالت سے بھاگ گیا تھا۔

یہ بات ابھی تک میرے ذہن نے قبول نہیں کی تھی کہ عدالت نے اس کی عبوری ضمانت کی توثیق کیسے کردی جبکہ اس کے خلاف پیش کیے جانے والے سارے دستاویزی ثبوت ٹھوس تھے اور نظرانداز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ عدالت میں بھگدڑ کے بعد وہ فرار ہوا تھا اور جج بھی اٹھ گیا تھا۔ پھر یہ فیصلہ کب ہوا؟ عدالت کے جج کے بارے میں میری ذاتی رائے خراب ہوگئی تھی۔ وہ جج انصاف کے معاملے میں جانبدار ہو کے اپنا احترام کھو بیٹھا تھا۔ میرے اس یقین کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی کہ اعلیٰ عدالتوں میں انصاف کے عمل کو کسی طرح متاثر نہیں کیا جاسکتا۔

میرے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی نیلم بھی آگئی۔ گھر کے سادہ کپڑوں میں' میک اپ کے بغیر وہ ایک بہت گھریلو سی عورت لگ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ نیلم وہی تھی۔ میں وہی تھا۔ رئیس بھی وہی تھا۔ صرف شاہدہ کی جگہ سونی بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلم میں تھوڑی سی متانت آگئی تھی۔ خود میں زمانے کے نشیب و فراز سے گزر کے بہت بدل گیا تھا اور رئیس بھی دس سال پہلے کا لاابالی نوجوان نہیں تھا۔ لیکن جو چیز نہیں بدلی تھی' وہ ہم سب کے جذبات تھے جو ہم ایک دوسرے کے لیے رکھتے تھے اور وہ رویہ تھا جس کی بنیاد ہمارے تعلق پر تھی۔

نیلم نے کہا "اُف۔ آج کچھ نہیں کیا میں نے مگر تھک زیادہ گئی ہوں۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا "سونی نے پریشان تو نہیں کیا تمہیں؟"

وہ ہنسنے لگی "سونی سے پوچھو۔ کیوں بھئی' تم نے تنگ کیا تھا مجھے؟"

رئیس بولا "دو دن میں دماغ چاٹ گئی ہوگی تمہارا؟"

سونی نے برا مان کے کہا "تم سے تو کم ہی بولتی ہوں میں۔"

"ہاں ہاں" رئیس مذاق اڑاتا رہا۔ "بولتی کہاں ہو تم"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاموش خانم۔ منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔"

سونی نے پوری زبان باہر نکالی "پھر یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ یہ تو قینچی ہے۔"

نیلم پھر ہنسی "کتنا عجیب لگ رہا ہے یہ سب۔ کل تک میں اینٹ پتھر کے اس مکان میں بالکل اکیلی تھی میں۔ گھر یہ آج نظر آرہا ہے گھر والوں کے دم سے۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔"

سونی نے کہا "کمال ہے نیلم باجی! آپ بھی اکیلا محسوس کرتی ہیں۔ اتنی رونق ہے آپ کی زندگی میں۔"

"بازار کی رونق دیکھ کے کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس پتھر میں کون اکیلا ہے۔ آج میرے پرستار لاکھوں ہیں۔ میری ایک ادا پر مرنے والے لاکھوں ہیں۔ میری تصویر کو سینے سے لگا کے خواب دیکھنے والے لاکھوں ہیں مگر یہ بڑے مطلبی اور بے وفا لوگ ہیں۔ گلیمر کی دنیا میں ہوس کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ زندگی کے بہت تھوڑے سے دن ہوتے ہیں جب فنکار اپنے عروج پر ہوتا ہے اور اسے یہ غلط فہمی اچھی لگتی ہے کہ دنیا میں سب آرٹ کے قدرداں' فن کی داد دینے والے اور فنکار ان کے دلوں پر راج کرتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ زمانہ بڑی جلدی نظروں سے گراتا ہے۔ اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے کہ فلاں ایکٹریا ایکٹریس کی زندگی بڑی کس مپرسی میں گزر رہی ہے۔ کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔ فنکاروں کی سرپرستی کی دعوے دار کوئی انجمن ان کا علاج کرائے' حکومت توجہ دے۔"

نیلم نے کہا "دور کیوں جائیں۔ ابھی کل صبیحہ خانم کا دور تھا۔ میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں۔ آج کی کوئی ہیروئن مقبولیت میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی مگر کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا کر رہی ہیں اور کیسے جی رہی ہیں؟ ان کے بھی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں مگر خود فلمی دنیا والے بھول گئے ہیں انہیں۔"

رئیس بولا "دیکھو جی۔ جب یہ بات سب فنکار جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا بڑی طوطا چشم ہے اور آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ تو انہیں پہلے سے اپنا بندوبست کرنا چاہیے۔ جب ان پر دولت برستی ہے تو وہ کل کے بارے میں سوچتے ہی نہیں' بڑھاپا تو سب پر آتا ہے۔"

"سچ کہا تم نے۔ اور اس فنکار کا بڑھاپا بڑا عذاب ہوتا ہے جس نے اتنی شہرت اتنی دولت اور اتنی عزت کمائی ہو اور پھر کچھ نہ رہے۔ پہلے کے مقابلے میں آج کے فنکار زیادہ سمجھ دار ہوگئے ہیں۔ پہلے سے کوئی بزنس کرلیتے ہیں۔ اپنے محمد علی صاحب گمنام ضرور ہوگئے ہیں مگر آرام سے ہیں۔ مسرت نذیر نے وقت پر ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی۔ پچیس سال ہوگئے' امریکا میں خوش ہیں۔ بیٹیوں کی بھی شادی کردی۔ کسی کو ظلم لائن کی طرف نہیں آنے دیا۔ نہ نورجہاں نے نہ صبیحہ نے حالانکہ وہ خود فلمیں بنا سکتی تھیں۔"

"بہت سی مثالیں ہیں صبیحہ اور مسرت نذیر جیسی۔ نرمس اور مدھوبالا جیسی سپر اسٹارز نے گھر بسالیا تھا۔" رئیس بولا "بیس سال سے زیادہ نہیں ہوتا کسی اداکارہ کے عروج کا زمانہ' کیا یہ غلط ہے۔"

نیلم چونکی "نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے یہ بات۔"

"تو پھر تم کیا بیس سال پورے ہونے کا انتظار کر رہی ہو؟ دس سال تو گزر گئے ہیں" رئیس بولا۔

میں نے کہا "کبھی کبھی یہ عقلمندی کی بات کرجاتا ہے۔ ابھی انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارے پاس لامحدود مواقع ہیں۔ فیصلہ کرلو۔"

نیلم مسکرائی "تمہارا مطلب ہے شادی کرلوں یا بزنس شروع کردوں؟"

میں نے کہا "دونوں کام ضروری ہیں۔"

سونی نے کہا "نہیں۔ شادی پہلے۔۔۔ آپ سے تو بہت ہوں گے شادی کے خواہش مند۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "سیکڑوں نہیں ہزاروں۔ مگر میرے ساتھ بھی وہی ہو رہا ہے۔ کوئی میری پسند کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ مردوں کو پرکھنا تو آگیا ہے مجھے مردوں کی دنیا میں مردوں کے ساتھ رہ کے۔ ایسا نہیں کہ میرا کوئی آسمانی معیار ہے اور دنیا میں مجھے کوئی ملتا ہی نہیں۔۔۔ مجھے آئیڈیل اور مثالی مرد بھی ملے۔"

"پھر؟ آپ نے انکار کردیا؟" سونی نے بے چینی اور مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ خود اپنی آئیڈیل اور مثالی عورت کی تلاش میں تھے۔ جو میں بہرحال نہیں تھی یا کوئی عورت پہلے ہی ان کو ٹیک اوور کرچکی تھی۔"

میں نے کہا "تم نے ٹیک اوور کرنے والی کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کبھی نہیں۔ حالانکہ مواقع ملے۔ ایسے چاہنے والے ملے جو ہر لحاظ سے میری پسند پر پورے اترتے تھے اور وہ میری خاطر اپنے بیوی بچوں کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے مگر ایک تو یہ جرم اور گناہ کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کسی کا گھر

اجاڑ کے اپنا گھر بساؤں۔ دوسرے مجھے ثانوی حیثیت قبول کرنا منظور نہیں۔ اچھا بہت ہوگئی مجھ سے تفتیش۔ اب ذرا اپنی بات کرو' تم کیوں لنڈورے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم تو جانتی ہو۔ میں شادی شدہ ہوں۔"

اس نے میری طرف دیکھ کے ایک ٹھنڈی سانس لی "کتنی سنگدلی کے ساتھ تم یہ بات مذاق میں کہہ رہے ہو۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ شادو کے ساتھ ہی نہیں مرجاؤ گے تم بھی۔"

رئیس نے کہا "تم نے بلاوجہ بچایا اس احسان فراموش کو۔"

سونی نے سرہلایا "ہاں۔ بچایا تو پھر۔۔۔ ایسے چھوڑنا نہیں تھا۔"

نیلم نے آہستہ سے کہا "پوچھو اس سے۔ چھوڑنے والا کون تھا؟"

میں نے کہا "ایک بات ایسی ہے جو رئیس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آج سب کے سامنے کہی جاسکتی ہے۔ شادو نے مرتے وقت مجھ سے اپنی قسم دے کر ایک وعدہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بعد نیلم سے شادی کرلینا۔"

سونی کا تو جیسے سانس رک گیا "اور۔۔۔ تم نے وعدہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ اس وقت انکار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔"

"تم نے جھوٹا وعدہ کرلیا تھا اس سے؟" سونی دکھی ہونے لگی۔

"یہی سمجھ لو۔"

سونی نے کہا "بڑے گنہگار۔۔۔ اور بے وقوف ہو تم۔"

نیلم مسکرانے لگی "نہیں سونی۔ ناصر کا بہت مضبوط کردار ہے۔ عقل کے معاملے میں بھی اور جذباتی طور پر بھی لیکن ہمارا معاملہ کچھ اور تھا جو دنیا کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ اٹھمار میں نیلم پر کرتا تھا۔ اتنا قریب کسی اور کے ساتھ نہیں تھا میں لیکن یہ قربت اور یہ بھروسا ایسا ہی تھا جیسے رئیس کے ساتھ تھا۔ میرا بھی خاندان ہوتا گھر میں کسی بہن کے ساتھ یا بھابی کے ساتھ۔ میں ایسا ہی محسوس کرتا۔"

نیلم نے سرہلایا "یہی بات تھی۔ خود میں نے جب ناصر کو دیکھا' یہ شادو کے خیال میں گم سڑک پر چلتے چلتے اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا تھا اور میں نے بھی یہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ میں خود جذباتی طور پر بہت آپ سیٹ تھی اور کچھ نشے میں بھی تھی۔ میں اسے بچا نہیں سکی۔ میں اسے اسپتال لے گئی علاج کے لیے۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک لمبا کیس بن گیا۔ بتادیا اخبار والوں نے۔"

میں نے کہا۔ "کچھ لوگوں نے مجھے اکسایا کہ میں فائدہ اٹھاؤں۔ میں تو نیلم کو جانتا ہی نہیں تھا۔"

نیلم ہنسی "ہاں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی اور غصہ بھی آیا تھا جب ناصر نے پہلے تو مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے بتایا تو کہنے لگا کہ کون نیلم۔ میں نے کہا کہ میں فلموں کی مشہور ہیروئن ہوں تو اس نے کہہ دیا کہ میں فلمیں دیکھتا ہی نہیں تو مجھے کیا معلوم۔ اس دن پہلی بار مجھے یہ خیال بہت عجیب لگا تھا کہ دنیا کی بات کیا' پاکستان میں اور لاہور میں بھی لوگ ہیں جو کسی نیلم کے نام سے واقف نہیں۔ میں نے خود ہی عدالتی معاملات کی پریشانی سے بچنے کے لیے اور کچھ اس کی مدد کے لیے' ایک چیک دے دیا تھا۔ ایک لاکھ کا یا شاید دس لاکھ کا۔ اب یاد نہیں۔ وہ اس نے مجھے واپس کردیا۔ حالانکہ یہ اس وقت بالکل پھکڑخاں اور کنگال بیگ تھے مگر اس کی یہی بات میرے دل پر اثر کرگئی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا جب اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ شادو اس کے ساتھ بے وفائی کررہی ہے اور یہ شادو کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میٹرک کا امتحان دیا تھا اس وقت ناصر نے۔ میں اس کے ساتھ گھر گئی۔ دھرمپورے کی ایک گلی تھی۔ یہ اپنی ماسی ہیر اور ڈاکٹر انجا کے ساتھ رہتا تھا۔"

میرا دل ایک دم ان نیک روحوں کے خیال سے شرمندگی کے بوجھ تلے دب گیا۔ "پتا نہیں کہاں ہوں گے وہ۔"

نیلم نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "تمہیں نہیں معلوم؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "نہیں' تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔ چھ سات مہینے پہلے ملنے گئی تھی' ٹھیک تھے۔"

رئیس نے کہا "ڈوب مرے غیرت آدمی۔ ماں باپ کتنا تھا انہیں۔"

میں نے کہا "چل دونوں ڈوب مرتے ہیں ایک ساتھ۔ تیرے کچھ نہیں لگتے تھے وہ؟"

سونی نے افسوس سے کہا "مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ جن کے باپ نہ ہوں' انہیں بڑا احساس ہوتا ہے محرومی کا اور کہیں پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں تو انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شاید یہی ایک فرق ہے حقیقی اور مصنوعی رشتوں میں۔ ماں باپ اور بہن بھائی کا رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہوتا۔ باقی سب وقتی ضرورت کے رشتے رہتے ہیں۔ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہو نیلم۔ میں لوٹ کے آیا تمہارے پاس یا نہیں۔ اور کیا کوئی فرق پڑا؟"

"آئے تو ضرورت پڑنے پر ہی" سوئی نے کہا۔

"ہاں۔ ضرورت پڑنے پر اپنے ہی یاد آتے ہیں۔ لوگ خدا کو بھولے رہتے ہیں۔ مصیبت میں پڑتے ہیں تو اسی کو یاد کرتے ہیں۔ اگر میں شرم یا جھجک اور خوف کے باعث نہ آتا تو مختلف بات ہوتی مگر یہاں میں پورے اعتماد کے ساتھ آیا اور میرا یہ اعتماد غلط ثابت نہیں ہوا۔ لوگ کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"

"ایسا ہی ہے دنیا میں۔"

میں نے کہا "میں نہیں مانتا۔ تجھ سے کتنے سال نہیں ملا میں۔ ملا تو کیا کوئی فرق پڑا۔ ہم جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہے۔ نیلم وہی ہے جو کل تھی۔ ماسی ہیر اور رانجھا بھی وہی ہوں گے۔ ویسے ہی ملیں گے۔ یہ جو جذبات ہیں نا ہمارے' یہ بولنے والے نہیں ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں پڑ کے آدمی بے خبر ضرور ہو جاتا ہے۔ بے گانہ نہیں ہوتا۔"

رئیس نے کہا "کہاں ہیں وہ دونوں؟"

"وہیں۔ ناصر نے جو مکان خریدا تھا ان کے لیے۔ اسی میں لوٹ آئے تھے۔ نیچے کی ایک دکان میں ڈاکٹر رانجھا کا کلینک ہے۔ اس نے اب داڑھی رکھ لی ہے۔ ایک فٹ لمبی۔ پہلے سر پر بال نہیں تھے' اب خوب ہیں ماشاءاللہ۔"

میں نے کہا "یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ اس کے کسی طلسماتی نسخہ کیمیا کا کمال ہے؟"

"نہیں۔ یہ وگ کا کمال ہے" نیلم ہنس پڑی۔

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا۔ نیلم نے سوئی کو آرام کے لیے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ پرانے دوستوں کی یہ محفل اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کہتی رہی کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں مگر نیلم نے اس کی ایک نہیں سنی۔ یہاں تک کہ وہ رونے پر آ گئی پھر نیلم کو اس کی بات ماننی پڑی۔ ہم نیلم کے خواب ناک ماحول والے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ یہاں ہر چیز بالکل سفید تھی۔ اجلے سفید ریشمی پردوں پر بالکل شفاف قسم کی جال کے پردے تھے۔ وائٹ اٹیلین پینٹ والا گول بیڈ تھا اور اس پر وائٹ ہی بیڈ کور تھے۔ فرش پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا وہیز قالین تھا لیکن اس کی سفید زمین میں ہلکے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں سفید ریگزین والا صوفہ سیٹ تھا جس پر سفید کشن پڑے تھے۔ میں نے سفید گاؤ تکیے کے ساتھ فرشی نشست کو ترجیح دی۔

اچانک ہی میری نظر کارنر ٹیبل پر گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ خود رئیس کی نگاہ تصویر کے ایک فریم پر رک گئی۔ چاندی کے سفید فریم میں میرے ساتھ شادو کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایسے کہ اس کی مسکراہٹ زماں و مکاں کی قیود سے آزاد لگتی تھی۔ وہ جیتی جاگتی شادو تھی جو کل کی ساری یادوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ ایسے کہ میں اس کے قرب کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے لمس کی سنسنی خیزی۔ اس کے وجود کی خوشبو۔ اس کی آواز کا جادو۔ سب اچانک زندہ ہو گئے۔

میں نے کہا "یہ تصویر۔۔۔"

نیلم نے کہا "تمہارے سامان میں تھی۔ تم دونوں نے اسٹوڈیو میں جا کے بنوائی تھی' کچھ یاد ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اس میں تو وہ بہت صحت مند لگ رہی ہے اور۔۔۔ یہ لباس' ایسے کپڑے کب پہنے تھے اس نے یہاں۔ پتلون اور اوور کوٹ۔"

نیلم نے کہا "ٹھیک ہے۔ یہ تصویر اس نے انگلینڈ میں بنوائی تھی۔"

میرے دل میں ایک پرانے زخم کی ٹیس جاگی "جب وہ شادی کے بعد ہاشمی صاحب کے ساتھ ہنی مون منانے گئی تھی؟ اس کے ساتھ ہاشمی صاحب بھی کھڑے ہوں گے تصویر میں۔"

"ہاں۔ انہیں میں نے نکال دیا۔ اور اتفاق سے تمہاری ایک تصویر تھی میرے پاس جو بالکل سیٹ ہو گئی۔ اس میں تم ایسے ہی میرے ساتھ کھڑے تھے۔"

"کیا فائدہ ہوا تمہیں ایسے ہمیں اکٹھا کر کے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ تمہارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ تمہاری تھی۔ مرتے وقت تک رہی۔ اس کا مرنا جینا سب تمہارے لیے تھا۔ اس کی ہر سانس تمہارے اچھے مستقبل کے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وقف تھی۔ ایک فقیر کی بیٹی تھی وہ مگر اس کا دل۔۔۔ اتنا بڑا کہ اس میں سمندر سما جائے۔ محبت کس جذبے کا نام ہے۔ یہ اس نے جی کے اور مر کے دکھایا۔ وہ مجسم قربانی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دیا تھا۔ سب تم پر قربان

کر کے دکھا دیا۔ گھر چھوڑا تمہارے لیے۔ ساتھ چھوڑا تمہارے لیے۔ تمہیں مضبوط اور خوش حال بنانے کے لیے' تمہاری ترقی کے لیے۔ ہاشمی صاحب سے شادی کی' تمہارے لیے اور بالآخر مر گئی تمہارے لیے تاکہ تم کامیابی کے راستے پر آگے بڑھو۔ وہ تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔"

میں نے کہا "سچ کہا تم نے۔ میں اس کے لائق نہیں تھا۔ کچھ نہیں کیا میں نے اس کے لیے۔ آج میں جو ہوں اس کی وجہ سے ہوں مگر وہ خود نہیں ہے۔"

نیلم نے محسوس کیا کہ یادِ ماضی میں ڈوب کے ہم سب پر افسردگی طاری ہو رہی ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "پہلے یہ بتاؤ کہ چائے چلے گی یا کافی!"

میں نے کہا "اچھی چائے' کافی کا موڈ نہیں۔"

"جاؤ' سوئی ذرا کہہ دو کسی سے اور اب ذرا تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آخر کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے کچھ سوچنے کی۔ اتنے لوگ ہیں نا سوچنے والے۔"

"مجھے سوئی نے سب بتا دیا ہے۔ آخر ایسے کب تک چلے گا ناصر؟ تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟"

میں نے کہا "اسے تقدیر کا چکر کہتے ہیں۔"

"بکو مت۔ تقدیر آدمی خود بناتا بگاڑتا ہے۔ تمہاری کامیابی اتنی ہی قابلِ رشک تھی جتنی خود اپنے ہاتھوں تمہاری تباہی۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ غلطی سے ہوا یا شامت اعمال کے باعث۔ تم اب شاہ عالم نہیں' پھر ناصر عظیم ہو۔ سب کچھ وہی ہے۔ جو تمہارا تھا' تمہارے پاس ہے۔"

"سوائے چندا کے" سوئی نے کہا۔

"صراطِ مستقیم سے بھٹکنے والے کو کچھ تو خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے اپنی نادانی کا۔ کچھ تو سزا ضرور ملتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں مانتی کوئی سزا ویزا ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا اس کی فطرت سامنے آ گئی۔" سوئی نے کہا "وہ کیا کہتے ہیں۔ مٹکے کی ہانڈی گئی۔ کتے کی ذات پہچانی گئی۔"

میں نے غصے سے کہا "سوچ سمجھ کے بولا کرو سوئی۔ تمہیں کیا معلوم چندا کیا تھی۔"

"تھی۔۔۔ مجھے اس سے کیا کہ وہ کیا تھی۔ میں تو وہ کہہ رہی ہوں جو ہے۔ وہ جیسی ہے۔"

میں نے کہا "وہ ایسی نہیں ہے۔ غلط سمجھا ہے تم نے اسے۔"

"حد کرتے ہو تم بھی۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے اس کے بعد"

میں نے کہا "شٹ اَپ سوئی۔ میں احسان مند ہوں اس کا۔ اس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں تباہی اور مایوسی کے اندھے کنوئیں میں گرا ہوا تھا۔ اس گھر میں دس سال گزارے ہیں میں نے اور کرنل خان کی بیٹی نے۔"

نیلم نے پھر صورتِ حال کو سنبھالا "دیکھو' یہ جذبات کے رشتے اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں۔ اصل بات ہے زندگی کا چلن۔ تم نے بڑی ترقی کی پھر بہت مختصر وقت کے لیے تم مخالف حالات کی دلدل میں پھنس گئے۔ سمجھو خود دلدل نے کھینچ لیا تھا تمہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم اس میں سے نکل آئے۔ کوئی نقصان اٹھائے بغیر۔ اس سے تمہاری قسمت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ قدرت تم پر کتنی مہربان ہے ورنہ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ شاہ عالم زندہ رہتا اور تمہیں مار دیا جاتا۔ یا یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تم شاہ عالم نہیں ہو' اس کے حامی اور ساتھی تمہاری تکا بوٹی کر دیتے۔ یا عدالت تمہیں جیل بھیج دیتی مگر دیکھو' کیسے حالات موافق ہوتے چلے گئے۔ رخشی نے مان لیا کہ تم شاہ عالم ہو پھر شبنم مان گئی اور اس کے بعد جب تم نے پھر ناصر عظیم بننے کا فیصلہ کیا تب بھی تمہیں تائید ایزدی حاصل رہی۔"

میں نے کہا "یہ سب کس نے بتایا تمہیں؟"

سوئی نے کہا "میں نے۔"

"اور تمہیں بتایا رئیس خاں نے؟" میں نے اسے گھور کے دیکھا۔

اس نے مجرمانہ اعتراف کے طور پر سر جھکا لیا "اے یار۔ اب سوئی نے بھی تو سب بتا دیا تھا۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ شبنم کے دل میں ابھی تک شک کی جڑیں باقی ہیں۔"

رئیس نے کہا "اب کچھ نہیں ہو گا یار۔ سوکھ چکی ہیں وہ جڑیں۔ اب وہ شاہ عالم کو نہیں بچنے چاہتی ہے۔ تو جو بھی ہے' جیسا بھی ہے۔ ناصر عظیم ہے یا کچھ اور۔ نام سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ تو شرط لگا کے آزما لے۔ کسی دن کہہ دے کہ میں سچ بولنا چاہتا ہوں اور پھر سچ بتا دے۔"

میں نے کہا "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک سادے کے باعث چندا تمہاری نہیں رہی اور اس کی جگہ شبنم آ گئی۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے شادو کی جگہ چندا نے لی تھی۔ نہ وہ تمہاری خواہش تھی۔ نہ یہ تم نے چاہا تھا لیکن یہ تو تم جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔ یہ سراسر دھوکا ہے تمہارا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ میں پرلے درجے کا احمق اور بے وقوف ہوں" میں نے کہا۔

"ناصر۔ چھوڑو یہ رب نواز کے ساتھ دشمنی کا چکر۔"

"محبت اور نفرت۔ دوستی اور دشمنی کا تعلق جذبات سے ہے اور ایک جذبے کو بٹن دبا کے نہ سوئچ آف کیا جا سکتا ہے اور نہ سوئچ آن۔ رب نواز کے ساتھ میری دشمنی کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ یہ تم جانتی ہو اور دشمن کے یہ جذبات بدل سکتے تھے' ختم ہو سکتے تھے۔ اگر وہ مجھ سے ایک شریف آدمی کی طرح ملتا۔ کہتی ہو کہ پرانی باتیں بھول جاؤ مگر وہ میرے سامنے فرعون کی طرح آیا۔ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا آیا۔ اس نے دس سال بعد بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے بھائی حق نواز نے میرے اور رئیس کے ساتھ اس وقت کیا تھا' جب ہم نو عمر لڑکے تھے۔"

نیلم نے کہا "میں تمہاری صلح کرا سکتی ہوں۔"

"صلح کی پیشکش وہ خود ہی کر چکا ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے کاروبار میں دخل اندازی نہ کروں۔ اس نے تو مجھے اپنا پارٹنر بنانے کی کوشش کی تھی۔ تم جانتی ہو اس کے کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

میں نے کہا "وہ ایک اسمگلر ہے۔ صرف منشیات کا نہیں' وہ اس ملک کی تاریخ اور تہذیب کے خزانوں کو لوٹ رہا ہے اور ہمارا قومی ورثہ ہمارے دشمنوں کو بیچ رہا ہے۔ ان لوگوں کو فروخت کر رہا ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ہمارے دشمن رہے ہیں۔ مذہبی طور پر اور معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ آج ان کی صلیبی جنگ کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ ایران' عراق' شام اور فلسطین کو آپس میں لڑا کے تباہ کرتے ہیں۔ ان پر براہِ راست حملے کرتے ہیں۔ ان کی معیشت پر قابض ہیں۔ وہ مسلمانوں کے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو اسی طرح پامال کر رہے ہیں۔ قرضوں سے' امداد سے' پیپسی کولا اور کوکا کولا سے اور ہر گرلز کلچر سے۔ سیٹلائٹ چینلز سے اور۔۔۔"

نیلم مسکرائی "ایزی۔۔۔ ایزی۔ اتنا چلانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "ہمارے نوادرات اور آثارِ قدیمہ یورپ اور امریکا منتقل ہو رہے ہیں۔ ایسا ہی ان لٹیرے انگریز تاجروں نے بھی کیا تھا جو یہاں کاروبار کرنے آئے اور دو سو سال کے عہدِ غلامی کی سند دے گئے۔ یہ رب نواز جیسے لوگ انہی کے ایجنٹ ہیں۔ غلام زادے ہیں۔ جن کو قومیت اور وطنیت کے نام کا مطلب معلوم نہیں۔ یہ پاکستان کے بھی دشمن ہیں اور مسلمانوں کے بھی۔ ان کو میں کیسے معاف کر دوں۔ کیسے ان کے ساتھ COMPROMISE کر لوں۔"

چائے لے کر آنے والی خادمہ نے ایک پیغام دیا "میڈم' ایک فون۔"

نیلم نے خفگی سے کہا "جب کہہ دیا تھا کہ نو فون۔"

خادمہ نے کہا "فون ان کے لیے ہے میڈم۔ رحمان صاحب نے پوچھا ہے کیا ناصر صاحب بات کریں گے؟ کوئی فرید عباسی ہیں۔"

میں نے کہا "او گاڈ! کہاں ہے فون؟"

"میں لاتی ہوں۔" وہ گئی اور ایک کارڈلیس فون کا ریسیور اٹھا کے واپس آئی۔ فرید ہولڈ کیے ہوئے تھا۔

میں نے کہا "وکیل صاحب خیریت ہے؟"

وہ بولا "اے خوش خبری ہے بہت بڑی۔"

میں نے کہا "تیرے منہ میں ویسی گھی اور ولایتی شکر۔"

"وہ سالا رب نواز۔ ایک نمبر کا فراڈیا اور جھوٹا۔ عدالت سے ہمارے سامنے بھاگا تھا۔ وہاں کہہ رہا تھا کہ میری ضمانت کی توثیق ہو گئی ہے۔"

"تو کیا۔۔۔ ضمانت نہیں ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ اسے فیملی نکال لے گئی تھی۔ پکا بندوبست کر کے آئے تھے وہ لوگ اور سینہ زوری دیکھو چور کے بچے کی۔ وہاں پہنچ گیا۔ پریس کانفرنس میں' پولیس اسٹیشن۔"

"اس کا تو سسرال ہے۔ ڈر کیسا' مگر مجھے کس نے بتایا؟"

"اس جج کے ریڈر کا بھائی ہے۔ وہ بھی وکیل ہے۔ اس نے بتایا کہ جج نے ضمانت کی توثیق نہیں کی تھی۔ کر بھی کیسے سکتا تھا یار۔ اپیل ہو جاتی تو وہ کیا جواز پیش کرتا؟ فل بینچ میں چیف جسٹس کے سامنے جاتا ہے فیصلہ۔"

میں نے کہا "اب کہاں ہے وہ؟"

"روپوش ہے۔ اس کے وکیل ضرور اپیل کریں گے۔ ڈویژن بینچ میں دوسرے جج ہوں گے۔ شبنم نے پوچھا تھا سوال کہ ضمانت کیا منظور ہوئی تو کیسے جواب کو گول کر دیا تھا اس نے۔ میں رخشی کے ساتھ یہاں ہوں' کریا رام کمپاؤنڈ میں۔ عزیز اللہ ہاشمی بیرسٹر سے بات کرنے آیا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ لیگل فرم بنانے پر راضی ہو گئے تو بڑا فائدہ ہو گا۔ ابھی تک وہ کسی کے ساتھ پارٹنرشپ میں تھے۔ اے اے ایسوسی ایٹس کا نام سنا ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو بہت بڑی لا فرم تھی۔"

"تھی نہیں ہے۔ ایک پارٹنر تھے عزیز صاحب دوسرا تھا عادل شاہ۔ مگر عادل شاہ نے ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور عملاً فرم پر قابض ہو گیا۔ عزیز صاحب بہت دل شکستہ ہو کے الگ ہو گئے۔ سب جانتے ہیں کہ فرم کی گڈ ول انہی کے دم سے تھی۔ کچھ مالی مسائل بھی درپیش ہیں انہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سینئر پارٹنر ہوں گے۔ دو تہائی آپ کا' ایک تہائی میرا۔ آفس وغیرہ کا انتظام میں کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ پارٹنرشپ تو ہو گی ففٹی ففٹی کی بنیاد پر لیکن وہ کچھ معاملات میں اپنے تحفظات رکھتے ہیں۔ محتاط ہیں ایک بار دھوکا کھا کے۔ تم کہاں ہو؟"

"ہم بڑی محفوظ جگہ پر ہیں۔ سونی کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ شام تک ہم آ جائیں گے ادھر ہی۔"

"یار' یہ تو بڑی زیادتی ہو گی' اگر ہم سب۔۔۔"

"یار' میں سمجھتا ہوں یہ بات۔ وہاں صرف سونی کو رہنا چاہیے۔ تجھے بھی نہیں' ایک جگہ میں نے دیکھی تھی۔ ایک رئیس نے دیکھی ہے۔ کیا اس نے بتایا نہیں؟"

"نہیں۔ دوسری باتوں میں خیال نہیں رہا ہو گا۔" میں نے کہا۔

فون پر میری یک طرفہ گفتگو سے بھی سب نے اندازہ کر لیا تھا کہ فرید عباسی نے فون پر کیا اہم خبر سنائی ہے۔ فون رکھ کے میں نے رئیس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا "نعرہ قلقلی۔"

رئیس نے فوراً منہ پھاڑا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے گیدڑ جیسی آواز نکالی۔ نیلم اور سونی کو جتنی حیرانی ہوئی' اس سے زیادہ ہنسی آئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ فتح کا نرالا ہے۔ عدالت نے رب نواز کی پہلی شکست پر میرا تصدیق لگا دی ہے" میں نے کہا۔

"اب اسے لگیں گی ہچکیاں۔ پھر وہ جائے گا جیل" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس کے بعد عدالت میں پیشی ہو گی تیس مار خان اور چھوٹی کے قاتل کی۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

"پھر ایک دن اسے پھانسی ہو گی۔"

"SLOW DOWN۔ آہستہ چلو۔ خرگوش کی طرح چھلانگیں مت مارو" نیلم نے کہا "ایسا نہ ہو توقعات کا یہ شیش محل ایک پتھر سے بکھر جائے۔ حقیقت صرف خواہش کا نام نہیں ہے۔"

"تم تو فلسفہ بولنے لگی ہو" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم بہت ضدی ہو۔ وہی کرو گے جو دل میں آئے گا۔ پھر بھی مشورہ دینا دوستوں کا فرض ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم جو کر رہے ہو وہ غلط ہے لیکن اس دنیا میں کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کی زندگی کے ساتھ تمہاری زندگی جڑی ہوئی ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت اور نفرت کے سوا۔ تم کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔"

"رائٹ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ بالآخر میرا یتیم خانے کی تعمیر کا خواب پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے" میں نے کہا "میں اب اپنا بزنس ہی سنبھالوں گا۔"

وہ بولی "مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔"

میں نے کہا "آفر سے پہلے تھینک یو۔ میں جانتا ہوں کہ اب تم کیا فرمائش کرو گی لیکن یہ ممکن نہیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ NEVER۔ یہ بات تو بھول جاؤ تم۔"

وہ بہت مایوس ہوئی "تم کہیں تو رہو گے۔ یہاں کیا کمی ہے جگہ کی۔ اچھا تھا یہ ویرانہ بھی آباد ہو جاتا۔"

میں نے کہا "ہم الو ہیں۔ جہاں بولتے ہیں وہ آباد گھر ویرانے ہو جاتے ہیں' رئیس نے کوئی جگہ دیکھ رکھی ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "ہاں۔ ہم آتے رہیں گے۔ سونی ہماری ضمانت کے طور پر یہاں رہے گی۔ فی الحال اسے قید میں ہی رہنا چاہیے۔"

"ہم سیکیورٹی رسک ہیں۔ جہاں جاتے ہیں خطرات کو ساتھ لے جاتے ہیں ورنہ وہ ہمیں تلاش کر لیتے ہیں۔"

ہم شام تک باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے وقت کی۔ آنے والے وقت کی۔ وقت جس نے ہمیں خواب دیے اور وقت جس نے ان کی تعبیروں کو پیچیدہ بنا دیا۔ شام ہوئی تو ملازموں نے ایک بہت خوبصورت جنت کے ٹکڑے جیسے باغ میں چائے لگا دی۔ سونی وہاں ایک صوفہ بیڈ پر جھولتی رہی اور بچوں کی طرح خوش ہوتی رہی۔ ہم رئیس کو چھیڑتے رہے۔ اس کے سارے عشق اسے یاد دلاتے رہے۔

"کیا پسند تھی اس کی۔ ایک تو ایک ہیوی ویٹ چیمپئن۔ دو سو پاؤنڈ وزن کے بغیر تو عاشقی کے لیے کوالیفائی ہی نہیں کرتی تھی کوئی۔ کہتا تھا کہ لڑکی ہونی چاہیے تو ان ون۔ جیسے صوفہ کم بیڈ ہوتا ہے۔ ایسے ہی بیوی کم صوفہ۔ یا مولنی فوم بیوی ہونی چاہیے۔ گدے کا مزہ آئے۔"

رئیس شرمندگی سے دانت نکالتا رہا۔ "ابے یار۔ پسند ہے اپنی اپنی۔"

میں نے کہا "سالا نام بھی کیا چن کے رکھتا تھا۔ برفی'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امرتی' جلیبی' رس ملائی' ربڑی۔"

"اب پسند بدل گئی ہے شاید؟" نیلم بولی۔

میں نے سونی کی طرف دیکھا "شاید کیا ... یقیناً اور تبدیلی بھی وہ آئی ہے کہ فرق ہے زمین آسمان کا۔ آدمی کو ایسا دھوبی پچھاڑ دیتا ہے وقت۔"

سونی نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ کچھ نہیں سن رہی حالانکہ وہ ہم سے اتنی دور بھی نہیں تھی۔ رئیس نے آہ بھری "سچ کہتا ہے تو پیارے' دیکھ لے رئیس خاں کے سب شوق بھی کہاں رہے ورنہ اپنے مرغے لڑتے تھے تو دھوم ہوتی تھی کراچی سے لنڈی کوتل تک۔"

نیلم نے اچانک سوال کرلیا "تمہاری عشق کی تیز گام کیا بالآخر شبنم کے اسٹیشن پر ٹھہر گئی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تو رکی ہوئی ہے۔ کل کا حال خدا جانتا ہے۔ تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ۔"

"اس سے پہلے کہ تقدیر کوئی چال چلے' شادی کرلو" وہ بولی۔

میں نے کہا "شادی ... ابھی کوئی جلدی نہیں ہے مجھے۔ ایک نہ ایک دن تو سب کی شادی ہوجاتی ہے۔ اپنی بھی ہوجائے گی اور شبنم کے ساتھ لکھی ہے تو اسی کے ساتھ ہوگی۔ جوڑے تو اوپر والا بناتا ہے۔"

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بالکل تمہاری پسند' مزاج اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کے بنائی ہے بنانے والے نے۔"

میں نے کہا "سب ایسی ہی لگتی ہیں نیلم اور ایسی ہوتی بھی ہیں۔ کیا خیال ہے ہم مانی ہیر کی طرف چلیں؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"آج نہیں۔ میں نے دو دن کے لیے سارے شیڈول ملتوی کردیے ہیں۔ ایسے فرصت کے دن میری زندگی میں آتے ہی نہیں۔ گھر پر رہ کے میں کیا کروں۔ شوٹنگ پر چلی جاتی ہوں۔ فلسز بہت خوش ہیں مجھ سے کہ میں انکار نہیں کرتی۔ وقت پر پہنچ جاتی ہوں اور لمبی ہوجائے شفٹ تو برا نہیں مانتی۔ مزہ آتا ہے آؤٹ ڈور میں۔ مری' کاغان' آزاد کشمیر' سوات۔ لوگ یہاں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ سیزن گزارتے ہیں فیملی کے ساتھ۔ میں کس کے ساتھ جاؤں؟ فلم یونٹ کے ساتھ بہت سے ملک دیکھ لیے۔ اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔"

میں نے کہا "تفریح کا نام تو میں بھی بھول گیا ہوں۔ خیر' اب ہم سب چلیں گے۔"

رات کو شبنم نے فون کیا۔ وہ آفس میں تھی اور اس نے آزاد صاحب کو قائل کرلیا تھا کہ اب وہ پھر سنجیدگی سے صحافت کرنا چاہتی ہے اور دیگر تمام ناپسندیدہ مشاغل سے تائب ہوچکی ہے۔

"انہوں نے یقین کرلیا؟" میں نے پوچھا۔

"یقین کرنا ان کے لیے ضروری ہوگیا ہے ناصر۔ وہ کچھ بیمار رہنے لگے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہ کم بخت دل' اس نے ہمیں بہت ستایا ساری عمر۔ اب بھی نہیں سمجھتا کہ جوانی نہیں رہی۔ اس عمر میں دل کا روگ لگ گیا ہے۔ بہت مایوسی اور ڈیپریشن کی باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"کوئی ہارٹ پرابلم ہوگئی ہے؟"

"ہاں۔ انجائنا کا مسئلہ پہلے بھی تھا' درمیان میں ایک MILD سا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں مکمل آرام کے لیے کہا ہے ڈاکٹرز نے مگر کام سے فرصت کہاں۔"

میں نے کہا "تم سنبھالو کام کو بھی اور آزاد صاحب کو بھی۔"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ وہ بھی چاہتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "تم بے فکر ہو کے انہیں ATTEMD کرو۔ ابھی ادھر آنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دن احتیاط لازم ہے۔"

کچھ دیر بعد فرید کے ساتھ رخشی آگئی۔ اسے بھی نیلم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے خالص زنانہ اور فلمی باتیں شروع کردیں تو میں۔ فرید عباسی اور رئیس باہر آگئے۔ باغ کا ماحول بڑا خوابناک تھا۔ مالی نے اس کی تزئین و آرائش پر بڑی محنت کی تھی مگر یہ نیلم کے ذوق وشوق کا آئینہ دار بھی تھا۔ ہم گارڈن چیئرز پر بیٹھ گئے تو ایک ملازم نے ہماری فرمائش پر کافی وہیں سرو کی۔

فرید نے سمن آباد کے علاقے میں ایک گھر دیکھا تھا۔

"آج خیال تھا کہ رئیس خانے جائیں اور سب کا ضروری سامان اٹھالیں۔ بس فرنیچر وغیرہ چھوڑ دیں۔ وہ نیا لے لیں گے لیکن رخشی رات کے وقت ادھر جاتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

"ہاں۔ ابھی تو ہے ایک مسلح محافظ ساتھ مگر اس سے زیادہ خود اپنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

رئیس نے کہا "ایک کوٹھی میں نے بھی دیکھی تھی ایئرپورٹ کی طرف۔ کسی سابق جنرل کی ہے۔ ایک پورشن میں خود رہتا ہے' دوسرا ہماری ضروریات کے لیے کافی تھا۔ مجھے خاصی محفوظ لگی وہ جگہ' چھاؤنی کا علاقہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا حرج ہے اگر وہ بھی لے لیں۔ ایک سے

دو ٹھکانے بھلے" میں نے کہا "کل AGREEMENT کرلو۔"

فرید نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ ہم سب کو محتاط رہنا ہوگا۔ نئی زندگی کے سیٹ اپ میں DISTURBANCE نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "عزیز ہاشمی کے ساتھ معاملات کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟"

"وہ مان گئے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا ایک مقام ہے اور رتبہ ہے اس پیشے میں۔ انہیں کئی بار ہائی کورٹ کا جج بننے کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے آزادانہ پریکٹس کو ترجیح دی۔ سب بڑے وکیل سرکار کی نوکری کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ ہاشمی صاحب چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات تو لیتے نہیں۔ سیاسی اور آئینی نوعیت کی PETITIONS ملتی ہیں انہیں اور ایسے کیس میں معاوضہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ وہ میرے جیسے جونیئرز سے احترام کا رویہ چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔ میں نے انہیں یقین دلادیا ہے کہ وہ فرم میں ہیڈ آف فیملی کی طرح ہوں گے۔ اب مسئلہ ہے ایک مناسب آفس کا۔ ایک آفس ہے مال پر۔ ہائی کورٹ کے سامنے رینکن اینڈ کمپنی والی گلی میں۔ ایک عمارت کا پورا فرسٹ فلور ہے۔ نیچے دکانیں ہیں۔ اوپر ایک اخبار کا دفتر ہے اور چند دوسرے وکیلوں کے آفس۔"

"اس سے اچھی جگہ کیا ہوگی؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "یار کرایہ بہت مانگ رہا ہے لینڈ لارڈ!"

میں نے کہا "اتنی دولت مند بیوی ہے تیری۔ کنجوسی کیوں دکھاتا ہے۔ ایک کامیاب مستقبل کے لیے یہ کوئی فضول خرچی نہیں۔ INVESTMENT ہے۔ ایک صحیح معنوں میں بڑی لیگل فرم کشمی چوک کے قلمی دفاتر والی بلڈنگ میں نہیں ہوسکتی۔"

اچانک دروازے کی طرف سے گارڈ کے چلانے کی آواز آئی۔ اس کا کسی سے جھگڑا ہو رہا تھا "ایسی بدمعاشی سے کوئی اندر نہیں جاسکتا۔"

"اوئے۔ بدمعاش کس کو بولا ہے ... تو جانتا نہیں۔"

جواب میں کسی نے اسے گالی دی۔

"گالی مت دو۔ تم جو بھی ہو' میڈم نے کہا ہے کہ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتیں۔ ابھی تو گورنر بھی نہیں مل سکتا ان سے۔"

"تو نے بتایا ہے انہیں نام ہمارا؟" کسی نے پھنکار کے کہا تو ہم سب ایک ساتھ چونکے کیونکہ یہ آواز کسی اور کی نہیں' ملک رب نواز کی تھی۔

"بتایا تھا جناب!"

رب نواز دہاڑنے لگا "اس دو ٹکے کی رنڈی کی یہ مجال!"

رب نواز کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نشے میں ہے "وہ ہم سے ملنے سے انکار کرتی ہے' ملک رب نواز سے ...؟"

"ملک صاحب! آپ ہوش میں نہیں ہو" گیٹ کیپر نے کہا۔

ملک رب نواز نے چیخ کے کہا "اوئے' کیا دیکھ رہا ہے ... گیٹ توڑ دے۔ اس بھونکنے والے کتے کو اڑا دے۔"

میں نے روڈ کے اندر نیلم کو بتایا۔ وہ رخشی اور سونی کے ساتھ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ انہیں باہر کی خبر نہ تھی۔ نیلم میرے ساتھ باہر تک آئی۔ اس کا سیکریٹری جاچکا تھا۔ میں نے اسے آگے جانے سے روک دیا۔ "تم پولیس کو فون کرو۔ کسی بڑے افسر سے کہو تاکہ پولیس فوراً آئے۔ یہیں گرفتار کرلے اسے۔"

نیلم نے کہا "نیک اٹ ایزی۔ وہ اندر نہیں آسکتا۔"

ایک ملازم نے اسے فون لا کے دیا۔ باہر ملک رب نواز گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا اور سیکیورٹی گارڈ نے اس پر واضح کردیا تھا کہ کسی نے زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ گولی مار دے گا۔ وہ ایک مشہور سیکیورٹی کمپنی کا لائسنس یافتہ گارڈ تھا۔

نیلم نمبر ملا رہی تھی کہ پہلا فائر ہوا۔

قیمت فی جلد 150 روپے

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

محی الدین نواب

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا

سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا جال

پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا جال

بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان

سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں

اپنے بک سیلر سے اپنے شہر کے بہترین بک سیل سے طلب فرمائیں

ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

اسٹاکسٹ: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ مزنگ روڈ' اردو بازار لاہور ☎7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صورتِ حال یکلخت خطرناک اور سنگین ہو گئی تھی۔
ایسا لگتا تھا کہ شراب کے نشے میں رب نواز کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا اور اس نے سیکیورٹی گارڈ کو گولی مار دی۔ گارڈ صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔ اسے دروازے پر اسی لیے کھڑا کیا گیا تھا کہ وہ وقت ناوقت ہر شخص کو اندر نہ جانے دے۔ کسی کا گھر بھی شارع عام نہیں ہوتا کہ جس کا دل چاہے بلا روک ٹوک اندر پہنچ جائے لیکن بدقسمتی سے رب نواز جیسے ہزاروں تھے جو نیلم کو بھی شارع عام سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی نہیں ایک ایکٹریس تھی۔ نیلم کے لیے اس کی کوٹھی اتنی ہی پرائیویٹ جگہ تھی جتنی ملک رب نواز کے لیے اس کی کوٹھی مگر وہ اسے گھر نہیں کوٹھا سمجھتا تھا تو یہ اس کے مزاج کی فرعونیت، فیوڈل سوچ اور بدکرداری کا قصور تھا۔
رئیس میرے ساتھ ہی گھبرا کے اُٹھا۔ "سونی! تم جاؤ اندر۔"
"کیوں۔۔۔؟ تم کیا کرو گے باہر جا کے؟" وہ بولی۔
رئیس دہاڑا "بکواس بند کرو اور جاؤ۔" اور سونی کو اندر دھکیل دیا۔
میں نے کہا "لگتا ہے اس نے بے چارے گارڈ کو مار دیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"
رئیس نے میرا بازو پکڑ لیا "کیا دیکھتا ہوں۔ تو باہر جائے گا۔۔۔؟"
میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتا میں۔"
"میں کرنے ہی نہیں دوں گا" وہ بولا۔
نیلم بدحواسی میں سیدھی ہماری طرف آئی "یہ کیا ہے۔ کس نے فائر کیا ہے۔ یہ کیسا شور ہو رہا ہے؟"
میں نے نرمی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"
"بات کیسے نہیں۔ یہ تو رب نواز ہے۔ اس کی آواز ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے 'کیوں شور کر رہا ہے؟" نیلم نروس تھی۔
"وہ غالباً نشے میں ادھر آ گیا ہے 'تم سے ملنے۔"
نیلم نے تیز لہجے میں کہا "مجھ سے ملنے 'کیوں؟ میں اس سے نہیں مل سکتی 'کیا سمجھتا ہے وہ مجھے؟"
میں نے اسے شانے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی "ٹیک اٹ ایزی 'تمہارے گارڈ نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔"
"اور گولی چلا دی اس نے۔ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔ بانو خالہ 'میرا موبائل فون لائیے" نیلم چلانے لگی۔
میں نے کہا "نیلم۔ ابھی پولیس کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم رب نواز کو اندر بلا لو۔ اس سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یہاں کیوں آیا ہے 'اسے سمجھاؤ کہ قانون کی نظر میں اس کی حیثیت ایک مفرور مجرم کی ہے اور اگر تم نے پولیس کو اطلاع کر دی تو وہ اسے ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ سمجھ جائے تو اچھا ہے۔"
رئیس نے بھی سر ہلایا "ہاں جی۔ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ کسی طرح اسے ٹال دو ورنہ آپ کی بدنامی خوا مخواہ ہو گی۔"
"ہو چکی میری جتنی بدنامی ہونی تھی۔ اب میں کسی بدنامی سے نہیں ڈرتی اور نہ کسی بدنام کرنے والے سے ڈرتی ہوں۔" وہ سخت مشتعل ہو رہی تھی۔
میں نے کہا "نہیں نیلم۔ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"
رئیس نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس نے چوکیدار کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی تھی 'کوئی نقصان نہیں ہوا۔"
"گارڈ پروفیشنل آدمی ہے۔ خود کار اسلحہ ہے اس کے پاس۔ اس کو کمپنی نے اختیار دے رکھا ہے کہ کوئی حملہ آور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دے۔ اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا 'کمپنی اسے بچا لے گی۔"
میں نے کہا "ان کی بحث چل رہی ہے۔ ہم اندر جاتے ہیں۔ تم کسی ملازم کو بھیجو یا انٹر کام پر گارڈ سے کہو کہ رب نواز کو اندر آنے دے۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں آئے گا اور وہ اسلحہ بھی ساتھ نہیں لائے گا۔"
"اچھا۔۔۔ میں بات کرتی ہوں۔ تم بھی آ جاؤ اندر" وہ بولی۔
لاؤنج کے انٹر کام۔۔۔۔۔۔۔۔ پر نیلم نے گارڈ سے بات کی "گارڈ۔ یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہے آدھی رات کو؟"
گارڈ کی آواز آئی "یہ کوئی ملک رب نواز ہیں میڈم۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ زبردستی اندر آنے کی کوشش کی تھی انہوں نے۔ ان کے ساتھ چار مسلح بندے ہیں۔ ایک نے فائر بھی کیا تھا۔ میں نے سب کو روک رکھا ہے۔ بول دیا ہے کہ کوئی آگے آیا تو مارا جائے گا۔"
میرے اشارے پر نیلم نے کہا "کہاں ہیں ملک رب نواز صاحب!"
"ادھر ہی ہیں میڈم۔ میں نے کہا کہ اپنے بندوں کو ہٹا دو ادھر گیٹ پر سے تو میں میڈم سے بات کر کے دیکھتا ہوں لیکن ایسے نہیں۔ سب کو نشانے پر لیا ہوا ہے میں نے۔ آپ فکر مت کرو میڈم! اپنی لاش پر سے گزر کے ہی اندر آ سکتا ہے

کوئی اور اپنی ایک لاش گرے گی تو ان کی پانچ لاشیں ساتھ ہی گریں گی۔"
"فون پر بات کراؤ میری رب نواز سے۔"
"ٹھیک ہے میڈم۔ جیسا آپ کا حکم۔"
چند سیکنڈ کے بعد رب نواز کی آواز آئی تو اس کا لہجہ بدل چکا تھا "کیا حال ہے آپ کا مس نیلم! ہم تو آئے تھے آپ سے ملنے۔"
"اس وقت؟ خیریت تو ہے نا ملک صاحب؟"
"اوجی سب خیر خیریت ہے۔ بس آج بہت دن بعد آپ کو دیکھا تو پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہم نے سوچا آپ سے مل لیں۔"
"بڑی مہربانی آپ کی۔ لیکن آپ کو اس طرح مسلح ہو کے اور اتنے لوگوں کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی؟"
ملک نے کہا "وہ تو ہم ایسے ہی پھرتے ہیں آج کل۔ دشمن بہت ہو گئے ہیں اپنے۔ باڈی گارڈ ساتھ رہتے ہیں ہر وقت۔"
"میرے گھر میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اپنا اسلحہ اور باڈی گارڈ باہر ہی چھوڑ کے تشریف لائیں پلیز، ورنہ یہ سیکیورٹی گارڈ بہت سخت آدمی ہے۔ میری بھی نہیں سنے گا۔ اسے کمپنی کی طرف سے جو احکامات ہیں یہ انہی پر عمل کرتا ہے۔ یہ میرا ملازم نہیں ہے" نیلم نے کہا۔
شاید رب نواز نے کچھ سبکی محسوس کی "گارڈ اس لیے تو نہیں ہوتے کہ خاندانی اور معزز لوگوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کریں۔"
نیلم نے اس کی بات کاٹ دی "آئی ایم سوری۔ لیکن آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ کمپنی کی ٹریننگ اور ہدایات ہیں۔"
"اچھا جی۔ بعد میں نمٹ لیں گے ہم کمپنی سے بھی۔ یہ تو کوئی طریقہ نہ ہوا۔" اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔
میں نے اور رئیس نے ساری گفتگو سنی تھی۔ ملک کی آواز میں کچھ بھاری پن تھا اور اپنی بے عزتی پر اس کا لہجہ غرانے والا ہو گیا تھا۔ وہ نشے میں نہ ہوتا تو اپنی بے بسی اور جھنجلاہٹ کو بھی عیاری سے فراخ دلانہ شائستگی میں چھپا لیتا مگر نشے میں آدمی مصلحت کی منافقت پر اختیار کھو دیتا ہے۔
"آخر یہ کیوں آیا ہے یہاں؟" نیلم کچھ خوف زدہ ہو گئی۔
میں نے کہا "وہ میری وجہ سے آیا ہو گا۔ شاید اسے یہ بھی اپنی توہین لگی ہو گی کہ تم اس کے ساتھ پرانے تعلق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے دشمن کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اور دشمن بھی کون؟ یتیم خانے کا ایک لاوارث شخص جس کی اوقات اس کے گھر کے ملازموں جیسی بھی نہ تھی۔"
"میں۔۔۔ کیا کہوں اس سے؟"
میں نے کہا "اتنا گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ وقت سب کے لیے بہت بدل گیا ہے نیلم!"
رئیس نے بھی کہا "تمہارا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے؟"
"میں۔۔۔ ڈرتی تو نہیں۔۔۔" وہ بولی "صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ بھی یہ سمجھے کہ نہ میں وہ کل والی نیلم ہوں 'نہ وہ ناصر عظیم اور رئیس ہیں۔"
"یہ بات اسے سمجھاؤ۔ ڈپلومیسی سے کام لو اور اسے عزت کے ساتھ رخصت کر دو۔"
رئیس نے کہا "ابے یار 'نیلم فون کر دے پولیس کو۔ سارا جھگڑا ہی ختم۔ ملک صاحب کا نشہ اترے گا تھانے میں۔"
میں نے اس کی مخالفت کی "نہیں یار۔ نیلم کو ہمارے لیے اس سے بگاڑ کے کیا ملے گا۔ خوا مخواہ کی پریشانی۔"
بانو خالہ نے اندر جھانک کے کہا "بیٹی' وہ بیٹھا ہے ڈرائنگ روم میں موا شرابی۔ کہو تو میں جا کے اس کی خبر لوں۔"
"نہیں خالہ۔ میں آتی ہوں" نیلم نے کہا۔
میں نے کہا "تمہارے لیے اچھا موقع ہے اس کو OBLIGE کرنے کا۔ اسے احساس دلا دینا کہ صرف پرانے تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے تم پولیس کو نہیں بلا رہی ہو۔"
"اور وہ بے قابو ہو گیا تو؟"
میں نے کہا "ہم دیکھتے رہیں گے یہاں سے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔"
"کیوں نہ میں اس کی بیوی کو بلا لوں' وہ آ کے اپنے شوہر کو لے جائے یہاں سے اور پٹہ ڈال کے رکھے۔"
"پٹہ نہیں 'دوپٹہ۔" میں نے ہنس کے کہا "ویسے ترکیب اچھی ہے۔"
ڈرائنگ روم سے ملحق کھانے کا کمرا تھا جس کو شیشے کے بڑے بڑے سلائیڈ کرنے والے دروازے جدا کرتے تھے۔ ان دروازوں کے سامنے پردے تھے چنانچہ عام طور پر ڈرائنگ اور ڈائننگ روم الگ ہی رہتے تھے۔ ڈرائنگ روم کے مہمان کھانے کی میز تک جانا چاہیں تو ایک بٹن دبا کے شیشے کی دیوار بنائی جا سکتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں رئیس کے ساتھ اسی شیشے کی دیوار کے پیچھے موجود رہا۔ اس کا ایک حصہ تھوڑا سا ہٹا دیا گیا تھا مگر سامنے پردے پڑے ہونے سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے حصے کا پردہ ہٹا ہوا تھا مگر پیچھے اندھیرا تھا چنانچہ ہم ملک کو دیکھ بھی سکتے تھے اور اس کی آواز بھی صاف سن سکتے تھے مگر اسے یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ بیشہ کی طرح لٹھے کے کلف لگے شلوار سوٹ اور سیاہ واسکٹ میں تھا۔ وہ شاید جب گھر سے نکلتا تھا' سوٹ بدل لیتا تھا۔ کپڑوں کی بے داغ سفیدی' استری کی دھار اور کلف کا کرارا پن دیکھ کے ایسا ہی لگتا تھا مگر اس وقت کپڑے پر شکن تھے اور ان پر داغ بھی نظر آ رہے تھے جو مجھے نہ جانے کیوں شراب کے لگے۔ وہ صوفے پر آگے کھسک کر دونوں پاؤں پھیلائے نیم دراز تھا اور منہ میں سگریٹ دبائے چھت کو گھور رہا تھا۔

نیلم کو دیکھ کر اس نے خود کو اوپر کھینچا اور مسکرایا۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر اس نے دھواں اوپر چھوڑا "خیر ہووے جناب کی۔ بڑا انتظار کرایا۔"

نیلم اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی "جب آپ آئے تو میں کھانا کھا رہی تھی۔"

اس نے بے تکلفی کی مسکراہٹ کے ساتھ گھڑی دیکھی "یہ کون سا کھانے کا ٹائم ہے جی!"

نیلم نے ناگواری سے کہا "میں کسی دفتر میں کام نہیں کرتی کہ میرے لنچ اور ڈنر کا وقت مقرر ہو۔ فلموں کی شوٹنگ میں بعض اوقات کھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔"

اس نے سر ہلایا "آہو جی۔ اب تو خیر سے آپ بڑی مصروف ہو۔ ہم جیسے چاہنے والوں کے لیے ٹائم بھی نہیں ہوگا آپ کے پاس؟"

نیلم نے متانت سے کہا "یہ صحیح ہے۔ میرے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے اور گھر پر تو میں کسی سے بھی نہیں ملتی۔"

وہ ہنسا "تو یہ سارے کاروالے بندے کہاں ملتے ہیں؟"

"کون کاروالے؟"

"اجی وہی' تقسیم کار' ہدایت کار' فن کار۔"

"ان سے میرا سیکرٹری عبدالرحمان معاملات طے کرتا ہے۔ لیکن دن کے اوقات میں۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ جب تشریف لائیں تو عبدالرحمان سے اپائنٹمنٹ لے کر آئیں۔ اگر کوئی کام ہو تو۔"

"دیکھو نیلم۔ ہمارے سامنے ایسے فالتو الفاظ مت ضائع کرو۔ یہ گزارش ۔ اور اوقات اور اپائنٹمنٹ ۔ ہم ملک رب نواز ہیں۔ کوئی فلم کار نہیں ہیں۔ ہم تمہیں اس وقت سے جانتے ہیں۔"

"پلیز ملک صاحب۔ پرانی باتوں کو بھول جائیں۔"

وہ برہمی سے بولا "کیسے بھول جائیں ہم یہ بات کہ تم خود آتی تھیں ہماری حویلی میں۔ اور اس حویلی کی مالکن بننا چاہتی تھیں۔ آج ان کنجروں اور میراثیوں کے مقابلے میں ہم جیسے جدی پشتی عزت داروں کو تمہارا ایک معمولی نوکر دروازے پر روک دیتا ہے۔ بندوق اٹھاتا ہے ہم پر۔"

"وہ آپ کو نہیں جانتا۔ یہاں وہ میری حفاظت پر مامور ہے۔ اتنے لوگ مسلح ہو کے ایک ساتھ آئیں گے تو وہ کیا سمجھے گا؟" نیلم نے کہا۔

"اتنی سمجھ ہونی چاہیے اس دو ٹکے کے ملازم میں۔"

"معاف کیجئے ملک صاحب۔ اگر ایسا آپ کے ساتھ ہوتا' چار پانچ آدمی اسلحے کے زور پر آپ کی حویلی میں زبردستی گھسنا چاہیں تو آپ کا گارڈ کیا کرے گا۔ اور آپ تو شراب کے نشے میں دھت ہیں' کیا عزت دار لوگ ایسے ہی کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ اس سے شرافت سے بات کر سکتے تھے۔"

"ہم نے شرافت سے سمجھایا تھا اسے۔"

"غلط۔ آپ نے تو مجھے بھی دروازے پر ہی گالیاں دیں۔ آپ کے ساتھ آنے والوں نے گولی چلائی۔ کون ہیں آخر وہ لوگ۔ ابھی میں ایک فون کروں تو ان کی ساری بدمعاشی نکل جائے۔ میں براہِ راست ڈی آئی جی سے بات کر سکتی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔ ڈی آئی جی سے' کمشنر سے' گورنر سے۔ سب سے بات کر سکتی ہو تم۔ یار جو ہیں تمہارے۔" ملک رب نواز چلانے لگا "مگر کس ماں کے یار کی مجال ہے جو ملک رب نواز کے سامنے سیدھا کھڑا ہو کے بات کر سکے۔ میرے ووٹ سے چلتی ہے ان کی حکومت۔ ان کی پارٹی۔"

نیلم اٹھ کھڑی ہوئی "آپ ہوش میں نہیں ہیں ملک صاحب۔ اور یہ بات بھی بھولے ہوئے ہیں کہ قانون کی نظر میں اس وقت آپ صرف ایک مفرور مجرم ہیں۔ آپ کی ضمانت منظور نہیں ہوئی تھی اور آپ عدالت سے بھاگ گئے تھے۔ وہ آپ ہی کے آدمی تھے جنہوں نے عدالت کے باہر فائرنگ کر کے افراتفری پھیلائی تھی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہوں۔ جب اس ملک کے وزیراعظم کو پھانسی ہو سکتی ہے تو آپ کیا چیز ہیں۔ ابھی ہتھکڑی ڈال کے لے جائے گی پولیس آپ کو اور بند کر دے گی تھانے کی حوالات میں تو سارا خاندانی

دولت اور طاقت کا نشہ اتر جائے گا۔"

ملک کے ذہن کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ اس نے خود کو منہ بھالنے کی کوشش کی۔ "اوکے ۔ اوکے۔ تم بیٹھ جاؤ' میں خیال رکھوں گا۔"

نیلم بیٹھ گئی۔ "آپ جیسے بہت سے عزت داروں کو آج بھی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھے گزرے ہوئے کل والی نیلم سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اس مقام تک آنے سے پہلے میں نے بڑی ذلت اٹھائی ہے آپ جیسے مردوں کے ہاتھوں۔ اپنی انا اور عزتِ نفس کا بہت خون کرنا پڑا تھا مجھے۔ مگر وہ وقت گزر چکا ہے اور آج میں اس پوزیشن میں ہوں کہ سب کا قرض اتار سکوں۔ عزت کا بھی اور ذلت کا بھی۔"

"بڑے زوردار ڈائیلاگ بولنے لگی ہو تم" ملک رب نواز تلخی سے بولا "مگر میں یہ ڈائیلاگ سننے نہیں آیا تھا یہاں۔ جو دس روپے دے کے کوئی بھی سینما میں جا کے سن سکتا ہے۔"

"میرے پاس بھی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ کیوں آئے تھے آپ۔ کام کی بات کیجئے اور جائیے۔ مجھے آرام کرنا ہے۔" نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔

ملک نے اس بے عزتی کے کڑوے گھونٹ کو پی لیا۔ "مجھے بتا' وہ کہاں ہے جسے تو اپنے ساتھ لائی تھی عدالت سے۔ تیرا یار ناصر عظیم؟"

"مجھے نہیں معلوم اس وقت وہ کہاں ہوگا۔"

"کہاں چھوڑا تھا تو نے اسے؟ کیوں لائی تھی اپنے ساتھ؟" ملک پھر چلانے لگا "کیا تجھے معلوم نہیں وہ دشمن ہے میرا' برسوں پرانا۔"

"ملک صاحب۔ مجھے نہ آپ کے دوستوں سے سروکار ہے نہ دشمنوں سے۔ ناصر عظیم کو میں نے ہوٹل پالیڈے ان کے سامنے اتار دیا تھا۔"

"تجھے کیا ضرورت تھی' اس کے حق میں گواہی دینے کی؟"

نیلم نے کہا "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں واقعی اسے دس سال سے جانتی ہوں۔ اس کے وکیل نے مجھ سے درخواست کی تو میں انکار کیسے کر سکتی تھی۔ اسے تو سارا شہر جانتا ہے ملک صاحب۔ اور بھی بہت لوگ تھے وہاں اس کو شناخت کرنے والے۔"

"مگر تو اس یتیم خانے کے ولدنامعلوم کو ایسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے لے آئی تھی جیسے۔"

نیلم پھر کھڑی ہو گئی "آپ جا سکتے ہیں ملک صاحب۔ اور خیال رہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اگر آپ نے کوئی بدتمیزی کی تو میرے ملازم آپ کو زبردستی باہر چھوڑ آئیں گے۔ یا میں فون کر کے آپ کی بیوی کو بلا لوں گی کہ اپنے سرتاج کو عزت کے ساتھ لے جائیں یہاں سے۔"

ملک کا غصہ اور نشہ پھر ہرن ہو گیا "میں ۔ آئی ایم ۔ واقعی' سوری! پلیز بیٹھو' یہ بتاؤ ۔ تمہارے اس ناصر عظیم کا پتا ٹھکانا کیا ہے۔"

"یہ آپ کو کہیں سے بھی معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آپ نے یہ دولت اور عزت پائی ہے ورثے میں۔ اس نے کمائی ہے' اپنی محنت اور صلاحیت' ہمت اور قسمت سے۔"

وہ ہنسنے لگا "تم کو ہر وقت فلمی باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"جی نہیں ملک صاحب! یہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنا آپ کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ آپ کو ہضم نہیں ہو رہی ہے یہ بات کہ ایک یتیم خانے کا لاوارث لڑکا ترقی کر کے کیسے آپ کا ہمسر ہو گیا۔ وہ چور ڈاکو کیوں نہیں بنا۔ بدمعاش کیوں نہیں بنا۔ بھیک مانگتا نظر کیوں نہیں آتا۔ نشے کا عادی کیوں نہیں ہوا۔ جیل کیوں نہیں گیا۔ موروثی دولت اور عزت پر کیسا غرور۔ یہ تو آپ کے بعد خود بخود نوازو کو مل جائے گی۔"

"میری سمجھ میں واقعی نہیں آتی یہ بات۔ خیر' میں ملوں گا اس سے۔ پوچھوں گا کہ وہ راتوں رات لکھ پتی کیسے بن گیا؟"

نیلم تلخی سے ہنسی "اسے لکھ پتی کہہ کے آپ کے دل کو سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کروڑ پتی سے بھی زیادہ ہے۔ جب آپ اس سے ملیں تو یہ بھی پوچھ لیں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے' سب کے سامنے ہے۔ وہ بلڈر ہے' امپورٹر ایکسپورٹر ہے۔ کنٹریکٹر ہے۔ ایک اسپتال میں بہت کچھ کر رہا ہے۔ ایک یتیم خانہ بنوا رہا ہے۔ ایسا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ایک انتہائی حساس اور مضبوط کردار کا آدمی ہے۔"

وہ بولا "وہ کیا لگتا ہے آخر تمہارا؟ جو اس کی اتنی تعریف ہو رہی ہے ہمارے سامنے۔"

"وہ دوست ہے میرا۔"

رب نواز نے ایک قہقہہ مارا "دوست۔ وہ تو ہم بھی تھے کبھی۔ تمہارا دوست تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے رب نواز۔ تم کبھی میرے دوست نہیں رہے اور نہ ہو سکتے ہو کیونکہ تمہارے ذہن میں کسی عورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دوستی کا صرف ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ ناصر کے سوا میں نے کسی کو آج تک اپنا دوست نہیں کہا۔"

ملک اسے دیکھتا رہا "وہ جوان اور ہینڈسم ہے۔ اور جیسا کہ تم نے خود بتایا' کروڑپتی سے بھی زیادہ ہے۔"

نیلم نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں "ملک صاحب! تمہارا کوئی دوست ہے؟ جس کے ساتھ ضرورت یا غرض کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ جس کی بنیاد صرف ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی' خلوص اور احساس کی رفاقت پر ہو۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟" ملک نے پُرحقارت انداز میں کہا۔

"حقیقت کو دیکھنے والی نظر کہاں سے لائیں گے آپ۔ کیسے سمجھ میں آئے گی یہ بات آپ کو کہ ناصر عظیم میرا دوست ہی نہیں بھائی بھی ہے۔ عزیز بھی ہے اور شریکِ حیات بھی۔ اس لفظ کا مطلب صرف شوہر نہیں ہوتا ملک صاحب۔ دس سال سے زیادہ ہوگئے' ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔"

"وہ۔۔۔ تمہارے ساتھ رہتا ہے؟"

نیلم ہنسی "نہیں ملک صاحب۔ یہ رفاقت کسی قربت کی محتاج نہیں۔ اسے فاصلے کم نہیں کرتے۔ آپ کو حیرانی ہوگی۔ شاید یقین کرنا مشکل ہو آپ کے لیے کہ وہ برسوں بعد مجھ سے ملا ہے۔ ہم اسی شہر میں تھے۔ وہ آٹھ سال کرنل خان کے گھر میں رہا۔"

"کون کرنل خان؟"

"زیادہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ مگر کسی پرانے جنرل' وزیر یا سفیر سے پوچھنا۔ بہت عظیم انسان تھا وہ۔ آٹھ سال میں ناصر ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ نیلم فلمی دنیا میں راج کررہی ہے۔ اس نے فون تک نہیں کیا مجھے۔ لیکن کل اچانک اس کے وکیل نے فون پر کہا کہ ناصر عظیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ ملنا ہے تو آجائے۔ وکیل نے کہا کہ اس نے تمہیں کورٹ میں بلایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کو شناخت کرو سب کے سامنے۔ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟"

رب نواز اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "اور تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہنچ گئیں کورٹ؟"

"ہاں۔ انکار کیسے کرسکتی تھی میں۔ دنیا میں ایک ہی تو دوست ہے وہ۔ اس نے کسی بھروسے پر مجھے بلایا تھا۔ مجھے اور ڈاکٹر کمال فاروقی کو۔ کرنل خان کی بیٹی چندا کو نہیں بلایا اس نے۔ اس کا دوست رئیس خان بھی ہے۔"

رب نواز نے ناگواری سے ہاتھ ہلا کے کہا "رفع کرو سب کو۔ یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا۔ اس کا پتا معلوم ہوگا تمہیں؟"

نیلم نے کہا "رب نواز۔ یہ بات تم فون پر بھی پوچھ سکتے تھے۔"

"ہاں۔ مگر میں نے سوچا کہ تم اسے اپنے ساتھ لائی تھیں۔ تو شاید وہ یہیں ہوگا' تمہارے ساتھ۔"

"اگر وہ مل جاتا تو آپ کیا کرتے؟ دس سال سے نفرت کا جو زہر آپ کے دل میں جمع ہورہا تھا' وہ اگل دیتے۔ نئے سرے سے پرانی دشمنی کے جذبات کو تازہ کرتے۔ آخر کیوں ملک صاحب؟"

ملک نے کہا "یہ بات تمہاری سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔ ہم تو ہیں خاندانی لوگ۔ ہماری دوستی اور دشمنی ایسے ہی چلتی ہے۔ دس سال پہلے اس نے ہمیں ہمارے گھر میں آکے ذلیل کیا تھا۔ یہ بات ہم بھولے نہیں ہیں۔"

"بھولا شاید وہ بھی نہیں ہوگا۔ اسے اور رئیس خان کو آپ نے اپنی حویلی میں عزت افزائی کے لیے نہیں بلایا تھا۔ میں نے تو سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور سنا تھا۔ انتقام کی خواہش سے اسے مغلوب ہونا چاہیے۔ بدلے کی آگ تو اس کے دل میں روشن ہونی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی بھول جائیں پرانی باتوں کو۔"

"بھول جائیں گے ہم اگر تم کہتی ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اور اس کا دوست رئیس خان ہم سے معافی مانگیں تمہارے سامنے۔"

نیلم نے چند سیکنڈ بعد بڑے سکون سے کہا "میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ جو زیادتی آپ نے ان کے ساتھ حویلی میں بلا کے کی تھی' اس پر آپ کو اظہارِ ندامت کرنا چاہیے۔"

ملک نے رنج سے کہا "تم۔۔۔ پاگل ہوگئی ہو۔ ہم اس سے معافی مانگیں؟ اس شخص سے جس کے نہ خاندان کا پتا ہے نہ ماں باپ کا۔ جو نہ جانے کس کا خون ہے' تم اسے ہمارے برابر سمجھتی ہو۔ ہمارے برابر ہے اس کی عزت؟"

نیلم نے اسی سکون سے کہا "نہیں۔ میری نظر میں اس کی عزت آپ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ رشتہ ہی باہمی عزت و احترام کا ہے۔ وہ کل میری جتنی عزت کرتا تھا آج بھی کرتا ہے۔"

میں نے رئیس سے سرگوشی میں کہا "آخر کیا ضرورت ہے نیلم کو بات بڑھانے کی۔"

رئیس نے سر ہلا کے مجھ سے اتفاق کیا "خوامخواہ ایک شرابی کے ساتھ بحث کررہی ہے۔ وہ ذلیل آدمی شراب کے نشے میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

رب نواز کا چہرہ نیلم کی بات پر احساسِ ذلت سے بگڑ گیا۔ اس نے دانت پیس کے کہا "ایک ایکسٹرلیس۔ لائٹ مین سے ڈائریکٹر تک سب کو خوش کرکے اس مقام تک پہنچنے والی۔ سب کی زر خرید' طوائف زادی' تو بھی اپنے آپ کو عزت داروں میں شمار کرنے لگی ہے۔"

نیلم نے زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہاں رب نواز۔ آج میں تم سے زیادہ عزت دار بھی جاتی ہوں۔ اور طاقتور بھی ہوں۔ اور ایسے ہی وہ یتیم خانے کا پلا ہوا لاوارث لڑکا تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ زمانہ وہ نہیں رہا جب تمہاری خاندانی عزت کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ اکیسویں صدی شروع ہونے والی ہے۔ اپنی پرانی حویلی کی بوسیدہ دیواروں کے پیچھے تم بالکل محفوظ نہیں ہو۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا ہوگیا ہے نیلم کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے سامنے جانا پڑے۔"

رئیس نے مجھے روکا "ضرورت پڑی تو میں جاؤں گا۔"

ملک رب نواز کو حیرت اور صدمے نے مفلوج کردیا تھا "تو جانتی ہے کتیا کہ تو کس پر بھونک رہی ہے؟"

نیلم نے چلا کے کہا "شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔ ورنہ میرے ملازم تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔"

نیلم کے اس جارحانہ رویے اور اعتماد کی وجہ فوراً ہی معلوم ہوگئی۔ ملک زخم خوردہ اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا ہی تھا کہ نیلم نے صوفے کا ایک کشن ہٹا کے ریوالور نکال لیا جو شاید وہ اپنے ساتھ ہی لے کر گئی تھی۔ ملک کا غصہ اور نشہ ریوالور کا رخ اپنی طرف دیکھتے ہی اتر گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا نیلم۔۔۔!" ملک کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

نیلم نے ایک قدم پیچھے ہٹ کے سوئچ بورڈ پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا۔ اندر ایک برگلر الارم چلانے لگا "تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو کتے کی موت مارے جاؤ گے رب نواز۔"

میں نے باہر سے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ پھر وہ سیکیورٹی گارڈ اندر آگئے۔ انہوں نے گیٹ کے گارڈ جیسی وردی پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھی۔ تیسرا چند سیکنڈ کے وقفے سے اندر آیا۔ کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر انہوں نے بڑے پیشہ ورانہ انداز میں ملک رب نواز کو محصور کرلیا۔

اغوا' قتل اور ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں نے ایک عام شہری کو بھی عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کردیا تھا۔ لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ پولیس جو قانون کی محافظ کہلاتی ہے' لاقانونیت کی سب سے بڑی علمبردار ہے اور جرائم کے فروغ میں پیش پیش ہے۔ صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیاں وجود میں آگئیں۔ انہوں نے سابق فوجیوں اور سیکیورٹی کے شعبے میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کو ملازم رکھا۔ جدید حفاظتی انتظامات کے لیے ضروری ساز و سامان باہر سے منگوایا اور پیسے والوں نے ان کی خدمات حاصل کرکے سکون کا سانس لیا۔ رہا عام آدمی تو وہ کسی گنتی میں نہیں۔ جیتا ہے جیے' مرتا ہے تو مرجائے۔

مین گیٹ پر میں نے سیکیورٹی کے ایک گارڈ کو ہمیشہ موجود پایا تھا۔ تعمیر کی اعتبار سے نیلم پیلس خاصی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف ایسے ہی دوسرے محل تھے جہاں صنعت کار بیوروکریٹ تاجر' زمیندار اور دولت مندی میں ایک سے بڑھ کر ایک لوگ رہتے تھے چنانچہ یہاں گلی محلوں کے چور اچکے اور اٹھائی گیرے چکر نہیں لگاتے تھے۔ یہاں مسلح ڈاکو حملہ کرتے تھے۔

نیلم ہاؤس کے گرد آٹھ فٹ اونچی فصیل تھی اور اس کے اوپر کانٹے والی تاروں کی باڑھ دیکھ کے میں نے یہ بھی فرض کرلیا تھا کہ اس میں رات کے وقت بجلی چھوڑی جاتی ہوگی مگر دن کے وقت میں نے وہاں کوئی گارڈ نہیں دیکھا تھا۔ شاید رات کے وقت حفاظتی انتظامات زیادہ سخت کردیے جاتے تھے۔ نیلم نے مجھے بعد میں بتایا کہ سیکیورٹی ایجنسی اسے پورا سیکیورٹی کور فراہم کرنے کے پچاس ہزار روپے ماہانہ چارج کرتی تھی اور اس میں صرف گھر کی حفاظت شامل نہیں تھی۔ گھر سے باہر اسٹوڈیو تک یا بازار آتے جاتے بھی کمپنی کا ڈرائیور گاڑی چلاتا تھا جو ایک ریٹائرڈ کمانڈو تھا۔

"اس کو یہاں سے ہلنے مت دینا" نیلم نے دروازے کا رخ کیا "میں ابھی پولیس کے ہنگامی مرکز سے فورس بلواتی ہوں۔"

رب نواز کی حالت غیر ہوگئی "نیلم' پلیز! میری بات سنو۔"

"بہت سن لی میں نے تمہاری۔ اب جو کہنا ہو پولیس سے کہنا" نیلم نے چیخ کے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھو' پولیس کو بلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہاں۔ تمہیں اپنے تعلقات اور اثر رسوخ پر بھروسا ہے نا۔ پولیس آئے گی اور چلی جائے گی۔ یا تمہیں باعزت طور پر ESCORT کرکے ملک ہاؤس پہنچادے گی۔ پھر کیا فائدہ پولیس کے چکر میں پڑنے کا لیکن ایسا نہیں ہوگا رب نواز۔ اگر تم مجھ سے اثر رسوخ کی جنگ لڑوگے تو ہار جاؤ گے۔ ایک ایکٹریس' طوائف زادی اور دو ٹکے کی عورت کی اوقات کا پتا چل جائے گا تمہیں۔ اچھا ہے آج یہ خوش فہمی بھی دور ہو جائے۔"

"نیلم! آئی ایم سوری۔ میں معافی مانگتا ہوں تم سے۔ شراب کے نشے میں جو کچھ بھی میں نے تم سے کہا' میں اس پر شرمندہ ہوں" رب نواز پر اب نشے کا ایک فیصد بھی اثر نہیں تھا۔

"آل رائٹ۔ ایک چوائس دیتی ہوں میں تمہیں" نیلم نے واپس آکے میکیورٹی گارڈز کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔

رب نواز شکست خوردہ اور پٹے ہوئے حریف کی طرح صوفے پر گر گیا "کیسی چوائس؟"

"تم یہاں سے کس کے ساتھ جانا چاہوگے' پولیس کے ساتھ یا اپنی بیوی کے ساتھ؟"

رب نواز کے لیے یہ مشکل سوال تھا "میں ــــ خود جا سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری شاندار گاڑی باہر موجود ہے۔ چار مسلح باڈی گارڈز تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں۔ میں انہیں رخصت کردوں تب بھی تم گھر پہنچ سکتے ہو۔ ٹیکسی کرکے' تانگے میں' پیدل میں تمہارے جوتے کپڑے اتار کے تمہیں یہاں سے نکال دوں تب بھی تم جاؤ گے۔"

میں نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا۔ شاید بہت عرصے بعد آج نیلم کو اس تمام ذلت کا حساب بے باق کرنے کا موقع ملا تھا جس نے برسوں پہلے دونوں ملک برادران حق نواز اور رب نواز کے ہاتھوں برداشت کی تھی۔ لیکن یہ اس کا کوئی موقع نہ تھا۔ انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے وہ رب نواز کی دشمنی کے جذبات کو ہوا دے رہی تھی اور اپنے لیے پریشانیاں مول لے رہی تھی مگر میں نیلم کو روکنے سے قاصر تھا۔

"نیلم۔ یہ سب تم اچھا نہیں کروگی۔"

"اور وہ سب جو تم کر چکے۔ وہ اچھا تھا؟" نیلم نے چلا کے کہا "میں کوئی دس سال پہلے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ آج میرے گھر میں آکے جو کچھ تم نے مجھ سے کہا۔ جیسے مجھے ذلیل کیا اپنے ہی گھر میں۔ وہ سب میں خاموشی سے برداشت کرلوں۔ ہمیشہ کی طرح میری عزت نفس کو مجروح کرکے بھی تم سربلند چلے جاؤ؟ نہیں رب نواز! کچھ تو نقصان اٹھانا ہی چاہیے تمہیں بھی۔ ذلت کا ایک تازیانہ تمہارے احساس پر بھی پڑنا ہی چاہیے۔"

"تمہیں میری دشمنی مہنگی پڑے گی نیلم!" وہ غرایا۔

"سنگی سستی دوستی دشمنی' عزت اور بے عزتی۔ بھول جاؤ یہ باتیں رب نواز' تم کس کس سے دشمنی کرو گے۔ کتنے دشمن بناؤ گے۔ یہاں سب تمہارے مزارع اور حکم کے غلام نہیں ہیں۔ سارے بزدل' کمزور اور نامرد نہیں بیٹھے ہیں چوڑیاں پہن کے۔ میرے جیسی عورت چیلنج کر سکتی ہے تمہیں اور تباہ بھی کر سکتی ہے۔ تم ایک گاؤں کی جاگیر' ایک حلقہ انتخاب اور کرائے کے بدمعاشوں کی تھوڑی سی طاقت پر خود کو فرعون سمجھتے ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ میں خمیر سے کراچی تک لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہوں۔ میرے ایک اشارے پر پیشہ ور قاتل' ہسٹری شیٹرڈ معاش۔ ڈاکوؤں کے گروہ' پولیس افسر' سرکاری حکام' سیاسی لیڈر' سب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمہارے پاس اثر رسوخ اور دولت کی جو طاقت ہے وہ میرے پاس بھی ہے مگر میرے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے' ایک عورت ہونے کی طاقت۔"

رب نواز نے مسکرانے کی کوشش کی "اوجی' ہم تو مانتے ہیں۔"

"اگر پولیس آئے گی تو اخبار والے بھی آئیں گے۔ صبح یہ خبر بھی آئے گی کہ مفرور ملزم رب نواز شراب کے نشے میں دھت فلم اسٹار نیلم کے گھر میں گھس گیا۔ سابق ایم پی اے اور چار مسلح افراد کی گرفتاری۔ جو کچھ آج تم نے عدالت میں کیا اس کے بعد ــــ"

ملک نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا "چلو بلالو میری بیوی کو۔ اگر یہی ہے تمہاری خوشی۔"

نیلم فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی اٹھی "اب یہ سوچو کہ وہ کتنی خوش ہوگی ــ اور تمہارے بچے کتنے خوش ہوں گے۔"

اس کے کمرے سے نکلتے ہی ایک میکیورٹی گارڈ پھر اندر آگیا۔ میں نے نیلم کو دروازے پر جالیا "یہ کیا بے وقوفی کی تم نے؟"

وہ بالکل پُرسکون رہی "یہ سب ڈراما ضروری تھا۔ رب نواز کی فرعونیت کا بت پاش پاش کرنے کے لیے معمولی چوٹ کافی نہ ہوتی۔"

"اسے چیلنج کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔

"ضرورت تھی۔ اب وہ میرا چیلنج قبول کرنے سے پہلے سو بار سوچے گا۔ میں نے اسے صاف بتادیا ہے کہ میں مقابلہ کروں گی۔ اس وقت رب نواز کے حالات مخالف ہیں۔ وہ دوسرے معاملات میں ایسا پھنس گیا ہے کہ آج کی ذلت کو خاموشی سے پی جائے گا۔ اس کو یقین ہے کہ میرے علاوہ یہ تماشا کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ وہ معاملے کو بڑھائے گا نہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہے نیلم!"

میں نے کہا "سوئی کو کہاں غائب کردیا ہے تم نے؟"

"ارے میں نے بہت سختی سے سمجھایا تھا کہ جب تک رب نواز چلا نہ جائے وہ اپنے بیڈ روم سے باہر نہ آئے۔ اس کی آواز تک باہر نہ آئے۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی اور یہ دوستی ختم۔ وہ ڈرگئی' کہنے لگی آپ کمرے کو باہر سے لاک کردیں بے شک۔" نیلم ہنس کے بولی۔

"پھر تم نے تالا لگایا؟" رئیس بولا۔

"ہاں۔ ایسے وہ کہاں رکتی۔ پارے کی طرح بے چین روح ہے اس کے اندر۔ چلی آتی دبے پاؤں جھانکنے کے لیے۔ میں نے کوئی رسک نہیں لیا۔"

رئیس نے اسے شکر گزاری کے ساتھ دیکھا "تم نے کتنا خیال رکھا اس کا۔ خود سگی بہن کو اتنی پروا نہیں تھی اس کی۔"

"فضول رسمی باتوں سے چڑ ہے مجھے" نیلم بولی "تمہیں رب نواز کے گھر کا فون نمبر معلوم ہے؟"

اتفاق سے مجھے نمبر یاد تھا۔ نیلم نے اپنے بیڈ روم کے بیڈ فری فون سے نمبر ملایا تو ریسیور اس کی بہن نے اٹھایا۔

اس نے کہا "جی میں نور بول رہی ہوں' ملک صاحب کی بیٹی۔"

"نور بیٹا۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟" نیلم نے پوچھا۔

"وہ تو گئی ہیں کہیں۔ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام ہے نیلم۔ کیا تم پاکستانی فلمیں دیکھتی ہو؟"

نور نے کہا "جی بہت کم۔ مگر میں نے دیکھا ہے آپ کو۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

"تھینک یو نور۔ دیکھو' مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ جب تمہاری امی آئیں تو انہیں بتادینا۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"دیکھو' تمہارے والد ــــ کیا کہتی ہو تم انہیں؟ پاپا یا ڈیڈی!"

"پاپا ــــ کیا ہوا ہے انہیں؟" نور گھبرائی۔

"کچھ نہیں ہوا ہے انہیں' ابھی تک ــــ وہ میرے گھر میں موجود ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تمہاری ممی یا تمہارے بڑے بھائی دلنواز انہیں لے جائیں۔"

"کیوں ــــ وہ خود کیوں نہیں آسکتے؟"

نیلم نے کہا "دراصل انہوں نے بہت زیادہ شراب پی رکھی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ وہ شراب کتنی پیتے ہیں۔"

"جی۔" اس نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

"تو نشے میں وہ میرے گھر میں زبردستی گھسنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے جو ملازم ہیں ان کے۔ ان سب کے پاس اسلحہ تھا۔ میرے گارڈ نے انہیں روکا تو تمہارے پاپا نے اس پر فائر کیا۔"

نور پریشانی سے بولی "پھر ــــ کیا گارڈ مر گیا؟"

"نہیں۔ قسمت اچھی تھی تمہارے پاپا کی۔ گارڈ بچ گیا ورنہ ان پر قتل کا ایک اور کیس بن جاتا۔ تم تو جانتی ہو قتل کرنے کے الزام میں ان پر ایک کیس پہلے ہی چل رہا ہے۔ آج عدالت نے ان کو ضمانت پر رہا کرنے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اس کے بعد وہ عدالت سے فرار ہو گئے تھے۔"

"یہ سب آپ ــــ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"

"اور کسے بتاؤں' تمہارے پاپا ہیں وہ ــــ اور امی بھی نہیں ہیں گھر پر۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ان کو پولیس کے حوالے کردوں؟ پولیس ابھی انہیں ہتھکڑی ڈال کے لے جائے گی اور تھانے میں بند کردے گی۔"

نور کی آواز رونے والی ہو گئی "پلیز آنٹی۔ آپ ایسا مت کریں۔"

"ابھی تو میں چاہتی ہوں کہ تمہاری ممی یا بھائی ان کو یہاں سے لے جائیں مگر ایک نہ ایک دن وہ ضرور پکڑے جائیں گے۔ وہ چھپ کے کیسے رہ سکتے ہیں اور کب تک رہ سکتے ہیں۔ اب جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ بالآخر پھانسی ہوگی انہیں۔"

نور چلانے لگی "جھوٹ کہتی ہو تم۔ میرے پاپا کو کچھ نہیں ہوگا۔"

نیلم نے ریسیور رکھ دیا "کیا تمہیں میری یہ حرکت اچھی نہیں لگی؟"

میں نے خفگی سے کہا "بالکل اچھی نہیں لگی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"گھر کے سربراہ کے اعمال خراب ہوں تو اس کا کفارہ گھر والوں کو ادا کرنا ہی پڑتا ہے" اس کے چہرے پر عجیب سی سفاک مسکراہٹ آگئی۔

"مگر تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت سب سے زیادہ مجھے ہے شاید۔ جتنی ذلت میں نے جھیلی تھی ان دونوں بھائیوں کے ہاتھوں۔ اس کا کوئی اندازہ کرہی نہیں سکتے تم۔ میں مانتی ہوں کہ میں کوئی شریف زادی نہیں ہوں۔ باحیا' باعصمت اور باکردار عورت نہیں سمجھا جاتا مجھے تو اتنا لحاظ بھی نہیں۔ وہ وقت ہی ایسا تھا جب ہر مخنث رب نواز کی طرح تھا۔ میری تحقیر اور تذلیل سے اپنی شرافت اور عزت کے احساس برتری کو تسکین دے کر خوش ہوتا تھا۔ اس وقت ان بھائیوں نے میرے ساتھ وہ کیا تھا جو کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ حالانکہ وہ بات بتانے والی نہیں ہے۔ میری عزت نفس کو بڑی بے رحمی سے کچلا تھا انہوں نے۔ اپنے گندے پیروں سے اپنے گنہگار ہاتھوں سے میری انا کو تار تار کیا تھا۔ سر محفل' سربازار۔ یہ تماشا دوسری بار نہیں ہوسکتا۔ آج اس نے پھر میری روح کے زخموں کو کھرچا ہے۔ اسے سزا ضرور دوں گی میں۔ ایسی کہ یہ خود اپنی نظر سے گر جائے۔"

میں نے کہا "نیک اٹ ایزی۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ رب نواز کے لیے برا وقت آنا ہی تھا۔ یہ قدرت کے مکافات عمل کا قانون ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔"

"ایک بار میں نے ذلت کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کرلیا تھا۔ کیونکہ میں کمزور تھی مگر اب میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔"

رئیس نے کہا "نیلم۔ کیا ملازم سوگئے ہوں گے۔ مجھے بھوک لگی ہے اور چائے بھی چاہیے مجھے؟"

میں نے کہا "یہ تو میرے دل کی بات کہی تو نے۔"

نیلم نے مسکراتے ہوئے ایک بٹن دبایا "خالہ۔ کیا کررہی ہو؟"

بورڈ کے چھوٹے سے اسپیکر میں خالہ کی آواز آئی "ارے بیٹی' کیا کرسکتی ہوں میں بڑھیا سوائے دعا کرنے کے۔ وظیفہ کررہی ہوں کہ اللہ اس آفت کو ٹال۔"

"ذرا میرے [illegible] میں چائے بھجوادو۔ اور کچھ کھانے کے لیے۔" نیلم نے کہا۔

"تمہارے اس قصر عالی شان کی چھت پر جانے کا راستہ کدھر ہے۔ زینہ تو یقیناً ہوگا کہیں؟" میں نے کہا۔

"زینہ ہے مگر اس کا گیٹ بند رہتا ہے۔ اوپر کوئی بھی نہیں جاتا۔ کبھی ٹیلی فون والے یا اوپر کے ٹینک کی صفائی کے لیے کوئی آئے تو خالہ کھول دیتی ہیں۔ چابی انہی کے پاس رہتی ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "باہر جاکے دیکھنا تو مشکل ہے۔ چھت پر جاکے دیکھا جاسکتا ہے کہ ملک رب نواز کے خصوصی محافظ کہاں کھڑے ہیں اور کیا کررہے ہیں؟"

"یہ دیکھ کے کیا ہوگا؟" رئیس بولا۔

"میں ان کی شکلیں ملاحظہ کرنا چاہتا ہوں دراصل۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں انہوں نے تمہاری شکل دیکھ لی۔ پھر؟" نیلم نے خفگی سے کہا۔

میں نے سوچ کے کہا "کیا ایسی کوئی صورت نہیں کہ میں ان کو دیکھ لوں مگر خود نظر نہ آؤں؟"

"وہ کون سی ٹوپی ہوتی ہے جسے پہن کے آدمی غائب ہوجاتا ہے' وہ ہے تو دے دو اسے" رئیس بولا۔

"سلیمانی ٹوپی؟" نیلم بولی "اس کی ضرورت تو مجھے بھی ہے۔ کہیں بھی جاؤں' لوگ پہچان جاتے ہیں اور مجمع لگ جاتا ہے۔"

"برقع تو ضرور ہوگا تمہارے پاس۔ سب فلم اسٹار استعمال کرتی ہیں روپوشی کے لیے۔"

نیلم ہنسنے لگی "ہاں۔ وہ تو میں بھی کرلیتی ہوں کبھی کبھی۔ لیکن اتنا ہی ضروری ہے تو احتیاط سے اوپر جاکے دیکھ لو۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "چل اٹھ۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نیلم نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف ملک رب نواز کی بیوی تھی۔ نیلم نے اسپیکر کا بٹن دبادیا "تم ہی نیلم ہو؟" اس نے بڑی رکھائی سے پوچھا۔

"جی۔ آپ کو میرا پیغام مل گیا؟"

وہ برہمی سے بولی "مل گیا.... مگر تمہیں یہ سب اس کو بتانے کی کیا ضرورت تھی' میری بیٹی کو؟"

"میں آپ کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سب تو رب نواز کے بچوں کو پہلے ہی معلوم ہوگا۔ آج کے بچے سب جانتے ہیں۔"

"تم کب سے جانتی ہو اسے؟"

نیلم نے طنز سے کہا "پہلے میں حق نواز کو جانتی تھی' اس کے بڑے بھائی کو۔ پھر تمہارے شوہر مجھ پر مہربان ہوگئے۔ حسن پرست اور شوقین مزاج رئیس زادے ہیں۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے خاندانی مراسم ہیں۔"

"پھر میں کیا کروں گی وہاں آکے؟" وہ تلخی سے بولی۔

نیلم نے کہا "مکافاتی جی۔ ایک بار ملک آپ کو عزت سے گھر لے گیا تھا۔ آج آپ اسے عزت کے ساتھ گھر لے جاؤ ورنہ آپ جانتی ہیں نا' قانونی طور پر وہ ایک مفرور اور مطلوب مجرم ہے۔ اس کی ضمانت منظور نہیں ہوئی تھی۔ مجھے پولیس کی امانت پولیس کے حوالے کرنی پڑے گی۔"

اس نے ناگواری سے کہا "اچھا۔ میں آتی ہوں دس منٹ میں۔"

نیلم نے گیٹ پر گارڈ کو ہدایات دیں اور پھر بانو خالہ کو طلب کیا۔ زینے کے دروازے کی چابی دیتے ہوئے خالہ نے باری باری رئیس کو اور مجھے بڑی شکوک نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

رئیس میرے ساتھ چلنے لگا "بڑا اچھا سلوک کیا نیلم نے رب نواز کے ساتھ۔ ذلیل بھی خوب کیا اور احسان الگ کردیا کہ پولیس کو نہیں بلایا۔ بیوی کے حوالے کردیا۔"

میں نے کہا "نیلم کے لیے مشکلات کے سارے دروازے کھلتے جارہے ہیں۔ صرف میری وجہ سے' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہاں۔ پرانے تعلق میں لحاظ اور مروت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اتنا عرصہ اس کی یاد بھی نہیں آئی۔ اب اپنی مصیبتوں کا ٹوکرا اٹھائے آگئے ہیں یہاں۔ اس کی زندگی گزر رہی تھی اچھی بھلی سکون سے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہمارا ارادہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس ذرا فرصت ملی تو پرانی یادیں تازہ کرنے آگئے تھے نیلم کے پاس' ہمیں کیا معلوم تھا کہ رب نواز بھی پیچھے پیچھے پہنچ جائے گا۔"

وسیع چھت پر اسٹریٹ لائٹس جیسی فٹنگ موجود تھی مگر میں نے روشنی سے احتراز کیا۔ اردگرد کے گھروں کی اور باہر کی روشنی میں فرش کی ہر رکاوٹ صاف نظر آرہی تھی۔ جگہ جگہ آرسی سی پلرز کے سرے یوں اگے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے صحرا میں کیکٹس۔ ایک گوشے میں آٹھ فٹ قطر والی تین سیٹلائٹ ریسیور کی ڈشیں لگی ہوئی تھیں۔ مخالف سمت میں کافی فاصلے پر چند کرسیاں پڑی تھیں۔

سڑک کی طرف والی چار فٹ کی دیوار پر سے میں نے گیٹ کو دیکھا۔ ملک رب نواز کی بجیر وائیک خالی پلاٹ پر کھڑی کردی گئی تھی۔ یہ پلاٹ سامنے والے مکانوں کی قطار میں دائیں ہاتھ کی طرف تیسرا تھا۔ یوں سڑک پر زیادہ تر کوٹھیاں مکمل ہوگئی تھیں مگر اکا دکا پلاٹ غیر آباد بھی نظر آرہے تھے۔ جس چیز نے مجھے چونکایا' وہ رب نواز کے باڈی گارڈز کی یونیفارم تھی۔

وہ سب گرین ٹراؤزر اور شرٹ میں تھے۔ گہرے سبز رنگ میں اوپر سے نیچے تک دوسفید لکیریں بہت نمایاں نظر آتی تھیں۔ یہ لکیریں پتلون پر دونوں جانب تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی آستین پر تھیں اور شرٹ کے سامنے والے حصے پر درمیان میں تھیں۔ ان سب نے وائٹ اسپورٹ شوز بھی پہن رکھے تھے۔ یہ وردی پاکستان کی ہاکی ٹیم کی وردی سے خاصی مشابہ تھی۔ وہ چاروں بجیر و سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے تھے۔ مجھ سے پہلے رئیس نے کہا "ابے یار۔ یہ تو وہی غنڈے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں نہیں ہیں۔"

"ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے اس وقت۔ مگر یہ وہی ہیں۔"

میں نے کہا "ان کا اسلحہ گاڑی میں ہے۔"

رئیس کی نظر ان چاروں پر جم کے رہ گئی تھی "ناصر۔ یہ چاروں جو ہاکی پلیئروں جیسے کپڑے پہنے کھڑے ہیں' یہ وہی قاتل ہیں۔ یہی رئیس خانے پہنچے تھے' فرید عباسی کو پوچھتے ہوئے۔"

"اور یہاں یہ رب نواز کے ساتھ آئے تھے میرا پتا پوچھتے۔ اگر نیلم کے حفاظتی انتظامات اتنے سخت نہ ہوتے تو...."

میری ادھوری بات پر رئیس نے سر ہلایا "شاید یہاں بھی وہی کہانی دہرائی جاتی۔ ناصر یہ چھوٹی کے اور تمیں مار خان کے قاتل ہیں۔ سب نے انہیں دیکھا تھا جو ہاکی پلیئر بن کے آئے تھے۔"

میں نے اسے تسلی دی "اپنے جذبات پر قابو رکھ۔ آج ہم نے دیکھ لیا ہے انہیں۔ بہت جلد ہم ان کے ساتھ ہاکی میچ کھیلیں گے۔ یہ ایک جیسے کپڑے انفرادی شناخت چھپانے کے لیے ہیں۔ یہ سب ایک جیسے نظر آرہے ہیں۔ سب کے سر پر کیپ ہے۔ اس سے ہیئر اسٹائل چھپ گئے ہیں۔"

"نیلم کے پاس کیمرا تو ہوگا؟"

میں نے کہا "مگر اندھیرے میں تصویر نہیں اتاری جاسکتی۔ اور فلیش چمکے گا تو وہ چوکنے ہوجائیں گے لیکن ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ابھی رب نواز کی بیوی آئے گی تو اپنی گاڑی ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس روکے گی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی ان پر پڑے گی۔ اگر اس وقت ہم فنیش کے بغیر تصویر اتاریں تو شاید آجائے۔ کوئی گاڑی گزرتی ہے تو روشنی کافی ہو جاتی ہے۔"

رئیس نیچے بھاگا۔ میں ان چاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بونٹ کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ دو کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ دو کا گاڑی کی ڈائریکشن میں۔ نہ وہ خوف زدہ تھے اور نہ پریشان مگران کی خاموشی اور سگریٹ پینے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ٹینشن میں ضرور ہیں۔ رب نواز کے حکم پر انہیں گیٹ سے دور جا کے ٹھہرنا پڑا تھا۔ وہ جس ارادے سے آئے تھے وہ پورا نہیں ہوا تھا اور الٹا رب نواز اپنا اسلحہ چھوڑ کے نیلم کے گھر میں عام آدمی کی طرح گیا تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ گیٹ پر سیکیورٹی کمپنی کا گارڈ بڑے خطرناک انداز میں کلاشنکوف تانے کھڑا تھا۔

حیرت سے زیادہ یہ میرے لیے افسوس کی بات تھی کہ آس پاس رہنے والے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھے۔ وہ ہمسائے صرف ایک دوسرے کے دائیں بائیں یا آمنے سامنے رہنے سے ہو گئے تھے ورنہ ان کے درمیان ہمسائیگی کے حقوق و فرائض کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ ہر شخص کی کوٹھی ایک الگ ریاست کی طرح تھی جہاں وہ اپنے' اپنی فیملی اور اپنے کاروبار کے مسائل کے ساتھ بالکل الگ رہنا پسند کرتا تھا۔ کسی سے انسانی اور جذباتی رشتوں کی بنیاد پر ضرورت کے وقت مدد کی امید رکھنا یا مدد کے لیے دوڑنا ان کے طرزِ زندگی اور اندازِ فکر سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب اپنے پیسے' اپنے وسائل اور اپنے تعلقات پر خدا سے بھی زیادہ بھروسا رکھتے تھے۔

وہاں سے اکا دکا گاڑی گزرتی تھی تو ہاکی کے کھلاڑیوں کی وردی میں چار افراد کا مشکوک انداز بہت واضح نظر آتا تھا۔ دوسری کوٹھیوں کے چوکیداروں نے بھی نوٹ ضرور کیا ہوگا کہ وہ ایک خالی پلاٹ پر کھڑے ہیں مگر کسی نے ان سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کس کے ملاقاتی ہیں۔

رئیس تقریباً دس منٹ بعد خوش خوش لوٹا۔ "اے یار' مل گیا کیمرا۔ اور دوربین بھی لے آیا میں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔ کیمرے میں فلم نہیں ہے؟"

وہ برا مان کے بولا "اتنے احمق نہیں ہیں ہم پیارے۔ اس کا فنیش کام نہیں کرتا۔ شاید سیل پرانے ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس سے دوربین لی اور فوکس کر کے دیکھا "یہ تو بہت پاور فل ہے۔ یہ بھی دیکھ سکتا ہوں میں کہ۔۔۔ کس نے آج شیو نہیں کی۔ سگریٹ کا برانڈ بھی پڑھا جا رہا ہے۔ پیکٹ پر گولڈ لیف لکھا ہوا ہے۔ ایک کی ناک کے پاس مسّا ہے۔ دوسرے کی دائیں آنکھ کے قریب زخم کا نشان ہے۔"

"تو کنٹری مت کر۔ میں خود دیکھ لوں گا" رئیس نے کہا۔

میں نے دوربین اسے تھمادی "لے۔ غور سے دیکھ لے' ایک ایک کی صورت' میں تو اب ان کو اندھیرے میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے بھی پہچان لوں۔"

رئیس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیس مار خان اور چھوٹی کے سفاک قاتلوں کے چہرے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے وجود میں بھڑکنے والی غصے کی آگ کے شعلے رئیس کی آنکھوں میں نظر آرہے تھے۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے اور اس کا چہرہ نفرت کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ ایک ایک کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا "قسم اللہ کی۔ ان سالوں کی شامت مال ان کو یہاں لے آئی ہے۔"

میں نے کیمرے کے ویو فائنڈر سے دیکھتے ہوئے کہا "شامت مال نہیں جاہل کی اولاد' شامت اعمال۔"

اس نے نوٹس نہیں لیا "ایک ایک سے نمٹ لوں گا میں۔ سب کو دیکھ لیا ہے آج۔ اب۔۔۔ بچ کے کہاں جائیں گے۔ چھٹرے اڑا دوں گا سب کے۔"

میں نے اسے ٹوکا "آہستہ۔ آہستہ بول۔ اعلان کیوں کر رہا ہے' چھت پر کھڑا ہو کے۔"

ایک گاڑی بائیں طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کی روشنی بہت تیز تھی۔ میں نے کیمرے کو فوکس کیا اور جب بجیرو کے ساتھ کھڑے ہوئے چاروں افراد کے چہرے پر پوری لائٹ پڑی تو میں نے شٹر دبا دیا۔ اس وقت وہ بھی سر گھما کے گاڑی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ میری آنکھوں کے لیے اتنی روشنی کافی تھی۔ میں نے ان سب کی صورتوں کو واضح طور پر دیکھ لیا تھا مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ اس روشنی میں کیمرے کی آنکھ نے بھی عکس کو واضح اتارا ہوگا۔ اس کا انحصار بہت سے عوامل پر تھا۔ کیمرا یقیناً مہنگا اور اچھی کوالٹی کا تھا مگر آٹو فوکس نہیں تھا اور میں کوئی ماہر فوٹوگرافر نہیں تھا۔ میرے فوکس کرنے میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا تھا۔ اس میں لوڈ کی ہوئی فلم کون سی تھی اور کیسی تھی؟ اس کی اسپیڈ کے ساتھ شٹر کی اسپیڈ بھی اہمیت رکھتی تھی۔ کسی شوقیہ فنکار کے لیے آٹو فوکس کیمرا مناسب رہتا ہے اور کسی حد تک اطمینان بخش رزلٹ دے سکتا ہے مگر جو کیمرا میرے پاس تھا وہ بہت اعلیٰ مہارت کا متقاضی تھا اور پروفیشنل فوٹوگرافر اس

سے یقیناً کمال دکھا سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اس کیمرے سے اچھی اور صاف تصویر حسنِ اتفاق ہی سے آسکتی تھی۔

کیمرے میں فلم نہ جانے کب لوڈ کی گئی تھی۔ تیسویں تصویر میں نے ابھی ابھی اتاری تھی۔ اب میرے اندازے کے مطابق اس میں کم سے کم چھ اسنیپ شاٹ باقی تھے۔ ان کی تعداد سات یا آٹھ بھی ہو سکتی تھی لیکن یہ بھی اتفاق پر منحصر تھا۔ ایک ایک منٹ کے وقفے سے دو گاڑیاں اور گزریں اور میں نے مزید دو شاٹ لیے۔ پھر ملکانی آگئی۔

ملکانی نے اپنی چھوٹی سی سوزوکی آلٹو کو سیدھا بجیرو کے پاس لے جا کے روکا۔ وہ سب ایک دم اس کے سامنے آکے ایٹن شن ہو گئے اور چند سیکنڈ کے لیے ہیڈ لائٹس بہت کم فاصلے سے ان کے چہروں پر مرکوز ہوئیں۔ یہ سب سے بہتر موقع تھا۔ ہر شاٹ کے بعد فلم خود بہ خود آگے بڑھ جاتی تھی چنانچہ میں نے کھٹا کھٹ دو بار شٹر دبایا۔ پھر ایک تصویر میں نے یوں لی کہ اس میں رب نواز کی بجیرو کے ساتھ ملکانی کی کار بھی نظر آئے۔

وہ سب ملکانی کو مختصراً حالات کی رپورٹ دے رہے تھے جب ایک اور گاڑی بائیں طرف سے آئی۔ یہ سوزوکی ہائی روف تھی جس کی ہیڈ لائٹس عام کار کے مقابلے میں کچھ بلند ہوتی ہیں۔ اس کی لائٹ بھی سرچ لائٹ جیسی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ملکانی نے پلٹ کے دیکھا تو میں نے شٹر دبایا اور بہت خوش ہوا۔ چاروں ہاکی پلیئروں کے ساتھ مسٹر رب نواز کی بیگم کی تصویر ایک کارآمد دستاویز ثابت ہو سکتی تھی۔

چھت پر میرے کانوں تک ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔ درمیانی فاصلہ زیادہ تھا اور وہ اونچی آواز میں بات نہیں کر رہے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ ملکانی کے گاڑی سے اترتے ہی ان سب نے ایک ساتھ سلام کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے اور پھر ایک ساتھ بولنا شروع کیا تھا مگر ملکانی نے ان سب کو خاموش کر دیا اور پھر ایک کو اشارے سے بات جاری رکھنے کے لیے کہا۔ وہ عمر میں بھی باقی لوگوں سے زیادہ تھا اور صورت سے بھی زیادہ خبیث اور سفاک نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب زخم کا نشان بدمعاشی کے ایک میڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔

چند منٹ بعد ملکانی پلٹ کے گیٹ کی طرف آئی اور حسبِ توقع وہاں سیکیورٹی گارڈ نے اسے بھی روک دیا۔ ملکانی سخت جز بز ہوئی۔ "ایک عورت سے ملتے ہوئے بھی ڈرتی ہے تمہاری مالکن۔ میں کیا اس کی جان لینے آئی ہوں۔ میں صرف اپنے شوہر کو لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے بلایا تھا نیلم نے۔"

لیکن سیکیورٹی گارڈ جو شاید عام حالات میں اسے رعایت دے دیتا' اس وقت کسی دلیل سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے انٹر کام پر نیلم سے بات کی۔ اندر سے خاتون کی جامہ تلاشی کے لیے بانو خالہ بقلم خود تشریف لائیں۔ انہوں نے ملکانی کے ہینڈ بیگ میں جھانکا اور اس کے کپڑوں پر ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنے کے بعد کلیئرنس دے دی۔ یہ سب ملکانی نے سخت ناگواری سے برداشت کیا۔ اس کے اور بانو خالہ کے درمیان ایک چھوٹی سی دلچسپ جھڑپ بھی ہوئی۔

"بس۔۔۔ ہو گئی تسلی؟ کوئی توپ تو نہیں ہے میرے پاس۔"

بانو خالہ نے کہا "تم کیا جانو بی بی۔ انگلی برابر توپیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ اور یہ تو ہے قاعدے کی بات۔"

"میں کیا صورت سے بدمعاش لگتی ہوں؟"

"اے۔۔۔ تو' یہ بھی اچھی کہی تم نے۔ ایسی ایسی شریف صورتوں والے ہوتے ہیں یہ بڑے بدمعاش۔ سوٹ بوٹ اور ٹائی لگا کے پھرتے ہیں۔ کوئی دیکھے تو سمجھے پروفیسر ہوں گے کالج میں۔۔۔ میں نے دیکھا ہے فلموں میں۔"

"میں بھی پروفیسر عامہ شاہ بھی شادی سے پہلے۔"

خالہ کا ہاتھ ایک دم رک گیا "تم پڑھاتی تھیں کالج میں۔۔۔ اے لو' پہلے کیوں نہیں بتایا۔ استاد کا تو بڑا درجہ ہوتا ہے۔"

"خاک درجہ ہوتا ہے۔ ایک ایکٹریس زیادہ اہم ہے۔"

خالہ نے ایک آہ بھری "ہزار دشمن ہوں جس کی جان کے وہ اور کیا کرے۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ بڑے بڑے عالم فاضل جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ جس کے پاس چار پیسے ہیں اس کی جان ہے عذاب میں۔ چور ڈاکو آجاتے ہیں دندناتے ہوئے۔ خیر' تم آؤ میرے ساتھ۔"

ملکانی نے خالہ کے ساتھ ڈرائنگ روم تک احتجاجی انداز میں واک کیا۔ میں نے اور رئیس نے نیچے جا کے دیکھا تو وہ صوفے پر نیم دراز ملک رب نواز کو بڑے دکھ' احساسِ ندامت اور غصے سے دیکھ رہی تھی۔

رب نواز نے اور پی تھی۔ شراب کی ایک چھوٹی سی چپٹی بوتل فرش پر خالی پڑی تھی۔ یہ شاید اس نے اپنی جیب میں سے نکالی ہوگی۔ وہ لڑھک کر صوفے کے بازو پر ٹک گیا تھا اور سو گیا تھا۔

نیلم اندر آئی تو دونوں عورتوں نے ایک دوسرے سے سلام دعا یا معافی کی اخلاقی ضرورت کو نظر انداز کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے متحارب حریفوں کی طرح ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولا۔

پھر نیلم نے کہا "اور کچھ دیر نہ آتیں تم تو میں۔"

"پولیس کو بلوالیتی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟" ملکانی نے کہا۔

"ہاں۔ صرف تمہاری وجہ سے۔"

ملکانی نے اس کی بات کاٹ دی "میری وجہ سے نہیں۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا تم نے۔ خود کو بدنامی سے بچایا ہے تم نے۔"

نیلم نے تلخی سے کہا "بدنامی سے ڈرتی ہیں تم جیسی شریف زادیاں' جن کو ان کے شوہر پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔"

"صرف اس لیے کہ تم جیسی لالچی ناگنیں دولت کے لیے ان کے شوہروں کو ڈس لیتی ہیں۔ زہر گھول دیتی ہیں ان کی زندگی میں۔"

نیلم نے چیخ کے کہا "نہیں۔ اس لیے کہ تم میں صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنے پالتو شوہروں کو پٹا ڈال کے رکھ سکو۔"

"کیا مطلب ہے آخر پٹا ڈال کے رکھنے کا' یہ کوئی کتا ہے؟"

"یہ تم اسی سے پوچھنا۔ میں نے نہیں بلایا تھا اسے۔ یہ خود آیا تھا یہاں پر بھٹکتا ہوا۔ کتا تو بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ ایک در چھوڑ کے نہیں جاتا۔"

اچانک ملک نے آنکھ کھول کے اپنی بیوی کو دیکھا "چل تو بھونکنا بند کر دے۔ یہاں کس لیے آئی تھی تو؟ فضول بکواس کرنے؟"

نیلم نے مسکرا کے ملکانی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ذلت کے خیال سے آنسو آ گئے تھے۔ اس کا شوہر ایک ایسی عورت کے گھر میں مدہوش پڑا تھا جسے ملکانی بھی طوائف ہی سمجھتی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ احساس برتری کا زعم رکھنے میں حق بجانب تھی۔ وہ ایک ایم پی اے کی قانونی بیوی اور ایک سابق پروفیسر بھی مگر یہاں آ کے اس کی اوقات دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ اس نے جس ایم پی اے سے شادی کی تھی' وہ اس وقت ایک شرابی اور مفرور مجرم تھا اور بدمعاشی کے سارے دعووں کے باوجود منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ وہ خود کم ذلیل نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے ایک طوائف کے گھر میں بلا کے پروفیسر جاصمہ شاہ کو بھی ذلیل کر دیا تھا۔

بالآخر ملکانی اپنے شوہر کو ساتھ لے کر نیلم کا شکریہ ادا کیے بغیر رخصت ہو گئی۔ کہنے کو وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی مگر معاشرتی حالات نے اس کے ذہن میں بھی تعصب بھر دیا تھا۔ ایک جھوٹے اور لاحاصل احساسِ خود فریبی کے حصار میں وہ خود کو نیلم کے مقابلے میں بہت معزز اور برتر سمجھنا چاہتی تھی۔ اس کی نظر میں نیلم کے لیے عزت کا کوئی تصور اور مفہوم نہ تھا۔ اس کے نزدیک وہ بازارِ حسن سے شوہر نس میں آنے والی کسی طوائف سے مختلف نہ تھی چنانچہ ایک سابق پروفیسر' ایک خاندانی رئیس اور رکن اسمبلی کی بیوی کا غرور اسے اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ نیلم کے احسان کو تسلیم کرے۔ الٹا وہ اسے مجرم سمجھ کے اس سے نفرت کا اظہار کر رہی تھی کیونکہ ہر طوائف کی طرح نیلم نے بھی اس کے شوہر کو اس سے چھینا تھا۔

یہ میں جانتا تھا اور رئیس کے علاوہ گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں گے کہ نیلم اپنے کردار کی مضبوطی میں ملکانی جیسی نام نہاد عزت دار بیبیوں کے مقابلے میں بہت بلند مقام پر فائز ہے لیکن اس سوسائٹی میں ڈانسر' سنگر اور ایکٹرس جیسی فنکارہ کو عزت دینے کا دستور نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ خود نیلم نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہوس کی قربان گاہ پر اپنی عزتِ نفس کو ہر مرحلے پر بھینٹ چڑھایا تھا اور رسوائی کے پرخار راستوں پر لمبا سفر طے کر کے اس منزل تک پہنچی تھی جہاں وہ نامور تھی اور اپنی کامیابی پر غرور کر سکتی تھی۔

تاہم اپنے ماضی کے ہر نئے آبرد لمحے کی یاد کا نقش یوں تھا جیسے کسی زخم کا نشان۔ اسے کھرچ کے مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ ایک لاشعوری انتقام کی خواہش سے مغلوب ہو کے نیلم نے خود کو تنہا کر لیا تھا اور ان سب سے ملنا چھوڑ دیا تھا جو کسی پُرانی اذیت والے سے پرانے زخموں کو کرید سکتے تھے۔

رب نواز ایک ایسا ہی شخص تھا جس نے برسوں بعد اس کی عزتِ نفس کو پھر بڑی بے رحمی سے بھنبھوڑ کے لہولہان کر دیا تھا۔ اس نے فلمی دنیا کے سب سے درخشاں ستارے کو آسمان کی بلندی سے زمین پر کھینچ کر ذلت کے گٹر میں گرا دیا تھا اور اسے خود اپنی کے گھر میں بے توقیر کر دیا تھا۔ ہمارے سامنے اور گھر کے اردلی ملازموں کے سامنے رب نواز اور پھر اس کی بیوی نے طوائف زادی تک کہہ دیا تھا۔

نیلم نے اپنے جارحانہ رویے سے ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے رب نواز کو اس کی بیٹی اور بیوی کی نظر میں قاتل' شرابی اور مفرور مجرم ثابت کر کے کم ذلیل نہیں کیا تھا مگر ان خاندانی لوگوں کا مفرور سر کسی احساسِ ندامت سے جھکانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں احساسِ کمتری کی خلش نے

نیلم کو اندر سے شکست کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد نیلم نے ہمارے سامنے نارمل نظر آنے اور یہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی کہ اس پر کسی ناخوشگوار بات کا کوئی اثر نہیں مگر بہت اچھی ایکٹرس ہونے کے باوجود اس کے رویے پر جھوٹ کا کھوکھلا پن غالب رہا۔

"خدا کا شکر ہے بلا ٹلی" اس نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اگر معاملہ پولیس تک جاتا تو تمہارے لیے بلاوجہ کے قانونی مسائل بھی پیدا ہوتے اور ایسے سنسنی خیز واقعات کی ٹوہ میں رہنے والے فلمی صحافیوں کو بھی اچھی خبر مل جاتی۔"

"اور یہ صرف ہماری وجہ سے ہوتا" رئیس بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ تمہارا اس میں کیا قصور ہے؟" نیلم بولی۔

میں نے کہا "بالکل ہے۔ نہ میں سوئی کو لے کر آتا اور نہ میرے ساتھ یہ مصیبتوں کا ٹوکرا آتا۔ ملک رب نواز آج تمہارے شوقِ دیدار میں نہیں آیا تھا یہاں' وہ تم سے میرا پتا پوچھنے آیا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی "تمہاری طرح اسے بھی دس سال بعد نیلم یاد آ گئی۔ خیر' اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں اور نہ یہ میرے لیے کوئی پریشانی کی بات ہے۔ گیدڑ کے لیے کہتے ہیں نا کہ اس کی موت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ ملک کو اس کی شامتِ اعمال یہاں لے آئی۔ آیا تھا بڑا عزت دار بن کے۔ کیسا ذلیل کیا میں نے۔ اور اس کی بیوی۔"

میں نے کہا "نیلم۔ چھوڑو یہ باتیں۔ جاؤ آرام کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

اس نے کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی کو دیکھا "اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور پھر مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ چلو باہر گارڈن میں بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ صبح تمہیں شیڈول کے مطابق شوٹنگ پر جانا ہو گا۔"

"دو دن کے لیے میں نے سب ڈیٹس منسوخ کر دی ہیں۔"

میں نے کہا "جھوٹ مت بولو۔"

وہ ہنسی "میرا مطلب تھا کر دوں گی۔ دیکھو' باہر موسم کتنا اچھا ہے اور چاندنی بھی ہے۔ چودھویں کا نہ سہی' چاند تو ہے۔"

اس کی ہنسی بھی کھوکھلی تھی۔ وہ اندر سے مضطرب اور برہم تھی اور اسے غمگساری کی ضرورت تھی۔ اپنائیت کا احساس دلانے والی باتوں کا مرہم درکار تھا جو اس کی روح کے پرانے زخموں کا درد مٹا سکے۔ ان زخموں کو آج رب نواز نے پھر چھیڑ دیا تھا۔ وہ ہم سے باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ اتنی مقبول فنکارہ جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی' اپنی نجی زندگی میں کتنی تنہا تھی۔ میں اسے انکار نہ کر سکا۔

"نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی تھی" میں نے مسکرا کے کہا "لیکن وہ کہاں ہے۔ سوئی کو اب تو رہائی مل جانی چاہیے۔"

رئیس بولا "غصے میں پاگل ہو رہی ہو گی وہ۔"

رئیس کا خیال نیک تھا۔ سوئی کچھ دیر بعد آتش فشاں کی طرح دھواں دیتی نمودار ہوئی۔ دو گھنٹے سے بھی زیادہ قید میں رکھے جانے پر سخت خفا تھی "یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ ایسے بند کر دیا مجھے جیسے میں کوئی خطرناک پاگل ہوں۔"

"اس میں کون سی شک کی بات ہے۔" رئیس بولا "اگر یقین نہیں تو خود اپنی صورت دیکھو آئینے میں۔"

وہ چلانے لگی "میں پاگل ہوں۔ تو پاگل ہی سہی۔ ابھی سب الٹ دوں گی۔ چلا چلا کے سب کو اکٹھا کر لوں گی۔ کپڑے پھاڑ کے نکل جاؤں گی باہر۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "سوئی۔ واٹ از دس۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ ہم نیلم کے گھر میں کیوں لائے تھے تمہیں۔ ہماری وجہ سے وہ مشکل میں پڑتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ کتنی مدد کر رہی ہے تمہاری۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے اس نے تم پر سختی کی تھی۔"

رئیس بولا "اور بالکل ٹھیک کی تھی۔ تم بالکل بھروسے کے قابل نہیں ہو۔ تم کو واپس وہیں شفٹ کر دینا چاہیے۔ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک۔"

سوئی شرمندہ ہو کے سیدھی بیٹھ گئی "وہاں تو خیر میں مر کے بھی نہیں جاؤں گی۔"

نیلم نے کہا "فکر مت کرو۔ کس کی مجال ہے جو میری اجازت کے بغیر تمہیں یہاں سے لے جا سکے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے یہاں آ کے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ۔"

"دیکھو۔ ایسی رسمی باتیں مجھے مصنوعی لگتی ہیں۔ اتنے عرصے بعد تم بلا جھجک مجھ سے مدد مانگنے آئے تھے تو مجھے اچھا لگا تھا۔ اگر تم اس خیال سے نہ آتے کہ نیلم کیا سوچے گی۔ کیا کہے گی کہ خود غرض آدمی کو دیکھے تو نیلم یاد آتی نہیں۔ کام پڑا تو دوڑا چلا آیا۔ اس خیال نے تمہارے قدم نہیں پکڑے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر میں تمہیں سناتی کھری کھری تو کیا تم برا مان کے چلے جاتے؟ نہیں جاتے نا؟ چپ چاپ سن لیتے۔ یہی ہے ہمارے درمیان اپنائیت کا وہ انداز جو کسی اور میں نہیں۔ خوشامد' تعریف اور غرض مندی کی چاہت بھری باتیں تو میں سب سے ہی سنتی رہتی ہوں۔ تم تو مجھے بور مت کرو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "زندگی کے حقائق سے ایسے نظر کب تک چرائی جاسکتی ہے اور حقیقت تلخ تو ہوتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "اور حقیقت کیا ہے؟"

میں نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تمہاری ایک زندگی ہے اور اس زندگی کے طے شدہ معمولات ہیں۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان ہوگا تو یہ دوستی نہیں دشمنی ہوگی۔ جیسے تم سونی کی حفاظت کررہی ہو ایسے ہی یہ ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ تمہاری حفاظت کریں۔"

وہ ہنسنے لگی "میری حفاظت کرنے والے کتنے مستعد ہیں۔ تم نے دیکھا؟"

"نہیں نیلم۔ دل کی تسلی کے لیے یہ انتظامات ٹھیک ہیں مگر اصل حفاظت تو خدا کرتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں مگر بندہ خود کچھ نہ کرے تو خدا اس کی کیا مدد کرے گا۔"

"اسی لیے میں کہہ رہا ہوں۔ ایک طرف تم اپنی حفاظت کے لیے سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کرو اور دوسری طرف تمہارے گھر کے اندر رہنے والے ہی تمہاری زندگی کے لیے خطرہ بن جائیں تو۔۔۔"

"تم سے مجھے کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "ہماری وجہ سے رب نواز جیسے لوگ تمہارے بھی دشمن ہوجائیں تو ان سے تم نہیں نمٹ سکو گی۔ تمہاری زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارا ذہنی سکون برباد ہوجائے۔ اس کا اثر تمہارے کیریئر پر پڑے۔"

"کیریئر۔" اس نے تلخی سے کہا "میرا کیریئر۔ میرا فلمی مستقبل۔ میری زندگی کے معمولات۔ میرے شوٹنگ شیڈول۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ میں خود کچھ بھی نہیں۔ میری اپنی کوئی اہمیت نہیں۔ کسی کٹھ پتلی کی طرح میں یہ سب کررہی ہوں دوسروں کے لیے۔ خود اپنے لیے میں کیا کررہی ہوں یا کوئی اور میرے لیے کیا کررہا ہے۔ بعض اوقات خیال آتا ہے کہ یہ سب کیوں کررہی ہوں میں۔ مقصد کیا ہے اس کا اور انجام کیا ہے۔"

"ایک معمولی سے واقعے نے تمہیں ذہنی طور پر کتنا ڈسٹرب کردیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ میرے اعصاب اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ لوگ جب مجھ سے فلمی دنیا میں میرے مقام کی' فلمی صنعت کے مستقبل کی یا ان ایوارڈز کی بات کرتے ہیں جو میں لے چکی یا لوں گی۔ تو میں سخت بیزار ہوتی ہوں۔ کوئی مجھ سے میری بات نہیں کرتا۔ میرے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لوگ۔ جانتے بوجھتے اس ذکر سے کتراتے ہیں۔ منافق اور خوشامدی لوگ جن کا سارا مفاد آج کے دن سے وابستہ ہے۔ آج کی نیلم حسین ہے اور جوان ہے۔ اس کی اداؤں کے دیوانے ہیں ٹکٹ خرید کر فلم دیکھنے والے۔ اس کے رقص پر پاگل ہوجاتے ہیں اور بار بار آتے ہیں۔ سینما ہاؤس فل جاتے ہیں اور فلم ساز کا یا ڈسٹری بیوٹر کا سارا پیسہ وصول ہوجاتا ہے۔ جلدی جلدی نیلم کو کیش کرالو۔ اس سے پہلے کہ وہ بوڑھی بھدی اور موٹی ہوجائے۔ اس کے چہرے کی شکنوں کو میک اپ اور کیمرا مین بھی نہ چھپا سکے۔"

میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ فلمی دنیا میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"کئی بار میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے بھول جائیں اور فلم انڈسٹری میں میری جگہ نہ رہے۔ کیوں نہ میں خود ایسا وقت آنے سے پہلے ہی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوجاؤں۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری شہرت اور میرے عروج کا سورج آج نصف النہار پر ہے۔ اس کے بعد زوال ہے۔"

"غلط ہے تمہارا خیال۔" رئیس نے کہا۔

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں کیا معلوم۔ بالکل صحیح اندازہ ہے مجھے۔ تم ساحل پر کھڑے رہ کر کیا دیکھ سکتے ہو۔ طوفان کب آئے گا۔ کدھر سے آئے گا اور کتنا شدید ہوگا۔ یہ میں جانتی ہوں کیونکہ۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ عمر گزری ہے اسی بحر کی سیاحی میں۔"

میں نے کہا "تم تو بڑی فلسفیانہ باتیں کرنے لگی ہو۔"

"میری تنہائی نے فلسفی بنا دیا ہے مجھے۔ یہ سارا وقت میں نے اپنی تنہائی کے ساتھ گزارا ہے اور تنہائی میں کوئی کیا کرتا ہے؟ میں اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ میری رفیق تھیں صرف کتابیں جو میں نے بہت پڑھیں اور سچ تو یہ ہے کہ میری تنہائی نے مجھے پاگل نہیں ہونے دیا۔ اس کا سارا کریڈٹ ان کتابوں کو جاتا ہے۔"

سونی بڑی مسحور سی بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی "میں

نے دیکھی ہے نیلم باجی کی لائبریری۔ ہزاروں کتابیں ہوں گی۔"

میں نے سخت حیران ہوکے کہا "لائبریری؟ تمہاری ذاتی۔"

نیلم مسکرائی "میں نے کہا نا۔ میں نے کتابوں سے دوستی کرلی تھی۔ لائف گزارنے کے علاوہ ذہنی سکون کے لیے۔ شوق تو سب کے ہوتے ہیں اور شوق معمولات کی یکسانیت اور زندگی کا جمود بناتے ہیں۔ بیزاری دور کرتے ہیں اور ذہنی تھکن نہیں ہونے دیتے۔ کتابوں نے صرف میری تنہائی کے احساس کو نہیں مٹایا۔ مجھے عقل اور شعور بھی دیا۔ مجھے خود کو سمجھنے کے قابل بنا دیا۔ میں سوچنے لگی۔ اپنے کل آج اور کل کے بارے میں اور میرا خیال ہے کہ تم میری تقدیر کے عین مطابق آئے۔"

باتوں سے نیلم کا اعصابی دباؤ کم ہورہا تھا اور کچھ اس کی باتیں بھی اتنی دلچسپ ہوگئی تھیں کہ میں اچانک اسے روکنے سے قاصر تھا "یہ بات میں سمجھا نہیں۔"

"ابھی سمجھاتی ہوں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "خالہ کچھ پوچھنے آرہی ہیں اور مجھے معلوم ہے وہ کیا کہیں گی۔"

خالہ نے قریب آکر کہا "ارے بیٹی۔ کچھ خیال ہے تمہیں رات کتنی بیت گئی ہے۔"

نیلم نے کہا "ہاں خالہ۔ آپ ابھی تک جاگ رہی ہو۔ آپ سوجاؤ۔"

"اور تمہیں نہیں سونا۔" خالہ نے خفگی سے کہا۔

"ہم ذرا باتیں کررہے ہیں ابھی۔"

"ایسی کیا ضروری باتیں ہیں جو کل نہیں ہوسکتیں۔ رات بھر جاگ کے کرنا ضروری ہیں۔۔۔؟" انہوں نے ہم سب کو غصے سے گھورا۔

"میرے لیے ضروری ہیں خالہ۔ تم کسی سے کہہ دو کہ چائے دے جائے۔" نیلم نے کسی بے مروت مالکن کا روکھا لہجہ اختیار کرلیا۔

خالہ کو نیلم کی صحت کی بہت فکر تھی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ "اب رات رات بھر ویسے بھی جاگنا ہوتا ہے۔ کبھی فلموں کی شوٹنگ میں تو کبھی ان موٹی کتابوں کی خاطر۔ اب یہ نئے رشتے دار آگئے ہیں۔"

نیلم ہنسی "اگر میں ایسے لہجے میں بات نہ کرتی تو خالہ کا لیکچر شروع ہوجاتا۔"

"بے چاری بہت خیال رکھتی ہیں تمہارا۔" رئیس نے کہا۔

"بڑی محبت بھی کرتی ہیں مجھ سے۔ تمہیں میرے سر سے آرہی ہے نا؟"

میں نے کہا "اب تو بالکل نہیں آرہی ہے۔"

رئیس بولا "اپن تو الو ہیں۔ رات کو جاگنے والی مخلوق۔ رہی سونی تو یہ باتیں سنتے سنتے ہی سوجائے گی۔"

سونی جھینپ کر ہنسی "ہاں۔ ایسی ہی ہے میری نیند۔"

نیلم نے کہا "تمہارے آنے سے پہلے میں کچھ فیصلے کرچکی تھی۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ تقدیر کے فیصلے تھے۔ ان کا تعلق میری تقدیر سے تھا۔ میں نے اپنے بارے میں بہت عرصہ سوچتے ہوئے گزار دیا تھا کہ آخر کیا مقصد ہے میری اس زندگی کا۔ میں جو کچھ کررہی ہوں کس کے لیے کررہی ہوں اور کیوں؟ ابھی فوراً نہ سہی۔ چار پانچ سال میں زوال کی جانب سفر شروع ہوگا۔ گمنامی اور عذاب ناک تنہائی کی طرف۔ ہونے کو یہ کسی بھی وقت ہوسکتی ہے۔ فلمی دنیا میں اچانک دو چار لڑکیاں نئی آجائیں۔ ان کی کامیابی میری ناکامی کا آغاز ہوگی۔ کیوں نا اس وقت کے آنے سے پہلے ہی میں فلمی دنیا کو چھوڑ دوں۔ اپنے عروج کے زمانے میں جس نے بھی فلمی دنیا سے رخصت سفر باندھا وہ عزت و آبرو کے ساتھ گئی لیکن جس نے یہ دنیا چھوڑی اس نے اپنی دنیا بسائی۔ میں یہ سب چھوڑ کے کیا کروں گی؟"

میں نے کہا "یہ سوال یقیناً بہت اہم ہے۔"

"اس سوال کے جواب میں یہ مت پوچھنا کہ میں کسی سے شادی کرکے اپنا گھر بسانے کا کیوں نہیں سوچتی۔ سوچنے سے یہ کام ہوتا تو میں بہت پہلے کرلیتی اور شاید کئی بار کرلیتی۔" وہ ہنسی۔

"الرجک ٹیلر کی طرح۔" سونی نے کہا۔

رئیس نے اسے گھور کے دیکھا "بے وقوفی کی بات کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی خاموش رہے۔"

"تمہیں تو پھر بولنا ہی نہیں چاہیے کبھی بھی۔" سونی نے کہا "سب سے زیادہ بے وقوفی کی باتیں تم کرتے ہو۔"

رئیس بولا "تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں دانائی کی باتیں تو تم اور کیا کہو گی۔"

"بڑے دانشور ہو نا تم۔ مسٹر دانا۔"

میں نے کہا "تاش کرکے فیصلہ کرلو کہ کون زیادہ بڑا بے وقوف ہے۔"

رئیس نے شکایتی انداز میں سونی سے کہا "دیکھا۔ انہوں نے کیا فرمایا ہے۔ بے وقوف تو ہم دونوں ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر میں تمہیں ... پس میں کرلیں۔"

... نے کہا "اس کا کیا فیصلہ کرنا۔ بڑے تو تم ہی ہو۔"

چائے آگئی مگر نیلم نے باتوں کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔

"پتا نہیں کیوں تم سے باتیں کرکے میرا دل بہت ہلکا محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے بھی میں بیزار اور بیمار ہوگئی تھی۔ خود سے کوئی کب تک ہم کلام رہ سکتا ہے۔ دنیا تو ایسے شخص کو فوراً پاگل قرار دے دیتی ہے جو اپنے آپ سے یا دیواروں سے باتیں کرتا ہو۔ اسی لیے میں خاموشی کی دنیا میں بولتی تھی اور میری آواز بھی میرے سوا کوئی نہیں سنتا تھا۔ میری تنہائی کی رفیق کتابیں بھی خاموشی کی زبان میں باتیں کرتی تھیں۔ آج میں بولنا چاہتی ہوں۔ ایسے کہ صرف میں نہیں۔ سب سنیں۔"

میں نے کہا "تم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔ ہم سب سن رہے ہیں۔"

"میں اپنی زندگی کے اس بیزار کردینے والے معمول سے اتنی پریشان ہوگئی تھی کہ کئی بار میں نے سوچا کہ بس اب کوئی فلم سائن نہیں کروں گی۔ جتنی فلمیں ہیں میرے پاس، وہی پوری کرکے فلمی دنیا سے رخصت۔ نام پیسہ بہت کمالیا۔ اس پیسے کا کوئی مصرف نہیں۔ نام کتنے دن کا۔ تم تو فلموں سے اور فلموں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ ایسی خبریں کئی بار شائع ہوئیں۔ فلم اسٹار نیلم نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نیلم ریٹائر ہورہی ہیں۔ نیلم شادی کررہی ہیں۔ نیلم باہر جارہی ہیں۔ نیلم ایک پُراسرار بیماری میں مبتلا ہیں اور مرنے والی ہیں۔ کیا بتاؤں کہ ایک معمولی سی بات منہ سے نکال کے میں کیسی مصیبت میں پڑجاتی تھی۔ فلم ساز اور ہدایت کار اور سنیما انڈسٹری کے سارے ساتھی پریشان ہوکے فون کرنے لگتے تھے۔ گھر کے چکر لگاتے تھے اور اخبار میں چھپنے والی خبروں کی تردید کرتے تھے پھر مجھ سے تردید کراتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک دلدل ہے جس میں سے نہ میں خود نکل سکوں گی اور نہ کوئی مجھے نکلنے دے گا۔ میرے نام چاہنے والوں کے ہزاروں خطوط تار اور ٹیلی فون آنے لگتے تھے۔ ایک بار تو کچھ لوگوں نے دروازے کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ اب میں اشارہ کرتی تو پولیس سب کو اٹھا لے جاتی مگر میں نے خود جاکے انہیں قائل کیا کہ میں فلمی دنیا چھوڑ کے کہیں نہیں جارہی ہوں پھر انہوں نے کچھ کھایا۔ ایک پاگل میری گاڑی کے سامنے لیٹ گیا تھا۔"

"کوئی دوسرا ناصر عظیم؟" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی "تم تو سامنے آگئے تھے اور تمہیں پتا بھی نہیں تھا کہ نیلم کون ہے۔ اس دیوانے کو سب معلوم تھا۔ خاموشی سے دنیا کو چھوڑنا ممکن ہے۔ فلمی دنیا سے جانا ناممکن ہے۔ میں نے ایک دو پروڈیوسرز سے رازداری کے ساتھ کہا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی فلم مکمل کرلیں کیونکہ میں اب مزید فلمیں نہیں لوں گی۔ بس وہ بات پھیل گئی اور کچھ سے کچھ ہوگئی۔ میں اتنی ڈپریشن کا شکار تھی کہ خودکشی کا سوچنے لگی۔ وہ تو اچھا ہے کہ میرے ساتھ ایک فیملی فزیشن بالکل دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ پہلے بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے خاصا حوصلہ دیا لیکن ایک آزار تھا کہ باقی رہا۔ میں نے بہت سوچا کہ فلمی دنیا سے الگ ہو کے میں کیا کرسکتی ہوں۔ کیسے خود کو مصروف رکھ سکتی ہوں اور سکون حاصل کرنے کے لیے کیا کام کرسکتی ہوں۔ میرے سامنے بہت سی مشہور فلم اسٹارز کی مثالیں تھیں۔ صوفیہ لارین نے سہارا بچے پالتی تھی۔ آڈرے ہیپ برن جنوبی افریقہ اور سیاہ فام بچوں کے لیے بہت کچھ کرتی رہی۔ انڈیا میں شبانہ اعظمی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی ایسا ہی کوئی کام کرنا چاہیے۔ انسانی فلاح کا۔ بچوں یا بوڑھوں کے لیے۔ بالآخر میں نے ایک ایسا ادارہ بنانے کا سوچا تھا جہاں وہ بوڑھے رہیں جن کا دنیا میں کوئی نہیں۔ پھر طے کیا کہ انہیں رکھوں جن کو اولاد نے سب کچھ لے کر چھوڑ دیا ہے پھر خیال بدلا کہ صرف ایسی عورتوں کو رکھا جائے جن کے شوہر بھی نہیں ہیں اور اولاد کے گھر میں ان کے لیے جگہ نہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب حقیقی معنوں میں فلاح کے کام ہیں۔"

وہ بولی "فلاح کے کاموں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ جدھر نظر اٹھائیں کوئی انسانی مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا نظر آتا ہے جس کے سامنے آپ کے ارادے اور آپ کے وسائل بہت حقیر لگتے ہیں۔ حوصلہ شکن حد تک ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔ بھوکے اونٹ کے منہ میں زیرہ ڈالنے سے کیا ہوگا۔ یہ احساس بہت بے بس کرتا ہے مگر پھر خیال آتا ہے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا یقیناً بہتر ہے۔ ابھی میں فیصلے کی کشمکش سے گزر رہی تھی کہ تم آگئے اور تم سب سے مل کے مجھے یوں لگا جیسے خدا نے میرے ارادوں کو استقامت دے دی ہے۔ میرا حوصلہ بڑھانے والے آگئے ہیں۔ میں اب اکیلی نہیں رہی۔ میرے لیے فیصلہ بھی آسان ہوگیا ہے اور فیصلے پر عمل کرنا بھی۔"

میں نے کہا "دیکھو نیلم۔ تم نے بتادیا کہ تم کیا چاہتی ہو۔

تمہارے عزائم بہت نیک ہیں اور ہم یقیناً تمہاری مدد بھی کریں گے لیکن ہم پر مکمل انحصار مت کرنا۔ کیونکہ ہمارے اپنے مسائل ہیں۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ سب بتا دیا ہے مجھے سونی نے۔"

میں نے کہا "یہ بات ایک رات میں ختم نہیں ہوسکتی۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر سارے معاملات پر غور کریں گے اور سوچ سمجھ کے فیصلہ کریں گے۔ رائٹ؟"

اس نے سر ہلایا "مجھے اپنی ذات پر اعتماد کرنا نہیں آتا اور ایسا مخلص کوئی نہیں جو تمہاری طرح مجھے صحیح مشورہ بھی دے۔ اکیلا آدمی خود کو بہت کمزور محسوس کرتا ہے۔"

میں نے کہا "خدا کے بعد ہر آدمی کی اصل طاقت خود اس کی ذات میں ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے۔ جو میرا یا سونی کا اور رئیس جیسے سب لوگوں کا مسئلہ بھی ہے کہ ہم عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہیں۔ ہمارے اندر ایک خوف ہے بے سہارا اور اکیلا ہونے کا۔ شاید اس لیے کہ ہم خونی رشتوں سے محروم تھے۔ وہ جو اعتماد باپ کو بیٹے پر یا بھائی کو بھائی پر ہوتا ہے۔ وہ ہم نے نہ دیکھا نہ محسوس کیا لیکن ایک دوسرے کے ساتھ رہ کے ہم نے اس خوف کو شکست دی اور اپنی طاقت حاصل کرلی۔"

"مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں حد درجہ خود غرض اور لالچی انسانوں کی دنیا میں بالکل تنہا رہی اور ڈرتی رہی۔ حالات کے دھارے میں پھنسی رہی اور جو ہوا اسے تقدیر سمجھ کے قبول کرتی گئی۔ اب میں اپنی مرضی سے خود کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میرا مطلب ہے تائید اور حمایت۔ راہنمائی اور مشورہ۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ ہر معاملے میں ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔"

رئیس بولا "جیسے تم ہمارے ساتھ رہو گی۔"

وہ بولی "مگر تم تو الگ رہنا چاہتے ہو؟"

میں نے ہنس کے کہا "ہاں۔ ابھی ہمارا گھر الگ ہوگا۔ ہماری مصروفیات کے دائرے الگ رہیں گے۔ ایک دم سب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک رات میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔"

"کرنا بھی نہیں چاہیے۔" رئیس نے کہا۔

"پہلے ہم اپنے مسائل کو کچھ سمیٹ لیں۔ سلجھا لیں۔ کچھ آپس کے معاملات کو ڈسکس کرلیں۔ پروگرام کچھ بھی ہو۔ اس پر ہر پہلو سے غور کرلیں۔ بالآخر ہم جو بھی کریں گے مل کے کریں گے۔" میں نے کہا۔

نیلم بہت مطمئن ہوگئی۔ رات کے آخری پہر میں ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔ سونی کا بیڈ روم الگ تھا مگر اس نے اکیلے سونے سے انکار کردیا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"چلو نکلو۔" رئیس نے اسے باہر جانے کا حکم دیا "کس سے ڈر لگتا ہے؟ یہاں کیا بھوت ہیں؟"

"کل تک نہیں تھے۔ آج نظر آرہے ہیں۔" وہ بولی۔

"جہاں ایک بھی چڑیل ہو وہاں بھوت جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جاؤ ہماری نیند مت خراب کرو۔ جاؤ۔"

"میں یہاں صوفے پر سوجاؤں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ جب تمہارا کمرا ہے الگ۔" رئیس بگڑنے لگا۔

"وہ۔۔۔ کہیں ملک پھر کوئی بدمعاشی نہ کرے۔"

"اندر سے دروازے کو لاک کرلو۔ باہر سیکیورٹی گارڈ بھی کھڑے ہیں۔ ملک کا باپ بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔" سونی نے کہا مگر رئیس نے اسے بازو سے پکڑ کے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کردیا۔

اس نے باہر سے دروازے کو لات ماری اور رئیس کو چند عام قسم کی گالیوں کے ساتھ ایک۔ خاص گالی بھی بک دی۔ غصے میں اسے اپنی زبان پر اب بھی کنٹرول نہیں رہتا تھا۔

رئیس نے دانت پیس کے کہا "دیکھ یار الو کی پٹھی باہر سے کیا بکواس کیے جارہی ہے۔ نیلم نے سنا تو کیا سمجھے گی۔"

میں نے آنکھیں بند کرکے خراٹے لیتے ہوئے کہا "کچھ نہیں سمجھے گی کیونکہ اسے سب معلوم ہے لیکن میں سو رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تو کیا کہہ رہا ہے۔"

میرا خیال یہ تھا کہ میری آنکھ لگتے ہی شبنم کا فون آگیا۔ باہر سے کسی نے دروازہ بجا کے مجھے یہ اطلاع دی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو اس میں صبح کے چھ بجے تھے یعنی میں تین گھنٹے کی نیند لے چکا تھا۔ اس کے باوجود میری آنکھیں بوجھل تھیں اور سر بھاری ہورہا تھا۔ فون سننے کے لیے مجھے باہر جانا پڑا تو مجھے شبنم پر سخت غصہ آیا۔ ملازم نے مجھے کہا۔ "آپ گارڈن میں چلے جائیں۔"

میں نے غرا کے کہا "کیا فون گھر میں سننے پر پابندی ہے؟"

"وہ۔۔۔ فون میڈم کے پاس ہے۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "انہوں نے ہی کہا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا اچھا۔ جاتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیلم ننگے پاؤں شبنم سے بھیگی ہوئی سبز گھاس کے قالین پر ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرائی "گڈ مارننگ۔"

میں نے کہا "تمہیں دیکھ کر تو کہنا ہی پڑے گا کہ ویری بیوٹی فل مارننگ۔"

اس نے مجھے فون تھما دیا "شبنم مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ ابھی پھر فون کرے گی۔ اس کا حکم تھا کہ تمہیں جگا دیا جائے۔"

"وہ خود تو رات کی مخلوق ہے۔ دوسروں کی نیند حرام کرنے کا شوق ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھ کے ایک اور جماہی لی "مگر تم کیوں بے خوابی کے مرض کا شکار ہو؟"

وہ خوب صورت گہرے آسمانی رنگ کے ریشمی نائٹ سوٹ میں تھی اور اس کے کھلے بال کچھ زیادہ ہی سنہرے لگ رہے تھے۔ اس کے اجلے گلابی پاؤں اوس میں بھیگ گئے تھے۔ اس کا چہرہ میک اپ نہ ہونے کے باوجود بے حد نکھرا ہوا اور جوان نظر آتا تھا "مجھے سارے نفسیاتی امراض پالنے کا شوق ہے۔" وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

"ایک بات کہوں۔ تمہارا اندازہ بالکل غلط تھا۔"

"کون سا اندازہ؟"

"میں اگلے دس سال کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ تمہارے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا۔ اگلے دس سال صرف تمہاری حکمرانی رہے گی۔ سنیما اسکرین پر بھی اور فلم بینوں کے دل پر بھی۔"

وہ زیادہ سیریس ہو گئی "صبح صبح ایسی باتوں سے بیزار مت کرو۔ ایسے ڈائیلاگ بولنے والے بد خواہ دوست بہت ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے جو کہا میرے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی۔ تم واقعی اتنی حسین لگ رہی ہو اس سیٹ اپ میں۔"

"اس باغ کے خوب صورت سیٹ پر؟" وہ طنز سے بولی۔

میرے اظہارِ شرمندگی سے پہلے فون بولنے لگا۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

شبنم نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا یہ جان کر کہ تم گہری نیند میں ہو۔"

"اچھا تو اب خوش ہیں آپ مجھے جگا کے؟" میں نے کہا۔

"خوشی ہوتی اگر آپ کہتے کہ میں تمہارے خیال اور تصور میں تم سے باتیں کر رہا تھا۔"

"تم مجھے لکھ دو پورا اسکرپٹ ایک جدائی کے مارے ہوئے بے وقوف عاشق کا۔ میں پڑھ دیا کروں گا ایسی چویشن میں۔ خود مجھے ایسے جھوٹ بولنا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی اخبار کی کاپی بھیجی ہے۔ آج دیر ہو گئی۔ پہلا دن تھا نا۔۔۔"

میں نے کہا "صرف یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اس وقت؟"

"بہت بڑی خبر لگائی ہے میں نے پہلے صفحے پر۔ رب نواز کی ضمانت منسوخ ہونے کی اور اس کے عدالت سے فرار کی۔ اس موضوع پر زبردست اداریہ بھی لکھا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کا احترام کیسے مجروح ہو رہا ہے۔ اثر رسوخ رکھنے والے ملزم پولیس کی ملی بھگت سے پکڑے نہیں جاتے اور اس کیس میں غنڈا گردی اور لاقانونیت کا مظاہرہ کرنے والا ایک سابق رکن صوبائی اسمبلی ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوا تھا۔"

میں نے خراٹے لینے شروع کیے۔

"اے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم سو گئے؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"رات تین بجے تک نیلم کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں تین منٹ بھی نہیں سویا کہ نیند آ گئی؟"

میں نے کچھ غوں غاں کی آواز نکالی "ہاں۔۔۔ وہ سب ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟ تمہارا دماغ تو میں ٹھیک کرتی ہوں آ کے۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے تم ادھر مت آنا۔ تمہیں میری قسم۔"

"اچھا نہیں آؤں گی لیکن تم ادھر نہ آئے سات بجے تک تو۔۔۔"

میں نے گھبرا کے کہا "سات۔۔۔ یعنی آدھے گھنٹے میں۔ ایسی کیا مصیبت ہے مس شبنم۔ میں پھر سونا چاہتا ہوں۔ نہا دھو کے اور ناشتا کر کے آجاؤں گا دوپہر تک۔"

"میں نے کہا نا سات بجے تو اس کا مطلب ہے سات بجے۔ ساڑھے سات بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے کہا "اف۔ یہ کیا بدمعاشی ہے۔" اور اس کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر شبنم جانتی تھی کہ اب میں فون کروں گا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

نیلم نے میرے سامنے بیٹھ کے ایک گہری سانس لی "کیا ہوا؟"

میں نے اپنا سر پکڑ کے کہا "کہتی ہے ساڑھے سات بجے

تک پہنچ جاؤ میرے آفس ورنہ۔"

"ورنہ کیا' ناراض ہو جائے گی؟"

میں نے کہا "ایسی میری قسمت کہاں۔ وہ خود نازل ہو جائے گی یہاں آدھے گھنٹے بعد۔ عجیب لڑکی ہے۔ میری قسم کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔"

نیلم ہنسنے لگی "بہت محبت کرتی ہے تم سے۔"

میں نے کہا "پاگل ہے بالکل۔"

"تم بھی تھے شادو کے لیے۔" وہ بولی "لیکن تم بہت خوش قسمت ہو۔ رشک آتا ہے مجھے بعض اوقات تم پر۔ شادو قربان ہو گئی تمہاری خاطر۔ اپنا سب کچھ تم پر نثار کر دیا۔ پھر چندا نے سنبھال لیا تمہیں اور اب دیکھو شبنم کیسے اپنی ذات کی نفی کرتی ہے تمہارے لیے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "پتا نہیں۔ خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ دکھ شادو نے بھی دیے۔ چندا نے بھی۔۔۔"

"ناصر۔" نیلم نے مجھے گھورا "ناشکرے۔ کسی کو ایک زندگی میں ایک بار کوئی ایسے نہیں چاہتا۔ تمہیں تین بار چاہت کے خزانے ملے۔"

میں نے کہا "اوکے' پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نمازِ شکرانہ ادا کرنا چاہیے یا کہیں چادر بھی چڑھانی چاہیے۔ خوشی میں بھنگڑا ڈالنا چاہیے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ شادو سے تم نے فوراً شادی کر لی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی۔ وہ بھی اس وقت جب۔ خیر چھوڑو اس کی بات۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

نیلم نے کہا "چندا اور شبنم میں سے تم کس کو۔۔۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے نیلم۔ یہ تم نے کیا صبح صبح میرا جذباتی پوسٹ مارٹم شروع کر دیا۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ چندا سے شادی کے معاملے میں تم نے اتنی دیر کیوں کی تھی۔ کہ بیچ میں شبنم آ گئی اور پھر سب گڑبڑ ہو گیا۔ یہ جو ہوا اچھا ہوا یا نہیں۔ چندا بہتر رہتی یا شبنم؟"

"اف۔ کتنا مشکل سوال کر لیا ہے تم نے۔ میں کیا کہوں۔ میرا جواب کبھی صحیح نہیں ہو گا کیونکہ میں بہرحال ایک پارٹی ہوں۔ میں غیر جانب دار نہیں ہو سکتا۔ چندا کے معاملے میں میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہوئی۔ خود اس نے مجھے پرکھنے اور JUDGE کرنے میں بہت وقت لگایا۔ وہ بہت DOUBTFUL تھی میرے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ یہی کہتی تھی کہ پہلے انسان کے بچے بن جاؤ پھر سوچوں گی۔ اسے بہت سی باتوں پر اعتراض تھا مثلاً کامیابی کے لیے میں کسی بھی قدم کو غیر اخلاقی یا ناجائز نہیں سمجھتا تھا۔ دولت میرے نزدیک سب سے بڑی طاقت اور مقصدِ حیات تھی۔ اسے وہ میرا کمپلیکس سمجھتی تھی۔ اس کی اور میری سوچ میں یہ فرق ہمیشہ رہا۔ وہ کلی مزاج تھی اور بہت زیادہ خود پرست۔ اب اندازہ ہو رہا ہے مجھے کہ وہ صرف لینا جانتی تھی۔ وہ سب اپنے لیے مانگتی تھی۔ اطاعت' پیار۔ توجہ۔ قربانی اور بالکل یک طرفہ۔۔۔"

"تم اسے خود غرض کہہ رہے ہو؟"

"شاید۔ اسے اور کیا کہا جائے گا۔ شبنم اس کے بالکل برعکس ہے۔ بالکل غیر مشروط انداز محبت رکھنے والی۔ کلی طور پر خود کو میری ملکیت میں دے کر مطمئن ہو جانے والی۔ اب میں اس کے ساتھ جو سلوک چاہوں کروں۔ اس سے محبت کروں یا نفرت۔ اس سے شادی کروں یا نہ کروں۔ کسی اور سے شادی کر لوں اور اسے ایسے ہی ساتھ رکھوں۔ داشتہ کیا کنیز بنا لوں۔"

نیلم حیرانی سے دیکھتی رہی "مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ تو بہت ہی ذہین لڑکی ہے۔ جینئس۔"

"اسی لیے تھوڑی سی پاگل ہے۔ جینئس لوگ دنیا کی سمجھ میں نہیں آتے اور دنیا جینئس لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مشکل سے گزارا کرتے ہیں۔"

ایک ملازم نے چائے درمیان میں رکھ دی "میں بناتی ہوں۔" نیلم بولی۔

میں نے کہا "تمہیں نیند بالکل نہیں آئی؟"

"کچھ دیر سوئی تھی میں لیکن میں بہت ایکسائٹڈ تھی اس خیال سے کہ اب میرے بھی خواب پورے ہوں گے۔ میری زندگی میرے لیے ہو گی۔ ایک نئی آزادانہ زندگی کے خیال نے سونے نہیں دیا۔ تمہارا آج کیا پروگرام ہے' ابھی چائے پی کر جاؤ گے؟" اس نے چائے کا کپ مجھے تھما دیا۔

"ہرگز نہیں۔ اس نے کہہ دیا اور میں دوڑتا ہوا چلا جاؤں سر کے بل۔ ایسا فرماں بردار پالتو عاشق نہیں ہوں میں۔"

"چلو اچھا ہے وہ یہاں آ جائے گی۔"

"اس میں کیا اچھائی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے گارڈز سے کہہ دو۔ اسے باہر روک لے۔ کہہ دے ناصر صاحب تو چلے گئے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچانک کہاں چلے گئے؟"

"کہیں بھی چلے گئے۔ کپڑے پھاڑ کے نکل گئے۔ سسرال چلے گئے۔ پولیس نے پکڑ لیا۔ فوت ہو گئے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" نیلم ہنس پڑی۔

"میں واقعی نہیں چاہتا کہ شبنم ادھر آئے۔ ابھی کچھ دن تمہیں اپنے پرانے معمول کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ رب نواز کا کوئی بھروسا نہیں۔ وہ تمہاری نقل و حرکت کی اور تم سے ملنے والوں کی نگرانی کرے۔"

"اتنا ڈرتے ہو تم اس سے؟"

"یہ ڈر نہیں۔ احتیاط کا تقاضا ہے۔ ایک بہت بڑے جھوٹ کو سچ بنانے اور رب نواز کو اس کا یقین دلانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ آخر کل رات وہ کیوں آیا تھا یہاں؟"

"وہ نشے میں بھٹکتا ہوا آ گیا تھا؟"

"نہیں۔ نشہ صرف بہانہ تھا اور وہ تم سے نہیں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ یہاں مجھ سے مل کے یقین کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی ناصر عظیم ہوں۔ اس کا ذہن ابھی تک اس بات کو قبول نہیں کر پایا کہ میں چراغ علی ولد باغ علی نہیں ہوں۔ چراغ علی بھی شبنم کا وہ ڈرائیور نہیں ہے جو اس کے گھر میں سوئی کے ساتھ داخل ہوا اور اس کے بیٹے دل نواز کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ہی نہیں، شبنم اور فرید عباسی بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ دو ہم شکل افراد کی کہانی تو عام ہے مگر تین افراد جو آپس میں جڑواں بھائی بھی نہ ہوں ان کے درمیان یہ پُرفریب مماثلت اسے بالکل ناممکن لگتی ہے۔ وہ حقیقت جاننا چاہتا ہے۔"

"تم نے تو خود کو ناصر عظیم ثابت کر دیا۔ اب تمہیں کیا ڈر؟"

"دیکھو۔ ناصر عظیم تمہیں جانتا ہے۔ ڈاکٹر کمال۔ چندا۔ رئیس خاں۔ قمر اور بہت سے لوگ ہیں جو ایک سچائی پر یقین رکھتے ہیں لیکن درمیان میں کچھ عرصہ ناصر عظیم غائب ہو گیا تھا۔ وہ شاہ عالم تھا۔ شاہ عالم کا حلقہ شناسائی بالکل مختلف تھا۔ ناصر عظیم کسی شبنم۔ رخشی یا فرید عباسی سے واقف نہیں اور یہ سب لوگ جو شاہ عالم کو جانتے تھے ناصر عظیم کے پرانے رشتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"یہ کس الجھن میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے؟"

میں نے کہا "ہم سب نے مل کے یہ طے کیا تھا کہ مجھے ناصر عظیم کی حیثیت سے اپنی پرانی زندگی اختیار کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ یہ گرفتاری اور کورٹ کا ڈراما اس پروگرام کا پہلا حصہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے مراسم شبنم سے فرید عباسی اور رخشی سے استوار ہوں گے۔ وہ تم سے ملیں گے۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا تو مجھے شاہ عالم سمجھ لیا جاتا۔ اس کے بارے میں تو ہم نے مشہور کر دیا ہے کہ وہ ملک سے فرار ہو گیا اور غالباً برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ خود شبنم کے وسیلے سے ہم نے ایسی خبریں پھیلائیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً اس کی ایک ماڈل سے شادی۔"

"اس کی تصویر بھی شائع کرا دی تھی تم نے؟" نیلم ہنسی۔

میں نے کہا "ہاں وہ کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ جس ماڈل کی تصویر تھی وہ بہت جز بز ہوئی تھی لیکن معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ بعد میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شاہ عالم برطانیہ میں کسی حادثے کا شکار ہو کے مر گیا۔ برطانیہ کی کسی جگہ کا ذکر نہیں تھا۔ اب لوگوں نے ویسے بھی اسے بھلا دیا ہے۔ صرف رب نواز کے ساتھ اس کے کچھ کاروباری مراسم تھے اور یہ کاروبار سب غیر قانونی تھا۔ شاہ عالم کی وجہ سے رب نواز کے سارے دھندے چوپٹ ہو گئے اور اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ رب نواز اس کے بارے میں کچھ بک نہ دے یا اسے بلیک میل نہ کرے۔ رب نواز کو آج بھی شاہ عالم کی تلاش ہے۔ اس نے معلوم کرا لیا تھا کہ شاہ عالم کی ایک ماڈل سے شادی کی خبریں کوئی صداقت نہیں تھی۔ شاید حادثے کی تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی اس نے لیکن اب سخت کنفیوژن ہے۔ شاہ عالم برطانیہ میں ہے تو کہاں اور وہاں سے چلا گیا ہے تو کہاں۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد رب نواز اپنے نقصان کو روپیٹ کے بیٹھ گیا ہے۔ اسے رب نواز کی وجہ سے افشائے راز کا اندیشہ بھی نہیں رہا اور اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کا بھی۔ اس نے اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے کوئی اور سیاسی رشتہ جوڑ لیا ہوگا۔ ایسے میں اگر ناصر عظیم سامنے آتا تو سب سے پہلے وہ چوکنا ہوتا۔ اس کا یہ سمجھنا جائز ہوتا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں اور میں اپنا نام بدل کے دنیا کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ میں نے مداری کا تماشا کیا۔ میں اچانک اس کے سامنے آیا اور ناقابل تردید ثبوت اور گواہوں کی مدد سے ثابت کر دیا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اب وہ جیسے چاہے ناصر عظیم کے ماضی کو کریدے۔ سچ تو سچ ہی رہے گا۔ اس کی پریشانی بالآخر دور ہو جائے گی کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ شبنم یہاں مجھ سے ملنے کے لیے نہ آئے۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا میں نے کہ ابھی ہم سب الگ رہیں گے اور ملیں گے تو چھپ کے

اور بہت کم۔ کچھ عرصے بعد ہمارے تعلقات بڑھ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔"

نیلم نے کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی کو دیکھا "سات تو بج گئے۔"

میں نے پھر فون اٹھا کے کوشش کی اور اس بار نمبر مل گیا۔ میں نے کہا "دیکھو شبنم۔ آج ہم نہیں مل سکتے۔"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "آپ کون صاحب ہیں؟"

میں نے کہا "شبنم۔ پلیز میری بات سنو۔"

"میں شبنم نہیں ہوں سر۔ آپریٹر ہوں۔" شبنم بولی۔

"یہ کیا مذاق ہے؟"

"مس شبنم جا چکی ہیں سر۔" شبنم نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"وہ ماننے والی نہیں ہے۔ یہاں آ کے رہے گی۔" میں نے غصے اور مایوسی سے کہا۔

نیلم نے کہا "فرض کرو وہ ایسے آ جائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"وہ کیسے۔؟"

نیلم نے فون اٹھا کے نمبر ملایا اور ہنسنے لگی "آپریٹر صاحبہ۔ آپ یوں کریں کہ سٹی لائٹ بیکری پر آ جائیں۔ سمن آباد موڑ پر۔ میں اپنے شوفر کو گاڑی کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ وہ ڈبل روٹی خریدے گا وہاں سے۔ تم گاڑی میں بیٹھ جانا۔ اس کے شیشے سیاہ ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا اور تم یہاں پہنچ جاؤ گی۔ اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دو۔ آفس میں۔ سمجھ گئیں نا تم۔ بس ٹھیک ہے۔"

ساڑھے سات بجے شبنم کا آنا ممکن نہیں تھا۔ ایک گھنٹا دیر سے ساڑھے آٹھ بجے بڑے پُرجوش انداز میں وہ گاڑی سے باہر کودی۔ ہم اس وقت بھی وہیں باغ میں تھے۔ باتیں کرتے ہوئے ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے پھر دھوپ اتر آئی تو ایک بہت گھنے درخت کے سائے میں اس جھولے پر جا بیٹھے جو سائز میں کسی بیڈ کے برابر تھا۔ شبنم نے اس سین کو مشتبہ دلچسپی سے دیکھا۔

قریب آ کے اس نے گول کیا ہوا ایک اخبار میری طرف بڑھایا "ذرا دیکھو۔"

میں نے کہا "کیا دیکھوں۔ نظر آ رہا ہے کہ یہ اخبار ہے۔"

وہ میرے اور نیلم کے درمیان بیٹھ گئی "یہ ایک خاص اخبار ہے، معلوم ہے کیوں۔ اس کی ایڈیٹر میں ہوں۔" اس نے بڑے غرور سے کہا "مبارک باد دو مجھے۔"

"اس سے پہلے میں فارسی کا ایک شعر پڑھوں گا۔"

"فارسی نہیں آتی مجھے اور شعر بھی نہیں سننا۔"

"اس کا مطلب سن لو۔ حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ مدینہ ہو کر آئے تو واپسی پر گدھا ہی کہلائے گا۔ حاجی نہیں۔"

وہ چلانے لگی "تم جلتے ہو۔ حسد کرتے ہو مجھ سے۔ سارے زمانے نے مجھے مبارک باد دی ہے۔"

نیلم نے کہا "اگر یہ سچ ہے تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ بہت مبارک ہو۔ ناصر۔ کمینہ پن مت کرو۔"

میں نے کہا "میں سب کے سامنے مبارک باد نہیں دے سکتا کیونکہ میرے جذبات کے اظہار کا انداز دوسروں سے ذرا مختلف ہوگا۔ یا اگر تم ایک منٹ کے لیے ادھر دیکھنے لگو۔"

شبنم نے خوشی سے ہنستے ہوئے اور شرماتے ہوئے مجھے دور دھکیل دیا "بدتمیزی کی تو مار دوں گی۔"

میں نے اخبار کی پرنٹ لائن دیکھی "اس میں تو وہی ابوبکر آزاد صاحب کا نام ہے بطور ایڈیٹر۔"

اس نے اخبار چھین لیا "تم بھی جاہل ہو بالکل۔ نام ایسے نہیں بدلتا۔ اس کے لیے وزارت اطلاعات کو مطلع کرنا پڑتا ہے کہ اب ایڈیٹر کا یہ نام ہوگا۔ وہ این او سی دیتے ہیں تو پرنٹ لائن بدلتی ہے۔ ویسے میں نے ایڈٹ کیا ہے پورا اخبار۔ سارا کام میرا ہے۔ نام بھی آ جائے گا، پھر چارج بھی لے لوں گی۔"

میں نے کہا "کیا خدانخواستہ۔ رضائے الٰہی سے اپنے ابوبکر آزاد صاحب۔"

"بکو مت۔ بالکل ٹھیک ہیں مگر انہوں نے ذمے داری مجھے سونپ دی ہے۔ وہ مالک تو رہیں گے۔"

میں نے کہا "یہ تو پھر مورونی بات ہو گئی۔ اب تم جیسی بھی ہو ان کی بیٹی ہو تو ایڈیٹر اور کون ہو سکتا تھا۔"

شبنم نے پھر شکایتی انداز میں نیلم کو دیکھا "ناصر صاحب فرما رہے ہیں کہ اہلیت وغیرہ کچھ نہیں تھی مجھ میں۔ گدی مل گئی مجھے ایڈیٹر کی۔"

نیلم نے کہا "مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟"

"آزاد صاحب کی عمر کافی ہو گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نوجوان کی ضرورت ہے اخبار کو، جو نئے آئیڈیاز لائے۔ جدید انداز میں اخبار کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق چلائے۔ میری عملی تربیت بڑی محنت سے کی تھی انہوں نے مگر وہ میرے رویے سے خاصے مایوس تھے۔ کہتے تھے تم میں ڈسپلن نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ڈسپلن کیا۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی "کل میں نے اپنے غیر ذمے دارانہ رویے پر سنجیدگی سے معافی مانگی پھر کہا کہ اب میں محنت کروں گی۔ دن رات ایک کروں گی اخبار کی اشاعت میں اضافے کے لیے۔ ریڈر شپ بڑھانے کے لیے۔ کافی عرصے سے اشاعت مسلسل زوال پذیر تھی اور اخراجات بھی مشکل سے پورے ہو رہے تھے۔ مسئلہ وہی تھے۔ آزاد صاحب کی غیر لچک دار۔ غیر کاروباری اور پرانی سوچ۔ اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے تھے۔ سرکولیشن، مارکیٹنگ اور بیگزین کے شعبے کمزور تھے۔ آزاد صاحب سنسنی خیزی کے مخالف تھے۔ مصلحت اور مفاہمت کی جانب سے الرجک تھے۔ پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا' پھر وہ اتنے خوش ہوئے کہ رونے لگے مجھے گلے لگا کے۔ بولے کہ میں نے تو بڑی امیدوں کے ساتھ اور بڑی دعائیں مانگ کے اس نخل آرزو کو پروان چڑھایا تھا گویا۔ تمہارے مستقبل کی کامیابی سے میرے ماضی کی ہر ناکامی کے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکتا تھا مگر تم نے اپنی خداداد صلاحیت اور تجربے کو بھی ایسے نظر انداز کر رکھا تھا کہ لگتا تھا تم اس پیشے سے منحرف ہو گئی ہو۔ خیر۔ اب تم نے ارادہ کر لیا ہے تو نیک کام میں دیر کیسی۔ آؤ بیٹھو اس کرسی پر جو تمہارے لیے ہی تھی۔ میرے لیے تو یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔"

"آزاد صاحب چالاک آدمی ہیں۔ ذمے داری کا پہاڑ رکھ دیا تمہارے سر پر اور خود ہاتھ جھاڑ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے تماشا دیکھنے۔ اب جیسے چاہو یہ بوجھ اٹھاؤ۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہ بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔" وہ چڑ گئی۔

"میرا کیا۔ خود آزاد صاحب کا بھی خیال ہوگا۔ تم نے بہت بڑھکیں ماریں تو انہوں نے کہا کہ اچھا آجاؤ میدان میں۔"

"میں نے بھی چیلنج قبول کر لیا ہے تو یہ کام کر کے دکھاؤں گی۔ اگلے تین مہینوں میں اشاعت نہ بڑھی تو استعفیٰ دے دوں گی۔"

"ایک ایک اخبار ہم سب خریدیں گے۔ فکر مت کرو۔ اشاعت بڑھ جائے گی۔ میں دو کاپیاں خرید لوں گا تمہاری خاطر۔" میں نے کہا۔

"چھ ماہ بعد اشاعت میں پچاس فیصد اضافے کا ٹارگٹ ہے میرا۔ ایک سال میں اشاعت دگنی۔"

"دو سال میں چار گنا۔ چار سال میں آٹھ گنا۔ آٹھ سال میں سولہ گنا۔ اکیسویں صدی شروع ہوگی تو یہ ملک کا نمبر ون اخبار ہوگا۔ چلو مس شیخ چلی۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

نیلم نے کہا "ہاں بھئی بہت دیر ہو گئی۔ باقی باتیں پھر کریں گے۔"

شبنم جھولے سے اتر کے بولی "خیالی پلاؤ نہیں پکا رہی ہوں میں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پلاؤ پکانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تم خیالی دال پکالو تو بڑی بات ہوگی۔"

سوئی اور رئیس کو زبردستی اٹھایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب نے دونوں پر اخبار کے ڈنڈے سے لاٹھی چارج کیا کیونکہ وہ شرافت کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔ ابھی وہ ہوش میں ہی نہیں آئے تھے کہ انہیں شبنم نے دنیا کی سب سے بڑی خبر سنا کے مبارک باد دینے پر مجبور کیا۔

یہ ہمارے پلان کی دوسری کامیابی تھی۔ فرید عباسی نے ہاشمی صاحب کے ساتھ مل کے اپنی لا فرم قائم کرنے کی کوشش میں بہت کامیاب پیش رفت کی تھی اور اس مقصد کے لیے ہاشمی صاحب کی رضامندی سے ایک آفس بھی لے لیا تھا۔ شبنم نے سب کی خواہش اور مشورے کا احترام کرتے ہوئے خود کو پھر پوری طرح صحافت کے لیے وقف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اسے غیر متوقع طور پر کامیابی ایک انعام کی صورت میں مل گئی تھی۔

ناشتے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ یہ پورا ہال تھا جس کا ایک گوشہ فرشی نشست کے لیے آراستہ تھا۔ ہم دبیز قالینوں پر گاؤ تکیے بغل میں دبا کے اور پاؤں پھیلا کے نیم دراز ہو گئے۔ گزشتہ دن کے مقابلے میں آج کی صبح بہت مبارک ثابت ہو رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد ہم بے فکری اور خوشی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

شبنم نے کہا "کیوں نا ہم فرید عباسی اور رخشی کو بھی بلا لیں۔"

"ضرور بلا لو۔" نیلم نے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے شبنم کو روک دیا "مجھے تو تمہارا یہاں آنا بھی منظور نہیں تھا۔ تم سب کو اکٹھا کرنا چاہتی ہو یہاں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے آج کہ کسی کو شک ہو۔ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو سب کچھ ایسے معمول کے مطابق لگے۔ نیلم۔ تمہارا کیا شیڈول ہے آج۔"

"میں کسی شوٹنگ میں حصہ نہیں لوں گی۔ آج۔۔۔!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"پلیز۔ ہماری خاطر ایسا مت کرو۔ آج ضرور جاؤ۔" میں نے کہا۔

"اور ہم سب یہاں بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے سارا دن؟" شبنم نے کہا۔

"نہیں۔ ہم سب باری باری خاموشی سے نکل جائیں گے۔ پہلے میں نکلوں گا۔ نیلم کے ساتھ۔ میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا پھر شوفر گاڑی کو باہر لے جائے گا اور دروازے کے سامنے کھڑی کر کے اندر باہر سے صاف کرے گا۔ ظاہر ہے ہوگا کہ ابھی گاڑی میں کوئی بھی نہیں ہے۔ گاڑی کے چاروں دروازے کھلے ہوں گے مگر میں نظر نہیں آؤں گا۔ میں پیچھے والی سیٹ کے بھی پیچھے لیٹا رہوں گا۔ پیچھے والا پانچواں دروازہ جس کے باہر کی طرف اسپیئر وہیل ہے۔ لاک رہے گا۔ نیلم آدھے گھنٹے بعد آ کے بیٹھے گی تو گاڑی اسے لے جائے گی۔ اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

نیلم نے سر ہلایا "میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ اتنی احتیاط؟"

"احتیاط میں نقصان کوئی نہیں لیکن یہ نقصان سے بچا سکتی ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ اسٹوڈیو کے اندر لے جا سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں لے جا سکتی۔"

"تو بس مجھے اندر اتار کے کسی دوسری گاڑی میں واپس بھیج دینا۔ اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ مایوس ہوئی "تم سے پھر کب ملاقات ہوگی؟"

"بہت جلد۔ دو چار دن میں۔" میں نے کہا اور وہ خاموش ہو گئی۔

"اور ہماری ملاقات کہاں ہوگی؟" شبنم نے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو۔ یہ بعد میں آجائے گا وہاں۔ اپنے نئے گھر میں۔ آج بہت سے کام نمٹانے ہیں مجھے۔" رئیس نے کہا۔

نیلم کی ڈریسنگ گیراج میں موجود تھی۔ نیلم نے اپنے سیکریٹری رحمان صاحب کو بلا کے ہدایات دیں۔ وہ پرانا' آزمودہ اور بہت بھروسے کا آدمی تھا۔ اس گھر میں میری حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات نے یقیناً اس کے ذہن میں بھی سوالات کو جنم دیا ہوگا مگر اس نے "یس میڈم" کے سوا کچھ نہیں کہا۔ بانو خالہ اپنی بزرگانہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت کچھ کہہ جاتی تھیں مگر گھر کے دوسرے نوکروں میں ہمت نہ تھی کہ اپنے رویے سے بھی ناخوشی کا اظہار کریں۔ وہ سب حیران تھے کہ یہ اجنبی کون ہیں جو گھر میں پہلے کبھی نظر نہیں آئے لیکن آئے تو گھر کے مالک کی طرح اہم ہو گئے۔ انہیں ہم پسند نہیں آئے تھے۔ سوئی اور شبنم پر شاید انہیں اعتراض نہ ہوتا مگر رئیس اور میں اپنے حلیے سے ہی ناپسندیدہ تھے۔

نیلم نے کہا "تم رابطہ تو رکھو گے نا۔ فون تو کرو گے؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں کروں گا اور موقع ملا تو چوروں کی طرح ملنے بھی آجاؤں گا۔"

وہ مسکرائی "خدا کے لیے اپنا یہ گیٹ اَپ بھی بدلو۔"

میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا "انشاء اللہ اگلی ملاقات میں تم مجھے پہچان نہیں پاؤ گی لیکن ناصر عظیم کو پہچان لوگی فوراً۔ یہ جو حلیہ تم آج دیکھ رہی ہو میرا' یہ بس تمہاری یادداشت میں محفوظ رہ جائے گا۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں آتی ہوں دس منٹ میں۔"

میں نے کہا "دس منٹ میں میک اَپ ہو جاتا ہے ایک ہیروئن کا۔"

وہ بولی "میک اَپ میں اسٹوڈیو پہنچ کے کراؤں گی۔ ورنہ تو دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

ڈریسر کے پیچھے والے حصے میں جگہ کی کمی نہ تھی۔ میں وہاں گاڑی کا کور اوڑھ کے لیٹ جاتا تو جھانک کر اندر دیکھنے والے کو بھی میری موجودگی کا پتا نہ چلتا۔ شوفر گاڑی کو باہر لے آیا اور اس کے چاروں دروازے کھول کے صفائی میں مصروف ہو گیا۔ وہ ضلع ہزارہ کا رہنے والا عمر رسیدہ اور خاموش طبع شخص تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بانو خالہ کا دوسرا شوہر تھا۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ اور انسانی فطرت کی کمی کی آئینہ دار تھی۔ خود بانو خالہ نے اپنے شوہر کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ کے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورت بقول خالہ کے ان کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ نیلم کے گھر میں اس کے برعکس ہوا۔ شوفر بارہ سال سے نیلم کے پاس ملازمت کر رہا تھا اور اسے بیوی کے ساتھ رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ اس کی بیوی سارا دن گھر میں اندر کے کام سنبھالتی تھی۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔ اچانک بانو خالہ اپنی دکھ بھری کہانی کے ساتھ آئیں اور نیلم نے ترس کھا کے انہیں بھی رکھ لیا۔ بانو خالہ گوری چٹی اور بہت تیز و طرار خاتون تھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ دس بارہ سال پہلے وہ ایک پرکشش عورت ہوں گی۔ انہوں نے آسانی سے شوفر کو اپنے دامِ حسن کا اسیر کر لیا۔ اولاد نہ ہونے کا بہانہ پہلے ہی تھا۔ شوفر نے بانو خالہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے عقد ثانی کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کی بیوی نے نیلم سے فریاد کی مگر نیلم نے اسے ہی عقل اور صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ شرعاً اور اخلاقاً یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ شوفر کی اولاد کی خواہش فطری بات تھی مگر اس کی بیوی نے نیلم سے بھی صاف کہہ دیا کہ اس کے جیتے جی یہ ناممکن ہے۔ نیلم نے کہا کہ وہ تین طلاق کے تین لفظ بول کے نکال دے گا تو کہاں جاؤ گی۔ دونوں عزت و آبرو کے ساتھ اسی گھر میں مل کے رہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک رات اس نے کیڑے کوڑے مارنے والی دوا پی لی اور مرگئی۔ نیلم نے بڑی مشکل سے شوفر کی گلو خلاصی کرائی ورنہ پولیس تو اس پر قتل کا کیس بنا چکی تھی۔ بانو خالہ کی شادی کو بھی دس سال ہوگئے تھے لیکن شوفر کی اولاد کی حسرت پوری نہیں ہوئی تھی۔

بیکرو میں لینے رہنا بڑا صبر آزما کام تھا۔ ایک بار میں نے سر اٹھا کے شیشے سے باہر جھانکا۔ سڑک پر کہیں کہیں کوئی گاڑی نظر آرہی تھی۔ بہت دور دایاڈا کی ایک۔ گاڑی کوئی کیبل فالٹ دور کرنے آئی تھی پھر میں نے دوسری طرف دیکھا۔ ایک کوٹھی کے سامنے شامیانہ لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے کرسیوں پر آٹھ دس اداس چہروں والے لوگ بیٹھے تھے۔ منظر اور ماحول دیکھ کے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہاں کسی کے لیے زندگی کے سفر کی آخری منزل آگئی تھی۔ آگے کھڑی ہوئی سب گاڑیاں انہی سوگواروں کی تھیں جو مرنے والے کے عزیز تھے۔

کہیں کوئی بات شک پیدا کرنے والی نہیں تھی۔ نیلم کے گھر کی نگرانی کوئی نہیں کر رہا تھا۔ رب نواز خود کہیں روپوش تھا۔ شاید وہ ضمانت کی منسوخی کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے لیے وکیلوں سے صلاح مشورہ کر رہا تھا۔ یا اپنے کسی نامعلوم ٹھکانے پر مشیروں اور مصاحبوں کے ساتھ اس صورتِ حال پر متبادلہ خیال کر رہا تھا۔ اسے ناصر عظیم اور نیلم یا گزشتہ شب کے واقعات کے بارے میں غور و فکر کی فرصت ہی کہاں تھی۔ نشہ اترنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا یقیناً احساس ہوا ہوگا۔

نیلم کے آنے تک میں سخت بیزار ہو گیا تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ غیر ضروری احتیاط پسندی سے کام لے کر میں نے خود کو مشکل میں ڈالا ہے۔ گرمی اور گھٹن سے میرا حال خراب تھا۔ خدا خدا کر کے نیلم آئی۔ سب دروازے بند ہوئے اور اے سی آن ہو گیا پھر گاڑی چلی تو میری کمر کا جھٹکوں سے برا حال ہو گیا۔

نیلم نے پیچھے پلٹ کے کہا "اب تم چاہو تو آگے آ کے میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

میں نے سر اٹھا کے کہا "آگے پیچھے دیکھ کے بتاؤ۔ خطرہ تو نہیں ہے کوئی؟"

"خطرہ کیسا ہوتا ہے؟" وہ بولی "میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ ویسے تو ہر طرف سکون ہے اور خیریت ہے۔ نہ فائرنگ ہو رہی ہے اور نہ بم پھٹ رہے ہیں۔ سڑک پر شریف لوگ کاروں میں پھر رہے ہیں۔ کوئی ٹینک نظر نہیں آرہا ہے مگر۔"

میں نے کہا "مگر کیا؟"

"ایک گاڑی ہے۔ نمبر ایل ای۔ آگے نہیں پڑھا جاتا۔ سیون فور ایٹ تھری۔ بہت دیر سے آگے پیچھے چل رہی ہے۔ شوفر۔ گاڑی روک لو۔"

گاڑی رک گئی۔ میں نے کہا "گاڑی آگے ہے یا پیچھے۔ کون سی گاڑی ہے؟"

"وائٹ کارولا۔ ماڈل چھیاسی۔ میرے پاس تھی اس لیے معلوم ہے۔ پہلے گاڑی آگے تھی اب وہ بھی رک گئی ہے۔" نیلم کی آواز میں کچھ پریشانی آگئی۔

شوفر نے کہا "آپ فکر مت کریں میڈم۔ میں پوچھتا ہوں ان سے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ جب تک وہ خود کچھ نہ کریں۔ تم چپ رہو۔" نیلم بولی۔

"میرے پاس ریوالور ہے میڈم۔" شوفر بولا۔

"وہ تو میرے پاس بھی ہے مگر دیکھو۔ کوشش کرو انہیں ڈاج کرنے کی۔" نیلم نے کہا "آگے پولیس اسٹیشن ہے نا؟"

"جی میڈم۔ یہ بدمعاش ہیں کون۔۔۔؟"

نیلم نے کہا "یہ لوگ تو راستہ روک کے کھڑے ہیں۔ ٹھہرو میں بات کروں گی پہلے۔ ناصر۔ تم گاڑی کے کور میں چھپ جاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ چھپنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر انہوں نے بدمعاشی دکھائی تو مجھے باہر نکلنا ہی ہوگا۔

شوفر نے کہا "کیا بات ہے۔ تم نے راستہ کیوں روکا ہے؟"

ایک اجنبی آواز نے کہا "یہ گاڑی مس نیلم کی ہے؟"

"ہاں ہے۔" شوفر نے کہا "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ہم مس نیلم کے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں۔" دوسرا بدمعاشی سے ہنسا۔

نیلم نے کہا "ڈرائیور۔ ٹھہرو۔ میں آٹوگراف دیتی ہوں۔"

ایک اور آواز آئی "اپنا نام میرے ہاتھ پر لکھ دو۔ جانِ

من۔"

دوسری آواز نے کہا "اور میرے دل پر۔ میری بلبل۔"

نیلم نے کہا "ایسے کیا جھانک رہے ہو اندر۔ کیا چاہتے ہو؟"

کسی نے ہنس کے کہا "او یار اس نے تو ریوالور نکال لیا۔"

"میں گولی مار دوں گی اگر کسی نے بدتمیزی کی۔" نیلم نے غرا کے کہا۔

شوفر نے کہا "چلو ہٹ جاؤ۔ پیچھے۔۔۔"

"اوئے۔ گالی مت دے۔" پہلی آواز نے کہا۔

"یار اندر تو کوئی نہیں ہے۔" کسی نے کہا۔

"اچھا جی ناراضگی کیسی۔ ہم جاتے ہیں۔"

پھر وہ چلے گئے۔ میں نے ان کے بے باک قہقہے اور گستاخ جملے سنے۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

نیلم نے کہا "اف۔۔۔ خدا کا شکر ہے دفع ہوئے خبیث۔"

میں نے کور سے سر نکال کے کہا "وہ ضرور مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔"

نیلم نے ایک گہری سانس لی "شاید۔"

میں نے کہا "تم نے دیکھا۔ احتیاط کام آگئی۔ یقیناً یہ رب نواز کے آدمی تھے۔"

شوفر نے کہا "میڈم۔ یہ گاڑی بھی ادھر ہی کھڑی تھی۔ جدھر آج ماتم ہو گیا۔ اپنا غلام حسین صاحب کا والد فوت ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ لوگ بھی وہیں بیٹھے تھے؟"

شوفر نے گاڑی آگے بڑھا دی "بیٹھیں ہوں گے سر۔ گاڑی ادھر سے آئی تھی۔"

میں نے کہا "چلو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمہاری پوزیشن بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ نگرانی شاید ابھی جاری رہے گی نیلم ہاؤس کی۔"

نیلم کا خوف اب غصے میں بدل گیا تھا "اگر رب نواز یہ سمجھتا ہے کہ یوں مجھے ہراساں کیا جا سکتا ہے۔۔۔"

میں کور ہٹا کے نیلم کے ساتھ بیٹھ گیا "رب نواز کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنی سیکیورٹی ایجنسی کو بتا دو کہ آج رات ہے میں تمہیں کچھ غنڈوں نے پریشان کیا تھا۔ وہ خود ہی کر دیں گے کچھ انتظام۔"

"میں نے کل رات اسے رعایت دے کر غلطی کی تھی۔ اچھا تھا اسی وقت پولیس کو اور اخبار والوں کو بلا لیتی۔ اگر ابھی میں فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کو بتا دوں۔۔۔"

میں نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ رب نواز اپنا اطمینان چاہتا ہے جب اسے یقین آجائے گا کہ میں واقعی تمہارے ساتھ نہیں ہوں تو وہ تمہیں اسی طرح بھول جائے گا۔ جیسے اب تک بھولا ہوا تھا۔"

نیلم کی گاڑی اسٹوڈیو کے گیٹ سے سیدھی گزر گئی اور پروڈیوسر کے آفس کے سامنے جا رکی۔ بہت سی سوالیہ نظریں نیلم کے ساتھ ایک مضحکہ خیز حلیے والے شخص پر اٹھیں مگر اتنی ہمت کس میں تھی کہ سوال کرتا۔ میں ایک ائر کنڈیشنڈ آفس میں پہنچ گیا جو کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وسیع میز پر رسالے، پوسٹر، تصویریں۔ فلموں کی ریلوں کے ڈبے۔ گیسٹ اور پتا نہیں کیا کچھ ڈھیر تھا۔ یہی حال فرش اور دیواروں کا تھا۔ نیلم اس کرسی پر بیٹھ گئی جو شاید پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کے لیے تھی۔ میں نے اس کے سامنے والی تین میں سے ایک کرسی پر جگہ بنائی۔ نیلم نے کسی سے چائے کے لیے کہا۔

میں نے کہا "چائے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"مجھے ہے۔ میں نروس ہو گئی ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھو۔" وہ بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر ایک ہفتے میں تم سے نہ ملوں۔۔۔"

"سوال یہ ہے کہ کیوں۔ ہمارے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ یہ تم نے خود ہی ثابت کر دیا ہے سب کے سامنے۔ کیا رب نواز کے ڈر سے تم کسی سے بھی نہیں ملو گے۔ نہ ڈاکٹر کمال سے۔ نہ قمر سے۔"

"ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا۔ مجھے بہت کام ہوں گے۔ میں خود کو ناصر عظیم کی حیثیت سے اسٹیبلش کروں گا۔ میں ایک بلڈر۔ امپورٹر ایکسپورٹر۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر جنرل آرڈر سپلائر سب کچھ ہوں مگر کہاں ہے میرا آفس۔ میرا بزنس۔ میرے کاروباری تعلقات۔ میرا اسٹاف۔ بھئی سرے سے سب کچھ کرنے کے لیے جو سیٹ اپ چاہیے وہ راتوں رات قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک ہفتہ بھی کم ہے مگر رئیس بھی میرے ساتھ ہے اور دنیا میں سارا کھیل ہے پیسے کا۔ پیسہ ہو تو ہتھیلی پر سرسوں بھی جمائی جا سکتی ہے۔ تم بھی سب کچھ بھول کے اپنا کام کرو۔ سونی تمہارے ساتھ ہے۔ ہم فون کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ ایک ہفتے یا دس دن بعد میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ اپنے گھر اور آفس لے جاؤں گا اور اس وقت جو کچھ تم دیکھو گی وہ بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مختلف ہوگا۔ تمہارا دل خوش ہوجائے گا۔"

"اگر رب نواز پھر آئے۔ یا فون کرے؟"

"تو کچھ نہیں۔ وہ پوچھے ناصر عظیم کے بارے میں تو جو تمہیں معلوم ہے وہ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ناصر عظیم کے بارے میں یقیناً تجسس میں مبتلا ہوگا کہ دس سال پہلے جو لاوارث اور مفلوک الحال لڑکا تھا وہ اتنا دولت مند کیسے ہوگیا۔ دس سال تمہارا بھی مجھ سے رابطہ نہیں رہا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ مجھے زیادہ نہیں معلوم۔ اس نے بزنس کیا اور ترقی کرتا رہا۔ شاید وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھے لیکن ابھی تو اسے اپنے خلاف قانونی مقدمات کی پریشانی لاحق ہوگی۔ اس کے قانونی مشیر مخلص ہوں گے تو اسے مشورہ دیں گے کہ فرید عباسی اور عزیز ہاشمی سے مل کر معاملات طے کرنے کی کوشش کرے۔ وہ رئیس سے بات کرے گا کہ تمہیں مار خاں اور چھوٹی کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابھی دوسرے سب معاملات کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ گرفتاری سے بچنا چاہتا ہے وہ پہلے تو۔"

"وہ جھکنے اور اپنی غلطی تسلیم کرکے مصالحت کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ کسی سے معافی مانگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہم کون سے کمپرومائز کے موڈ میں ہیں اور پھر یہ قانونی معاملات ہیں۔ ان میں معافی دینے کا اختیار تو اعلیٰ ترین عدالت کے پاس بھی نہیں۔"

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہر معاملہ دبایا جاسکتا ہے یہاں۔"

"ہاں۔ آج تک وہ یہی کرتے آئے ہیں۔ تم نے عمران کا بیان سنا تھا۔ وہ صرف ایک کہانی تھی۔ اس کا شوہر کیوں مارا گیا؟ صرف اس لیے کہ عمران نے عدالت سے جینے کا حق مانگا تھا اور کچھ نہیں۔ ایسی بہت سی سفاک کہانیاں ان کہی رہ گئی ہیں۔ اگر میں حساب کروں تو مجھے صرف رب نواز کے دامن پر کم سے کم دس انسانوں کے لہو کے داغ نظر آتے ہیں۔"

"تمہیں کیا ضرورت ہے سب کا حساب کرنے کی؟"

میں نے کہا "حساب ایک نہ ایک دن خود قدرت کرتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ رب نواز کو اب اپنے آباؤ اجداد کے وقتوں کا حساب دینا ہی پڑے گا۔ خیر۔ میں چلتا ہوں۔ تم کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

یہ تسلی کے کھوکھلے الفاظ تھے جن پر خود مجھے اعتبار نہیں تھا۔ نیلم نے میرے لیے کوئی گاڑی منگوائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ گاڑی میرے ڈسپوزل پر ہے۔ میں چاہوں تو ڈرائیور کو ساتھ رکھوں۔ میں نے ڈرائیور کو واپس کردیا اور خود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اسٹوڈیو سے نکل گیا۔ یہ ایک شاندار نسان سٹی کار تھی اور اس کے کاغذات میں مالک کا نام بابو رشید لکھا ہوا تھا جو کچھ عجیب سا نام تھا۔ شاید وہ کوئی پروڈیوسر ہوگا۔ نیلم کے ایک اشارے پر وہ ایسی دس گاڑیاں حاضر کردیتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

یہ کہانی وطن کے پُرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

آسماتھ مرے اور دیکھ ذرا جس دنیا میں تُو رہتا ہے
یہ دنیا اک تماشا ہے اور سب انسان مداری ہیں

کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا کیا کھیل دکھاتے ہیں
یہ لیڈر، ووٹر، پیر مرید، شاگرد اُستاد مداری ہیں

آ دیکھ ذرا آنکھوں سے انہیں ان سب کے ہاتھ میں جھنڈا ہے
یہ قوم کے خادم، دانشور، فن کار، وزیر مداری ہیں

ان چہرہ بدلنے والوں کو ایمان اصول وفا سے کیا
یہ ڈاکو تاجر، چور افسر، عاشق معشوق مداری ہیں

آئین، الیکشن، یو این او، انصاف، حقوق انسانی
لے سچ جھوٹ یہ باتیں جو کرتے ہیں وہ مداری ہیں

احمد اقبال

PDFBOOKSFREE.PK

Rs.60/-

ISBN 969-517-084-6